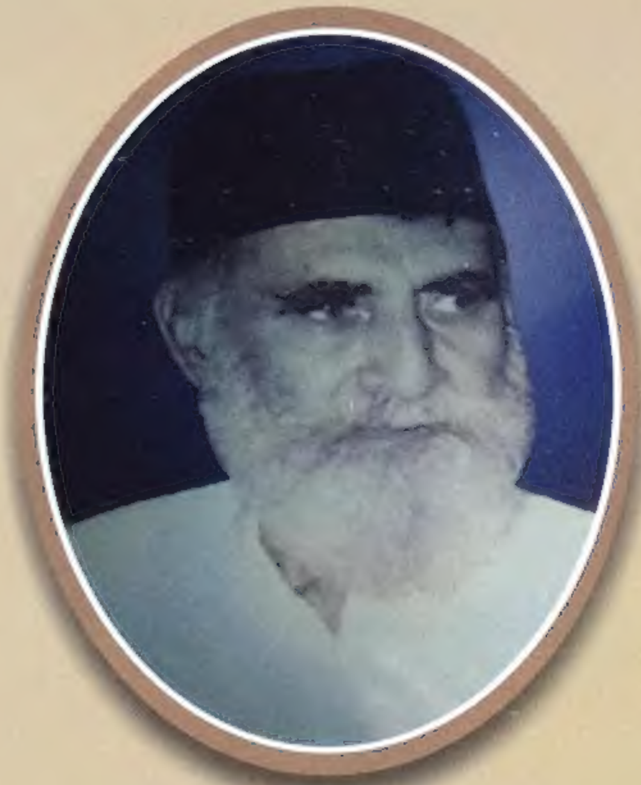
امتیازِ علی عرشی کی
غالب شناسی



تلاش وترتیب : ثاقب عمران

رام پور رضا لائبریری
رام پور، ۲۴۴۹۰۱ (یو پی)

امتیاز علی عرشی کی غالب شناسی

تلاش و ترتیب

ثاقب عمران

رام پور رضا لائبریری
رام پور، ۲۴۴۹۰۱ (یوپی)

سلسلۂ مطبوعات رام پور رضا لائبریری

Name of the Book	:	**IMTEYAZ ALI ARSHI KI GHALIB SHANASI**
Complied by	:	Dr. Saquib Imran
Edition	:	1439AH / 2018AD
Published By	:	**Prof. Syed Hasan Abbas** Director, Rampur Raza Library, Rampur

نام کتاب : امتیاز علی عرشی کی غالب شناسی

مرتب : ڈاکٹر ثاقب عمران

سن اشاعت : ۱۴۳۹ھ/۲۰۱۸ء

مطبع : آئی بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی

ناشر : **پروفیسر سید حسن عباس**

ڈائریکٹر

رام پور رضا لائبریری، رام پور

ISBN 978-93-82949-52-7

مرتب کا پتہ : ڈاکٹر ثاقب عمران

گڈ ویل اپارٹمنٹ 16&15-I، فرسٹ فلور

ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025

موبائل: 9891423216، ای میل: saquibimran@gmail.com

Rampur Raza Library, Rampur

رام پور رضا لائبریری

حامد منزل، رام پور-۲۴۴۹۰۱ (یو.پی.)

Phone Library : 0595-2325045, 2327244

Fax : 0595 - 2340548

Website : www.razalibrary.gov.in

E-mail : directorrazalibrary@gmail.com

استاد محترم

پروفیسر شہپر رسول

کے نام

جن کی علمی بصیرت میری فکر و نظر کے لیے شہپر پرواز ہے۔

میرے افکار کی رعنائیاں تیرے دم سے
میری آواز میں شامل تری آواز بھی ہے

(غلام ربانی تاباں)

فہرست

فہرست

پیش نامہ

مولانا امتیاز علی عرشی رامپوری کا شمار مشرقی علوم کے ناموراور سرآوردہ علما و محققین میں ہوتا ہے۔ ان کا دائرۂ مطالعہ و تحقیق بہت وسیع اور متنوع رہا ہے۔ اردو، عربی اور فارسی ادبیات، اسلامیات، مخطوطہ شناسی، کتاب شناسی، فہرست نویسی اور تدوین و تصحیح متون کے میدان میں ان کی خدمات اور سب سے بڑھ کر ماہر غالبیات کی حیثیت سے برصغیر میں وہ اپنی مخصوص شناخت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ رامپور رضا لائبریری جیسے علمی مرکز میں گذارا اور اس کے بیش قیمت علمی ذخائر کو علمی دنیا سے متعارف کرا کے اپنی اور لائبریری کی شان میں زبردست اضافہ کیا۔ ان کی علمی کاوشوں کی بدولت لائبریری کے ساتھ وہ خود بھی عظمت و اعتبار کی بلندیوں سے ہم کنار ہوئے۔ ان کی اسی غیر معمولی اور مثالی کوششوں کے سبب انھیں اور رضا لائبریری کو لازم و ملزوم قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ فنافی العلم تھے۔ ایک بڑے عالم اور محقق کی شان بھی یہی ہوتی ہے۔ لیکن وہ ایک بڑے انسان بھی تھے اور ان کی یہ صفت انھیں مزید ہر دل عزیز بنانے میں بہت معاون اور کارگر ثابت ہوئی۔ اہل علم و فضل کے درمیان انھیں جو عزت و احترام حاصل تھا ویسا ہی احترام عوام الناس میں بھی پایا جاتا تھا۔ وہ ثمر دار درخت کی مانند تھے۔ ان کی شرافت نفس، خاکساری اور منکسر المزاجی سے سبھی واقف ہیں۔ ان کے علمی کارناموں کی فہرست نہ صرف بہت طویل ہے بلکہ گوناگوں بھی ہے۔ انھوں نے رضا لائبریری کے نادرِ روزگار مخطوطات کو متعارف کرایا اور چھ جلدوں میں عربی مخطوطات کی فہرست سازی کی جبکہ اردو مخطوطات کی ایک جلد تیار کی جس کے لیے انھیں نہ جانے کتنے کیٹلاگ اور فہرست نویسوں کی کاوشوں سے رجوع کرنا پڑا ہوگا۔ جن مخطوطات کی ترتیب و تدوین اور تصحیح کا بیڑا اٹھایا انھیں پوری دیانت داری اور سخت محنت سے معیاری متن تیار کر کے اہل علم کی خدمت میں پیش کیا جس کے سبب وہ علمی دنیا میں ایک بلند پایا محقق و مدوّن کی حیثیت سے اپنا مقام بنا سکے۔ اس خدمت گذاری کے باعث انھیں کئی طرح کے

انعامات جیسے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، غالب ایوارڈ اور صدر جمہوریہ ایوارڈ سے سرفراز کر کے ان کی علمی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔''نذرِ عرشی' کی پیش کش بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

مولانا امتیاز علی عرشی کی تحقیقات ومطالعات کا ایک اہم پہلو غالب شناسی رہا ہے۔انھیں غالب، اس کی شاعری اور دیگر آثار سے بے پناہ دلچسپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے غالبیات کے موضوع پر بہت گہرا اور دقیق مطالعہ کیا اور اپنی غیر معمولی علمی اور تحقیقی کاوشوں سے غالب کی عظمت کو منوایا۔ مستقل کتابوں کے علاوہ غالب، اس کی تصنیفات وتالیفات اور دیگر متعلقات کے بارے میں بے شمار مضامین ومقالات سپرد قلم کیے اور ان موضوعات سے دل چسپی رکھنے والوں کو نت نئے پہلوؤں سے متعارف کرایا۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر کے غالب شناسوں میں ان کا نام اور کام عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اتنے بڑے غالب شناس کی تحریریں رسائل وجرائد کے سینوں میں مدفون تھیں اور جویائے علم وآگہی ان کے متلاشی تو ضرور تھے مگر انھیں وہ دستیاب نہیں ہوتی تھیں یا کچھ ہوتی تھیں اور کچھ ناپید تھیں۔ثاقب عمران صاحب کی تلاش وجستجو کی داد دینا چاہیے کہ انھوں نے عرشی صاحب جیسے صفِ اول کے غالب شناس کی کم وبیش غالب سے متعلق تمام تحریریں ڈھونڈ نکالیں اور اس طرح ''امتیاز علی عرشی کی غالب شناسی'' نامی یہ مجموعۂ مضامین تیار ہوسکا جو آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ سارے مضامین جو نصف صدی سے زائد عرصے پر محیط ہیں اور جنھیں ثاقب عمران صاحب نے بڑی محنت سے تلاش کر کے ایک مفصل مقدمے کے ساتھ اس مجموعے میں یکجا پیش کیا ہے، اس کا ایک بڑا افادی پہلو یہی ہے کہ یہ سارے مضامین اب بہ آسانی ہماری دسترس میں ہیں اور ہم ان سے بخوبی استفادہ کر سکتے ہیں۔

رضا لائبریری کے تمام علمی، ادبی اور ثقافتی کام وزارت ثقافت حکومت ہند، گورنر اتر پردیش اور لائبریری بورڈ کے چیرمین جناب رام نائک، بورڈ کے معزز ممبران اور اکیڈمک اور پبلی کیشنز سب کمیٹی کے تمام اراکین کے تعاون اور دستگیری سے ہی عملی جامہ پہنتے ہیں، لہٰذا ان کا شکریہ ادا کرنا لازم ہے۔ ثاقب عمران صاحب کی بےلوث علمی خدمت بھی لائق ستائش ہے،جنھوں نے زبردست محنت وجانفشانی سے ایک اہم علمی خدمت انجام دے کر اپنا نام علم وادب کے خدمت گاروں میں ثبت کرالیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ مستقبل میں بھی وہ ایسا ہی کچھ اہم علمی کام انجام دیں گے جس سے ان کا نام اور کام دونوں ہمیشہ یادرکھا جاسکے گا۔

مولانا عرشی کی شخصیت اور عظیم خدمات کو فراموش کرنا ناممکن ہے۔وہ 1932 سے لے کر 1981

تک رضا لائبریری سے وابستہ رہے۔ نصف صدی سے زائد کی یہ وابستگی کوئی معمولی چیز نہیں۔ ان برسوں میں انھوں نے جہاں لائبریری کے ذخائر کو از سر نو مرتب کیا، وہیں محدود وسائل میں جو عظیم علمی خدمات انجام دی ہیں، وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ ایسے با کمال عالم و محقق کی تحریروں کا تحفظ بھی اہم علمی فریضہ ہے جس کا سلسلہ اب باضابطہ شروع ہو چکا ہے اور یہ کتاب اسی سلسلے کی پہلی کڑی ہے جسے رضا لائبریری کی جانب سے شائع کیا جا رہا ہے۔ خدا نے چاہا تو ان شاء اللہ مولانا عرشی (جنھوں نے علم و ادب کی راہ میں اپنی پوری عمر کھپا دی) کی دیگر تحقیقات علمیہ بھی اسی طرح رفتہ رفتہ اہل علم کی خدمت میں کتابی صورت میں پیش کی جاتی رہیں گی۔

میں مرتب کتاب کو مبارکباد پیش کرنے کے ساتھ اہل دانش و بینش سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ ہمیں اپنے خیالات و تاثرات سے نوازیں گے تاکہ اس قسم کے علمی کاموں کی انجام دہی میں ان کے مفید مشوروں سے فائدہ اٹھایا جائے اور مستقبل میں علم و ادب کی بیش از بیش خدمت انجام دی جا سکے۔

پروفیسر سید حسن عباس
ڈائرکٹر
رام پور رضا لائبریری، رام پور

مولانا امتیاز علی خاں عرشی



(۸؍ دسمبر ۱۹۰۴ء .... ۲۵؍ فروری ۱۹۸۱ء)

بزمِ مے سے اُس کے اُٹھتے ہی نظر آنے لگا
جیسے اس کے ساتھ میخانے کا میخانہ گیا

مقدمہ

امتیاز علی عرشی (8/دسمبر 1904 تا 25/فروری 1981) کو تحقیق کی دنیا میں اہم مقام حاصل ہے۔ اردو ادب، فارسی ادب، عربی ادب نیز اسلامیات کے تحت انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں انھیں ہمیشہ تحسین کی نظروں سے دیکھا جائے گا اور یہی وہ کام ہے جس کے سبب رہتی دنیا تک ان کا نام ادبی محفلوں میں اپنی حاضری درج کراتا رہے گا۔ انھوں نے ایک لائبریرین کی حیثیت سے رامپور رضا لائبریری کو اپنی خدمات پیش کیں اور ساری زندگی اس کی خدمت میں سرگرم رہے۔ ان کو رضا لائبریری رامپور سے اتنی محبت تھی کہ ان کے انتقال کے بعد نواب رامپور جناب مرتضیٰ علی خاں صاحب اور کلکٹر رامپور کی اجازت کے بعد، مولانا کی خواہش کے مطابق لائبریری سے متصل نواب محمد سعید خاں اور نواب یوسف علی خاں کے مقبرے کے پاس انھیں دفن کیا گیا۔ امتیاز علی عرشی نے دفتری امور کی ذمہ داریاں نبھانے کے ساتھ ساتھ اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے بہت محنت کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امتیاز علی عرشی کا نام آتے ہی ہمارے ذہن میں ایک ذمہ دار اور ایماندار محقق کی تصویر اُبھرتی ہے۔ ان کی محققانہ جستجو، دقیق نظر اور کسی بھی موضوع کی تہہ تک جانے کا جذبہ ہی انھیں تحقیق کی دنیا میں ایک اہم مقام پر فائز کرتا ہے۔ امتیاز علی عرشی نے بہت سے نادر و نایاب مخطوطات کو از سر نو اپنے تحقیقی نکات کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ غالب سے ان کی محبت بھی جگ ظاہر ہے۔ دیوان غالب کی تدوین نے انھیں غالب شناسوں میں عزت و احترام بخشا، ساتھ ہی انھیں ماہر غالبیات کے زمرے میں بھی اہم مقام عطا کیا۔ کسی محفل میں غالب پر گفتگو ہو رہی ہو اور مولانا عرشی کا نام نہ آئے، ایسا ممکن ہی نہیں۔ غالبیات کے ضمن میں ان کا ایک اہم کارنامہ دیوان غالب کی تدوین ہے۔ اس وقت میں نے امتیاز علی عرشی کے مطالعۂ غالب کو موضوع ضرور بنایا ہے لیکن دیوان غالب نسخۂ عرشی پر گفتگو کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ امتیاز علی عرشی

کی وہ تحریریں میرا ہدف ہیں جو مختلف رسالوں میں بکھری ہوئی تھیں اور ابھی تک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئیں۔ غالبیات کے حوالے سے یہ 38 مضامین ہیں جن کی نوعیت تحقیقی و تنقیدی ہے۔ یہ مضامین 1936 سے 1974 کے درمیان شائع ہوئے تھے۔ ان میں زمانی ترتیب سے پہلا مضمون دراصل کوئی مضمون نہیں ہے بلکہ یہ غالب کے تین غیر مطبوعہ خط ہیں جو انھوں نے قاضی عبدالودود کو رسالہ معیار کے لیے بھیجے تھے جو مارچ 1936 کے شمارے میں شائع ہوئے۔ قاضی عبدالودود نے معیار کے دیباچے میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ خطوط امتیاز علی عرشی کو رامپور رضا لائبریری میں ملے تھے۔ یہ تینوں خط 'خطوط غالب' مرتبہ خلیق انجم میں موجود ہیں۔ میں نے ان خطوط کو کتاب میں شامل نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امتیاز علی عرشی نے ان خطوط کے متعلق کسی طرح کا کوئی تحقیقی یا تنقیدی حاشیہ نہیں لکھا تھا۔ یہاں پر ان خطوط کو ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ خطوط کی دریافت کا سہرا امتیاز علی عرشی کے سر ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ پہلی بار ان خطوط کی وجہ سے ہی امتیاز علی عرشی کا نام غالب کے ساتھ جڑا تھا، جو ساری عمر ان کے ساتھ ہی رہا اور آج بھی ہم انھیں ماہر غالبیات کی شکل میں ہی یاد کرتے ہیں۔ یہاں ایک اور مضمون کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ امتیاز علی عرشی کے توسط سے رسالہ نگار کے مدیر نیاز فتح پوری کو ایک مضمون بعنوان ''میرزا غالب کی اصلاحیں'' موصول ہوا تھا، جو اکتوبر 1943 کے شمارے میں شامل ہے۔ اس مضمون میں غالب نے نواب محمد یوسف علی خاں ناظم اور صاحبزادہ عباس علی خاں بیتاب کے کلام پر اصلاحیں دی تھیں۔ ان اصلاحوں کے ذکر کی اصل وجہ یہ ہے کہ مداحان غالب کو ان اصلاحات کا علم ہو جائے اور یہ بھی کہ یہ اصلاحیں امتیاز علی عرشی کی کوششوں سے منظر عام پر آئیں تھیں۔ مضمون کی ابتدا میں نیاز فتح پوری نے اس مضمون کے متعلق ایک نوٹ لگایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ اصلاحیں ہمیں مولانا امتیاز علی عرشی کی وساطت سے حاصل ہوئی ہیں، جو ریاست رامپور کے سرکاری کتاب خانہ میں ناظم کی حیثیت سے معمور ہیں۔
> مولانا عرشی کو یہ اصلاحیں کتب خانہ کے پرانے مسودات میں دستیاب ہوئی تھیں اور اس میں شک نہیں کہ بڑی ادبی و تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔''

امتیاز علی عرشی کا ایک مضمون ''غالب کی شعر گوئی اور ان کے دواوین'' ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے غالب کے مختلف دواوین پر تو روشنی ڈالی ہی ہے، ساتھ ہی انھوں نے غالب

کے خطوط کا جائزہ بھی لیا ہے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ غالب نے شعرگوئی کی ابتدا عمر کے کس حصے میں کی تھی۔ اپنی غزل گوئی کی ابتدا کے تعلق سے کلیات فارسی کے دیباچے میں غالب نے لکھا ہے کہ 'اس وقت میری عمر دس سال تھی۔' قدر بلگرامی کو 1857 کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ 'بارہ برس کی عمر سے ریختہ میں اشعار کہہ رہا ہوں' اور ان ہی کو 1868 کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ 'پندرہ برس کی عمر سے شعر کہتا ہوں۔' امتیاز علی عرشی ان کی شعرگوئی کے ابتدائی دور پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''علائی کے نام... کے خط میں انھوں [غالب] نے پندرہ سال کی عمر میں کہی ہوئی غزل کے دو شعر لکھے ہیں، جو میری دانست میں آغاز شعرگوئی میں بمشکل کہے جا سکتے ہیں، اس لیے قرین قیاس یہ ہے کہ وہ پندرہ سال کی عمر سے قبل ہی یہ شغل اختیار کر چکے تھے، اور غالباً ان کی عمر اس وقت دس سال کی تھی جیسا کہ کلیات کے خاتمے میں لکھا ہے۔''

امتیاز علی عرشی نے غالب کی ریختہ گوئی کے بھی دو باب قائم کیے ہیں۔ پہلے باب میں غالب کے ابتدائی دس سال کے کلام کا ذکر ہے جو انھوں نے ریختہ میں کہے تھے۔ غالب نے خاکسار کو ایک خط میں لکھا ہے:

> ''خاکسار نے ابتدائی سن تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی۔''
> (عود ہندی:125 اور اردوے معلیٰ:204)

شاکر کو لکھتے ہیں:

> ''ابتدائی فکر سخن میں... ریختہ لکھتا تھا۔'' (عود ہندی:159)

ایک اور خط میں شاکر کو لکھتے ہیں:

> ''15 برس کی عمر سے 25 برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔'' (عود ہندی:156)

امتیاز علی عرشی کے مطابق غالب نے جس بڑے دیوان کی جانب اشارہ کیا ہے وہ 20 سال کی عمر میں مکمل ہو گیا تھا۔ نثار احمد فاروقی نے بھی ''دیوان غالب نسخۂ امروہہ'' کے متعلق اپنے مضمون میں اسی جانب اشارہ کیا ہے۔

ریختہ گوئی کا دوسرا دور 1850 اور اس کے بعد کا ہے۔ غالب کا 1850 میں قلعہ سے تعلق

اور بہادر شاہ ظفر سے راہ و رسم پیدا ہوگئی تھی، جس کی وجہ سے غالب نے پھر سے اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ ایسا نہیں ہے کہ 1817 / 1822 سے لے کر 1850 تک غالب صرف فارسی زبان میں نثر و نظم لکھتے رہے۔ یہاں میں نے دو سنہ کا ذکر اس لیے کیا ہے کیوں کہ غالب کی تحریروں میں ہی ان کے ''بڑا دیوان'' کے متعلق تضاد پایا جاتا ہے۔ ''بڑا دیوان'' کے متعلق 20 برس اور 25 برس کا ذکر ملتا ہے۔ ابھی تک کی تحقیق سے دیوان غالب کے متعلق یہ بات سامنے آچکی ہے کہ غالب نے 20 برس کی عمر میں ایک دیوان تیار کرلیا تھا، جو نسخہ امروہہ کی شکل میں نثار احمد فاروقی نے دریافت کیا ہے۔ بہر حال 1817/1822 سے 1850 کے درمیانی عرصہ میں غالب نے ذائقہ بدلنے کے لیے اردو میں بھی اشعار کہے ہیں لیکن ان کی تعداد فارسی اشعار کے مقابلے میں کم ہے۔

امتیاز علی عرشی کے دو مضامین '' کچھ غالب کے بارے میں'' اور '' کچھ غالب سے متعلق'' ہیں۔ اول الذکر مضمون رسالہ ''مہر نیم روز'' کراچی (1958) میں شائع ہوا تھا۔ اس میں امتیاز علی عرشی نے غالب کے تعلق سے اپنی تازہ دریافت پیش کی تھی۔ پہلی دریافت میں انھوں نے نواب محتشم الدولہ غوث محمد خاں بہادر شوکت جنگ والی جاورہ کی سیر و سیاحت کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے 1852 میں ہندوستان کی سیر کی تھی جو 1852 ہی میں ''سیر المحتشم '' کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ دہلی کے شعرا میں انھوں نے اسد اللہ خاں غالب، امام بخش صہبائی اور محمد ابراہیم ذوق کا ذکر کیا ہے۔ غالب کے بارے میں نواب صاحب کا جو بیان ہے، امتیاز علی عرشی نے اسے مضمون میں درج کردیا ہے اور ساتھ ہی غالب کا وہ مختصر کلام بھی پیش کیا ہے جنھیں نواب صاحب نے اپنی کتاب میں شامل کیا تھا۔ نواب صاحب لکھتے ہیں:

> ''شاہ جہاں آباد میں شعرا بھی بہت ہیں...مگر میرزا اسد اللہ خاں غالب عرف میرزا نوشہ کمال سخنوری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اگر رودکی اِس زمانے میں ہوتا تو اپنے دیوان کو رودِ اشکِ ندامت سے دھوتا۔ اگر آذری ان کے کلامِ روشن کو دیکھتا تو آتشِ غیرت سے اپنی تصنیفات کو جلا دیتا۔ حقیقت میں ان کا ہر مصرع، مصرعۂ ہلالِ آسمان سے بلند تر ہے اور بیت، بیتِ ابروئے خوباں سے خوب تر...''

اس مضمون میں امتیاز علی عرشی نے غالب کے ایک لطیفے کا بھی ذکر کیا ہے۔ امتیاز علی عرشی کے مطابق یہ لطیفہ سید زمان علی شاہ کی مرتب کردہ کتاب میں شامل ہے۔ امتیاز علی عرشی نے کتاب کا نام نہیں لکھا ہے۔ اس کتاب میں مختلف شعرا کے چیدہ منقبتی کلام ہیں اور یہ مطبع یوسفی

سے 1320ھ میں شائع ہوئی تھی۔ لطیفہ کچھ یوں ہے: ایک مرتبہ میر حامد غالب کے گھر تشریف لائے۔ انھوں نے غالب کو ایک مصرعہ ''اسپ وزن و شمشیرِ وفادار کہ دید؟'' سنایا اور کہا کہ مصرعہ ثانی موزوں نہیں ہوتا۔ غالب مصرعہ سنتے ہی جوش میں اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا:

اسپ و زن و شمشیرِ وفادار کہ دید؟
واللہ، علی دید، علی دید، علی دید

امتیاز علی عرشی نے برہان قاطع کے متعلق بھی کئی مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تمام مضامین ایک ہی سلسلے کی الگ الگ کڑیاں ہیں۔ انھوں نے برہان قاطع پر لکھے اپنے پہلے مضمون میں اس جانب اشارہ بھی کیا ہے۔ ان مضامین میں امتیاز علی عرشی نے ''برہان قاطع'' کے اس نسخے کا تعارف کرایا ہے جس میں مرزا غالب نے اپنی یادداشتیں لکھی تھیں۔ ان میں ایک مضمون ''غالب اور برہان'' کے عنوان سے رسالہ ''تحریک'' دہلی، اپریل 1961 میں شائع ہوا تھا۔ ''برہان قاطع'' محمد حسین برہان ابن خلف تبریزی کی فارسی فرہنگ ہے۔ مرزا غالب نے اسی فارسی فرہنگ کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا اور اپنے خیالات کو ''قاطع برہان'' کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ''برہان قاطع'' کی پہلی اشاعت کلکتے سے ٹامس روبک Thomas Roebuck کے ذریعہ 1818 میں عمل میں آئی۔ ٹامس روبک نے برہان کو کلکتے ہی سے 1822 اور 1834 میں بھی شائع کیا تھا۔ مرزا غالب کے زیرِ نظر برہان کا جو نسخہ تھا وہ 1836 میں افضل المطابع، کلکتہ میں محمد اعلم لکھنوی کے اہتمام سے شائع ہوا تھا۔ برہان قاطع پر غالب نے جو حواشی یا یادداشتیں لکھی ہیں وہ زیادہ تر فارسی زبان اور چند اردو زبان میں ہیں۔ رسالہ تحریک میں شائع مضمون ''غالب اور برہان'' میں امتیاز علی عرشی نے غالب کے صرف ان خیالات کو پیش کیا ہے جو اردو میں لکھے گئے ہیں۔ مرزا غالب ''برہان قاطع'' کا مطالعہ کرتے وقت فارسی کے مشکل الفاظ کے اردو مترادفات بھی حاشیے میں درج کرتے جاتے تھے۔ امتیاز علی عرشی ان الفاظ کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''انھوں [غالب] نے برہان کے لفظ ''آ'' سے لفظ ''اُقلی'' تک 108 فارسی لفظوں کے اردو مترادفات بھی متن یا حاشیوں میں لکھے ہیں۔ اس عمل پیہم سے خیال ہوتا ہے کہ ان کا ارادہ پوری کتاب کے اہم الفاظ کے اردو معنی بتانے کا تھا، بعد میں کسی وجہ سے اس ارادے کو ترک کر دیا۔''

لفظ '' آ '' سے لفظ ''اُقلی'' تک 108 فارسی لفظوں کے اردو مترادفات لکھنا بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر غالب اپنے اس عمل کو جاری رکھتے اور پوری کتاب کے اہم الفاظ کے اردو معنی بتاتے تو ایک فارسی۔اردو لغت تیار ہو سکتی تھی۔

مرزا غالب نے قاطع برہان کے دیباچے میں لکھا ہے کہ انھوں نے دستنبو کی تالیف کے بعد تنہائی دور کرنے کی غرض سے ''برہان قاطع'' کا مطالعہ کرنا اور اس کے حواشی میں اپنے اعتراضات درج کرنا شروع کیا تھا اور آخر میں ان تمام اعتراضات کو ''قاطع برہان'' کے نام سے کتابی صورت میں جمع کر دیا لیکن امتیاز علی عرشی کی تحقیق کے مطابق غالب نے 'برہان قاطع' کا مطالعہ دستنبو لکھنے سے پہلے ہی شروع کر دیا تھا اور مختلف اوقات میں اس پر حواشی لکھتے رہے تھے۔ امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

> ''لیکن مجھے اس میں شبہہ ہے کہ انھوں [غالب] نے دستنبو سے فارغ ہو کر برہان کا تنقیدی مطالعہ شروع کیا۔''

غالب کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق دستنبو کا کام 31/جولائی 1858 کو مکمل ہو چکا تھا اور غالب نے 20/جولائی 1860 تک ''قاطع برہان'' کا کام مکمل کرلیا تھا۔ اگر غالب دستنبو کے مکمل ہونے کے بعد برہان قاطع کا مطالعہ کرتے تو یکم اگست 1858 سے لے کر 20/جولائی 1860 تک برہان قاطع کا نسخہ غالب کے پاس ہونا چاہیے تھا۔ امتیاز علی عرشی نے برہان قاطع کے جس نسخے کا تعارف کرایا ہے اس پر غالب نے یادداشتیں درج کی تھیں، اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یکم اگست 1858 کو مرزا غالب نے برہان کا یہ نسخہ علاؤ الدین خاں کو دے دیا تھا۔ امتیاز علی عرشی اس بابت رقمطراز ہیں:

> ''...برہان کے زیرِ نظر نسخے کی تحریروں کے مطابق یکم اگست 1858 کو یہ نسخہ میرزا صاحب کی طرف سے بطور ارمغان نواب علاء الدین خاں بہادر علائی، ولی عہد لوہارو کے پاس پہنچ چکا تھا اور یکم اگست 1859 کو انھوں نے اپنے والد نواب امین الدین احمد خاں بہادر کی خدمت میں بطور نذر پیش کر دیا تھا۔ ان دونوں تاریخوں کے درمیان یا اس کے بعد نسخۂ مذکور، بطور مستعار میرزا غالب کے پاس آیا ہو، اس کا کوئی ثبوت ہنوز دستیاب نہیں ہوا۔''

درج بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب نے دستنبو سے پہلے ہی برہان قاطع کا

مطالعہ شروع کر دیا تھا اور اس کے حاشیے میں اپنی رائے بھی لکھتے تھے۔ قرین قیاس ہے کہ یہ وہی زمانہ ہے جب غالب دستنبو کی تصنیف کر رہے تھے۔ دستنبو کی تالیف سے فارغ ہو کر "برہان قاطع" پر لکھے اپنے تمام اختلافات جمع کر کے اسے "قاطع برہان" کی شکل دے دی۔ اس سلسلے میں امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

> "انھوں نے قاطع برہان کے آخر میں جو فوائد لکھے ہیں ان کے بارے میں کہا ہے کہ "نگارش فوائد کہ از ملحقاتِ قاطع برہان است، در سال "رستخیز" انجام یافت۔" اور سال رستخیز اسی کتاب کے دیباچے کے مطابق 1273ھ تھا، جو 1857 کے مطابق تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دستنبو ختم ہونے سے پہلے ہی وہ ان فوائد کو لکھ چکے تھے۔ اس صورت میں قریب بہ یقین ہے کہ انھوں نے مختلف اوقات میں برہان پر یادداشتیں لکھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کہیں اردو میں کہیں فارسی میں لکھتے ہیں اور یہ زمانہ زیادہ تر دستنبو سے پہلے کا اور کچھ دستنبو کی ترتیب کے دوران کا تھا۔"

وہ مزید لکھتے ہیں:

> "...کتاب علائی کو دینے سے پہلے ہی انھوں نے ان یادداشتوں کو الگ نقل کر لیا تھا۔ جب دستنبو کے کام سے فارغ ہوئے تو... مختصر عبارتوں کو پھیلا کر لکھا تا آنکہ اس مسودے نے قاطع برہان کی شکل اختیار کر لی۔"

اس سلسلے میں امتیاز علی عرشی نے غالب کے ایک خط کی تحریر بھی نقل کی ہے۔ یہ خط مارچ 1859 بنام چودھری عبدالغفور سرور ہے۔ اس خط میں غالب نے صاحب عالم مارہروی کو مخاطب کر کے لکھا تھا:

> "ان دنوں برہان قاطع دیکھ رہا ہوں اور اس کے فہم کی غلطیاں نکال رہا ہوں۔ اگر زیست باقی ہے، تو ان نکات کو جمع کر کے اس نسخے کا نام قاطع برہان رکھوں گا۔"

برہان قاطع پر غالب کے لکھے حواشی کو امتیاز علی عرشی نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جن میں برہان قاطع کی ہیئت یا ترتیب پر اعتراض ہے اور دوسرا وہ جن میں تلفظ یا معنی پر گفتگو کی گئی ہے۔ ہیئت اور لفظ و معنی کو الگ الگ پیش کرنے میں برہان قاطع پر درج غالب

کے حواشی کی ترتیب باقی نہیں رہی لیکن اس التزام کے سبب غالب کے اعتراضات اوران کے حواشی بہ آسانی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ برھان قاطع پر غالب کے جواعتراضات ہیں ان میں چند درست ہیں اور چند ایسے بھی ہیں جومحل نظر ہیں۔ مثال کے طور پر برھان قاطع میں لکھا تھا ''کالب بروزن ومعنی قالب است۔'' اس پر غالب لکھتے ہیں:

''یہ نیا ڈھکوسلا ہے۔ قالب لفظ عربی ہے۔ کالبد انھیں معنوں میں لفظ فارسی ہے۔ کالب آج تک کوئی لفظ نہیں سنا، قیاس چاہتا ہے کہ کالبد کا مخفف ہو۔ یہ بھی مسموع نہیں۔ مگر ہاں یہ بات کہ ارذال اور گنوار قاف کو کاف بولتے ہیں۔ قسم کو کسم اور قرآن کو کُران۔ اس شخص نے جو دکن کے عوام الناس کو کالب کالب بولتے سنا، کہا کہ آؤ اس کو بھی ایک لفظ ٹھہرادو۔''

غالب نے قاطع برھان لکھتے وقت بھی اسی طرح کے الفاظ لکھے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ 'اگر حیرت روی ندادی، از خندہ بیخود شدی۔' درج بالا اعتراض کے تعلق سے امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

''موید برھان نے جہانگیری اور سراج اللغتہ سے نقل کیا ہے کہ کالب کالبد کا مخفف ہے۔ قالب اس کا معرب ہے۔ شیخ نظامی فرماتے ہیں:

این من و این من کہ درین کالب است
ہیچ مگو، جنبش این قالب است

اندریں حال یہ گنواروں اور رذیلوں کی بولی نہ ہوئی، شرفا اور علما کی گفتگو ہوگئی اور برھان کے حامیوں کو اس کا حق پہنچا کہ وہ بھی اس اعتراض پر ہنستے ہنستے لوٹ ہو جائیں۔''

اسی طرح لفظ ''فسوس'' پر غالب لکھتے ہیں:

''فسوس کے لفظ میں چاروں خانے چت گرے ہیں حکیم جی۔ عربی اور فارسی کو ملا کر معنی لکھے ہیں اور یہ بڑا پالغز ہے۔ باوجود اس خرابی کے لابہ و لاغ اور چیز ہے اور فسوس اور چیز ہے۔''

اصل یہ ہے کہ عربی میں افسوس بمعنی حیف دریغ ہے۔ تاسف اور متاسف یہ سب وہی بحث ہے۔ فارسی میں فسوس بہ فائے مضموم و واوین معروف نہ بہ واو مجہول، استہزا و ظرافت کو کہتے ہیں نہ لابہ و لاغ کو۔ لابہ و لاغ اختلاط و

انبساط کا نام ہے اور فسوس ظریفانہ چھیڑ چھاڑ کو کہتے ہیں۔“

فسوس کے تعلق سے امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

”...لیکن خدا کی قدرت کہ اس لفظ کی تحقیق میں خود غالب چاروں خانے چت گر پڑے اور خود ان کی عربی دانی کی پردہ دری ہوگئی۔ یعنی انھوں نے افسوس کو عربی لفظ بتایا حالانکہ یہ فارسی ہے اور پھر تاسف اور متاسف کو اس سے مشتق مانا حالانکہ ان دونوں کا مادہ اسف ہے۔“

ایسا نہیں ہے کہ امتیاز علی عرشی نے برھان قاطع پر غالب کے لکھے صرف اردو نکات کو ہی پیش کیا ہے بلکہ انھوں نے برھان قاطع کے متعلق اپنے دیگر مضامین میں غالب کی لکھی فارسی یادداشتوں کو بھی گفتگو کا موضوع بنایا ہے۔ دراصل برھان قاطع کے متعلق امتیاز علی عرشی کے آٹھ مضامین ہیں جو انھوں نے الگ الگ موقعوں پر تحریر کیے۔ اس سے پہلے یہ بات کہی جا چکی ہے کہ یہ مضامین ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ان مضامین میں امتیاز علی عرشی نے حواشی میں درج غالب کی اردو اور فارسی دونوں یادداشتوں پر مفصل گفتگو کی ہے۔

غالب کی کتاب ”قاطع برھان“ جب منظر عام پر آئی تو ”برھان قاطع“ کے حامیوں میں ایک اضطراب کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ انھوں نے اس کا جواب بھی لکھا۔ پھر غالب اور ان کے حامیوں نے اس کا جواب دیا اور بحث کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ خواجہ احمد فاروقی نے اپنے مضمون ”معرکۂ غالب اور حامیان قتیل“ میں ان کتابوں کی فہرست بھی درج کی ہے، یہ مضمون ”احوال غالب“ مرتبہ مختارالدین احمد آرزو میں شامل ہے۔ نیر مسعود نے بھی اپنے مضمون ”قاطع برھان“ نیا دور لکھنؤ، غالب نمبر جنوری 1969 میں ان کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ اس طویل بحث سے متعلق جو کتابیں سامنے آئیں ان کے نام یہ ہیں:

(1) قاطع برھان (غالب) (2) درفش کاویانی (غالب۔ یہ قاطع برھان ہی کا نظر ثانی کیا ہوا ایڈیشن ہے) (3) دافع ھذیان (مولوی نجف علی) (4) تیغ تیز (غالب) (5) لطائف غیبی (میاں داد خاں سیاح کے نام سے چھپی لیکن اس کے اصل مصنف غالب ہی سمجھے جاتے ہیں) (6) سوالات عبدالکریم (7) ہنگامۂ دل آشوب (8) محرق قطع برھان (مولوی سعادت علی) (9) موید برھان (آغا احمد علی جہانگیر نگری) (10) قاطع القاطع (مولوی امین الدین) (11) ساطع برھان (مرزا رحیم بیگ میرٹھی) (12) تیغ تیز تر (آغا احمد علی جہانگیر نگری)

(13) شمشیر تیز تر (آغا احمد علی جہانگیر نگری)

درج بالا کتابوں کے علاوہ نظموں میں بھی اس قضیے کا ذکر ملتا ہے۔ نیر مسعود لکھتے ہیں:

''ان نثری کتابوں کے علاوہ اس مباحثے نے نظم کا پیکر بھی اختیار کیا۔ غالب نے آغا احمد علی کی موید برہان کے جواب میں ایک قطعہ کہا جس کے جواب میں آغا احمد علی کے شاگرد عبدالصمد فدا نے ایک قطعہ کہا۔ فدا کے جواب میں غالب کے دو شاگردوں باقر علی باقر اور فخر الدین حسین سخن (مصنف سروش سخن) نے قطعات کہے اور ان دونوں قطعات کا جواب پھر عبدالصمد فدا نے ایک قطعے کی صورت میں دیا۔ یہ سب فارسی زبان اور ایک ہی زمین میں ہیں۔''

ان قطعوں کے متعلق نیر مسعود نے حاشیے میں لکھا ہے کہ 'یہ قطعے آغا احمد علی کی کتاب شمشیر تیز تر میں شامل ہیں۔ خواجہ حالی نے غالب کے قطعے کے چند اشعار یادگار غالب میں نقل کیے ہیں۔'

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ذاکر حسین لائبریری کے محفوظے Rare Section میں بھی برہان قاطع، قاطع برہان اور ساطع برہان کے نسخے موجود ہیں۔

امتیاز علی عرشی کا ایک مضمون ''دلی کے چند مشاعروں کی کہانی، غالب کی زبانی'' ہے۔ اس مضمون میں امتیاز علی عرشی نے نو مشاعروں کا ذکر کیا ہے۔ یہ مشاعرے قلعہ اور شہر میں منعقد ہوئے تھے۔ ان میں غالب بھی شریک تھے۔ امتیاز علی عرشی نے ان تمام مشاعروں کی تفصیلات غالب کے خطوط سے دریافت کی ہیں۔ قلعہ میں منعقد ہونے والے مشاعروں کے تعلق سے امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

''ہر مہینے کا آخری جمعہ اس کے لیے مقرر تھا۔''

لیکن اس مضمون اور غالب کے خطوط کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم نہیں ہوتا کہ شہر میں ہونے والے مشاعروں کے لیے بھی مہینے کا آخری جمعہ مقرر تھا۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ مشاعرے کی محفلیں جمعہ کے دن ہی منعقد ہوتی تھیں۔ ان خطوط میں منتظمین اور مشاعرہ گاہ کا ذکر صراحتاً کہیں نہیں ملتا۔ امتیاز علی عرشی اس بارے میں لکھتے ہیں:

''لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب ضیا الدین احمد خاں بہادر نیر کے زیر اہتمام منعقد ہوتا تھا۔ عارف و مجروح اس کے انتظام کے ذمہ دار تھے۔''

17 مارچ 1843 کو بروز جمعہ ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا، اس کی روداد غالب نے

23 مارچ کو مکتوب بنام شیفتہ میں اس طرح بیان کی ہے۔

''جمعہ کے دن، رات ہو جانے پر بزم سخن آراستہ کی گئی۔ میں نے چونکہ غزل نہیں کہی تھی اس لیے شرم تہی دستی سے سر جھکائے ہوئے تھا اور جا کر شریک بزم ہونا ایک ایسا خیال تھا جو ہرگز دل میں نہیں گذر سکتا تھا۔ والا جاہ نواب ضیاء الدین خاں سلمہٗ اللہ تعالیٰ نے دو فرشتے مجھ پر مقرر کیے، زین العابدین خاں عارفؔ اور غلام حسین خاں محوؔ۔ یعنی یہ دونوں ابرام پیشہ شام کے وقت میرے اکیلے گھر پر آئے اور ہاتھی ساتھ لائے اور جس طرح شیر کو شکار کر کے ہاتھی پر لادتے ہیں، مجھے مشاعرے میں لے گئے۔ مخدومِ معظم مولوی صدر الدین خاں بہادر صدر اعظم کے دیدار بہجت آثار نے راستے کی تکلیف کی تلافی کر دی...'' (کلیات نثر، پنج آہنگ، ص201)

دوسرا مشاعرہ جمعہ کے دن 28 اپریل 1843 کو منعقد ہوا تھا۔ اس کے متعلق غالب نے شیفتہ کو لکھا ہے:

''کل، کہ جمعہ کا دن تھا۔ شام کے وقت حضرت آزردہ کی محفل میں باریابی پائی... بہر صورت [آزردہ] مشاعرے میں تشریف نہیں لائے، فدوی کو اجازت دے دی۔'' (کلیات نثر، پنج آہنگ، ص201)

تیسرے مشاعرے کے تعلق سے غالب 26 مئی 1843 کے ایک خط میں شیفتہ کو لکھتے ہیں:

''کل جمعہ کا دن تھا اور نوید بزم سخن سامعہ افروز ہو چکی تھی۔ شام کے وقت وہی دو خجستہ پے ہاتف دروازے سے اندر آئے اور مجھے بزم میں لے گئے۔'' (کلیات نثر، پنج آہنگ، ص202)

درج بالا تینوں خطوط کی فراہم کردہ اطلاعات کے اندراجات پر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشاعرے کا انعقاد نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیر کے زیر اہتمام ہوتا تھا اور اس کے منتظمین میں عارفؔ اور محوؔ تھے لیکن 28 اپریل کے خط کے مطابق مشاعرے کی محفل آزردہؔ نے منعقد کی تھی اور فدوی اس کے ناظم تھے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مشاعرے کی محفل کسی ایک جگہ منعقد نہیں ہوتی تھی بلکہ مختلف جگہوں پر اس کا انعقاد ہوتا تھا اور اس کے ناظم بھی تبدیل ہوتے رہتے تھے۔

لال قلعے میں جو مشاعرے منعقد کیے جاتے تھے ان میں سے پانچ مشاعروں کا تذکرہ غالب کے خطوط میں ملتا ہے۔ شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے علاوہ شاہزادے بھی مشاعرے کا انعقاد کیا کرتے تھے۔ غالب نے 22/فروری 1848 کے ایک خط میں منشی نبی بخش کو لکھا تھا:

> ''کل تیموری خانی شاہزادوں میں سے ایک نے بزم سخن آراستہ کی تھی اور سخن سنجوں کو غزل خوانی کی دعوت دی تھی۔ میں نے کہ اب ریختہ گوئی کا خیال چھوڑ چکا ہوں، اگر چہ دل کو فکر سخن پر آمادہ نہ کیا تھا، لیکن جس دن رات کو مشاعرے میں جانا تھا، عین راستہ چلنے کے دوران میں، چند شعر بلا خواہش، غمزدہ طبیعت سے انجام پا گئے۔'' (کلیات نثر، پنج آہنگ، ص217)

غالب کے مندرجہ بالا خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب اس وقت تک فارسی میں غزل کہتے تھے اور کبھی منھ کا مزہ بدلنے کے لیے ریختہ میں بھی اشعار کہہ لیا کرتے تھے۔ درج بالا مشاعرے کے علاوہ غالب نے لال قلعے کے چار مشاعروں میں غزلیں پڑھی ہیں، ان میں سے ایک مشاعرہ کا اہتمام مرزا نورالدین بہادر (جن کا تخلص شاہی تھا) نے کیا تھا اور باقی تین مشاعرے بہادر شاہ ظفر نے منعقد کرائے تھے۔

امتیاز علی عرشی کی ایک تحریر ''دیوان غالب (نسخۂ حمیدیہ) کی اشاعت کا سال'' ہے۔ یہ تحریر کوئی مضمون نہیں بلکہ ایک مراسلہ ہے جو ہفت روزہ ہماری زبان میں 8/اگست 1961 میں شائع ہوا تھا۔ اس مراسلے کے پہلے پیراگراف میں انھوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کے جو نسخے عام طور پر دستیاب ہیں ان میں سے کسی ایک پر بھی سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ امتیاز علی عرشی نے آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں موجود دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ کی ایک کاپی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے سرورق پر حسب ذیل عبارت چھپی ہے:

> ''مفید عام اسٹیم پریس آگرہ میں محمد قادر علی خاں صوفی کے اہتمام سے چھپا۔
> اس عبارت میں تقریباً اسٹیم پریس کے اوپر خفی خط میں 1921 لکھا ہوا ہے۔''

میری پاس نسخۂ حمیدیہ کی ایک کاپی بعنوان ''دیوان غالب جدید (المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ) مرتبہ مفتی محمد انوار الحق موجود ہے۔ یہ نسخہ مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے زیر اہتمام شائع ہوا تھا۔ اس نسخے کے پرنٹ لائن صفحہ پر طبع اول 1921 اور طبع دوم 1982 درج ہے۔

امتیاز علی عرشی کا مضمون ''دیوان غالب اردو (نسخۂ عرشی)'' رسالہ نوائے ادب بمبئی، اکتوبر 1964 میں

شائع ہوا۔ مضمون کے عنوان سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ آیا یہ دیوان غالب نسخۂ عرشی کا دیباچہ یا اس کا کوئی حصہ تو نہیں ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس مضمون کے پہلے پیراگراف ہی میں امتیاز علی عرشی نے اس مضمون کے متعلق تفصیلات لکھ دی ہیں۔ دیوان غالب نسخۂ عرشی کی اشاعت کے بعد مالک رام نے اس پر تبصرہ کیا تھا جو رسالہ فکر ونظر علی گڑھ جنوری 1961 میں شائع ہوا۔ مالک رام کے تبصرے میں چند باتیں ایسی تھیں جن پر امتیاز علی عرشی کو اعتراض تھا یا یہ کہہ سکتے ہیں کہ چند باتیں وضاحت طلب تھیں جن کی طرف انھوں نے اپنے اس مضمون میں اشارہ کیا ہے۔

امتیاز علی عرشی کا ایک مضمون ''انشائے غالب'' کتاب نما مارچ 1969 میں شائع ہوا تھا۔ یہ امتیاز علی عرشی کی مرتب کردہ کتاب ''مکاتیب غالب'' کا ایک حصہ ہے۔ غالب نے خطوط کیوں لکھے اور ان کے خطوط کی تعداد اتنی زیادہ کیوں ہے؟ یہ چند سوالات بنیادی نوعیت کے ہیں۔ غالب کے خطوط میں ہمیں ان کے عہد کی دہلی نظر آتی ہے۔ امتیاز علی عرشی کے بقول ''اردو مکتوب نگاری ان کے تفریحی مشغلوں کا جز بن گئی تھی۔ وہ جو کچھ لکھتے تھے اپنا اور اپنے مکتوب الیہ کا دل بہلانے کے لیے لکھا کرتے تھے۔''

غالب کی طبیعت میں شوخی وظرافت اور بذلہ سنجی شامل تھی، اس کا اثر ہمیں ان کے خطوط میں بھی نظر آتا ہے۔ اوپر ہم نے انشائے غالب کے تعلق سے جو سوالات قائم کیے ہیں، ان کے جوابات آگے مل جائیں گے۔ غالب کے خطوط کا بڑا حصہ 1857 کے بعد کا ہے۔ 1857 کے بعد انگریزوں نے ہندوستانیوں پر جو مظالم ڈھائے وہ تاریخ کے اوراق پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ غالب کے خطوط میں بھی 1857 کے بعد کی دہلی دیکھی جاسکتی ہے۔ شہر اور قلعے میں جو مشاعرے منعقد ہوتے تھے یا دوستوں کی وہ محفلیں جن سے زندگی باقی تھی دھیرے دھیرے ختم ہوتی گئیں۔ غالب کے لیے یہ دور بڑا پر آشوب تھا۔ ان کے عزیز واقارب میں سے اکثر قتل کیے جاچکے تھے یا شہر بدر کردیے گئے تھے۔ اپنی تنہائی کاٹنے کے لیے ان کے پاس ایک ہی مشغلہ تھا کہ وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو خط لکھیں۔ امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

> ''اس عہد افسردگی کو فرحت وانبساط کے ساتھ گزارنے کی یہی ایک ترکیب باقی تھی کہ جو دو چار دوست آشنا رہ گئے تھے ان سے خط وکتابت کا سلسلہ جاری رکھا جائے تاکہ اپنا دکھ انھیں سنانے اور ان کا درد خود سننے سے کچھ غم غلط ہوجایا کرے۔''

انسانی فطرت ہے کہ اسے اپنے آس پاس ایسے لوگوں کی ضرورت رہتی ہے جن سے وہ باتیں کر سکے، اپنی خوشیوں اور دکھوں میں شریک کر سکے۔ یہی وجہ تھی کہ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جب غالب کے آس پاس کوئی ایسا رفیق نہیں بچا جس سے زندگی کی باتیں کر سکتے تو انھوں نے اپنے دوستوں کو کثیر تعداد میں خط لکھے۔ خط کو انھوں نے اپنی ذات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اسی لیے ان کے شب و روز خط پڑھنے اور خط کا جواب لکھنے میں گذرتے تھے۔ غالب 27 دسمبر 1858 کے مکتوب میں تفتہ کو لکھتے ہیں:

> ''... میں اس تنہائی میں صرف خطوط کے بھروسے جیتا ہوں، یعنی جس کا خط آیا، میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لے آیا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا، جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہ آتے رہتے ہوں۔ بلکہ ایسا دن بھی ہوتا ہے کہ دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے، ایک دو صبح کو اور ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے، دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گذر جاتا ہے...''

تنہائی کے خوف سے بچنے کے لیے انسان کیا کیا تدابیر اختیار کرتا ہے۔ لہٰذا غالب نے بھی اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے مکتوب کا سہارا لیا۔ اگر اصحاب میں سے کسی کا خط آنے میں دیر ہوتی تو غالب اپنے مکتوب میں شکایتیں بھی کرتے تھے۔ 19/جون 1858 کے خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں:

> ''کیوں صاحب، مجھ سے کیوں خفا ہو! آج مہینہ بھر ہو گیا ہوگا۔ یا بعد دو چار دن کے ہو جائے گا کہ آپ کا خط نہیں آیا...''

13/نومبر 1858 کے خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں:

> ''کیوں صاحب، کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں؟ بھلا اگر یہ حکم ہوا ہوتا، تو یہاں بھی اشتہار ہو جاتا کہ زنہار، کوئی خط سکندر آباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جاوے۔''

اس کے باوجود تفتہ کا خط آنے میں دیر ہوئی تو بڑی انکساری اور لجاجت کے ساتھ 27/ دسمبر 1858 کو غالب نے لکھا:

> ''کیوں صاحب، روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی؟ اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو...''

مرزا صاحب کے خطوط میں لفافے بنانے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ وہ لفافے بنانے کا عمل دل کو بہلانے کے لیے کیا کرتے تھے۔ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خطوط پڑھنے اوران کے جوابات لکھنے کے بعد جو وقت بچ جاتا تھا وہ اس میں گزرتا تھا۔

امتیاز علی عرشی کا ایک مضمون ''دیوان غالب (اردو) کے ابتدائی مطبوعہ نسخے'' رسالہ جامعہ ستمبر 1942 میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون اصل میں اس دیباچہ کا ایک حصہ ہے جو امتیاز علی عرشی نے ''انتخاب غالب'' کے لیے لکھا تھا۔ اس مضمون میں صرف دیوان غالب کی طباعت سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ امتیاز علی عرشی نے ''انتخاب غالب'' کے دیباچے سے اپنی اس تحریر کو جو طباعت کے متعلق تھی، الگ سے شائع کرایا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ رسالہ جامعہ (مئی 1942) میں سید اسد علی انوری فرید آبادی کا ایک مضمون ''دیوان غالب اردو کا ایک نایاب نسخہ'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔مضمون میں اسد علی انوری نے اپنے ذاتی کتب خانے میں موجود ایک نسخے کا تعارف کرایا تھا، ساتھ ہی غالب کا دیوان، غالب کی زندگی میں کتنی مرتبہ شائع ہوا اس پر بھی گفتگو کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ امتیاز علی عرشی نے انتخاب غالب پر لکھے اپنے مقدمے سے طباعت کے متعلق تحریر کو الگ سے شائع کرانے کی ضرورت محسوس کی۔ امتیاز علی عرشی اپنے مقدمے کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''اس مقدمے کا وہ حصہ جو طباعت دیوان سے متعلق ہے، زیر بحث مسئلے پر برہان قاطع ہے۔ اس لیے میں اسے معمولی تغیر کے ساتھ شائع کرنے کی جرأت کررہا ہوں۔''

امتیاز علی عرشی نے فرید آبادی صاحب کے مضمون کے جواب میں اپنے مضمون کا کچھ حصہ ترمیم واضافے کے ساتھ پیش کیا ہے تاکہ فرید آبادی صاحب کے مضمون میں جو غلطیاں راہ پاگئی ہیں وہ دور ہوسکیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''...[اسد علی انوری نے] کوشش کی ہے کہ اپنے پیش رووں کی ساری غلط فہمیوں کو دور کردیں۔ مگر اس سلسلے میں خود موصوف کو بھی بعض غلط فہمیاں ہوئی ہیں جو واقعات کے قطعاً خلاف ہیں اور اس لیے ان کی بابت کچھ عرض کردینا ضروری ہے تاکہ یہ مرض متعدی نہ ہوجائے۔''

امتیاز علی عرشی نے جس انتخاب غالب کے لیے مقدمہ لکھا تھا وہ خود غالب کا اپنا منتخب

کردہ تھا جس میں فارسی اور اردو دونوں کلام شامل ہے۔ یہ انتخاب رامپور رضا لائبریری میں موجود ہے۔ امتیاز علی عرشی اس انتخاب غالب پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''صورت یہ درپیش آئی تھی کہ نواب خلد آشیاں نے اساتذۂ فارسی و اردو کے منتخب اشعار کی بیاض ترتیب دینے کا عزم فرمایا تھا اور اسی سلسلے میں مرزا صاحب سے فرمائش کی تھی کہ وہ اپنے کلام کا خود انتخاب کر کے بھیج دیں۔ ستمبر 1866 میں میرزا صاحب نے اس ارشاد کی تعمیل میں دیوان فارسی اور دیوان اردو کا انتخاب کچھ خود لکھ کر اور زیادہ دوسروں سے نقل کرا کے ارسال کیا تھا۔''

امتیاز علی عرشی نے دیوان غالب کی طباعت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ مرزا غالب کا دیوان ان کی زندگی میں چار مرتبہ شائع ہوا تھا۔ پہلا ایڈیشن سید الاخبار دہلی سے اکتوبر 1841 میں چھپا تھا۔ دوسرا ایڈیشن مئی 1847 میں مطبع دارالسلام دہلی سے شائع ہوا۔ تیسرا ایڈیشن جولائی 1861 میں مطبع احمدی سے اور چوتھا ایڈیشن ستمبر 1863 میں مطبع شیو نرائن سے شائع ہوا۔ ان تمام نسخوں پر امتیاز علی عرشی نے سیر حاصل گفتگو کی ہے جن پر ہم آئندہ بحث کریں گے۔ فی الحال میرے سامنے دیوان غالب کا ایک نسخہ ہے جسے نورالحسن نقوی نے مرتب کیا ہے اور یہ نسخہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے 2008 میں شائع ہوا تھا۔ نورالحسن نقوی نے اپنے مقدمے میں مرزا غالب کی زندگی میں دیوان غالب کے چھ مرتبہ شائع ہونے کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ان [غالب] کا اردو دیوان ان کی زندگی میں چھ بار چھپا۔ پہلی مرتبہ سید المطابع دہلی سے 1841 میں، دوسری بار مطبع دارالسلام دہلی سے 1847 میں، تیسری بار مطبع احمدی سے 1861 میں، چوتھی بار مطبع نظامی کانپور سے 1862 میں، پانچویں بار مومن و ذوق کے دواوین کے ساتھ مطبع احمدی دہلی سے 1862 ہی میں اور چھٹی بار مطبع شیو نرائن آگرہ سے 1863 میں۔''

امتیاز علی عرشی اور نورالحسن نقوی کے قول میں جو تضاد ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب امتیاز علی عرشی کے مضمون میں مل سکتا ہے۔ شروع کے تین ایڈیشن تو وہی ہیں جن کا ذکر دونوں حضرات نے کیا ہے لیکن نورالحسن نقوی کے مطابق 1862 میں غالب کے دو ایڈیشن اور شائع ہوئے۔ دیوان غالب کا پہلا ایڈیشن سر سید احمد خاں کے بھائی سید محمد بہادر خاں کے مطبع سید الاخبار دہلی سے 1841 میں شائع ہوا تھا۔ اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری، جامعہ

ملیہ اسلامیہ میں بھی محفوظ ہے۔ امتیاز علی عرشی کے زیر نظر دیوان غالب کا جو پہلا ایڈیشن تھا وہ ان کے مطابق پبلک لائبریری رامپور میں موجود ہے۔ امتیاز علی عرشی نے تفصیل سے اس ایڈیشن کی کیفیات بتائی ہیں۔اس مضمون میں انھوں نے سرنامہ سے لے کر تقریظ تک کے مضامین مع تعداد اشعار درج کیے ہیں۔ دیوان غالب کے اس ایڈیشن کے لیے نواب ضیاالدین احمد خاں بہادر نیر نے تقریظ لکھی تھی۔

دیوان غالب کا دوسرا ایڈیشن مئی 1847 میں مطبع دارالسلام دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس ایڈیشن میں پچھلے ایڈیشن سے چودہ شعر زیادہ ہیں۔ دونوں ایڈیشن میں صرف ایک غزل کا فرق ہے۔ غالب نے نواب تجمل حسین خاں کی مدح میں جو غزل کہی تھی وہ دوسرے ایڈیشن میں موجود ہے۔ اس غزل میں چودہ شعر ہیں۔ دونوں ایڈیشن میں ہونے والے اس فرق کے تعلق سے امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

> ''گویا چھ برس کی عمر میں میرزا صاحب نے زیادہ سے زیادہ پانچ اور نو کل چودہ شعر کہے تھے جو اس نسخے میں بڑھا دیے گئے... بقیہ اشعار جوں کے توں ہیں۔

امتیاز علی عرشی کو یہ نسخہ دہلی کالج کی لائبریری میں ملا تھا۔ انھوں نے بعد میں اس نسخے کی نقل رامپور رضا لائبریری کے لیے بھی کرا لی تھی۔ اس نسخے کی ہیئت کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''یہ نسخہ $10\ {}^1/_2 \times 7$، $8\ {}^1/_4 \times 4\ {}^1/_4$ سائز کے پندرہ سطری 98 صفحوں پر چھپا تھا۔ کاغذ باریک انگریزی سفید اور خط معمولی نستعلیق تھا۔ ہر غزل کے آغاز میں عنوان پر لفظ ''غزل یا ولہ'' لکھا گیا تھا۔''

1857 تک پہنچتے پہنچتے بازار سے دوسرا ایڈیشن بھی ختم ہو چکا تھا اور اگر کچھ بچا بھی تو وہ 1857 کے ہنگامے کی نذر ہو گیا۔ ہنگامے کے گذر جانے کے بعد منشی شیو نرائن نے اسے پھر سے چھاپنے کی خواہش ظاہر کی لیکن دیوان کا کوئی نسخہ غالب کے پاس موجود نہیں تھا۔ غالب نے 1857 سے قبل ایک نسخہ نقل کرا کے نواب یوسف علی خاں بہادر کو رامپور بھیجا تھا۔ چنانچہ انھوں نے رامپور سے وہ نسخہ بطور مستعار منگایا اور اسے نقل کرایا۔ 25/جون 1860 کو غالب نے وہ نقل منشی شیو نرائن کی جانب بھیج دی تا کہ دیوان کی تیسری طباعت ہو سکے۔ بالآخر اگست 1861 میں دیوان کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ امتیاز علی عرشی نے اس سلسلے میں غالب کے مختلف خطوط بھی پیش کیے ہیں جن سے ہمیں دیوان کی تیسری طباعت میں ہونے والی پریشانیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

تیسرے ایڈیشن میں غزلوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو چکا تھا۔ امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

''...اس مطبوعہ نسخے میں 1695 کے بجائے 1796 اشعار ہیں... اس ایڈیشن میں میرزا صاحب نے اپنے کلام میں کچھ ضروری ترمیم بھی کی تھی اور چونکہ وہ ترمیم طباعت کے بعد ذہن میں آئی تھی اس لیے اسے غلط نامے میں ظاہر کرنا پڑا۔''

تیسرا ایڈیشن شائع ہونے کے بعد جب اس کی کاپی غالب کی نظروں سے گذری تو انھیں اس میں غلطیاں نظر آئیں، آخر میں جو غلط نامہ شائع ہوا تھا وہ اپنی جگہ۔ دراصل دیوان غالب طباعت دوم میں چند اغلاط رہ گئی تھیں۔ تیسری طباعت کے وقت غالب نے ان کی تصحیح کر کے منشی شیو نرائن کو بھیجا تاکہ وہ غلطیاں بھی درست ہو جائیں۔ لیکن کسی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکا اور وہ غلطیاں تیسری اشاعت میں بھی باقی رہ گئیں۔ غالب نے 8/اگست 1861 کے اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے:

''...اب جو دیوان چھپ چکے حق التصنیف ایک مجکو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ غلط جوں کے توں ہیں۔ یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔''(اردوے معلیٰ 154)

دیوان غالب کے تیسرے ایڈیشن کی کاپی کا مطالعہ کرتے وقت جب غالب کی نظر دیوان میں راہ پا جانے والی غلطیوں پر پڑی تو اس کا اظہار انھوں نے مالک مطبع احمدی دہلی سے کیا۔ چوں کہ دیوان کا تیسرا ایڈیشن مطبع احمدی سے شائع ہوا تھا اس لیے مالک مطبع یوسف حسین خاں اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ غالب نسخۂ احمدی کی تصحیح کر دیں تاکہ اسے کہیں اور سے شائع کرایا جا سکے۔ غالب نے ایک کاپی پر تصحیح کر کے یوسف حسین خاں کو بھیج دی۔ غالباً یہ 1862 کا ابتدائی زمانہ تھا۔ چوتھی مرتبہ دیوان غالب کا نسخہ مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا۔ امتیاز علی عرشی نے بھی اپنی تحریر میں اس بات کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''محمد حسین خاں نے اس مسودے کو کانپور کے مطبع نظامی کو بھیجا۔ یہ ابتدائی سال کا قصہ معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اس دیوان کا دوسرا ایڈیشن کانپور کے مطبع نظامی میں طبع ہوا۔''

امتیاز علی عرشی نے اس سلسلے میں نظامی ایڈیشن کے خاتمہ پر لکھی ایک تحریر بھی اپنے مضمون میں پیش کی ہے:

''بخدمت ارباب سخن عرض کرنا ہے امیدوار رحمت وغفران محمد عبدالرحمٰن بن

حاجی محمد روشن خاں طیب اللہ ثراہ کہ اس کے پہلے دیوان بلاغت نشان جناب نواب
اسد اللہ خاں غالب کا دہلی میں چھپا لیکن بسبب سھو ونسیان کے بعض مقام میں
تغیر وتبدل ہوا اس لیے جناب مجمع لطف بیکراں محمد حسین خاں صاحب دہلوی نے
بعد نظر ثانی اور تصحیح جناب مصنف کے ایک نسخہ میرے پاس بھیجا۔ میں نے
بافضال ایزدی مطابق اس نسخے کے شہر ذی الحجہ 1278 (جون 1862) مطبع
نظامی واقع شہر کانپور میں صحت تمام اور درستی کمال سے چھاپا۔ امید کہ جب ناظرین
اس کے مطالعہ سے حلاوت سخن کی پائیں مہتمم کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں۔''

امتیاز علی عرشی کی مذکورہ بالا تحریر اور نظامی ایڈیشن کے آخر میں چھپی تحریر کے مطالعہ سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دیوان غالب کا ایک ایڈیشن مطبع نظامی کانپور نے 1862 میں شائع کیا تھا۔ امتیاز علی عرشی نے اس ایڈیشن کو احمدی ایڈیشن ہی کا ''دوسرا ایڈیشن'' بتایا ہے لیکن انھوں نے نظامی ایڈیشن کو غالب کی زندگی میں شائع ہونے والا چوتھا ایڈیشن کیوں نہیں تسلیم کیا یہ بات عقل سے پرے ہے۔ جب نیا ایڈیشن شائع ہوا، بھلے ہی وہ پرانے ایڈیشن کی تصحیح ہو یا توسیع ہو اسے نیا ایڈیشن تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔ نظامی ایڈیشن میں سے اس تقریظ کو بھی نکال دیا گیا تھا جو نواب ضیاالدین احمد خاں بہادر نیر نے لکھی تھی۔ اس کے علاوہ اس میں دو غزلوں کا اضافہ بھی کیا گیا تھا۔ امتیاز علی عرشی اس ترمیم واضافے کے متعلق لکھتے ہیں:

''...ترتیب مضامین بالکل احمدی کی تھی۔ مگر ایک تو اس میں نیر کی تقریظ شامل
نہیں کی گئی اور دوسرے حسب ذیل دو غزلیں اضافہ کی گئیں جو نسخۂ رامپور اور
احمدی ایڈیشن کسی میں نہیں پائی جاتیں۔

(1) کیوں کہ اس بت سے رکھوں جان عزیز (3 شعر)

(2) بہت سہی غم گیتی، شراب کم کیا ہے (3 شعر)''

امتیاز علی عرشی نے اُس پانچویں ایڈیشن کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا ہے جس کا ذکر نورالحسن نقوی نے اپنے مرتب کردہ دیوان غالب کے دیباچے میں کیا ہے کہ 'پانچویں مرتبہ مومن و ذوق کے دواوین کے ساتھ مطبع احمدی دہلی سے 1862 ہی میں شائع ہوا' لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ نورالحسن نقوی نے بھی صرف تاریخ لکھ دینے پر اکتفا کیا ہے جب کہ چاہیے تھا کہ انھوں نے غالب کی زندگی میں شائع ہونے والے جن چھ ایڈیشن کا ذکر کیا ہے اس پر تفصیل

سے گفتگو بھی کرتے۔ تحقیق کرتے وقت مجھے کوئی شہادت اب تک نہیں مل سکی ہے۔ کلی طور پر فیصلہ کرنے سے پہلے مزید تحقیق ہنوز جاری ہے اور جب تک یہ بات تحقیق سے ثابت نہیں ہو جاتی، اس وقت تک ہم یہ مان کر چلیں گے کہ غالب کی زندگی میں ان کا دیوان پانچ مرتبہ شائع ہوا تھا۔

غالب کی زندگی میں شائع ہونے والا آخری ایڈیشن ستمبر 1863 میں منظر عام پر آیا تھا۔ ان تمام ایڈیشنوں کا ذکر کرتے ہوئے امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

''اس دیوان کے بعد پھر میرزا صاحب کی زندگی میں دیوان اردو کا کوئی ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔ کتاب خانۂ عالیۂ ریاست رامپور میں بحمداللہ ابتدائی دو ایڈیشنوں کی نقلیں اور آخری ایڈیشنوں کے اصل نسخے محفوظ ہیں۔''

امتیاز علی عرشی کا ایک مضمون ''نسخۂ حمیدیہ کی فروگذاشتیں نسخۂ بھوپال کی روشنی میں'' ہے۔ یہ مضمون ''نیا دور'' لکھنؤ مئی 1969 میں شائع ہوا تھا۔ نسخۂ حمیدیہ دیوان غالب کے قدیم نسخے نسخۂ بھوپال کی تصحیح کردہ شکل ہے۔ تصحیح کے بعد اسے نسخۂ حمیدیہ کا نام اس لیے دیا گیا کیوں کہ نسخۂ بھوپال، بھوپال کی ایک لائبریری ''کتاب خانۂ حمیدیہ'' میں محفوظ تھا۔ اس کو سامنے لانے کا سہرا مفتی انوار الحق اور مولانا عبداللہ صاحب ٹونکی کے سر ہے اور اس کے لیے مقدمہ عبدالرحمٰن بجنوری نے لکھا تھا جس کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے انجمن ترقی اردو نے اسے ''محاسن کلام غالب'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ 19 تا 21 جنوری 1944 میں امتیاز علی عرشی انجمن ترقی اردو کے ذریعے کرائے گئے ایک کل ہند اجلاس میں شرکت کے لیے ناگپور تشریف لے گئے تھے، وہاں سے واپسی میں دو روز بھوپال میں بھی قیام کیا۔ امتیاز علی عرشی نے وہاں نسخۂ حمیدیہ کی اصل یعنی نسخۂ بھوپال کی زیارت کی اور ساتھ ہی اصل اور نقل کا تقابل بھی کیا۔ مختصر وقت میں وہ جو کچھ نوٹ کر سکے تھے وہ نوٹس ہی اس مضمون کا محرک بنے۔ امتیاز علی عرشی اس مضمون کے متعلق لکھتے ہیں:

''اس مختصر سے وقت میں جو کچھ نوٹ میں نے لیے تھے انھیں نسخۂ عرشی کے دیباچے اور حواشی میں پیش کر چکا ہوں۔ لیکن نسخۂ بھوپال کے ضائع ہو جانے کی وجہ سے ان نوٹس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے اس لیے علیحدہ مضمون کی شکل میں یکجا پیش کرنا مناسب جانتا ہوں تاکہ وہ حضرات جن کے پاس نسخۂ حمیدیہ ہے اپنے اپنے نسخوں میں تصحیح و اضافہ کر سکیں۔''

امتیاز علی عرشی نے نسخے کی ہئیت کے متعلق تفصیل سے تمام باتیں درج کی ہیں لیکن یہ

نسخہ بھوپال کس سنہ میں پہنچا اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ ہاں! اتنا ضرور ہے کہ نسخے کے داخلی شواہد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ 1248 ہجری مطابق 1832 میں یہ نسخہ فوج دار محمد خاں بہادر کے کتب خانے میں موجود تھا۔ دراصل اس نسخے میں متعدد جگہ فوج دار محمد خاں بہادر کی مہر ثبت ہے جس پر ان کے نام کے ساتھ 1248 ہجری کندہ ہے۔ یہ نسخہ کتاب خانۂ حمیدیہ بھوپال میں 1248 ہجری کے بعد ہی پہنچا ہوگا۔ امتیاز علی عرشی نے جو اغلاط نوٹ کی تھیں ان کا نسخۂ حمیدیہ سے تقابل کیا ہے اور اس کے ترمیم و اضافے کو اپنے مضمون میں پیش کیا ہے۔ یہ ترمیم و اضافے نسخۂ حمیدیہ کے صفحہ 1 سے صفحہ 286 تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مختصر وقت میں مختلف صفحات سے اغلاط نوٹ کر کے پیش کرنا، یہ ظاہر کرتا ہے کہ اگر اس کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا تو نسخۂ حمیدیہ میں راہ پا جانے والی غلطیوں کا سد باب کیا جا سکتا تھا۔ امتیاز علی عرشی مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں:

> ''ان مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر نسخۂ بھوپال کا تفصیلی مطالعہ ممکن ہوتا تو نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب نو میں کس قدر مدد ملتی اور نسخۂ بھوپال کے ضائع ہو جانے سے کیسا ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔''

نسخۂ بھوپال کا کھو جانا ایک المیہ تھا لیکن اس کا پھر سے منظر عام پر آنا بھی ایک واقعہ ہے۔ گذشتہ برس شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ایک توسیعی خطبہ کرایا تھا جس میں بطور مقرر ڈاکٹر مہر افشاں فاروقی مدعو تھیں۔ انھوں نے اپنے لکچر کے دوران نسخۂ بھوپال کے دوبارہ مل جانے کی کہانی تفصیل سے سنائی تھی کہ کس طرح انھیں کسی اجنبی کا فون آیا اور اس اجنبی نے وہ نسخہ انھیں تحفۃً دے دیا۔ فی الحال مجھے اس اجنبی شخص کا نام یاد نہیں آ رہا ہے اس لیے میں نام درج کرنے سے قاصر ہوں اور یہ باتیں بھی آدھی ادھوری میرے حافظے میں موجود رہ گئی ہیں اس لیے ان آدھی ادھوری باتوں کو درج کرنے پر اکتفا کر رہا ہوں۔ یہاں غائب ہو جانے والے نسخۂ بھوپال کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ فی الحال اس کے متعلق صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس نسخے کو محترمہ فاروقی نے ''نسخۂ حمیدیہ'' کے عنوان سے شائع کرا دیا ہے اور یہ Amazon.in پر دستیاب ہے۔

رسالہ ''العلم'' کراچی جنوری تا مارچ 1969 میں امتیاز علی عرشی کا ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان ''غالب اور بجنوری'' تھا۔ عبدالرحمٰن بجنوری کے متعلق یہ سبھی جانتے ہیں کہ انھوں نے غالب کے دیوان کے لیے ایک مقدمہ لکھا تھا جسے بعد میں انجمن ترقی اردو نے ''محاسن کلام غالب'' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کرایا تھا۔ امتیاز علی عرشی کے مذکورہ بالا مضمون

میں اسی مقدمے کے متعلق چند سوالات قائم کیے گئے ہیں۔ عبدالرحمٰن بجنوری کا یہ مقدمہ کس دیوان غالب کے لیے لکھا گیا تھا؟ نسخۂ حمیدیہ جس کی اساس نسخۂ بھوپال ہے یا کوئی دوسرا نسخہ؟ مفتی انوار الحق جو کہ نسخۂ حمیدیہ کے مرتب ہیں، ان کے مطابق انجمن ترقی اردو نے عبدالرحمٰن بجنوری سے فرمائش کی تھی کہ وہ دیوان غالب کا ایک نیا ایڈیشن ترتیب دے دیں اور عبدالرحمٰن بجنوری نے اس نئے ایڈیشن کے لیے مقدمہ لکھا تھا۔ گویا انھوں نے مقدمہ نسخۂ حمیدیہ کے بجائے کسی دوسرے ایڈیشن کے لیے لکھا تھا۔ نومبر 1949 تک اسی بات پر یقین کیا گیا تھا لیکن نومبر 1949 میں احتشام حسین کو نسخۂ حمیدیہ کی ایک کاپی ملی جس پر مالک نسخہ نے کچھ نوٹ لکھے تھے۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

> ''نومبر 1949 میں پروفیسر سید احتشام حسین صاحب کو نسخۂ حمیدیہ کی ایک کاپی ملی تھی، جو محمد احتشام الدین دہلوی کی ملک رہ چکی تھی، اس کاپی کے اندر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے مقدمے کے آخر میں مالک نسخہ کا ایک نوٹ مورخہ 11/ مئی 1937 درج ہے۔ اس کے ضروری حصے یہ ہیں:
>
> ''یہ غلط ہے کہ بجنوری مرحوم نے یہ دیباچہ غالب کے نسخۂ دیوان معدوم کی دستیابی سے پہلے لکھا تھا۔ نہیں، بلکہ دستیاب ہونے پر ان کو مکمل کلام غالب کے شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا، اور یہ مقدمہ اسی ارادہ کی پیروی میں لکھا گیا۔ اس کے لکھنے کے بعد وہ ایک بار علی گڑھ آئے اور راقم کے پاس دو ایک روز مہمان رہے۔ یہ مقدمہ پنسل سے لکھا ہوا، کٹا پھٹا ان کے پاس موجود تھا، اور انھوں نے خود اپنی زبان سے اس کو پڑھ کر سنایا، اور طباعت کے متعلق مشورے کیے۔''

درج بالا نوٹ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عبدالرحمٰن بجنوری نے جو مقدمہ لکھا تھا وہ نسخۂ بھوپال کی جدید شکل یعنی نسخۂ حمیدیہ کے لیے لکھا تھا لیکن دوسری طرف مفتی انوار الحق صاحب کے مطابق عبدالرحمٰن بجنوری نے جو مقدمہ لکھا وہ دیوان غالب کے نئے ایڈیشن کے لیے تھا جو نسخۂ حمیدیہ نہیں بلکہ کوئی دوسرا نسخہ ہے۔ ان دونوں بیانوں میں جو اختلافات ہیں اس سے متعدد سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں۔ امتیاز علی عرشی نے بھی اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالات کو اپنے مضمون میں درج کیا ہے اور ایک ایک کر کے ان سبھی کے جوابات قارئین کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ایک سوال، کیا انجمن ترقی اردو نے بجنوری

سے دیوان غالب مرتب کرنے کی فرمائش کی تھی؟ کے جواب میں مولوی عبدالحق کے پیش لفظ کا اقتباس پیش کیا ہے۔ واضح رہے کہ مولوی عبدالحق نے ''محاسن کلام غالب'' مطبوعہ 1921 پر پیش لفظ لکھا تھا اور ان ہی کی تحریک پر عبدالرحمٰن بجنوری نے دیوان غالب پر مقدمہ لکھنے کا کام شروع کیا تھا۔ مولوی عبدالحق کا اقتباس یہ ہے:

> ''انجمن ترقی اردو کا ایک مدت سے ارادہ تھا کہ مرزا غالب کے اردو دواوین کا ایک نفیس صحیح جدید ایڈیشن طبع کرے۔ چنانچہ بڑی کوشش اور تحقیق سے یہ دیوان مرتب کیا گیا۔
>
> میری درخواست پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے اس کے لیے بطور مقدمہ کے غالب کے کلام پر تبصرہ لکھنا شروع کیا۔
>
> اس اثنا میں اتفاق سے بھوپال کے سرکاری کتب خانہ میں مرزا صاحب کے قدیم دیوان کا مکمل نسخہ نکل آیا، جس میں وہ تمام نظمیں درج تھیں جو بعد میں خارج کردی گئی تھیں۔ علمی لحاظ سے یہ ایک بڑی نعمت اور بیش بہا خزانہ تھا۔
>
> مرحوم نے انجمن کے لیے اسے ترتیب دینا شروع کیا۔
>
> لیکن افسوس اجل نے اتنی مہلت نہ دی کہ اس کی تکمیل ہو جاتی اور یہ ہونہار نوجوان جو علم واخلاق کا پتلا تھا، بے وقت اس دنیا سے کوچ کر گیا۔
>
> یہ مضمون جو زور بیان، جدت فکر اور بلندی خیالات کے لحاظ سے اردو زبان میں بالکل ایک نئی چیز ہے مرحوم کی یادگار میں سب سے اول رسالہ اردو میں شائع ہوا تھا، اور اب مستقل کتاب کی صورت میں چھاپا جاتا ہے۔''

مولوی عبدالحق کے اقتباس سے چند باتیں واضح ہوتی ہیں۔

(1) انجمن ترقی اردو نے غالب کا ایک اردو دیوان بڑی محنت اور تحقیق سے مرتب کرالیا تھا۔

(2) مولوی عبدالحق کی ایما پر اس دیوان پر مقدمہ لکھنے کی ذمہ داری عبدالرحمٰن بجنوری نے قبول کی تھی اور اس پر لکھنا شروع کر دیا تھا۔

(3) مقدمہ ابھی لکھ ہی رہے تھے کہ بھوپال کے سرکاری کتب خانے میں مرزا غالب کے ایک قدیم دیوان کے موجود ہونے کا علم ہوا جسے نسخۂ بھوپال کے نام سے منسوب کیا گیا۔

(4) عبدالرحمٰن بجنوری نے انجمن ترقی اردو کے لیے اس نسخے کو ترتیب دینا شروع کیا۔

(5) عبدالرحمٰن بجنوری کا انتقال ہو گیا اور اس وقت تک ترتیب کا کام مکمل نہیں ہوا تھا۔
(6) ان کے تبصرہ کو ''محاسن کلام غالب'' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا۔

امتیاز علی عرشی کے مضمون ''غالب اور بجنوری'' میں ایک اہم سوال تو تھا ہی کہ عبدالرحمٰن بجنوری نے مقدمہ کس دیوان کے لیے لکھا تھا، نسخۂ حمیدیہ یا کسی دوسرے نسخے کے لیے؟ ایک سوال اور ہمارے سامنے آتا ہے کہ عبدالرحمٰن بجنوری نے نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب کا کام کیا تھا یا نہیں۔ ان دونوں سوالوں کے جواب مولوی عبدالحق کے پیش لفظ میں موجود ہیں۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے انجمن ترقی اردو کے ذریعے ترتیب دیے گئے غالب کے ایک اردو دیوان پر مقدمہ لکھنا شروع کیا تھا اور اس وقت ان کے سامنے نسخۂ بھوپال موجود نہیں تھا۔ نسخۂ بھوپال کی دریافت کے بعد انھوں نے اس سے کچھ استفادہ کیا یا نہیں اس کے متعلق احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ''ان [عبدالرحمٰن بجنوری] کے مقدمے میں نسخۂ حمیدیہ کے مشہور اشعار کے حوالے نہیں ملتے۔''

اور مفتی انوار الحق نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ

> ''ممکن ہے کہ مرحوم اس تبصرے پر نظر ثانی کرتے، کیوں کہ ابھی تک انھوں نے اسے ختم نہیں کیا تھا اور قرین قیاس ہے کہ اس میں کچھ ردو بدل ہوتا کیوں کہ جو کچھ لکھا گیا تھا وہ مروجہ اور مطبوعہ دیوان کے متعلق تھا۔ اور اب ایک سو برس کے قلمی دیوان میں غالب کا غیر مطبوعہ اور قلم زد کلام مل جانے سے میدان سخن فراخ ہو گیا تھا۔ مقابلے کے لیے نئے نئے مضمون ہاتھ آ گئے تھے اور مرحوم کی نکتہ رس اور دقیقہ سنجی کے لیے نہایت وسیع جولاں گاہ مہیا ہو گیا تھا۔''

مفتی انوار الحق کا درج بالا قول قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری کی زندگی میں نسخۂ بھوپال کی دریافت ہونے کے باوجود کسی سبب سے وہ اپنے مقدمے پر نظر ثانی نہ کر سکے اور اگر کیا بھی ہو گا تو انھیں اس میں ترمیم و اضافے کا موقع نہیں ملا۔ اس لیے یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ عبدالرحمٰن بجنوری نے غالب کے جس اردو دیوان کے لیے مقدمہ لکھا تھا وہ نسخۂ بھوپال نہیں بلکہ کوئی اور نسخہ تھا اور رہی بات نسخۂ بھوپال کی تدوین و ترتیب کی تو مولوی عبدالحق (سکریٹری، انجمن ترقی اردو) کے مطابق اس کی ترتیب کا ذمہ انجمن ترقی اردو نے عبدالرحمٰن بجنوری کو سونپا تھا۔ مولوی عبدالحق کے اس جملہ 'مرحوم نے اسے انجمن کے لیے

ترتیب دینا شروع کیا' سے واضح ہو جاتا ہے کہ عبدالرحمٰن بجنوری کو ترتیب کی ذمہ داری دی گئی تھی۔ لیکن انھوں نے کام شروع کیا تھا یا ابھی اس کا خاکہ ہی تیار کر رہے تھے؟ اگر انھوں نے ترتیب کی ابتدا کر دی تھی تو کس قدر کام تکمیل کو پہنچا تھا؟ ان سارے سوالات کے جواب پردۂ غیب میں ہیں۔ چونکہ مفتی انوار الحق نے اس کام کو اختتام تک پہنچایا اس لیے ممکن ہے کہ انھیں عبدالرحمٰن بجنوری کے کام کا علم رہا ہو۔ اس لیے مولوی عبدالحق جنھوں نے عبدالرحمٰن بجنوری کو نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب کی ذمہ داری دی اور نسخۂ حمیدیہ پر پیش لفظ بھی لکھا اور مفتی انوار الحق جنھوں نے ترتیب کا کام مکمل کیا، ان دونوں کو اس بات کا ذکر کرنا چاہیے تھا کہ عبدالرحمٰن بجنوری نے ترتیب کا کتنا کام کر لیا تھا یا اگر انھوں نے ابھی اس کی ابتدا نہیں کی تھی تو بھی اس کا ذکر ان لوگوں کو اپنے پیش لفظ میں ضرور کرنا چاہیے تھا۔

ماہنامہ تحریک نے اپریل 1974 میں غالب نمبر شائع کیا تھا۔ اس میں امتیاز علی عرشی کا ایک مضمون بعنوان ''مجلس یادگار غالب کا شائع کردہ دیوان غالب'' شامل ہے۔ غالب صدی کے موقع پر مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، پاکستان نے دیوان غالب کا ایک نسخہ شائع کیا تھا جس کی تصحیح و ترتیب کی ذمہ داری مولانا حامد علی خاں نے قبول کی تھی۔ وہ اس وقت موسسہ مطبوعات فرینکلن، لاہور کے مدیر تھے۔ اس نسخے کی ترتیب نسخۂ نظامی کانپور کے مطابق ہے جو غالب کی زندگی ہی میں 1862 میں شائع ہوا تھا۔ حامد علی خاں نے اپنے حرف آغاز میں اعتراف کیا ہے کہ دیوان غالب کی ترتیب و تدوین ایک مشکل امر ہے۔ اس کے لیے دس دس پندرہ پندرہ نسخوں کو سامنے رکھنا پڑا اور قدیم و جدید نسخوں کا باہم مقابلہ کرنے کے ساتھ ساتھ بسا اوقات شرحوں اور مستند لغات کا بھی سہارا لینا پڑا۔ لیکن انھوں نے اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ اتنی محنت کے بعد بھی اس نسخے کو حرف آخر نہیں سمجھنا چاہیے۔ امتیاز علی عرشی جو خود ماہر غالبیات ہیں، انھوں نے اس نسخے کا مطالعہ کیا اور اس میں انھیں بہت سی غلطیاں نظر آئیں جن کی جانب انھوں نے اپنے اس مضمون میں اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''چونکہ اس نسخے کی ترتیب نسخۂ نظامی کانپور کے مطابق ہے جو خود غالب کا نسخہ ہے۔ اس لیے اس سے قطع نظر کر کے آئندہ صفحات میں اس نسخے کی صحت متن کا جائزہ لیا جاتا ہے۔''

غالب نے اپنے اردو دیوان کا پیش لفظ فارسی میں لکھا تھا۔ اس میں ایک لفظ حامد علی

خاں کو سمجھ میں نہیں آیا جس کے تحت انھوں نے چند قیاسی باتیں درج کر دیں۔ امتیاز علی عرشی نے ان کے الفاظ نقل کیے ہیں:

''نہ چو بہای سنگروب خوردہ''۔ مصحح نے سنگروب پر حاشیہ لکھا ہے: ''متداول نسخوں میں یہاں لفظ ''ژوپ'' چھپا ہے جو کسی لغت میں نہیں ملا۔ پروفیسر عابدی کا خیال ہے کہ غالب نے سنگ ژوپ کے بجائے سنگ روب لکھا ہوگا۔''

تدوین وتصحیح کا یہ تقاضہ ہے کہ متن میں وہی چیز رہنی چاہیے جو تمام قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں درج ہے اور اگر کسی لفظ یا فقرے سے مصحح کو اعتراض ہے تو اسے حاشیے میں درج کرنا چاہیے۔ امتیاز علی عرشی لفظ ''ژوپ'' اور ''روب'' کے متعلق لکھتے ہیں:

''حاشیے میں پروفیسر عابدی صاحب کا قیاس درج کر دیا جاتا تو مضائقہ نہ تھا۔ رہا لفظ ژوپ تو اگر چہ متداول لغات میں اس کا مذکور نہیں، مگر غالب نے اسے دستنبو میں بھی استعمال کیا ہے: لکھتے ہیں: ''وتوپ از در ژوپ تندر خروش گرداگر فرو چیدہ در بے آرامی از روے پاداری آرامیدہ اند۔'' مطبوعہ نسخے کے حاشیے میں اسے حل نہیں کیا ہے۔ مگر جو قلمی نسخہ نواب یوسف علی خاں ناظم کو بھیجا تھا، اس کے حواشی میں مشکل الفاظ کا حل اپنے قلم سے کیا ہے۔ اس حل میں ''ژوپ'' کے معنی ضرب لکھے ہیں۔ اس صورت میں دیباچے کے الفاظ ''سنگ ژوپ خوردہ'' کا ترجمہ ہوگا پتھر کی مار کھایا ہوا یا وہ جس پر پتھر کی چوٹ پڑی ہو اور ''سنگ روب خوردہ'' بے معنی فقرہ رہے گا۔''

مذکورہ دیوان میں ایک شعر یوں درج ہے:

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آئی ہے آپ
ہے ردیف شعر میں غالب زبس تکرار دوست

اس کے متعلق امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

''تمام نسخوں میں جن میں نسخۂ نظامی بھی شامل ہے۔ ''پسند آتی'' ہے اور یہی مناسب بھی ہے۔ ''آئی'' سہو کتابت ہے اور غالباً نسخۂ حمیدیہ کے ذریعے اس مصرع میں داخل ہوا ہے۔ مصحح نے یہ لفظ اختیار کیا تھا، تو حاشیے میں اس کی سند لکھنا چاہیے تھی۔''

امتیاز علی عرشی اپنے مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں:

''ان معروضات کے باوجود میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ غالب کی صد سالہ تقریبات پر دیوان غالب اردو کے جتنے ایڈیشن شائع ہوئے، ان میں یہ سب سے ممتاز ہے۔''

امتیاز علی عرشی نے مجلس یادگار غالب کے تحت شائع ہونے والے نسخے میں 35 غلطیوں کی نشاندہی کی ہے لیکن ساتھ ہی امتیاز علی عرشی کے درج بالا قول سے ہمیں اس نسخے کی اہمیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

امتیاز علی عرشی کا مضمون ''دیوان غالب کا ایک نادر انتخاب'' نقوش، غالب نمبر اکتوبر 1969 میں شائع ہوا تھا۔ مضمون کے عنوان ہی سے واضح ہوتا ہے کہ یہ تحقیقی نوعیت کا ہے۔ اس مضمون میں دیوان غالب کے ایک انتخاب کو پیش کیا گیا ہے۔ رامپور رضا لائبریری میں دیوان مومن کا ایک نسخہ موجود ہے جس کے ساتھ دیوان غالب کا یہ انتخاب بھی مجلد تھا۔ یہ انتخاب کس نے کیا اس کا ذکر اس دیوان میں کہیں نہیں ملتا۔ امتیاز علی عرشی کے مطابق 'کاتب کم سواد نظر آتا ہے اس لیے کہ اس نے دو جگہ اسد کا املا ''ص'' سے لکھا ہے۔ کاتب نے دیوان غالب کے کس نسخے کو سامنے رکھ کر یہ انتخاب کیا ہے، اس کے متعلق امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

''یہ انتخاب دیوان کے کس نسخے پر مبنی ہے، اس بارے میں قیاس یہ ہے کہ اس میں ایسا کوئی شعر نہیں ہے، جو 1248ھ کے مرتبہ دیوان کے بعد کے نسخے کا ہو، لہٰذا اسے 1248ھ یا اس کے قریب کے کسی نسخے پر مبنی ہونا چاہیے۔ اس کی تائید میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انتخاب کے سرورق پر 1836 تحریر ہے، جو 1252ھ کے مطابق ہے۔''

دیوان غالب کا جو نسخہ 1248 ہجری مطابق 1833 ہے اسے ہم نسخۂ رامپور (قدیم) کے نام سے جانتے ہیں اور اس کے بعد جس نسخے کا ذکر ملتا ہے وہ نسخۂ بدایوں ہے جو 1254 ہجری کا مخطوطہ ہے۔ دراصل امتیاز علی عرشی نے نسخۂ بدایوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ اب لیاقت میوزیم کراچی میں محفوظ ہے اور وہ 1254ھ کا مرتبہ ہے۔ درج بالا اقتباس میں امتیاز علی عرشی نے انتخاب کے متعلق ایک سوال قائم کیا ہے کہ یہ انتخاب دیوان کے کس نسخے پر مبنی ہے، پھر خود ہی اس کا جواب دیتے ہوئے قیاس کرتے ہیں کہ اس انتخاب میں 1248ھ کے بعد

کے کسی نسخے کے اشعار نہیں ملتے ہیں اس لیے یہ انتخاب 1248ھ یعنی نسخۂ رامپور قدیم پر مبنی ہونا چاہیے۔ امتیاز علی عرشی کے مطابق اس انتخاب پر 1836 تحریر ہے جو 1252ھ کے مطابق ہے اور اس میں 1248ھ کے نسخے کے اشعار بھی موجود ہیں۔ ابھی تک کی تحقیق کے مطابق 1248ھ اور 1254ھ کے درمیان غالب کے کسی اور نسخے کا ذکر نہیں ملتا اس لیے اغلب ہے کہ یہ انتخاب نسخۂ رامپور قدیم (1248ھ) کے نسخے پر مبنی ہے۔ یہاں ایک بات اور عرض کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ جن نسخوں کی بات ہو رہی ہے دراصل وہ مخطوطات ہیں جو مختلف موقعوں پر ترتیب دیے گئے تھے۔ اگر ہم دیوان کی اشاعت کی بات کریں تو غالب کا پہلا دیوان 1841 میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا تھا۔

امتیاز علی عرشی نے نسخۂ رامپور (قدیم) اور اس انتخاب کا تقابل بھی کیا ہے۔ انتخاب اور نسخۂ رامپور (قدیم) کے متون میں انھیں جو اختلافات نظر آئے ان کی طرف بھی انھوں نے مضمون میں اشارے کیے ہیں۔ اس تقابل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انتخاب کرتے وقت نسخۂ رامپور (قدیم) سامنے نہیں تھا بلکہ کوئی اور نسخہ تھا۔ امتیاز علی عرشی اس کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"1248ھ کے نسخے میں ہے:

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

یہی قرأت بعد کے تمام نسخوں میں ملتی ہے۔ مگر اس انتخاب میں "نظر ہائے" کی جگہ "نگہ ہائے" ہے۔ ممکن تھا کہ اس اختلاف کو کاتب کا سہو قرار دے دیا جاتا۔ مگر غالب کے "گل رعنا" اور شیفتہ کے "گلشن بے خار" میں بھی "نگہ ہائے" ملتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس انتخاب کی بنا جس نسخے پر ہے، وہ ہمارے نسخے کی جگہ شیفتہ کے نسخۂ دیوان غالب کے مطابق تھا۔

اسی طرح انتخاب کی غزلوں کی ترتیب تو 1248ھ کے نسخے کے مطابق ہے مگر اشعار کی ترتیب جگہ جگہ مختلف ہے۔ یہ بھی اسی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے کہ انتخاب کی اصل 1248ھ کے نسخے سے الگ کوئی نسخہ ہے۔"

اس انتخاب کی اہمیت یہ ہے کہ یہ دیوان غالب کا پہلا انتخاب ہے۔ اس سے پہلے کسی اور انتخاب کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ امتیاز علی عرشی نے مضمون کے آخر میں انتخاب کو بھی شائع کیا ہے اور

ساتھ ہی غالب کے مختلف مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں سے اس کے متن کا تقابل بھی کیا ہے اور اس میں پائے جانے والے اختلافات کو حاشیے میں درج کیا ہے۔

امتیاز علی عرشی کا مضمون ''غالب کا خود نقل کردہ نسخۂ دیوان اردو'' آج کل جولائی 1969 میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں غالب کے جس خود نقل کردہ دیوان کا ذکر کیا گیا ہے اسے مختلف ناموں سے منسوب کیا گیا۔ طفیل احمد خاں ایڈیٹر نقوش، لاہور اسے نسخۂ لاہور کہنے پر بضد رہے کیوں کہ اس کی اشاعت سب سے پہلے نقوش کے غالب نمبر اکتوبر 1969 میں ہوئی تھی، گیان چند جین اور ڈاکٹر ابو محمد سحر نے اسے نسخۂ بھوپال ثانی کے نام سے یاد کیا کیوں کہ اس کی دریافت بھوپال میں ہوئی تھی۔ امتیاز علی عرشی، اکبر علی خاں اور آل احمد سرور نے اسے نسخۂ عرشی زادہ کے نام سے منسوب کیا کیوں کہ اکبر علی خاں عرشی زادہ نے بھی اسے ''عرشی زادہ'' کے نام سے شائع کیا تھا لیکن نثار احمد فاروقی نے اسے نسخۂ امروہہ کے نام سے یاد کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ امروہہ کے رہنے والے توفیق احمد چشتی جو کہ پرانی کتابوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتے تھے، انھیں یہ نسخہ بھوپال میں اپنے ہم پیشہ شفیق الحسن سے موصول ہوا تھا۔ اس نسخے کی خبر سب سے پہلے نثار احمد فاروقی کی تصدیق کے ساتھ ہماری زبان علی گڑھ میں شائع ہوئی تھی۔ اکبر علی خاں نے اگرچہ نثار احمد فاروقی سے پہلے غالب کا خود نقل کردہ دیوان، عرشی زادہ کے نام سے شائع کیا تھا لیکن قبول عام اسے نسخۂ امروہہ کے نام سے ملی اور اس کی دریافت کا سہرا نثار احمد فاروقی کے سر بندھا۔ نثار احمد فاروقی نے اس کی تدوین و ترتیب کے وقت اس بات کا بھی اہتمام کیا کہ یہ دیوان عکس کے ساتھ ساتھ نستعلیق میں بھی شائع ہو جائے، ساتھ ہی انھوں نے بخط غالب سے متعلق دو مضامین بھی لکھے ہیں۔ ایک مضمون میں اس کی دریافت کی روداد بیان کی ہے اور دوسرے مضمون میں اس کی ہیئت اور اس میں موجود شاعری پر نہ صرف تفصیل سے روشنی ڈالی ہے بلکہ اس کا موازنہ نسخۂ حمیدیہ سے بھی کیا ہے۔ واضح رہے کہ نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ بھوپال کی جدید شکل ہے۔ یہ نسخہ بھی بھوپال کے ایک سرکاری کتب خانے میں دریافت ہوا تھا۔ نسخۂ حمیدیہ سے موازنہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ نسخۂ امروہہ کی دریافت سے پہلے تک دیوان غالب کا سب سے قدیم مخطوطہ تھا جو منظر عام پر آیا تھا۔ نسخۂ بھوپال 1921 میں مفتی انوار الحق کی تصحیح اور عبدالرحمٰن بجنوری کے مقدمے کے ساتھ نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شائع ہوا تھا۔ نسخۂ بھوپال کا بیشتر کلام وہ تھا جو اس وقت تک کسی دوسرے نسخے میں

شامل نہیں تھا۔ اس میں جو غلطیاں راہ پا گئیں خواہ وہ نسخے کے کاتب کی ہوں یا مرتب نے اسے پڑھنے میں غلطی کی ہو، ان کی تصحیح کا کوئی التزام نہیں کیا جا سکا۔ نثار احمد فاروقی ان غلطیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"... جو بھی طباعت، کتابت یا قرأت کی غلطی اس میں رہ گئی وہ کسی اور ذریعے سے دور نہیں کی جا سکتی، قیاسی تصحیح کو صحت کا مدار بنانا عموماً خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ اب نسخۂ امروہہ کے سامنے آ جانے سے یہ دشواری نہ رہے گی۔" (تلاش غالب، ص115)

نثار احمد فاروقی نے یہ مضامین اپنی کتاب "تلاش غالب" میں بھی شامل کر لیے تھے۔ نثار احمد فاروقی نے جب پہلی مرتبہ نسخۂ امروہہ کو دیکھا اور اس کی زیارت سے انھیں جو خوشی ہوئی تھی، اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"...میں نے پہلی نگاہ میں اسے شناخت کر لیا کہ واقعی یہ غالب کا خط ہے۔ اپنی مختصر سی زندگی میں مجھے بہت کم کتابوں کی زیارت سے اتنی خوشی ہوئی ہے جتنی اس قلمی نسخے کو دیکھ کر حاصل ہوئی۔"

(نثار احمد فاروقی، دیوان غالب: نسخۂ امروہہ، تلاش غالب، ص96)

امتیاز علی عرشی نے اپنے مذکورہ مضمون میں اسی دیوان کے تعلق سے گفتگو کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"چند دن ہوئے امروہہ کے ایک نوادر فروش توفیق احمد صاحب قادری چشتی کو کہیں سے دیوان غالب کا ... نادر اور اہم نسخہ دستیاب ہوا ہے۔ اس نسخے میں 63 ورق ہیں۔ غزلوں کا اندراج بیشتر ترچھا بیاض نما ہے۔ مکتوب حصے کا طول 4 ء 6 اور عرض 2 ء 4 انچ ہے۔ اگر حاشیے کو بھی ناپ میں شامل کر لیا جائے تو طول 9 انچ اور عرض 2 ء 6 انچ ہے۔"

نسخۂ امروہہ بخط غالب ہے اور نسخۂ بھوپال سے مقدم ہے، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

"...نو دریافت نسخہ از روے زمانہ نسخۂ حمیدیہ سے مقدم ہے، اس دعوے کا مزید ثبوت یہ ہے کہ جو غزلیں نسخۂ مذکور اور حمیدیہ میں مشترک ہیں، ان کے

مختلف شعروں کا متن زیر بحث نسخے میں پہلے اور تھا، بعد میں مرزا صاحب نے ترمیم کردی۔ حمیدیہ میں وہ شعران ترمیم شدہ الفاظ کے ساتھ لکھے گئے ہیں، مثلاً

(1) حمیدیہ میں ہے:

مرے دل نے مرے تارنفس سے غالب
ساز پہ رشتۂ پئے نغمۂ بیدل باندھا

نودریافت نسخے میں مصرع اول پہلے یوں تھا:

وہ نفس ہوں کہ اسد زمزمہ فرصت نے

پھر اسے قلم زد کر کے دوسرے مصرعے کے نیچے لکھا ''وہ نفس ہوں کہ اسد مطرب دل نے مجھ سے'' حمیدیہ کا مصرع ان دونوں اصلاح کے بعد کہا گیا ہے۔ بہر حال دوسرا مصرع نسخۂ مذکور میں پہلے اس طرح تھا: ''رشتۂ بر ساز پئے نغمۂ بیدل باندھا'' بعد ازاں اسے حمیدیہ کے مصرع ثانی کے مطابق کر دیا، جب کہ حمیدیہ میں متن اول نہیں، متن ثانی ہے تو اس کا مطلب نکلتا ہے کہ حمیدیہ کا متن بعد کا ہے۔''

غالب نے کلیات فارسی شائع ہونے کے بعد فارسی زبان میں جتنے اشعار کہے تھے انھیں سبد چین کے عنوان سے شائع کرا دیا تھا لیکن سبد چین کے شائع ہونے کے بعد بھی بہت سا فارسی کلام ایسا تھا جو منظر عام پر نہیں آ سکا۔ اس کا سبب چاہے جو بھی رہا ہو۔ غالب پر تحقیق کرنے والے، بہت سے ایسے کلام جو پردۂ خفا میں تھے، اپنی محنت اور لگن سے انھیں منظر عام پر لاتے رہے ہیں۔ غالب کی ایک فارسی مثنوی جس کا عنوان ''ترجمۂ منظوم دعاء الصباح'' ہے اس وقت ہماری بحث کا موضوع ہے۔ اس مثنوی کو غالب دوستوں کے سامنے لانے کا کارنامہ بھی امتیاز علی عرشی نے انجام دیا ہے۔ نیا دور لکھنؤ مارچ 1969 میں امتیاز علی عرشی کا ایک مضمون ''ترجمۂ منظوم دعاء الصباح: غالب کی ایک فارسی مثنوی کا مخطوطۂ رامپور'' شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کے آخر میں انھوں نے فارسی مثنوی کو بھی شامل کیا ہے تاکہ غالب شناسوں کی اس تک آسانی سے رسائی ہو سکے۔ اس مثنوی کے متعلق امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

''برادر مکرم جناب مالک رام صاحب نے مکاتیب غالب کی اشاعت کے بعد سبد چین کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا تو اس میں مکاتیب غالب کے حوالے

کے ساتھ وہ فارسی اشعار بھی درج کر دیے۔ لیکن اب بھی میرزا صاحب کے
فارسی کلام کا کچھ حصہ باقی ہے، جو یا تو ابھی تک شرمندۂ طباعت نہ ہو سکا اور
یا اس کی شہرت نہ ہونے پائی۔ موخر الذکر صنف میں ان کی ایک فارسی مثنوی کا
شمار ہو سکتا ہے جو انھوں نے اپنے حقیقی بھانجے میرزا عباس بیگ صاحب اکسٹرا
اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ کی فرمائش پر لکھی تھی۔ یہ مثنوی دعاء الصباح کا ترجمہ ہے جو
امیرالمومنین حضرت علیؑ بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔''

مذکورہ اقتباس میں امتیاز علی عرشی نے مکاتیب غالب کا ذکر کیا ہے۔ اس کے متعلق یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مکاتیب غالب، غالب کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے نوابان رامپور اور ان کے درباریوں کو مختلف اوقات میں لکھے تھے۔ ان خطوط کو امتیاز علی عرشی نے ہی ایک مفصل دیباچے اور تشریحی حاشیوں کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔

ترجمۂ منظوم دعاء الصباح کا قلمی نسخہ امتیاز علی عرشی کو رامپور رضا لائبریری میں ملا تھا۔ اس میں کل 23 صفحات تھے اور اسے محمد علی بن سید برخوردار علی نام کے کسی شخص نے 1284 ہجری میں نقل کیا تھا۔ محمد علی امروہہ کے رہنے والے تھے۔ اس مثنوی کی ہیئت کا ذکر کرتے ہوئے امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

''اس قلمی نسخے میں اصل دعا کا عربی متن سیاہ روشنائی میں لکھا گیا ہے۔ اس
کے نیچے منثور فارسی ترجمہ شنگرفی روشنائی سے اور ترجمۂ نثر کے نیچے منظوم
ترجمہ، متن عربی کی ہم رنگ سیاہ روشنائی سے تحریر ہے۔ عبارت کے چاروں
طرف قرمزی دہری جدول ہے اور متن عربی، ترجمۂ نثر اور ترجمۂ نظم کو باہم
جدا کرنے کے لیے بھی قرمزی لکیریں کھینچی گئی ہیں۔ یہ کتاب مجموعے کے ورق
56ب سے شروع ہو کر 67ب پر ختم ہوتی ہے۔ لیکن کاتب مجموعہ نے ہر
رسالے کے اوراق پر جداگانہ ہندسے ڈالے ہیں۔ کاغذ باریک یورپی ہے۔ کہیں
کہیں پیوند کاری اور اکثر جگہ کرم خوردگی کے نشانات پائے جاتے ہیں۔''

مثنوی کے آغاز میں محمد باقر بن محمد مومن خراسانی کا ایک اقتباس درج ہے جس میں دعاء الصباح کی فضیلت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد اگلے صفحے سے مثنوی دعاء الصباح شروع ہوتی ہے۔ لیکن اس مثنوی کا ترجمۂ منظوم غالب نے ہی کیا ہے اس کا خلاصہ 'دعاء الصباح'

کے خاتمے پر ہوتا ہے۔ دراصل مثنوی کے اختتام پر کاتب نے اس مثنوی کے متعلق ایک فارسی نوٹ لکھا ہے جس میں اس بات کا ذکر ہے کہ مرزا عباس بیگ کی ایما پر مرزا غالب نے ترجمۂ منظوم کہا تھا۔ امتیاز علی عرشی نے فارسی کا وہ ترقیمہ بھی اپنے مضمون میں نقل کر دیا ہے۔ اس کے سنہ کتابت کے تعلق سے وہ لکھتے ہیں:

> ''...جن الفاظ کے ذریعے 1284ھ ظاہر کیا گیا ہے، یہاں غالباً کاتب نے سال طباعت نقل کیا تھا لیکن بعد ازاں اس کو مٹا کر سال کتابت لکھا ہے۔ بہر حال اس سے اتنا یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمۂ منظوم میرزا عباس بیگ صاحب کی فرمائش پر منشی نول کشور کے مطبع لکھنؤ میں میرزا غالب (متوفی 1285ھ) کی زندگی میں چھپا تھا اور ان کے انتقال سے ایک سال تین مہینے کچھ دن قبل نسخۂ مطبوعہ سے اس کی نقل کی گئی ہے۔''

امتیاز علی عرشی کا مضمون ''غالب کی چند نئی اردو تحریریں'' رسالہ شاعر خاص نمبر 1959 میں شائع ہوا تھا۔ مضمون کے عنوان ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون میں غالب کی چند نئی تحریروں پر گفتگو کی گئی ہے۔ غالب کے تنقیدی نکات محمد حسین برھان ابن خلف تبریزی کی فارسی فرہنگ ''برھان قاطع'' پر تو ملتے ہیں لیکن امتیاز علی عرشی نے اس مضمون میں برہان قاطع کے بجائے خان آرزو کی کتاب ''موہبت عظمیٰ'' کا ذکر کیا ہے۔ اس کتاب کے حاشیوں میں غالب نے بقلم خود چند اختلافات درج کیے تھے۔ ''موہبت عظمیٰ'' رامپور رضا لائبریری کے لوہارو سیکشن میں محفوظ ہے۔

امتیاز علی عرشی کا مضمون ''غالب کی اپنے کلام پر اصلاحیں'' آج کل دہلی فروری 1952 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں امتیاز علی عرشی نے دیوان غالب کے مختلف نسخوں میں موجود غالب کی اصلاحوں کو پیش کیا ہے۔ دراصل غالب نے جب بھی دیوان کی طباعت کا ارادہ کیا تو اپنے کلام میں کچھ تصحیح بھی کی۔ 1861 میں مطبع احمدی سے دیوان کا جو نسخہ شائع ہوا تھا اس کے آخر میں غالب کی ایک تحریر ''عبارت خاتمۂ دیوان'' کے عنوان سے شامل ہے۔ اس میں غالب نے لکھا ہے کہ دیوان کی تمام کاپیاں ان کی نظر سے گزرتی رہیں اور وہ اغلاط کی تصحیح کرتے رہے۔ پھر بھی کہیں نہ کہیں غلطیوں کے باقی رہ جانے کا امکان رہتا ہے۔ غالب کا اقتباس دیکھیے:

> یقین ہے کہ کسی جگہ حرف غلط نہ رہا ہو۔ مگر ہاں ایک لفظ میرے منطق کے خلاف نہ ایک جگہ بلکہ سو جگہ چھاپا گیا ہے۔ کہاں تک بدلتا۔ ناچار جا بجا یوں

ہی چھوڑ دیا۔ یعنی ''کسو'' بکاف مکسور و سین مضموم و واو معروف۔ میں یہ نہیں
کہتا کہ یہ لفظ صحیح نہیں۔ البتہ فصیح نہیں۔ قافیے کی رعایت سے اگر لکھا جائے تو
عیب نہیں۔ ورنہ فصیح بلکہ افصح ''کسی'' ہے، واو کی جگہ یائے تحتانی۔''

یہاں پر غالب نے صرف ایک لفظ کے متعلق بات کہی ہے لیکن اکثر جگہ انھوں نے کلام کی طباعت سے پہلے اپنے اشعار میں بھی اصلاحیں کی تھیں۔ امتیاز علی عرشی نے غالب کی زندگی میں شائع ہونے والے تمام نسخوں کو سامنے رکھ کر ان میں پائے جانے والی اصلاحوں پر گفتگو کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جب کبھی انھوں [غالب] نے کوئی نسخہ کسی کو تحفۃً دینے یا مطبع بھیجنے کے
لیے تیار کرایا، تو نہ صرف ان کی صحت ہی کی بلکہ اس میں مناسب ترمیم بھی کہیں
نہ کہیں ضرور فرمائی۔ رضا لائبریری رامپور میں ان کے عہد کے لکھے اور چھپے ہوئے
متعدد دیوان محفوظ ہیں۔ ان کو دیکھنے سے مذکورہ خیال کی تائید ہوتی ہے۔''

مثال کے طور پر غالب کا یہ شعر دیکھیے:

مر گیا پھوڑ کے سر غالب وحشی، ہے ہے
بیٹھنا اُس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

اس شعر کے متعلق امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

''قاؔ میں ''پھوڑ'' کی جگہ ''مار'' ہے۔ چونکہ سر پھوڑنے میں وحشت ''مارنے''
کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ نیز ''سر مارنا'' کئی معنی کا احتمال رکھتا ہے۔ جن
میں سے بعض وحشت کی ضد بھی ہیں۔ اس لیے 1841 سے قبل ہی مرزا
صاحب نے یہ اصلاح فرمائی۔''

قاؔ سے مراد وہ نسخہ ہے جو نواب خلد آشیاں، والی رامپور نے کسی کاتب سے نقل کروایا تھا۔ اس میں 1067 اشعار ہیں۔ چونکہ امتیاز علی عرشی نے مضمون میں مختلف نسخوں کے حوالے دیے ہیں اس لیے آسانی کے لیے تمام نسخوں کا ایک نام رکھ دیا ہے تاکہ قارئین کو سمجھنے میں آسانی رہے۔ اس نسخے کے متعلق ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ امتیاز علی عرشی کے خیال میں یہ دیوان غالب کا پہلا انتخاب ہے۔ دراصل غالب کا پہلا دیوان جو غالب کی زندگی میں 1841 شائع ہوا اس میں ضیا الدین احمد خاں بہادر نیر کی تقریظ بھی شامل تھی۔ ضیاء الدین نیر نے دیوان

کے اشعار کی کل تعداد 1090 بتائی ہے۔ چونکہ قآ میں صرف 1067 اشعار ہیں اس لیے قآ کو دیوان غالب 1841 والے نسخے سے پہلے کا ہونا چاہیے۔

راقم نے کتاب میں ایک مضمون ''تاثرات غالب'' کے عنوان سے شامل کیا ہے۔ دراصل یہ ایک انٹرویو ہے جو رسالہ علم وفن دہلی کے غالب نمبر اپریل 1969 میں شائع ہوا تھا۔ امتیاز علی عرشی سے ملاقات کی غرض سے رامپور کا سفر اور غالب کے موضوع پر ان کا انٹرویو لینے کے بارے میں صاحب انٹرویو لکھتے ہیں:

''عرشی صاحب سے میری پہلے کوئی ملاقات نہ تھی، زندگی میں دیکھا بھی دوسری ہی بار تھا۔ پہلی بار گیان بھون کی اس تقریب میں دیکھا تھا جس میں دیوان غالب کے نسخۂ عرشی کی ترتیب پر انھیں ساہتیہ اکیڈمی کا ایوارڈ دیا گیا تھا۔ دلّی سے ایک خط بغیر کسی ''دید شنید'' کے ان کے صاحبزادے اکبر علی خاں کے نام لکھ کر رامپور پہنچ گیا تھا اور یہ مولانا کی وضع داری، شفقت اور غالب سے غیر معمولی لگاؤ تھا کہ انھوں نے طویل بیماری سے حال ہی میں اٹھنے اور مکمل طور پر صحت یاب نہ ہونے کے باوجود مجھے اتنا وقت عنایت فرمایا۔''

امتیاز علی عرشی کا ایک اہم مضمون ''اردو شاعری پر غالب کا اثر'' ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں اردو شاعری پر غالب کے اثرات کی نشان دہی کی ہے۔ امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں کہ 'میرزا غالب بھی بڑے شاعر تھے۔ ان کے سامنے وہی آیا جو ہر بڑے شاعر کی قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔' غالب نے بھی اپنے عہد کے شاعروں کے طعن تشنے برداشت کیے۔ یہاں تک کہ غالب جب اپنا کوئی شعر سناتے تو لوگ ان کا مذاق اڑانے کی غرض سے اس شعر کا مطلب بھی پوچھا کرتے تھے۔ غالب کو ان تمام باتوں سے چڑ تھی۔ وہ بعض اوقات شدید جھنجھلاہٹ میں سامنے والے پر برس پڑتے تھے اور انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

غالب کے حریفوں نے گرچہ غالب کی شاعری کا بہت مذاق اڑایا لیکن یہی وہ چیز ہے جس نے غالب کو غالب بنانے میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔ امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

''یہ اس بات کا کھلا ہوا اقرار ہے کہ حریفوں کے بار بار ٹوکنے پر انھیں بھی

خیال آیا کہ اپنے کلام کو پرکھیں اس کے لیے پہلے کسوٹی کی ضرورت تھی جو
ظہوریؔ، نظیریؔ، عرفی وغیرہ کے کلام میں ہاتھ آگئی۔ میرزا صاحب نے اس
پر اپنے طلسمی اشعار کس کر دیکھے تو ان کی حقیقت کھلی جس کے نتیجے میں انھیں
اردو اشعار کے بڑے حصے سے دست بردار ہونا پڑا۔
آپ کہیں گے یہ تو میرزا صاحب کی ہار ہے میں عرض کروں گا ہرگز نہیں میرزا
صاحب نے صرف میدان چھوڑا تھا ہتھیار نہیں ڈالے تھے انھوں نے اردو
شاعری سے بالکل ہاتھ کبھی نہیں اٹھایا۔ وہاں ایرانی مسالے سے ایٹم بنانے
میں زیادہ وقت صرف کیا اور کچھ عرصے کے بعد اس میدان میں واپس آئے۔"

اس کے بعد جو اشعار کہے اس سے ان کے معاصر میں ایک بے چینی اور اضطراب کی
کیفیت پائی جانے لگی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نکتہ چیں ہے، غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

اس سلسلے میں غالب کے اور بھی بہت سے اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان کے
معاصرین نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دینے کے لیے خود کو تیار کیا اور اپنے کلام میں گہرائی اور
گیرائی پیدا کر سامنے آگئے۔ اس سلسلے میں امتیاز علی عرشی نے مومن و آزردہ کے متعدد شعر درج
کیے ہیں۔ چند پیش خدمت ہیں:

مومنؔ:

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

آزردہ:

میں اور ذوق بادہ کشی! لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں
اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جاں کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

اس کے بعد امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

"یہ تھا وہ اثر جو غالب نے اپنے زمانے کی شاعری پر ڈالا اور قبول کیا۔ اگر ان کے اور دلّی کے حلقہ ادب کے درمیان اتنی کش مکش نہ ہوتی تو یقین ہے کہ شعر میں وہ گہرائی اور گیرائی بھی نظر نہ آتی جو دہلی اسکول کی جان ہے۔

امتیاز علی عرشی نے مثال میں مومن اور آزردہ کے اور بھی شعر پیش کیے ہیں جن پر غالب کے اثرات کی نشان دہی کی ہے۔ امتیاز علی عرشی نے اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں پیش کیا ہے کہ مومن اور آزردہ نے غالب کے اثر کے تحت ہی درج بالا شعر کہے تھے۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ غالب کے زمانے میں عموماً مشاعروں میں مصرع طرح دیا جاتا تھا اور تمام شعرا اس پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ اُس وقت کے بیشتر شعرا سے غالب کی دوستی تھی۔

امتیاز علی عرشی نے عارفؔ، نسبتیؔ، سالکؔ، ناظمؔ، شیفتہؔ، حالیؔ، اقبالؔ، فانیؔ، وحشتؔ اور چکبستؔ کے نام اور ان کے چند اشعار بھی پیش کیے ہیں اور آخر میں لکھتے ہیں:

"میں نہیں کہہ سکتا کہ ان شعروں کو پڑھ کر آپ نے کیا رائے قائم کی مگر میں تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ان کے پردے میں غالبؔ کی یہ آواز سنائی دے رہی ہے۔
کیوں صاحبو! میں نہ کہتا تھا؟

قدر شعر من بگیتی بعد من خواہد شدن

آج بھی غالب کی زمین میں شعر کہنا لوگ باعث فخر سمجھتے ہیں۔ بعض شعرا اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نے غالب کے طرز پر اپنا کلام پیش کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش کی ہے۔

اخیر میں چند باتیں اس کتاب کے متعلق عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

امتیاز علی عرشی کے ان مضامین کو موضوعاتی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ کتاب میں شامل تمام مضامین کو اصل متن سے جوں کا توں پیش کر دیا گیا ہے۔ اگر کہیں راقم کو اختلاف یا

اضافہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو *لگا کر اپنے نام کے ساتھ حاشیے میں یا[ ] کے اندر اس کو درج کیا ہے۔

امتیاز علی عرشی کے مضامین جو ابھی تک مجھے دستیاب ہو سکے ہیں، ان میں اڑتیس مضامین ایسے ہیں جن کا مرکز ومحور مرزا اسداللہ خاں غالب ہیں۔ دیگر موضوعات پر مضامین کی تعداد پچاس یا اس سے کچھ زائد ہے۔ بعض بزرگوں اور دوستوں کا یہ مشورہ مجھے زیادہ بہتر معلوم ہوا کہ غالب پر تحریر کردہ مضامین کو ایک الگ کتاب کی صورت میں پیش کیا جائے۔

کتاب میں شامل مضامین میں سے ''غالب کا زائچہ''، ''غالب کا دربار اور خلعت''، ''میرزا غالب کی ایک غیر معروف فارسی مثنوی''، ''مقدمۂ دیوان غالب فارسی (مرتبہ عرشی) کے چند اوراق'' اور ''غالب کے فارسی خطوط: ایک نئی تحقیق''، یہ مضامین ''مقالات مولانا عرشی'' مرتبہ اخلاق احمد آہن میں موجود ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ اخلاق صاحب کی کتاب میں شامل مضامین کے موضوعات مختلف ہیں۔ چونکہ میری کتاب صرف غالب پر لکھے گئے مضامین کا احاطہ کرتی ہے اس لیے میں نے ان مضامین کو بھی اس کتاب میں شامل کر لیا ہے تاکہ غالب پر لکھے گئے تمام مضامین یکجا ہو جائیں۔

یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ کتاب میں شامل مضامین کے علاوہ بھی چند مضامین ہیں جنھیں امتیاز علی عرشی نے غالب کے تعلق سے تحریر کیا ہے۔ ''تبرکات غالب'' (نیرنگ، دہلی، جنوری 1933)، ''یادگار غالب'' (نیرنگ دہلی، اپریل مئی 1934) اور ''کلام غالب کا انتخاب کس نے کیا'' (الشجاع، کراچی، جلد 17، 1969) دستیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ تلاش ہنوز جاری ہے۔ کسی صاحب علم کو یہ مضامین دستیاب ہو جائیں تو از راہ کرم فرمائی مجھے ارسال کریں تاکہ اگلے شمارے میں اس خلا کو بھی پُر کیا جا سکے۔

اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ یہ کام استاد محترم ڈاکٹر سرور الہدیٰ کے مشورے سے عمل میں آیا۔ انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ امتیاز علی خاں عرشی کے ان مضامین کو جمع کیجیے جو ابھی تک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے ہیں۔ انھوں نے ان مضامین کی تلاش میں بھی بہت مدد کی ہے نیز اس کتاب کی ترتیب و تزئین اور اشاعت میں بھی ساتھ ساتھ رہے۔ میں ان کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ استاد محترم پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر عبدالرشید صاحب اور شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد ڈاکٹر احمد حسن نے کتاب میں

موجود فارسی عبارتوں کی قرات میں بہت مدد کی ہے۔ میں ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

استاد مکرم پروفیسر شہپر رسول صاحب کی بے کراں محبت اور بے پایاں شفقت میرے بیان سے باہر ہے۔ علمی اور ادبی مسائل کی تفہیم کے علاوہ بھی دیارِ غیر میں ان کا وجود مسعود میرے لیے ایک مربی کے مانند ہے۔ استاد محترم نے اپنی بے پناہ مشغولیت کے باوجود اس کتاب کے مسودے کو جا بجا بڑی توجہ اور دلچسپی سے دیکھا اور مفید مشوروں سے نوازا۔ یہ مشورے یقیناً میرے لیے علم و ادب کے لامتناہی میدان میں مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ استاد محترم کی محبتوں اور عنایتوں کا بے حد مشکور ہوں۔ یہاں اس بات کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ شہپر رسول صاحب اور پروفیسر اقتدار محمد خان، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ کی کوششوں سے ہی مجھے اس کتاب کو شائع کرنے کی اجازت ملی ہے۔

استاد محترم پروفیسر شہزاد انجم صاحب سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ان کی محبت اور شفقت ہمیشہ ساتھ رہی ہے۔ انھوں نے اس کتاب کی اشاعت میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ پروفیسر شہزاد انجم صاحب رامپور رضا لائبریری کے ممبر ہیں۔ ایک میٹنگ سے واپسی کے بعد انھوں نے ہی یہ خوش خبری سنائی کہ رامپور رضا لائبریری کی اشاعت کمیٹی نے اس کتاب کو رامپور رضا لائبریری سے شائع کرنا منظور کیا ہے۔ ناسپاسی ہوگی اگر میں پروفیسر حسن عباس صاحب، ڈائرکٹر رامپور رضا لائبریری، رامپور کا ذکر نہ کروں۔ اس کتاب کی اشاعت میں ان کی خاص دلچسپی رہی ہے۔ اکثر ان سے موبائل پر گفتگو ہوتی تو نہ صرف کتاب کے متعلق دریافت کرتے کہ مرحلہ کہاں تک طے ہوا بلکہ وہ برابر ہمت بھی بڑھاتے رہے۔ میں دونوں حضرات کا تہہ دل سے مشکور ہوں اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ میرے ان تمام اساتذہ کا سایہ تادیر مجھ پر قائم رکھے۔ شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تمام اساتذہ کا شکر گزار ہوں جو علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں برابر میرا حوصلہ بڑھاتے رہتے ہیں۔ دراصل شکریہ ادا کرنا تو رسمی چیز ہے، حقیقت یہ ہے کہ میں ان اساتذہ کے لیے اپنے جذبات کا اظہار کرنے سے قاصر ہوں۔

انتہائی ناسپاسی ہوگی اگر میں ان بزرگوں کا نام نہ لوں جو باقاعدہ اور رسمی طور پر میرے استاد نہیں رہے لیکن علم و ادب کی دنیا میں ان کی استادانہ حیثیت مسلم ہے۔ ان کی اسی مسلمہ حیثیت اور علم و ادب سے شغف کی وجہ سے مجھ ایسے ادب کے ادنیٰ طالب علم کو ان بزرگ

شخصیات سے ایک خاص تعلق خاطر ہے۔ نامور محقق جناب عابد رضا بیدار صاحب ایسی ہی شخصیات میں سے ایک ہیں، میری کتاب کی اشاعت کے تعلق سے انھوں نے جس فکرمندی کا اظہار کیا اس کے لیے صد شکر۔ میں امتیاز علی عرشی کے صاحب زادے ڈاکٹر ممتاز عرشی صاحب کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے نہ صرف مجھے ان مضامین کو ترتیب دینے کی اجازت دی بلکہ انھوں نے کتاب پر چند سطریں لکھنے کی میری دلی آرزو کو شرف قبولیت بخشا۔

اس کتاب کی ترتیب و تزئین میں ڈاکٹر محمد مقیم، ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی اور عابدہ اعظمی کا کئی طرح سے تعاون رہا ہے۔ محمد اکرام صاحب نے اپنی مصروفیتوں سے وقت نکال کر ان مضامین کو کمپوز کیا، جو بعض جگہ نہایت مخدوش حالت میں تھے اور بہ مشکل پڑھے جاتے تھے۔ ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کی لائبریری، دہلی یونیورسٹی کی لائبریری، اردو اکادمی دہلی کی لائبریری، رسالہ آج کل اردو (پبلی کیشنز ڈویژن)، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، رامپور رضا لائبریری رام پور، خدا بخش لائبریری پٹنہ اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کے اراکین کا شکریہ کہ انھوں نے مواد کی فراہمی میں میری مدد کی۔

اخیر میں والدین کا ذکر بھی ضروری ہے جن کی نیک تمنائیں کسی بھی قسم کے صلے کی خواہش سے ماورا ہوتی ہیں اور یہی بات ان کی تمناؤں کے خلوص کی معراج اور محبتوں کی نیر تاباں ہے۔ صلے کی پرواہ سے ماورا والدین کی یہ محبت ہمیشہ مجھے تقویت بخشتی رہتی ہیں۔

یہ کتاب علم و ادب کے ادنیٰ سے طالب اور تحقیق و جستجو کے متلاشی کی حقیر سی کوشش ہے۔ مدارج تحقیق کی تمام تر دقتوں کے باوجود میری یہ کوشش رہی ہے کہ یہ کتاب علم و ادب کی دنیا میں کسی قسم کا اضافہ ثابت ہوجائے یا کم از کم اپنی اہمیت کے پیش نظر کوئی مقام حاصل کر لے۔ مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ اپنی کل مساعی کے باوجود کتاب کی افادیت کو مزید تر کرنے کے لیے ابھی بہت گنجائشیں نکل آئیں گی۔ ان گنجائشوں اور امکانات پر میری نظر ہے، آئندہ طباعت میں انشاء اللہ اس کتاب کو مزید بہتر، پرمغز اور مفید مطلب بنانے کا عزم مصمم ہے۔

ڈاکٹر ثاقب عمران
اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول)
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ

14 اکتوبر 2017

ابّا مرحوم

ہمہ عالم گواہ عظمت اوست

برادرم ثاقب عمران صاحب نے مولانا عرشی (محترم ابا مرحوم) کے میرزا غالب پر لکھے گئے مضامین کو یکجا کر کے شائع کرنے کی اجازت کچھ عرصہ پہلے چاہی تھی مگر بہ سوئے اتفاق میری ہمشیرہ ڈاکٹر زہرہ عرشی یہ کام کر رہی تھیں، اس لیے میں نے معذرت کر لی۔ لیکن 'مرضی مولیٰ برہمہ اولیٰ' میری ہمشیرہ یہ کام مکمل نہ کر سکیں اور داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئیں۔ پروفیسر شہپر رسول صاحب اور ثاقب صاحب نے میرے عزیز پروفیسر اقتدار حسین خاں (جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی) کے توسط سے دوبارہ اس امر کی اجازت چاہی۔ ثاقب صاحب کی اس کاوش اور خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے انکار کیسے ہو سکتا تھا۔ یہ کاوش اُن کے علمی و تحقیقی ذوق کی نشان دہی کرتی ہے۔ اللہ ان کے اس ذوق کو قائم رکھے۔ آمین!

ثاقب صاحب مسودہ لے کر رام پور تشریف لائے اور مجھ سے یہ اصرار کیا کہ میں اس مجموعے کا دیباچہ لکھ دوں۔ ان کے اس حسن ظن پر مجھے دل ہی دل میں ہنسی آئی اور ندامت بھی ہوئی۔ ہنسی اس لیے آئی کہ انھیں میری بے بضاعتی کا اندازہ نہیں تھا اور ندامت اس لیے ہوئی کہ مجھے ان کے اس گمان کے عین مطابق ہونا ہی چاہیے تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ دیباچہ آپ یا شہپر رسول صاحب لکھیں، میں ایک مضمون لکھ دوں گا۔

اس اعتراف کے ساتھ کہ محترم ابا مرحوم کے علمی کاموں پر قلم اٹھانے کی علمی استعداد مجھ میں نہیں ہے۔ میں ابا مرحوم کے بارے میں کچھ اہل علم کی آراء اور ابا مرحوم کی شخصیت کے ان پہلوؤں کا ذکر کروں گا جو ابھی تک حلقۂ تحریر میں نہیں آئے یا اشارۃً آئے ہیں۔

یہ مجموعۂ مضامین میرزا غالب سے متعلق ہے اس لیے آراء کی ابتدا، میں بھی غالب پر کیے گئے کاموں سے کرتا ہوں۔

حبیب الرحمٰن خاں شیروانی اپنے مکتوب 14 و 15 مارچ 1938 میں لکھتے ہیں:

''اوّل شکریہ لطف نامے کا اس کے بعد 'مکاتیب غالب' کا۔ مکاتیب دیکھ رہا ہوں بڑی ادبی خدمت ہوئی۔ آپ کی دیدہ ریزی اور محنت اور آپ کے معاونوں کی خدمت لائق تحسین وشکر ہے۔ یہ کام رام پور میں ہی ہوسکتا تھا اور وہ بھی آپ کے نکتہ سنج ہاتھوں سے۔ آفریں بردست دیر بازوے تو۔''

''رات 'مکاتیب غالب' صفحہ 108 تک پڑھ ڈالی۔ آپ کی کوشش بلیغ کا دل نے مزید اعتراف کیا۔''

اپنے خط (25 ستمبر 1947) میں لکھتے ہیں:

''فرہنگ غالب'' کا نسخہ پہنچا۔ زہے الطاف۔ شکر الطاف قبول ہو۔ غالب آپ کے ذوق خاص سے فیض یاب ہے نیز فارسی ادب۔ ورنہ کون غالب و فارسی ادب کا جویا ہے۔ فرہنگ غالب پر نظر ڈالی۔ بہت فیض رساں تالیف ہے۔ پہلی نظر میں مجھ کو یہ سبق ملا کہ 'جال' بمعنی 'رام' فارسی بھی ہے ورنہ صرف اس کے ہندی ہونے کا علم تھا۔''

مولانا ابوالکلام آزاد تحریر فرماتے ہیں:

''مکاتیب غالب، کی اشاعت پر ریاست رام پور مستحق تبریک ہے۔ اگر غالب کے رقعات کا یہ مجموعہ شائع نہ ہوتا تو ان کی زندگی کے متعدد گوشے تاریخ کی روشنی سے محروم رہ جاتے۔ عرشی صاحب نے ترتیب کے ساتھ بحث ونظر کا فریضہ بھی مورخانہ قابلیت کے ساتھ انجام دیا ہے۔''

علامہ نیاز فتح پوری ماہنامہ 'نگار' 1943 میں لکھتے ہیں:

''مولانا عرشی عرصے سے غالب کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام مٹائے بغیر نہ رہیں گے۔ کسی شخص کے متعلق اتنا کچھ لکھنا کہ پھر کچھ لکھنے کو باقی نہ رہے، اس کا نام مٹانا ہی ہے۔''

سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نسخۂ عرشی (دیوانِ غالب) کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

''جب ان کا (مولانا عرشی) مرتبہ دیوانِ غالب منظر عام پر آیا تو ایسا معلوم

ہوا کہ عرشی صاحب نے نہ صرف نظم طباطبائی، حسرت موہانی، آسی، سُہا،
مفتی انوارالحق، مالک رام اور آغا محمد باقر وغیرہ کے مرتب کردہ دیوان
اور ان کی شرحوں بلکہ چغتائی ایڈیشن اور اکرام کے غالب نامے کی امتیازی
خصوصیات سے بھی ہماری نظروں کو ہٹا کر اپنی طرف مائل کرنے پر مجبور
کردیا ہے۔"

سید صاحب محترم ابا مرحوم کی غالب کے ساتھ شیفتگی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"تراوشِ خوں نابہ کو ظہور میں لانے کے لیے ایک لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔
عرشی صاحب کو یہ لگن غالبیات کے ساتھ ہے۔ غالب کی ہر عبارت، ہر
اشارت، ہر ادا ان کے لیے بلائے جاں ہے، اگرچہ وہ اس کے سہارے نہ
صرف جیتے ہیں بلکہ ہمیشہ جیتے رہیں گے۔"

آمنہ مشفق صاحبہ غالبیات پر ابا کی مہارت کا ذکر ان الفاظ میں کرتی ہیں:

"غالبیات کے ماہر کی حیثیت سے بھی مولانا عرشی کا مقام و مرتبہ بلند ہے۔
یوں تو اس میدان میں بہت سے اہل قلم نے دادِ تحقیق دی ہے، لیکن مولانا
عرشی کا کام کیفیت وکمیت، نوعیت وافادیت ہر اعتبار سے منفرد ہے۔"

ظفر احمد صدیقی صاحب کا خیال ہے کہ:

"مولانا عرشی نے تدوین خطوطِ غالب کو نقشِ اوّل میں ہی جس مقام تک
پہنچا دیا، ان کے بعد کے محققین و ماہر غالبیات پیہم کوششوں کے بعد ان سے
بہتر تو دور کی بات، ان جیسا بھی کوئی نقش تیار نہ کر سکے۔"

ناز انصاری صاحب (ماہنامہ 'علم وفن' دہلی) رقم طراز ہیں:

"اس برصغیر میں جو ماہر غالبیات ہیں یا جن لوگوں کو غالب پر اتھارٹی قرار دیا
جاسکتا ہے یا غالب شناس کہا جاسکتا ہے ان میں مولانا عرشی کا نام بڑی
اہمیت کا حامل بلکہ سرِ فہرست ہے۔ ذکر غالب ہو اور محفل میں مولانا عرشی نہ
ہوں تو محفل بے رنگ رہے گی۔ غالب پر کوئی کتاب لکھی جائے اور اس میں
عرشی صاحب کا کوئی Contribution نہ ہو تو اس کتاب کی کیا قیمت۔
غالب پر اگر کوئی دستاویز تیار کی جائے اور اس میں مولانا عرشی کا حصہ نہ ہو تو

میرے نزدیک وہ دستاویز خام ہوگی۔''

ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب 'تفسیر غالب' (1971) کا انتساب محترم ابا مرحوم کے نام ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے:

''کلامِ غالب کے سب سے بڑے ماہر اور اردو کے مستند محقق مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے نام، جو حالی کی طرح منکسرالمزاج، شریف اور مرنجاں مرنج انسان ہیں۔ جن کے نسخۂ عرشی پر یہ شرح مبنی ہے۔''

اپنے دیباچے میں ڈاکٹر جبین غالب کے قلم زد کلام پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''غالب کا یہ کلام اردو شاعری کے ذخیرے میں سب سے زیادہ دقیق اور مغلق ہے اس کے معنی تلاش کرنا ناکوں چنے چبانا ہے اور وہ بھی لوہے کے۔ شرح کی ابتدا میں، میں نے عرشی صاحب کی خدمت میں تقریباً دس شعر بھیجے اور ان کے مفہوم کے بارے میں رہبری چاہی۔ موصوف نے کمالِ لطف سے ان کے معنی عنایت کیے، ان میں سے بعض سے میں مطمئن ہوا بعض کے بارے میں کسی قدر شبہ رہا۔ ان کے علاوہ میں نے چند دوسرے چوٹی کے محققین سے مل کر بعض دقیق اشعار کے حل معنی میں مدد چاہی۔ ہاتھ کے ہاتھ وہ ایک بھی شعر کے معنی کی گتھی نہ سلجھا سکے۔''

ڈاکٹر گیان چند جین اپنی کتاب خود لے کر رام پور تشریف لائے اور محترم ابا کو پیش کی۔ (اپنے قیام رام پور کے دوران انھوں نے یہ بتایا کہ انھوں نے ابا مرحوم کے علاوہ اس دور کے سبھی ماہر غالبیات کو بھی دس اشعار بھیج کر ان کے معنی دریافت کیے تھے لیکن کسی نے بھی ان کے خط کا جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد وہ ان سے ذاتی طور سے ملے تھے۔)

پروفیسر نذیر احمد (سابق صدر شعبۂ فارسی) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ 'غالب نامہ' جنوری 1992 کے اداریے میں لکھتے ہیں:

''جناب امتیاز علی عرشی صاحب بعض اعتبار سے ہندوستان کے اکثر محققین سے ممتاز ہیں۔ ہندوستان میں ان کی تمام شہرت اردو محقق اور ماہر غالبیات کی حیثیت سے ہے لیکن یہ محض تصویر کا ایک رخ ہے، وہ فارسی اور عربی دونوں زبانوں کے زبردست عالم اور عظیم محقق و دانش مند تھے اور اس تخصیص

> کے اعتبار سے دو ایک محققین شاید ان کے ہم پلہ ہوں...... بہرحال جب ہماری نظر مولانا عرشی کی طرف جاتی ہے تو ہمارا سرِ افتخار بلند ہو جاتا ہے...... صحیح مسلم کے ایک قدیم نسخے کو روشناس کرانے میں عرشی صاحب نے جس محققانہ صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے وہ ستائش سے مستغنیٰ ہے...... فارسی میں بھی ان کی تحقیق کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ خیام پر انھوں نے جس بالغ نظری سے بحث کی ہے وہ خیام شناسی میں معتد بہ اضافے کا موجب ہے۔ تاریخ محمدی کا انتقادی متن بھی بڑی قابلیت سے شائع کیا...... ماہرین غالبیات میں ان کا پایہ بہت بلند ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عرشی صاحب پشتو زبان سے بھی بخوبی واقفیت رکھتے تھے، انھی وجوہ سے ان کی تحقیق میں جو عمق ہے وہ کم لوگوں کے حصے میں آسکا ہے۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی (فاران، فروری 1983) نے محترم ابا مرحوم کو ان الفاظ میں یاد فرمایا ہے ''مولانا عرشی صاحب کا اوڑھنا بچھونا علم تھا اور بقول شیخ سعدیؒ'' پۓ علم چوں شمع باید گداخت'' کے مصداق تھے، اب ان کی طرح خاموشی اور سچی لگن کے ساتھ صلہ وستائش کی تمنا کیے بغیر علم کی خدمت کرنے والے کم یاب ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو عالم آخرت کے بلند مدارج عطا فرمائے۔ آمین!

پروفیسر آمنہ خاتون نے 17 نومبر 1974 کو (ایشیا دہلی، نہرو سپلیمنٹ) اپنے مضمون 'مولانا عرشی حق وصداقت کی قابل رشک مثال' میں محترم ابا مرحوم کی تحقیق کی دنیا میں حق و صداقت پر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور اس عہد کے دوسرے محققین سے موازنہ کیا ہے۔ وہ دوسرے محققین سے شاکی ہیں کہ ان کے کاموں میں کمیوں کی نشاندہی کرنے پر کسی نے بھی شکریہ ادا کرنا تو درکنار، اعتراف بھی نہیں کیا۔ انھوں نے اس مضمون میں محترم ابا مرحوم کے ایک خط (17 جون 1946) کا یہ اقتباس نقل کیا ہے:

> ''میں بہرحال انسانی سہو ونسیان کو ایک پائیدار اور رواں دواں حقیقت مانتا ہوں اور ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی رکھتا ہوں کہ خدا نے اپنے فیض کے سوتے بند نہیں کیے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جب کچھ لکھتا ہوں، اپنے مخلص احباب سے خواہش کرتا ہوں کہ مجھے اغلاط پر متنبہ کریں اور خدا نے جو علم عطا کیا ہے اس

کی زکوٰۃ اس طرح ادا کریں کہ نئی معلومات سے میں بھی بہرہ یاب ہوجاؤں۔"

ڈاکٹر آمنہ خاتون نے ابا مرحوم کی ایک کتاب 'دستور الفصاحت' پر اپنی رائے ایک مضمون کی شکل میں ابا مرحوم کو بھیجی تھی جس میں اس کتاب کی بعض کمیوں کے بارے میں لکھا تھا۔ ابا مرحوم نے ان کا بے حد شکریہ ادا کیا اور اس مضمون کو خود رسالہ برہان دہلی میں شائع کروایا۔ پروفیسر آمنہ خاتون (مرحومہ) نے اپنے اس مضمون کا اختتام ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے:

"جن لوگوں میں اپنی غلطی تسلیم کرنے کی قابلیت نہیں ہوتی ان کا اپنے فن میں ترقی کرنا ناممکن ہے اور جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ کسی فن میں ترقی کے اس درجے پر پہنچ چکے ہیں جس سے اونچا درجہ حاصل نہیں ہوسکتا وہ نہ حالی کے مخاطب ہیں، نہ مولانا عرشی کے اور نہ میرے۔"

محترم ابا بنیادی طور سے عربی زبان و ادب کے عالم تھے۔ عربی زبان میں ان کے تحقیقی کارناموں کی اہل عرب اور یوروپ کے عربی اسکالروں نے بے حد تعریف کی ہے۔ یہاں ان کی ایک تحقیقی کتاب 'تفسیر سفیان ثوری' پر چند علماء کی آراء کا اردو ترجمہ حاضر خدمت ہے:

1. شیخ محمد بہجۃ البیطار (علامہ الشام)

"حق بات یہ ہے کہ میں نے مشرق و مغرب میں کوئی ایسی کتاب نہیں دیکھی جو پورے موضوع کی شمولیت کے اعتبار سے اتنی وسیع اور اس سے زیادہ پختہ ہو اور (جناب علامہ امتیاز علی عرشی) کی تصنیفات کی نظیر پورے عجم میں نہیں ملتی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ اپنی فصاحت میں امتیازی حیثیت کی حامل اور سہل ممتنع کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔"

2. الاستاذ قاسم محمد الرجب (بغداد)

"اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اس جیسی خدمت کو انجام دینے والا اس زمانے میں نہیں دیکھا جس زمانے میں علم اور علماء دونوں کی قلت پائی جاتی ہے۔"

3. الامام الاکبر دکتور عبدالحلیم محمود، شیخ الازہر، قاہرہ

"اور یہ حقیقت ہے کہ استاذ امتیاز (امتیاز علی عرشی) نے اس نسخے کی بے حد

عمدہ تحقیق کی ہے۔ یہ کتاب پختہ علمی عمل کے لیے ایک مثالی تصویر ہے اور یہ ایک ایسی تحقیق ہے جو علم کی وسعت، تحقیق میں توقف و مشقت و دشواریوں پر ثابت قدمی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس جہد صادق اور اس شاندار عمل کے راستے میں دشواریوں کو برداشت کرنے میں آپ کی ثابت قدمی پر آپ کو اس کی بہترین جزا عطا فرمائے۔

مغربی محققین عام طور سے مشرقی محققین کے تحقیقی کاموں کو نہیں گردانتے لیکن ابا مرحوم کے اس تحقیقی کارنامے سے وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ کیمبرج یونیورسٹی کے عربی کے پروفیسر کو یہ لکھنا پڑا۔

4. پروفیسر مونٹگری واٹ (Montguary Watt) کیمبرج یونیورسٹی

اپنے مکمل توصیفی تبصرے کے آخر میں لکھتے ہیں ''خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مغربی محققین کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اس کام کو پسند نہ کریں اور حیرت زدہ نہ رہ جائیں اور اس کے اندر پوشیدہ اُس علم و معرفت کے گرویدہ ہو جائیں جو مداومت اور مہارت سے متصف ہے۔''

چند عربی علماء کی ابا مرحوم کے کاموں پر آراء کا اختتام ان کے عربی کے مشہور زمانہ استاد سابق صدر شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، جناب عبدالعزیز میمن کی محترم ابا کے بارے میں رائے پر کرنا مناسب ہوگا:

''عرشی صاحب اور ان کے علمی مشاغل اوروں کے لیے مشعل ہدایت اور میرے لیے باعثِ فخر و مباہات ہیں۔ اللہ ان کی عمر میں برکت دے..... اس امر کا اظہار اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جناب عرشی صاحب نے اردو، فارسی، عربی، بلکہ پشتو کی بھی جو خدمت کی ہے وہ اس آخری دور میں اپنی مثال نہیں رکھتی۔ اگر مادرِ ہند و سندھ ایسے دو چار فرزند اور جن ڈالتی تو آج ہماری بے مائگی کا یہ علم نہ ہوتا۔ ان کی زندگی ہمارے ملک کے لیے نمونۂ عبرت ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

میری زندگی کی تین چار پیداواروں میں ان کی ذات صف اوّل میں ہے۔ اس سے میرا سر بلند ہے اور رہے گا مگر فی الواقع منقبت انھی کی ہے کہ اپنی

مسلسل کوشش اور ایثار سے اس مقام کو پہنچے۔ (14 دسمبر 1962)

محترم ابا مرحوم کے بارے میں تمام اہل علم اور ان سے ملنے والا ہر شخص بیک زبان ان کے منکسر المزاج ہونے کا معترف ہے۔ اللہ عز و جل نے ان کو ایسا لہجہ اور شیریں زبان سے نوازا تھا کہ ان سے ملاقات کرنے والا ہر شخص ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ ان سے ملاقات کرنے والے مختلف مذاہب اور مسالک کے لوگ اپنے عقائد کے خلاف سن کر بھی ان سے بدظن نہ ہوتے تھے۔ خودنمائی تو ان کو چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ انھوں نے ادبی گروہ بندیوں اور تحریکوں سے ہمیشہ خود کو دور رکھا، بالفاظ دیگر وہ اپنے علمی کاموں میں اتنے مستغرق رہتے کہ ان فضول باتوں کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ اپنی علمیت پر گھمنڈ اور اس کا اظہار ان کی عادت نہ تھی۔ جب کوئی ملنے آتا تو اس بات کا خیال رکھتے کہ اس کے ذوق کی بات کریں اور اس سے وہ باتیں پوچھیں جس کا اس کو علم ہو۔ اس طرح ہر شخص ان سے گفتگو کرتے ہوئے اپنے آپ کو ابا مرحوم سے برتر سمجھتا اور کھل کر گفتگو کرتا۔ میں رضا ڈگری کالج میں علم نباتات کا استاد تھا، اکثر اس موضوع پر بات کرتے اور مجھے پروفیسر صاحب کہہ کر مخاطب کرتے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ اور اس کی کارسازی پر ایسا پختہ یقین میں نے اپنی زندگی میں کسی شخص میں نہیں دیکھا۔ (البتہ پڑھا ضروری ہے) کبھی کسی انسان سے کچھ نہیں مانگا، صرف اور صرف اللہ سے مانگا اور حقیقت یہ ہے کہ جو انھوں نے اللہ سے مانگا، وہ اللہ نے ان کو عطا بھی کیا۔ ہم لوگوں (اپنی اولاد) سے بھی ہمیشہ فرماتے، اللہ نے یہ دو ہاتھ اپنے آگے پھیلانے کو دیے ہیں تو دوسروں کے آگے کیوں پھیلائے جائیں۔

محترم ابا مرحوم کو دولت، زمین، جائیداد اور دنیاوی آسائشوں اور لذتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ کرنل بشیر حسین زیدی صاحب (مرحوم) سابق وزیر اعلیٰ ریاست رام پور نے ابا مرحوم کے بارے میں، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب سے کہا تھا "جب سے میں چیف منسٹر ہوا ہوں کسی افسر شعبہ نے مجھے اتنا دق نہ کیا ہوگا، مجھ سے اتنے مطالبے نہ کیے ہوں گے جتنے عرشی صاحب نے مگر سب کتب خانے کے لیے، اپنی ذات کے لیے ایک بھی نہیں۔"

ریاست کے دور میں کتب خانہ (موجودہ عمارت کے عقب میں) ایک چھوٹی عمارت میں تھا اور موجودہ عمارت میں دربار لگتا تھا۔ انضمام ریاست کے موقعے پر ابا مرحوم نے نواب

رضا علی خاں اور کرنل زیدی کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ 'حامد منزل' (موجودہ عمارت) کتب خانے کو دے دی جائے۔ ابتدا میں دونوں حضرات اس کے لیے تیار نہ تھے کیونکہ کتب خانہ نواب صاحب کی ذاتی ملکیت تھی۔ ان کے خیال میں مرکزی حکومت اتنی بڑی عمارت نواب صاحب کو نہ دے گی کیونکہ وہ خاص باغ پیلیس، کوٹھی بے نظیر، کوٹھی شاہ آباد اور زرعی فارم وغیرہ اپنے تصرف میں لینا چاہتے تھے۔ لیکن ابا کے مسلسل اصرار پر نواب صاحب تیار ہو گئے اور انضمامی معاہدے میں اس کو شامل کر لیا گیا۔ انضمام کے بعد ریاست کی تمام عمارات یوپی سرکار کو منتقل کر دی گئیں۔ یوپی کی حکومت اس عمارت کو لائبریری کو دینے میں ٹال مٹول کرتی رہی مگر ابا مرحوم کی مستقل کوششوں کے بعد بالآخر 1957 میں کتب خانہ اس عمارت میں منتقل ہو گیا۔

ابا مرحوم کی تجویز پر کتب خانے کا نام رضا لائبریری رکھا گیا۔ رضا لائبریری کی انتظامیہ کمیٹی بنائی گئی جس کے صدر نواب رضا علی خاں، سکریٹری ضلع کلکٹر رام پور اور کرنل زیدی تاحیات رکن نامزد کیے گئے۔ یوپی کی حکومت کی جانب سے 48 ہزار روپے سالانہ کی امداد مقرر ہوئی۔

جب یہ طے ہو گیا کہ رضا لائبریری حامد منزل میں منتقل ہو گی تو کرنل زیدی صاحب نے جن کو ابا مرحوم سے بہت انسیت تھی یہ تجویز رکھی کہ حامد منزل سے متصل عمارت مچھلی بھون ابا مرحوم کے نام الاٹ کر دی جائے تو ابا مرحوم نے یہ معروضہ کیا کہ اس عمارت کے رکھ رکھاؤ کے لیے جو مالی استعداد کی ضرورت ہو گی وہ مجھ میں نہیں ہے، میں سادہ زندگی گزارنے کا عادی ہوں اور اپنے موروثی مکان میں ہی خوش ہوں۔

انضمام ریاست کے بعد رام پور کے پہلے ضلع کلکٹر چورامنی صاحب ہوئے۔ وہ بھی ابا مرحوم سے بے حد متاثر ہوئے۔ ضلع رام پور کی بلاسپور تحصیل میں بانس کا بہت بڑا جنگل تھا۔ انھوں نے اس کو تقسیم کر کے بانٹنا شروع کیا۔ ایک روز ابا مرحوم کو بلا کر کہا، عرشی صاحب میں نے جنگل کا ایک ہزار بیگھا حصہ آپ کے نام الاٹ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ابا مرحوم ان کے شکر گذار ہوئے اور کہا آپ کے علم میں ہے کہ مجھے لکھنے اور پڑھنے سے فرصت ہی نہیں ملتی، کاشتکاری مستقل وقت چاہتی ہے اور میں کاشتکاری سے نابلد ہوں۔ آپ میرے نام زمین الاٹ کر دیں گے تو میں تو کبھی وہاں جا نہیں سکوں گا، کوئی دوسرا اس پر قبضہ کر لے گا بہتر یہ ہے کہ آپ یہ زمین کسی ایسے شخص کو الاٹ کر دیں جو اس پر کاشت کاری کر سکے۔

مرکزی حکومت ہر سال قدیم زبانوں (سنسکرت، عربی، فارسی، تامل وغیرہ) کے علماء حضرات کو توصیفی سرٹیفکیٹ اور سالانہ مالی عطیہ دیا کرتی ہے۔ اس توصیفی سرٹیفکیٹ کو حاصل کرنے کے لیے ایک درخواست فارم بھرا جاتا ہے جس میں درخواست گذار کو متعلقہ زبان میں اس کے ذریعے کیے گئے کاموں کی تفصیل کا اندراج کرتے ہوئے لکھنا ہوتا ہے کہ میں متعلقہ زبان کا عالم ہوں۔ 1959 کا واقعہ ہے، ابا مرحوم علی گڑھ کسی انجمن کی میٹنگ میں تشریف لے گئے اور اپنے مخلص دوست سید حامد حسین جیلانی صاحب (مرحوم) کے دولت خانے، 2، ڈگی روڈ پر قیام کیا۔ پروفیسر عبدالعلیم (سابق صدر شعبۂ عربی و وائس چانسلر) ابا سے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ اسی دوران علیم صاحب نے وہ فارم ابا مرحوم کو دے کر کہا مولانا آپ اس پر صرف دستخط کر دیں، بقیہ فارم میں خود بھرلوں گا۔ ابا مرحوم نے اس فارم کو پڑھا اور بغیر دستخط کیے ہوئے یہ کہہ کر واپس کر دیا۔ علیم صاحب میں عربی زبان کا طالب علم ہوں، عالم نہیں۔ اگر عربی عالم کا نام تجویز کرنے والی کمیٹی یہ سمجھتی ہے کہ مجھے راشٹر پتی ایوارڈ ملنا چاہیے تو وہ خود میرا نام تجویز کرے۔ میں کیوں درخواست دوں۔ پروفیسر علیم اس کمیٹی کے صدر تھے۔ مجبور ہو کر 1972 میں کمیٹی نے مرکزی سرکار کو ابا مرحوم کے اعتراضات سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا کہ مولانا عرشی سے کمتر علماء کو یہ ایوارڈ دیا جا چکا ہے اس لیے درخواست فارم بھرنے کی بندش سے مولانا عرشی کو مستثنیٰ کر دیا جائے۔ مرکزی سرکار نے کمیٹی کی سفارش قبول کرتے ہوئے صرف ابا مرحوم کے لیے یہ بندش ہٹا دی اور عربی عالم کا راشٹر پتی ایوارڈ دیا۔ اب بھی کسی عالم کو بغیر درخواست فارم بھرے ہوئے راشٹر پتی ایوارڈ نہیں دیا جاتا۔ ابا مرحوم نے 12 سال تک 5000 روپے سالانہ کا نقصان برداشت کیا لیکن اپنے اصولوں سے سمجھوتا نہیں کیا۔

عربی اور فارسی کیٹلاگ تیار کرنے کے لیے مرکزی حکومت نے ایک اسکیم کے تحت مالی امداد دی تھی، عربی کیٹلاگ ابا مرحوم تیار کر رہے تھے اور فارسی کا کیٹلاگ بھائی جان (عرشی زادہ) جب وہ امداد وصول ہوئی تو ابا مرحوم نے ساری رقم رضا لائبریری کو دے دی اور بھائی جان سے بھی دلوا دی۔ اس وقت لائبریری مالی بحران کا شکار تھی کیونکہ یو پی حکومت سے ملنے والی 48 ہزار کی مالی امداد سے ملازمین کو صرف چھ ماہ کی تنخواہ ہی ملا کرتی تھی۔ اتفاق سے اس دن میں بھی بھائی جان کے پاس بیٹھا تھا۔ شام کو جب ہم گھر واپس لوٹے تو چائے کی میز پر

میں نے یہ بات اپنی والدہ کو بتائی۔ میری والدہ نے ابا مرحوم سے کہا کہ آپ نے اپنی رقم لائبریری کو دے دی لیکن میرے بیٹے کی رقم کیوں دلوادی۔ ابا مرحوم نے مسکراتے ہوئے کہا، میں نے اپنے بیٹے کی رقم دلوائی ہے، پھر فرمایا ہم دونوں نے یہ کام لائبریری کے اوقات میں کیا تھا جس کی ہم تنخواہ لیتے ہیں، اس لیے اس رقم کی حقدار لائبریری ہی تھی۔

مشہور عربی عالم جناب آصف علی اصغر فیضی صاحب (جن کے نام ابا مرحوم نے نسخۂ عرشی کا انتساب کیا ہے) کو کسی تحقیقی اسکیم کے تحت حکومت ہند کی جانب سے وظیفہ ملا تھا۔ اس کام کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے وقتاً فوقتاً علمی مدد لی تھی۔ اس کام کی تکمیل کے بعد جب وہ وظیفہ ملا تو اصغر صاحب نے اپنے خط میں شکریہ ادا کرتے ہوئے ابا مرحوم کے نام ایک چیک بھی منسلک کرتے ہوئے لکھا کہ میں آپ کے مزاج سے واقف ہوں، آپ کی مدد کے بغیر یہ کام مکمل نہ ہوسکتا تھا میری دلی خواہش ہے کہ آپ اس چیک کو قبول کرلیں۔ ابا مرحوم نے جواب میں شکریے کا خط لکھتے ہوئے تحریر فرمایا ''میں نے آپ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے آپ کے چیک کو محفوظ کرلیا ہے تا کہ میری آنے والی نسل یہ جان سکے کہ آپ جیسے عالم میرے قدر دان رہے ہیں۔''

میری شادی کے موقع پر ابا مرحوم کے دوستوں کو دعوت نامے ارسال کیے گئے تھے۔ سبھی نے مبارکباد کے خطوط لکھے۔ جناب مالک رام صاحب نے مبارکباد کے ساتھ -/100 روپے کا چیک بھی بھیجا۔ میں نے ابا مرحوم سے پوچھا کہ اس چیک کا کیا کروں، فرمایا اگر بنک میں جمع کرو گے تو اس کی قیمت صرف -/100 روپے ہوگی اور اپنے پاس رکھو گے تو یہ بیش قیمت رہے گا کیونکہ یہ مالک رام صاحب کا چیک ہے۔

ابا مرحوم کو 1945 میں ایران، افغانستان اور عرب کی ثقافتی سفارت پیش کی گئی۔ اس وقت لائبریری میں ابا مرحوم کی تنخواہ -/250 روپے ماہوار تھی اور سفیر کی تنخواہ -/2500 روپے ماہوار۔ ابا مرحوم وہ تقرر نامہ لے کر دادا مرحوم کے پاس گئے۔ دادا مرحوم نے تقرر نامہ پڑھ کر ابا مرحوم کو مزید دنیاوی ترقیوں کی دعائیں دیتے ہوئے فرمایا، بیٹے اب میرا آخری وقت ہے، میرا دل چاہتا ہے کہ میری آخری سانس تمہارے ہاتھوں میں نکلے۔ ابا مرحوم نے سفارت قبول کرنے سے انکار کردیا۔ دادا مرحوم کا انتقال ابا کے ہاتھوں میں ہوا۔ وہ اس دنیا کو یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے ''بیٹے اللہ تجھے دونوں جہان کا بادشاہ کرے۔''

ریاست جموں و کشمیر نے ابا مرحوم کو کشمیر میوزیم کی ڈائرکٹر شپ کی پیش کش کی جو انھوں نے قبول نہیں کی۔

خدا بخش لائبریری کو جب مرکزی حکومت نے اپنی تحویل میں لیا تو اس کے ڈائرکٹر کے انتخاب کے لیے ایک کمیٹی بنائی جس کے صدر خواجہ غلام السیدین صاحب تھے۔ انھوں نے ابا مرحوم کو خط لکھا کہ خدا بخش لائبریری کو آپ کی ضرورت ہے۔ ابا مرحوم نے جواب میں شکریے کا خط لکھتے ہوئے تحریر کیا کہ کیا آپ کی نظر میں رضا لائبریری کو اب میری ضرورت نہیں ہے۔ خواجہ صاحب نے خط کے جواب میں لکھا ''یہ خدا بخش لائبریری کی بدقسمتی ہے کہ آپ نے وہاں جانا پسند نہ کیا اور خوش قسمتی ہے رضا لائبریری کی کہ آپ اس سے الگ نہیں رہنا چاہتے۔ یہ ملحوظ رہے کہ خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر کی تنخواہ رضا لائبریری کے ڈائرکٹر سے کئی گنا زیادہ تھی کیونکہ وہ مرکزی ادارہ ہوگئی تھی اور رضا لائبریری مالی بحران کا شکار تھی۔

ابا مرحوم نے ہمیشہ ہر شخص کو عزت دی۔ سلام کرنے میں ہمیشہ پہل کی۔ مہمان اور رشتے دار چاہے عمر میں چھوٹے ہوں یا بڑے جب واپس جاتے تو ان کے ساتھ دروازے تک جاتے اور اللہ حافظ و ناصر کہا کرتے۔ اسی طرح انھیں عزت نفس بھی پسند تھی۔ رام پور ایک ریاست تھی اور نواب کی شخصی حکومت تھی۔ ابا مرحوم نواب صاحب کی رہائش گاہ پر سال میں ان کی سالگرہ پر مبارکباد دینے جاتے اس کے علاوہ جب تک نواب صاحب نہ بلائیں نہ جاتے۔ جبکہ دوسرے افسران چاپلوسی کرنے برابر حاضر ہوتے۔ نواب رضا علی خاں کو بھی یہ بات محسوس ہوئی اور ایک روز نواب صاحب نے ابا مرحوم سے کہہ ہی دیا ''عرشی تم تو میرے پاس اس وقت ہی آتے ہو، جب میں بلاتا ہوں'' ابا مرحوم نے بڑا خوبصورت جواب دیا۔ ''سرکار میرے پاس تو فضول وقت بہت ہے مگر سرکار کا وقت تو بہت قیمتی ہے۔'' نواب صاحب مرحوم اس جواب پر مسکرائے۔ ابا مرحوم نے اپنی روش قائم رکھی۔

میں نے اپنی زندگی میں ابا مرحوم کے علاوہ کوئی ایسی ہستی نہیں دیکھی جس نے اپنے تمام رشتوں میں ایسا توازن رکھا ہو۔ والدین کی عظمت اپنی جگہ، زوجہ کا مرتبہ اپنی جگہ، اعزا سے تعلق مشفقانہ اپنی جگہ، دوستوں سے تعلقات کے مدارج اپنی جگہ، اولادوں سے محبت و شفقت اپنی جگہ، اور لطف یہ ہے کہ سب کو اپنے مقام اور دوسرے رشتے کا مقام کا اندازہ تھا۔ کوئی رشتہ بھی دوسرے رشتے کی حد میں داخل نہ ہو سکا اور ان میں سے کبھی کوئی اس بات کا شاکی نہ ہوا

کہ ابا مرحوم نے اس کی اہمیت کی ان دیکھی کی ہو۔ اس کے برخلاف ہر ایک ان کا گرویدہ تھا۔ ان کے افسران اور ماتحت نہ صرف ان کا احترام کرتے بلکہ ان سے محبت کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے کسی ماتحت کو کبھی ڈانٹا تک نہیں لیکن ماتحتوں پر رعب اتنا تھا کہ اگر وہ اپنے چپراسی کو بھیج کر بلاتے تو وہ ان کے کمرے میں خوف زدہ گھستا تھا۔ کتب خانہ جس وقت بند ہوتا تو سارے ملازمین دروازے پر کھڑے ہوتے اس وقت ابا مرحوم ہر ایک سے فرداً فرداً اس کا حال پوچھتے اور کہتے کہ کوئی پریشانی ہو تو بتائیں۔

ابا کی والدہ کا انتقال ہوا تو ابا کی عمر ڈھائی سال کی تھی۔ ان کا بچپن ماں کی شفقت و محبت سے محروم رہا۔ دوسری والدہ نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا لیکن قدرتی محبت جو اپنی اولاد سے ہوتی ہے کہاں سے لاتیں۔ ابا ہمیشہ ان کا ذکر بھلائی کے ساتھ ہی کرتے۔

ابا مرحوم کی یہ عادت تھی کہ وہ کسی سے کچھ مانگتے نہیں تھے۔ حد یہ تھی کہ اپنی زوجہ سے بھی۔ میں نے کبھی ان کو کھانا مانگتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ یہ معمول تھا کہ جب ہماری والدہ ان سے کھانے کے لیے پوچھتیں تو وہ مسکرا کر کہتے، بیوی اگر بھوک لگ رہی ہے تو چلو کھائے لیتے ہیں۔ میری والدہ بھی ان کی اس عادت سے واقف تھیں چنانچہ ہر تیسرے دن وہ ان کے کپڑے نکال کر رکھ دیتی تھیں۔ ایک روز گھر پر میرے ماموں، مولانا اسحٰق النبی خاں صاحب، میرے خالو مولانا عبدالسلام خاں صاحب (سابق پرنسپل مدرسۂ عالیہ) ابا کے ساتھ محو گفتگو تھے، میرے ماموں نے ابا مرحوم سے پوچھا، امتیاز بھائی، یہ آپ کی نہ مانگنے کی عادت کیسے پڑی۔ ابا مرحوم نے کہا یہ عادت 'بی' (اپنی دوسری والدہ کو ابا 'بی' کہا کرتے تھے) نے ڈلوادی۔ میرے خالو نے پوچھا وہ کیسے؟ ابا نے بتایا 'بی' ہمیشہ مغرب کے بعد سب سے پہلے مجھے کھانا کھلواتیں۔ ایک روز مغرب کے وقت گھر میں مہمان تھے اور 'بی' ان کے پاس بیٹھی تھیں۔ میں بچہ تھا، مہمانوں کا کیا لحاظ کرتا۔ میں نے بی سے کھانا مانگا۔ بی نے کہا '' کیسے پٹھان ہو کہ مانگتے ہو، بھوک برداشت نہیں کرسکتے۔ یہ بات میرے دل میں ایسی سرایت کرگئی کہ میں نے اس کے بعد نہ صرف 'بی' سے کچھ مانگا نہ کسی اور سے۔ گھر میں اپنے کام خود ہی کرتے۔ آخری عمر میں بیماریوں اور کمزوری کی وجہ سے زیادہ چل پھر نہیں سکتے تھے ایک روز شام کو شدید گرمی تھی، ابا کو پیاس لگی، میں ان کے سامنے بیٹھا تھا، مجھ سے کہا مناج میاں کیا تمھیں پیاس نہیں لگ رہی ہے؟ میں سمجھ گیا اور ایک گلاس پانی لاکر ابا مرحوم کو پلایا۔

اپنی دوسری والدہ کی آخری عمر میں ایسی خدمت کی کہ سگی اولاد بھی نہ کر سکے گی۔ ابا کی دوسری والدہ سے ایک بھائی امانت علی خاں صاحب تھے۔ وہ تقسیم ہند کے بعد ابا مرحوم کے بے حد روکنے کے باوجود پاکستان چلے گئے۔ ابا مرحوم نے دادی مرحومہ کے دونوں مکان اور کاشت کی زمین فروخت کر کے چچا کو پاکستان بھجوادی۔ اس کے علاوہ پاکستان میں شائع ہونے والے مضامین اور کتابوں کی رائلٹی بھی چچا ہی وصول کر لیتے تھے۔ ابا مرحوم نے اپنی دوسری والدہ اور بھائی سے سگے رشتوں سے بھی زیادہ سلوک کیا۔ کبھی کسی شخص کی ہمت نہیں پڑی کہ ان کی والدہ یا بھائی کو 'سوتیلا' کہہ سکے۔

ابا مرحوم کے علمی کاموں کا اعتراف اور قدردانی، عربی، فارسی اور اردو کے سبھی علماء نے ان کی زندگی میں بھی کی اور بعد میں بھی۔

ابا مرحوم عربی، فارسی اور اردو کے ہندوستان میں پہلے عالم تھے جن کی اکسٹھویں سالگرہ پر خراجِ تحسین کی صورت میں ارمغان ادب (Souvenir Volume) 'نذر عرشی' پیش کیا گیا۔

ابا مرحوم پہلے عالم ہیں جن کو تدوین کے اعلیٰ معیار پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دیا گیا۔ ان سے قبل یہ ایوارڈ تخلیقی کاموں پر دیا جاتا تھا۔

ابا مرحوم وہ پہلے عالم ہیں جن کو عربی زبان کے عالم کی حیثیت سے بغیر درخواست فارم بھرے راشٹر پتی ایوارڈ دیا گیا۔

ابا مرحوم ہندوستان کی شاید واحد شخصیت تھے جو 76 سال کی عمر میں بھی نوکری میں، بحیثیت ڈائرکٹر رضا لائبریری رہے۔ مزید یہ کہ 58 سال کی عمر میں رٹائر ہونا تھا مگر رضا لائبریری بورڈ ان کو، بغیر کسی درخواست کے خود سے توسیع دیتا رہا۔ ابا مرحوم نے نہ کبھی نوکری میں توسیع کی درخواست دی اور نہ کسی انسان سے توسیع کی خواہش کی۔ انھوں نے جو مانگا، اللہ تبارک وتعالیٰ سے مانگا۔ اللہ عزوجل نے عطا کیا اور ان کے سر کو بلند رکھا۔

اہل خانہ سے بے تکلف، علمی، تربیتی گفتگو کا وقت شام کو چائے پیتے ہوئے مقرر تھا۔ اس وقت وہ کبھی پرانے خاندانی واقعات بیان کرتے، حدیث سناتے، اس کا مفہوم بتاتے، اسلامی تاریخ کے واقعات سناتے، کوئی شعر پڑھ کر اس کے معنی پوچھتے، لطائف بیان کرتے، عام معلومات کی باتیں کرتے اور یہ سلسلہ مغرب کے وقت تک رہتا۔ شیخ سعدیؒ، حافظؒ، غالب، اقبال اور مولانا حالی کا تذکرہ زیادہ رہتا۔ اس وقت کے دو واقعات لکھنے پر اکتفا کروں گا۔

1۔ ایک روز شیخ سعدیؒ کی مشہور رباعی 'بلغ العلیٰ بکمالہٖ' پڑھی، اس کا مطلب سمجھایا پھر فرمایا علامہ اقبال نے اس رباعی سے متاثر ہوکر فارسی میں بہت عمدہ نعت لکھی اور دل ہی دل میں نازاں ہوئے۔ اس رات ایک خواب دیکھا کہ ایک محفل سجی ہوئی ہے جس کی صدارت حضور اکرمؐ فرما رہے ہیں اور شیخ سعدیؒ، رسول اکرم کے قریب بیٹھے ہیں، علامہ پہنچے تو سب سے آخیر میں جگہ ملی۔ خواب سن کر میں نے ابا سے پوچھا کہ کیا آپ نے کبھی حضور اکرم کو دیکھا۔ ابا نے اثبات میں جواب دیا۔ میرے خواب کی تفصیل پوچھنے پر فرمایا کہ طالب علمی کے زمانے میں یہ دیکھا کہ حضور اکرمؐ ایک چبوترے پر کھڑے ہیں اور اس چبوترے کی سیڑھی پر حضرت علیؓ اور میں نیچے رسول اکرم کے سامنے کھڑا ہوں۔ حضور اکرمؐ سے میرا تعارف حضور علیؓ کرا رہے ہیں اور میرے بائیں ہاتھ میں ایک کتاب ہے۔ طالب علمی کا یہ خواب محترم ابا کی پوری زندگی کی تعبیر بن گیا۔ آخر دم تک کتاب ان سے نہ چھوٹی۔ تفسیر امام ابوسفیان ثوری اور نہج البلاغہ پر ان کی تحقیق سے دنیا ان کے علم و فضل کی قائل ہوگئی۔

2. ابا نے ایک روز میری بہن ڈاکٹر زہرہ عرشی (مرحومہ) سے پوچھا کہ غالب کا وہ کون سا شعر ہے جو انھوں نے غلط جگہ استعمال کیا ہے۔ ہم سب نے سوچا مگر سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر فرمایا تمہارے بھائی جان (عرشی زادہ مرحوم) بھی ماہر غالبیات ہیں ان سے پوچھو (بھائی جان شادی کے بعد گھر کے دوسرے حصے میں رہتے تھے) باجی نے بھائی جان سے جا کر پوچھا، انھوں نے بھی بہت غور کیا مگر کچھ یاد نہیں آیا تو وہ باجی کے ساتھ ہی آگئے اور کہا کہ آپ ہی بتادیں۔ ابا مسکرائے اور کہا ایسے نہیں، پہلے سب لوگ کہیں ہار گئے، لوہے کے چنے چاب گئے۔ ہم سب نے بیک زبان یہ الفاظ دہرائے تو فرمایا:

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

پھر فرمایا غالب نے یہ شعر تجمل حسین خاں کے لیے کہا ہے جبکہ یہ شعر ان کو حضور اکرمؐ کے لیے کہنا چاہیے تھا۔

میں نہایت شکر گزار ہوں ڈاکٹر حسن عباس صاحب، ڈائرکٹر رضا لائبریری رامپور کا

جنھوں نے ابا مرحوم سے اپنے دیرینہ انس کا ثبوت دیتے ہوئے اس کتاب کو شائع کرنے کی میری خواہش کو منظور کیا۔ مولانا عرشی کی وفات کے بعد وہ پہلے ایسے عالم اور محقق ہیں جو ہر لمحہ تحقیق کی دنیا میں ہی رہتے ہیں۔ یہ رضا لائبریری کی خوش قسمتی ہے کہ اسے دوبارہ ایک محقق ڈائرکٹر مل گیا۔



میرزا غالب کا زائچہ

میرزا غالبؔ نے ایک فارسی قصیدے میں اپنا زائچہ (جنم پتر) بیان کیا ہے۔ یہ قصیدہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی منقبت میں ہے، اور کلیاتِ فارسی کے نولکشوری نسخہ مطبوعہ سنہ 1279ھ (1863) کے صفحہ 197 سے شروع ہو کر صفحہ 203 پر ختم ہوتا ہے۔ مطلع یہ ہے:

مگر مرا دلِ کافر بود شبِ میلاد
کہ ظلمتش دہد از گورِ اہلِ عصیاں یاد

اس قصیدے کی تاریخِ نظم کیا ہے، اس کا قرار واقعی علم ابھی تک نہ ہو سکا۔ لیکن کلیاتِ نظمِ فارسی کے اس مخطوطے میں یہ قصیدہ موجود ہے جو خاتمے کے مطابق 1253ھ (1837) میں مرتب ہوا تھا اور اب پٹنہ کے کتب خانے میں محفوظ ہے لہٰذا یہ اس سال سے پہلے ہی کا منظومہ ہوگا۔

اس قصیدے کا یہ شعر تاریخ نظم پر مزید روشنی ڈالتا ہے:

نفس بلرزہ ز یادِ 'نہیبِ کلکتہ'
نگاہ خیرہ ز 'ہنگامۂ الہ آباد'

اس شعر میں 'نہیبِ کلکتہ' اور 'ہنگامۂ الہ آباد' سے کیا مراد ہے، اسے سمجھنے کے لیے مولانا مہرؔ کی کتاب 'غالب' کے حسبِ ذیل اقتباسات ملاحظہ فرمایئے، جو اُن کی کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے صفحات 164 تا 168 سے ماخوذ ہیں:

''آخرکار (گورنر جنرل کے یہاں سے) غالبؔ کے خلاف فیصلہ صادر ہوا۔ غالبؔ اس کے بعد اس درجہ مایوس ہوئے تھے کہ گورنر جنرل دہلی آئے، تو ان سے ملنے بھی نہ گئے۔

اس دوران میں ولیم فریزرؔ کے قتل کا واقعہ پیش آیا، جس میں نواب شمس الدین احمد خاں ماخوذ ہوئے۔ اس زمانے میں دہلی کا علاقہ آگرہ والہ آباد کی لیفٹیننٹ گورنری سے متعلق تھا۔ غالبؔ نے بھی 30 جون 1835 (4 ربیع الاوّل 1351ھ) کو اپنے پرانے مطالبات کے متعلق

'ماہِ نو'، جلد: 22، شمارہ: 1، 2 جنوری-فروری 1969

ایک مفصل درخواست مرتب کر کے لیفٹیننٹ گورنر آگرہ واله آباد کے پاس بھیج دی۔ اس درخواست کے جواب میں لیفٹیننٹ گورنر نے حکم دیا کہ: ریذیڈنٹ دہلی اس کے متعلق رپورٹ پیش کریں۔

دعوے کے جواب میں لیفٹیننٹ گورنر کا حکم آیا کہ مقدمہ سپریم کونسل میں پیش ہو چکا ہے، اس لیے لیفٹیننٹ گورنر اس کے متعلق کوئی کارروائی نہیں کر سکتا۔ سارے کاغذات گورنر جنرل کے پاس بھیجے جائیں۔ 23 مارچ 1836 (5 ذی الحجہ 1251ھ) کو غالبؔ نے لارڈ آکلینڈ کے پاس دو درخواستیں بھیجیں۔ ان میں اپنے مقدمے کی روئداد تحریر کر دی۔ نیز لکھا کہ "سکریٹری اور ریذیڈنٹ نے میرا مقدمہ خراب کر دیا۔ آپ خود انگریزی انصاف کے اصول پر اس مقدمے کا فیصلہ کریں۔"

میری دانست میں 'نہیبِ کلکتہ' اور 'ہنگامۂ الٰہ آباد' سے انھیں احکام اور فیصلوں اور اس درمیانی مدت کی کشمکش اُمید و بیم کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لہٰذا قصیدے کو 1251ھ (1836ء) کے قرب و جوار کا ہونا چاہیے۔

بہر حال اس قصیدے میں اپنے زائچے کا بیان حسبِ ذیل اشعار میں کیا ہے:

بطالعے ز عدم آمدم بباغِ وجود — کہ رفتہ بود بہ دروازۂ اِرم شدّاد
خروشِ مرگ کہ طوفانِ نا امیدیہاست — غریوِ یاس کہ مرگے آنو مبارک باد
مگوئے زائچہ کایں نسخہ ایست از اسقام — مگوئے زائچہ کایں جامعیست از اضداد
خود اصل طالعِ من جزوے از کمانستے[1] — کزوست ناوکِ غم را ہزار گونہ کشاد
خرامِ زہرہ[2] بطالع اگرچہ دادہ نشاں — ہم از لطافتِ طبع و ہم از صفائے نہاد
ولی ازاں کہ غریب است زہرہ اندر قوس — نشستہ بر رخِ نقدِ قبول گردِ کساد
تو گوئی از اثر انتقامِ ہاروت ست — کہ مر بطالعِ من چرخ زہرہ را جا داد
بہ صفر جدی[3] ذنب[4] را اشارۂ باشد — بخاک و حلقۂ دام و کمیں گہِ صیاد
چہ دام، روح و رواں را گدازشِ پر و بال — چہ صفر، رنج و الم را فزائشِ اعداد
ز مہر[5] و پیکرِ تیر[6] آشکار گشتہ بجدی — فروغ اخگرِ رخشندہ و کفے زِ رماد
بحوت[7] در شدہ ہم مشتری[8] و ہم مریخ[9] — یکے کفیلِ صلاح، و یکے دلیلِ فساد

---

1. کمان یعنی برج قوس (دھن) 2. زہرہ یعنی سکر 3. یعنی مکر
4. یعنی کیت [کیتو] 5. یعنی سورج 6. یعنی عطارد جسے ہندی میں بدھ کہتے ہیں
7. یعنی مین 8. یعنی برہسپت 9. یعنی منگل

یکے بہیئت پیرے کہ ناگہ از غوغا — بکنجِ صومعہ وامانده باشد از اوراد
یکے بصورتِ ترکے کہ از پئے یغما — ستیزه جور درآید بخانۂ زہاد
قمر[1] بہ ثور[2] کہ کاشانۂ ششم باشد — چو نورِ خویش کند دستگاهِ خصم زیاد
سیاه گشتہ دو پیکر[3] ز سیلی[4] کیوان — چنانچہ از اثرِ خاک تیره گردد باد
بدیں دو نحس نگر تا چہ شکلِ مستقبل — کشیده اند ز تربیعِ خویش در اوتاد
بہ چارمین کده بہرام[5] پنجمیں پایہ — بہ ہفتمیں رده کیوان ہفتمیں بنیاد
کند چو ترکِ ستمگر بہ کشتن استعجال — کند چو ہندوِ رہزن ببردن استبداد
زحوت، ہیبتِ طوفانِ نوح پرده کشا — عیاں ز صورتِ جوزا نہیبِ صرصرِ عاد
تو و خدا کہ دریں کشمکش کہ من باشم — چگونہ چوں دگراں زیستن تواں بمراد

ان احکام کے بیان کے ساتھ کلیاتِ مذکورہ میں زائچہ بھی شامل ہے لیکن یہ 1253ھ کے مرتبہ کلیات میں بھی موجود ہے یا نہیں، میں سردست اس کے بتانے سے قاصر ہوں۔ البتہ کلیات کے نسخۂ مرتبہ 1264ھ (1848ء) میں ضرور پایا جاتا ہے۔ میری دانست میں یہ زائچہ خود غالب کے قلم کا ہے۔ لیکن اس میں شک کرنے کی تو کوئی وجہ ہی نہیں کہ خود غالب نے اس زائچہ کے لیے تاریخی معلومات بہم پہنچائی تھیں، اور یہ غالب کی نظر سے ایک سے زائد بار گزرا ہے، اس لیے اس کے مندرجات کسی دوسرے کے رہینِ منت نہیں ہو سکتے۔

وہ زائچہ حسبِ ذیل ہے:

جیسا کہ اگلے زائچے سے معلوم ہوتا ہے، یہ زائچہ یونانی تقویم کے مطابق بنایا گیا ہے، اس لیے غالب نے اپنے مذکورۂ بالا اشعار میں جو احکام بیان کیے ہیں، انھیں اس تقویم کے قواعد و ضوابط کے تحت دیکھنا اور پرکھنا چاہیے۔ میں یہاں میر خیرات علی مرحوم کی دو کتابوں 'نیر اعظم' اور 'کشاف النجوم' کی مدد سے

1. یعنی چاند
2. یعنی برکھ
3. یعنی جوزا جسے ہندی میں متھن کہتے ہیں
4. یعنی زحل جسے ہندی میں سنیچر کہتے ہیں
5. یعنی مریخ

ہندی تقویم کے مطابق بھی ہر خانے کے احکام بیان کیے دیتا ہوں۔

خانۂ اوّل میں جو مولود کا خانۂ طالع بھی ہے، زہرہ (سکر) براجمان ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ صاحبِ طالع شعر گو اور سخنور ہو۔ نیز اور قسم کے کمالات بھی رکھتا ہو مگر زہرہ اس خانے میں اجنبی مانی گئی ہے، اس لیے صاحبِ طالع کی خاطر خواہ قدر نہ ہو۔

خانۂ دوم میں شمس (سُورج) براجمان ہے جو تلاشِ مال و دولت اور اُس کے ساتھ ہی نقصانِ مایہ کا پتا دیتا ہے۔ عطارد (بدھ) کے اس خانے میں ہونے سے تلاشِ دولت میں اور مدد ملتی ہے، نیز یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ صاحبِ طالع خرچیلا ہوگا۔ پھر آفتاب کے ساتھ عطارد کی یکجائی بتاتی ہے کہ صاحبِ طالع قوی، خوش شکل اور شیریں گفتار ہوگا اور چونکہ ذَنَب (کیت) [کیتو] بھی اس خانے میں موجود ہے، لہٰذا صاحبِ طالع کو مکانِ موروثی سے محروم ہونا چاہیے، مال کے نقصان کا رنج بھی اٹھانا چاہیے اور اسے سفر بھی کرنا پڑیں۔

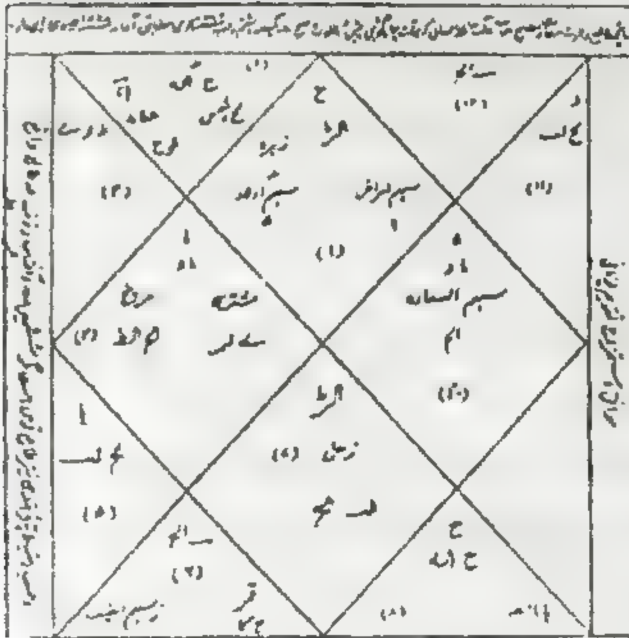
خانۂ چہارم میں مشتری (برہسپت) کا براجمان ہونا اس کی دلیل ہے کہ صاحبِ طالع کے والدین خوشحال اور صاحب جاہ وعزت ہوں اور وہ خود صنعت دوست ہو، اور خورد سالی ہی سے لوگ اس سے محبت کریں، اور وہ صاحب اسپ سواری ہو۔ مگر مشتری کے ساتھ مریخ (منگل) کا ہونا اس پر دال ہے کہ صاحبِ طالع کے اہلِ خاندان کم ہوں اور وہ تخریب کے زیادہ درپے رہے۔ لیکن وہ اپنے کنبے کی پرورش کرے گا، اور سب پر یکساں نظر رکھے گا۔

خانۂ ششم میں قمر (چاند) کا براجمان ہونا اس کا پتا دیتا ہے کہ صاحبِ طالع بے مقدور ہو، اور فسق و فجور میں مبتلا رہے۔

خانۂ ہفتم میں زحل (سنیچر) کی موجودگی اس کی دلیل ہے کہ صاحبِ طالع ہر شخص سے اچھا برتاؤ کرے گا۔

دس سال کے بعد 1278ھ (2-1861ء) میں غالبؔ نے کلیاتِ نظم فارسی کا تیسرا ایڈیشن مرتب کیا، تو اس میں قصیدہ زیرِ بحث کے ساتھ حسب ذیل زائچہ شامل کیا۔

یہ زائچہ مخطوطۂ مذکور کے صفحہ 40 کے بعد چپکایا گیا ہے، اور اس کے آخر میں سرخ روشنائی سے کسی نے لکھا ہے ''نوشتۂ حضرتِ نیرِ رخشاں مرحوم' بظاہر اس نوٹ کے کاتب نیر کے بیٹے سعید الدین احمد خاں طالبؔ ہیں، کیونکہ یہ نسخہ ان کی ملکیت میں تھا اور 1906 میں



انھوں نے سرامیر الدین احمد خاں بہادر والی لوہارو کو تحفے میں دے دیا تھا۔

اس زائچہ میں میرزا غالبؔ کا سالِ ولادت 1212ھ ہی لکھا ہوا ہے۔ لیکن پہلا 2 کا ہندسہ کسی قدر مشتبہ سا نظر آتا ہے، اس لیے منشی نولکشور نے 1279ھ (1863ء) میں اس نسخے سے مطبع کے لیے کاپی لکھوائی، تو اُن کے کاپی نویس نے اسے اس بنا پر 4 پڑھ لیا کہ وہ غالبؔ کی واقعی تاریخ پیدائش سے آگاہ نہ تھا۔ ورنہ اسے 2 اور 4 میں دھوکا کبھی نہ ہوتا۔

اس نئے زائچے میں جو مزید نجومی معلومات مندرج ہیں، انھیں میں اہلِ تنجیم کے لیے چھوڑ کر ایک اور مسئلے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور وہ ہے میرزا غالبؔ کی تاریخ و یوم و سالِ ولادت کا معاملہ۔

زیرِنظر دونوں زائچوں میں اُن کی تاریخ پیدائش 'صبحِ روز یکشنبہ ہشتم رجب 1212ھ' مندرج ہے۔ دوسرے زائچے میں اس کے ساتھ 'مطابق آغاز 1790' بھی لکھ دیا گیا ہے۔

جہاں تک 1212ھ کا تعلق ہے۔ میرزا صاحب نے 'شورشِ شوق' اور 'غریب' کو مادۂ تاریخ لکھا ہے جن سے یہی اعداد نکلتے ہیں۔ نیز انھوں نے ازراہِ خوش طبعی مولانا صاحب عالم مارہروی کے مادۂ تاریخِ ولادت 'تاریخ' پر الف بڑھا کر اپنا مادہ 'تاریخا' قرار دیا تھا، جس سے وہی اعداد مستخرج ہوتے ہیں۔

رہا ماہ پیدائش اور تاریخ، تو خود غالبؔ ہی نے ان دونوں کا مذکورہ نواب علائیؔ کے نام کے ایک خط مورخہ جون 1861ء میں کیا ہے۔ علاوہ بریں تذکرۂ مظہر العجائب کے لیے انھوں نے 1864 میں اپنا حال لکھا تھا۔ اُس میں اپنے قلم سے '8 رجب' کو تاریخِ ولادت لکھا ہے۔

اس نوٹ کا عکس 'احوالِ غالب' میں صفحہ 24 کے مقابل چسپاں ہے۔

یومِ پیدائش کا ذکر ان کی صرف ایک اور تحریر میں ہے جو تذکرۂ مظہر العجائب کے لیے لکھی تھی اور وہی 'یکشنبہ' ہے، جس کا ذکر زائچے میں ہوا ہے چونکہ از روئے تقویم اس تاریخ کو چہار شنبہ ہونا چاہیے۔ اس لیے سب سے پہلے مولانا مہر نے 'غالبؔ' میں اس غلطی کی نشاندہی کی۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''غالبؔ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ان کی ولادت بوقت شب چار گھڑی پیش از طلوع آفتاب صبح روز یکشنبہ ہشتم رجب 1212ھ مطابق آغاز 1798ء ہوئی۔'' لیکن تقویم کی رو سے 8 رجب 1212ھ کی عیسوی 27 دسمبر 1797 نکلتی ہے نیز اس دو دن یکشنبہ یعنی اتوار نہ تھا بلکہ چہار شنبہ تھا۔''
>
> (غالبؔ ص 1، ج 1)

اس سلسلے میں جناب مالک رام صاحب ذکرِ غالبؔ میں زیادہ وضاحت کے ساتھ فرماتے ہیں:

> ''میرزا کے کلیاتِ نظم فارسی (طبع دوم) میں ان کا زائچہ بھی شامل ہے۔ اس کے عنوان میں نواب نیر رخشاں نے ولادت سے متعلق لکھا ہے۔ روز یکشنبہ ہشتم رجب 1214ھ مطابق آغاز 1798 روداده۔ اس تحریر میں کئی غلطیاں ہیں۔ ہجری تاریخ اور مہینہ ٹھیک ہے۔ البتہ سال میں کاتب کی مہربانی سے 1212ھ کی جگہ 1214ھ لکھا گیا ہے۔ یہ ہجری تاریخ جو یقیناً میرزا نے انھیں بتائی ہوگی درست ہے اور اس کی تائید اور کئی جگہ سے بھی ہوتی ہے۔ باقی سب باتیں خود نیرؔ رخشاں نے اضافہ کیں اور بدقسمتی سے سب غلط ہیں۔ دن یکشنبہ نہیں بلکہ چہار شنبہ تھا۔ عیسوی سال 1797 چاہیے تھا اور وہ بھی اواخر۔ غالبؔ نے اپنے جو حالات تذکرۂ مظہر العجائب کے لیے لکھے تھے (احوال غالبؔ بلاک محولہ فوق) وہاں نیر رخشاںؔ ہی کا تتبع کرتے ہوئے انھوں نے بھی یومِ ولادت یکشنبہ لکھ دیا ہے۔ اس سلسلے میں بنیادی چیز 8 رجب 1212ھ کی تاریخ ہے۔'' ('ذکر غالبؔ ص 25 ج 3)

ان دونوں محققوں کا یہ ارشاد بالکل درست ہے کہ زائچے کے عنوان میں ہجری تاریخ اور

مہینہ صحیح ہیں۔ دن اور عیسوی سنہ غلط ہیں لیکن مالک رام صاحب کا یہ قول ابھی مزید تحقیق چاہتا ہے کہ یکشنبہ اور آغاز 1798 نواب نیر رخشاں کا اضافہ ہے۔

اس طرح یہ امر بھی قابل قبول نہیں معلوم ہوتا کہ مظہر العجائب والے نوٹ میں یکشنبہ کا اضافہ غالب کے ذاتی علم کی بنا پر نہیں ہے بلکہ وہ نیر رخشاں کے تتبع میں ایسا لکھ گئے ہیں۔

میری دانست میں نیر رخشاں صرف ناقل ہیں۔ یکشنبہ خود غالب کا لکھا اور بتایا ہوا لفظ ہے۔ چنانچہ یہ کلیات کے 1264ھ والے نسخے میں بھی موجود ہے اور جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں بگمان قوی خود غالب کے قلم کا نوشتہ ہے۔ بہر صورت جو لفظ 1848 میں بھی غالب نے لکھا یا لکھوایا تھا اس کا 1864 میں (جو مظہر العجائب والے نوٹ کا سال تحریر ہے) اعادہ دوسرے کا تتبع قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ اس بارے میں از روئے نجوم معلوم کرنا چاہیے کہ زائچہ کس دن کے لحاظ سے بنایا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ غالب نے اپنی ماں نانی سے تاریخ اور دن یونہی غلط سنا ہو اور پھر اس کے مطابق زائچہ بھی تیار کیا گیا ہو۔

رہ گیا سنہ عیسوی تو بعید نہیں کہ اس کا اضافہ اس ہندی نجومی کے قول پر کیا گیا ہو جس نے از روئے حساب ہندی اس زائچے کی توثیق و تائید کی تھی کیونکہ اہلِ ہند کے بقول آفتاب برج جدی (مکر) میں داخلہ آغاز سال یعنی جنوری کی کسی تاریخ کو ہوا کرتا ہے۔

خدا کرے غیب سے کوئی مرد کار پیدا ہو اور وہ میرزا غالب کے دونوں زائچوں کی جانچ کر کے اس گتھی کو سلجھا دے۔

(مطبوعہ ماہ نو، ستمبر 1967)

بلبل ہند مر گیا ہیہات — جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں، نکتہ سنج نکتہ شناس — پاک دل، پاک ذات پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج — رند اور مرجع کرم و ثقات
اس کے مرتے سے مر گئی دلّی — خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

دل کو جب باتیں اس کی یاد آئیں — کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں
کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل — کس سے دادِ سخنوری پائیں

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح اہل انصاف غور فرمائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں
غالبؔ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

[مرثیۂ غالب از حالی]



مرزا غالب کی تاریخ پیدائش

مرزا غالب نے اپنی تاریخ پیدائش ایک شنبہ 8 رجب 1212ھ بتائی ہے نیز کلیات نظم فارسی میں شامل زائچے میں اسے آغاز 1798 کے مطابق کہا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ از روئے حساب نہ تو 8 رجب کو یک شنبہ پڑتا ہے اور نہ یہ تاریخ آغاز 1798 کے مطابق ہوتی ہے۔ مختلف اہل علم نے اس سلسلے میں مختلف توجیہیں کی ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی قابل اطمینان نہیں۔

میں نے بھی دو سال ہوئے ایک مضمون اس موضوع پر لکھا تھا جو آج کل دہلی میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں میں نے ایک فارسی قصیدے اور کلیات نظم فارسی میں شامل زائچے کو سامنے رکھ کر گفتگو کی تھی مگر اس وقت میں بھی اس اختلاف کا کوئی حل پیش نہیں کر سکا تھا۔

حال ہی میں یہ مسئلہ پھر میرے زیر غور رہا اور ایک حل سمجھ میں آیا۔ وہ یہ کہ غالب کی تاریخ پیدائش ہشتم نہیں بلکہ ہژدہم رجب ہے اور مرزا صاحب کو اپنے بزرگوں سے سنی ہوئی تاریخ میں التباس ہو گیا ہے یعنی انھیں 18 کے بجائے 8 تاریخ یاد رہ گئی۔ چونکہ عیسوی سال کا آغاز وہ نہ بھولے تھے اس لیے مذکورہ التباس کا پتا چل گیا چنانچہ از روئے تقویم 18 رجب کو یک شنبہ ہی تھا اور یہ 7 جنوری 1798 کے مطابق بھی ہے جسے بقول غالب آغاز 1798 قرار دیا جا سکتا ہے۔

ہماری زبان، 8 جولائی 1969

اس قسم کی التباس کی مثالیں اگر عام نہیں ہیں تو نادر بھی نہیں اس لیے میرے نزدیک مرزا غالب کی تاریخ پیدائش: یک شنبہ 18 رجب 1213ھ مطابق 7 جنوری 1798 ہے۔ میں سمجھتا ہوں اہل علم کے لیے یہ حل قابل قبول ہوگا۔



کچھ غالب کے بارے میں

میرزا غالب اردو شاعروں میں سب سے زیادہ خوش بخت ہیں کہ ان کے متعلق ہر سال ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اگلی سطروں میں اپنی تازہ دریافت پیش کرتا ہوں، تاکہ غالب دوست اس سے فائدہ اٹھاسکیں۔

(1)

نواب محتشم الدولہ غوث محمد خاں بہادر شوکت جنگ والی جاورہ نے 1468ھ (1852) میں ہندوستان کی سیر و سیاحت کی تھی۔ ان کی روداد سفر کو مذکورہ صدر سال کے اندر ہی ریاست کے سرکاری مطبع سے مصور شائع ہوئی تھی۔ یہ 'سیر المحتشم' نام سے موسوم ہے اور مورخین کے مطالعے کی حق دار ہے۔ نواب صاحب نے شعرائے دہلی میں سے میرزا غالب، امام بخش صہبائی اور ذوق کا ذکر کیا ہے۔ غالب کے بارے میں اُن کا بیان حسبِ ذیل ہے:

> ''شاہجہاں آباد میں شعرا بھی بہت ہیں۔ ہر ایک اپنے اپنے انداز خوش بیانی اور طرزِ شیریں کلامی میں ہلالی و زلالی اور فیضی و عرفی ہے مگر میرزا اسداللہ خاں غالب، عرف میرزا نوشہ کمالِ سخنوری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اگر رودکی اس زمانے میں ہوتا، تو اپنے دیوان کو رودِ اشکِ ندامت میں دھوتا۔ اگر آذری ان کے کلام روشن کو دیکھتا تو آتشِ غیرت سے اپنی تصنیفات کو جلا دیتا۔ حقیقت میں ان کا ہر مصرع، مصرعۂ ہلالِ آسمان سے بلند تر ہے، اور بیت، بیت ابروئے، خوباں سے خوب تر۔ معانی دقیق گویا تنگی وہانِ غنچہ و دہناں، اور مضمون باریک موی میانِ نازک بدناں خیالات میرزا جلال اُن کے دامِ

مہر نیمروز، کراچی، فروری 1958

زلفِ خیال بندی میں سراپا اسیر، اور معانی بلند پرواز بیدل اُن کی نظمِ مسلسل میں پابزنجیر۔ نثر گہربار نصیرائے ہمدانی اُن کی عبارتِ پربشارت کے آگے معترف ہیچمدانی۔ چار عنصرِ میرزا بیدل ان کے فقراتِ موزوں کے روبرونامعتدل، انشاءِ وحید ابوالفضل ان کے رقعاتِ بے بدل کے مقابل میں ذلیل ومبتذل، یہ شعرانہیں کے ہیں نظم:

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد | بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی | ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مے مردافگنِ عشق؟ | ہے مکرر لبِ ساقی سے صلا میرے بعد

ایضاً

دل جگر تشنۂ فریاد آیا | پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد | سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

ولہ

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں | ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل اے عمر | برق کو پابحنا باندھتے ہیں

ولہ

دوست غمخواری میں میری سعی فرمادیں* گے کیا | زخم کے بھرتے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا

ولہ

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن | ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

ولہ

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں | کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ گھر میں آئے ہمارے خدا کی قدرت ہے | کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اس اقتباس میں غالب کا تقابل فارسی کے استادوں سے کیا گیا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ خود نواب صاحب کی نظر میں، یا جن اصحاب نے انھیں معلومات بہم پہنچائیں تھیں ان کی نظر میں، غالب اردو کے نہیں فارسی کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں کے ہم پلہ تھے۔

* اکثر نسخوں میں ''فرمائیں'' ملتا ہے۔

(2)

قاطع برہان کے جواب میں مولوی احمد بنگالی نے موید البرہان لکھی، تو جواب وردِ جواب کا ایک طویل سلسلہ قائم ہوگیا۔ امیر مینائی مرحوم نے غالب کی حمایت میں ایک مضمون لکھ کر چھپوایا تو اس کے جواب میں میر آغا علی شمس شاگرد قاضی محمد صادق خاں اختر نے اودھ اخبار شمارہ 26، مورخہ 25 ماہ جون 1867 میں اس کی تردید کی۔ اس تردید میں آغا نے غالب کے چند اردو شعروں پر اعتراض بھی کیے تھے، باقر نے فارسی نثر میں ان کا رد کیا اور خود قتیل پر اعتراض جڑے، آغا کا ایک اعتراض یہ تھا کہ غالب نے اپنے مصرع ''نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے۔'' میں اعلان نون کیا ہے، جو درست نہیں۔ اس کا جواب باقر نے یہ دیا۔ (دیوان صفحہ 440) کہ اصل میں مصرع یوں تھا۔ ''نافِ زمیں ہے یہ نہ کہ نافِ غزال ہے۔'' مطبوعہ نسخے کے کاتب نے لفظ، یہ کو جو لفظ۔ ''نہ'' کی تجنیس ہے، مکرر جان کر حذف کر دیا اور مصرع دیوان میں غلط چھپ گیا، ورنہ یہ غلطی تو مبتدی بھی نہیں کر سکتے، چہ جائیکہ، رئیس المنتہین لیکن واقعہ یہ ہے کہ غالب کے تمام قلمی و مطبوعہ نسخوں میں ''زمین'' اعلان نون ہی ہے، اس لیے باقر کا یہ جواب کسی طرح درست نہیں۔ اگر یہ غلطی ہے تو ان کے استاد رئیس المنتہین سے یقیناً سرزد ہوئی ہے۔

(3)

کوئی بزرگ سید زمان علی شاہ دفعہ دار تھے انھوں نے بوئی خلد نام کی ایک چھوٹی سی کتاب مرتب کی تھی جو مختلف شعرا کے چیدہ منقبتی کلام پر مشتمل ہے اور مطبع یوسفی دہلی میں 1320ھ میں چھپی تھی۔

اس کتاب کے آخر میں (ص 56) انھوں نے بعنوان— ''لطیفۂ غالب'' لکھا ہے کہ مرزا اسداللہ الغالب (غالب) دہلوی اپنے معمولی شغل میں تھے۔ ناگاہ ایک شخص نے دستک دی، معلوم ہوا کہ میر حامد ہیں۔ اندر آنے کی اجازت ہوئی۔ بعد مزاج پرسی حالِ تشریف آوری دریافت فرمایا۔ میر صاحب نے عرض کی، عرصے سے ایک مصرع کے واسطے متفکر اور متحیر ہوں۔ ہر چند مغز مارتا ہوں لیکن مصرعہ ثانی موزوں نہیں ہوتا۔ مرزا صاحب نے کمال مہربانی سے مصرع پوچھا۔ میر صاحب نے یہ مصرع کہا:

اسپ و زن و شمشیرِ وفادار کہ دید؟

مصرع سنتے ہی مرزا صاحب جوش میں اٹھ کھڑے ہوئے اور بآواز بلند بڑے جذبے اورشوق سے یہ فرماتے تھے۔''واللہ علی دید علی دید علی دید'' اور بار بار بہ تکرار خوش ہوکر اچھلتے تھے اورفرماتے تھے:

اسپ و زن و شمشیر وفادار کہ دید؟ واللہ علی دید، علی دید، علی دید

میر حامد صاحب اس خداداد لیاقت پراور حاضر جوابی پر عش عش کر گئے اور خوش وخرم اپنے دولت سرا کو واپس ہوئے۔۔۔(مخلص)



کچھ غالب سے متعلق

غالب کی ایک فارسی رباعی ہے:[1]

غالب، بہ گہر ز دودۂ زاد شم
زاں رو بہ صفائی دم تیغ است دم
چوں رفت سپہبدی، زدم چنگ بہ شعر
شد تیر شکستۂ نیاگاں قلم

غالب کے فارسی اور اردو کلامِ نظم ونثر کا مطالعہ کرنے والے بخوبی واقف ہیں کہ اس رباعی میں انھوں نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ میرا قلم باپ دادا کے ٹوٹے ہوئے تیر سے بنایا گیا ہے، بالکل درست ہے وہ جب کسی کے خلاف کچھ لکھتے ہیں، تو ان کا شکار ان کے اس شعر کا مصداق ہوتا ہے:

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

کسی معترض نے کہہ دیا ہوگا کہ فلاں شعر میں آپ کو فلاں شاعر سے توارد ہوگیا ہے۔ زادشم کے پوتے سے یہ بات کیسے برداشت ہوتی۔ قلم دان میں سے وہی تیر سے تراشا ہوا قلم نکالا اور اس کے دل ودماغ کو برما دیا۔ فرماتے ہیں:[2]

ز رفتگاں بیکے گر توارُدم رو داد
مداں کہ خوبیِ آرائشِ غزل بُردست
مراست ننگ ولے فخر اوست کاں بسخن
بسعیِ فکرِ رسا، جابداں محل بُردست

آج کل، مارچ 1972

میر گمانِ توارد، یقیں شناس کہ دُزد
متاعِ من ز نہاں خانہ ازل بُردست

دیکھا آپ نے توارد کے اعتراض پر کیا تیر باری کی ہے۔ معترض ہی نہیں، وہ استاد بھی شکار ہوگیا، جس کا مضمون بقول معترض میرزا صاحب نے نظم کر دیا تھا۔

کسی امیر سے ناراض ہو کر اس کی ہجو میں یہاں تک کہہ گزرے کہ:[3]

بتو ہرگز نداد ے زر و سیم
خواجہ، گر بودے خدای تو من

ایک دشمن کی مذمت میں فرماتے ہیں:[4]

بیتے از استاد دیدم، ذوق کے بخشید لیک
ہیچ در تسکین نیفزود و ز وحشت کم نکرد
ہچو تو ناقابلے در صلب آدم دیدہ بود
زاں سبب ابلیس ملعوں سجدہ بر آدم نکرد
حاشا للہ، بودنت در صلب آدم تہمت است
پیش ہر کس گفتم ایں اندیشہ، باور ہم نکرد

ہجو و مذمت کی حد ہوگئی۔ کیا تیر اس سے گہرا زخم کرتا۔ خیر یہ تو نظم کے کچھ شعر تھے اور نظم میں مبالغہ ہوا ہی کرتا ہے۔ میرزا صاحب نثر میں بھی اسی قدر تیز و تند تھے۔ قاطع برہان میں محمد حسین تبریزی کو جو کچھ کہا ہے، وہ کیا کم تھا کہ اس سلسلے میں انھوں نے اِدھر اُدھر جو خط لکھے، ان میں سے دوسرے فرہنگ نویسوں کو بھی بری طرح زخمی کیا۔ بیچارے ملا غیاث الدین نے فارسی لغات جمع کر کے ماخذ کے حوالوں کے ساتھ عربی و فارسی کے نصابی کتابوں میں مستعمل الفاظ کی ایک فرہنگ مرتب کر دی تھی۔ قبول عام خداداد بات ہوتی ہے۔ اُسے وہ شہرت نصیب ہوئی کہ باید و شاید۔ میرزا صاحب نے اس غریب کو بھی نہ چھوڑا اور ایک خط میں لکھا[5] کہ ''غیاث الدین رامپور میں ایک ملائے مکتبی تھا، ناقل ناعاقل۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:[6]

''غیاث اللغات ایک نام موقر و معزز، جیسے الفربہ خواہ مخواہ مرد آدمی۔
آپ جانتے ہیں کہ یہ کون ہے؟ ایک معلم فرومایہ، رام پور کا رہنے والا، فارسی

سے نا آشنائے محض اور صرف ونحو میں ناتمام، انشائی خلیفہ ومنشیات مادھورام کا
پڑھانے والا۔"

مرزا تفتہ کو اسی غیاث اللغات کے بارے میں تحریر کیا ہے:[7]

"میں برہان کا خاکہ اڑا رہا ہوں۔ چار شربت اور غیاث اللغات کو حیض کا لتّا
سمجھتا ہوں۔ ایسے گم نام چھوکروں سے کیا مقابلہ کروں گا؟"

صاحب عالم مارہروی کو لکھا ہے:[8]

"اگر قائل تحقیق ہو تو میرے بیان پر غور کرو اور جو عبدالواسع اور غیاث الدین
اور عبدالرزاق ان ناموں کی شوکت نظر میں ہے، تو تم جانو۔ ایک شخص بھیک
مانگتا ہے۔ باپ نے اس کا نام میر بادشاہ رکھ دیا ہے۔ اصل فارسی کو اس
کھتری بچے قتیل ملیہ ما ملیہ نے تباہ کیا۔ رہا سہا غیاث الدین رام پوری نے
کھو دیا۔ ان کی سی قسمت کہاں سے لاؤں، جو صاحب عالم کی نظر میں اعتبار
پاؤں، خالصاً لِللہ غور کرو کہ وہ خرانِ نا مشخص کیا کہتے ہیں، اور میں خستہ و
دردمند کیا بکتا ہوں۔ واللہ نہ قتیل فارسی شعر کہتا ہے، اور نہ غیاث الدین فارسی
جانتا ہے۔"

قتیل اور غیاث الدین فارسی اور عربی کتنی جانتے تھے۔ اس کا حال مصحفی کی عقد ثریا[9] اور حافظ احمد علی خاں شوق کے تذکرے کاملان رام پور[10] میں دیکھا جاسکتا ہے، یہاں صرف اتنا بیان کردینا کافی ہوگا کہ قتیل مرزا محمد باقر شہید اصفہانی کی تربیت میں رہا تھا اور غیاث الدین، جسے مرزا صاحب خرنا مشخص قرار دے رہے ہیں نواب یوسف علی خاں بہادر اور نواب کلب علی خاں بہادر والیانِ رامپور کا استاد تھا۔

یہ جو کچھ لکھا گیا، دراصل تمہید ہے۔ اصل مقصد یہ کہنا ہے کہ مرزا صاحب نے مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب کو لکھا ہے:[11]

"تم علاء الدین خاں کو لکھو کہ بڑی شرم کی بات ہے کہ ہر دم آزردگی غیر سبب
راچہ علاج، اس غزل کو حافظ کی غزل سمجھتے ہو۔ واہ، واہ! غیر سبب کہاں کی بولی
ہے؟

از خواندن قرآن تو، قاری، چہ فائدہ؟ عیاذاً باللہ! امیر خسرو قرآن کو کہ بہ سکون

رای قرشت والفِ ممدودہ ہے قران بروزن پران لکھیں گے؟
یہ دونوں غزلیں دو گدھوں کی ہیں۔ شاید ایک نے مقطع میں حافظ اور ایک کے
مقطع میں خسرو لکھ دیا ہو۔"

یہاں بھی مرزا صاحب نے وہی تیر سے تراشا ہوا قلم استعمال کیا۔ ممکن ہے کہ مذکورہ بالا دونوں غزلیں دو گدھوں کی ہوں مگر جہاں تک قرآن کو قران نظم کرنے کا تعلق ہے یہ الزام امیر خسرو پر نہ سہی امیر ناصر خسرو پر عائد ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:[12]

بر جامہ سخنہاش جز معنی آستر نیست
چوں پندہاش پندے جز در قراں مگر نیست

منوچہری نے بھی مرزا صاحب کے برخلاف ایک شعر میں قران باندھا ہے وہ لکھتا ہے:[13]

خسرو تنہ ملک بود او دلۂ ملک
ملکت چو قران، او چو معانی قران است

حکیم سنائی ان دونوں سے بھی اونچے درجے کے شاعر ہیں ان کے ایک ہی قصیدے کے یہ دو شعر پڑھیے:[14]

رسن دادت ز قرآن تا ز چاہ تن بروں آئی
کہ فرمودت رسن بازی ز راہِ دیو نفسانی
یکے خوانیست پر نعمت قرآن بہر غذائے جان
و لیکن چوں تو بیماری، نیابی طعم مہمانی

دیکھیے پہلے شعر میں سنائی نے قرآں کو بتلفظ اصلی باندھا ہے اور دوسرے شعر میں اسی لفظ کو بروزن پران نظم کر دیا ہے۔ حکیم قطران تبریزی نے بھی اس شعر میں مرزا صاحب کے علی الرغم قرآن ہی باندھا ہے۔[15]

روش روشن ہمچو آتش، سرش تیرہ ہمچو دود
شخص او در دست جود، وعلم او بر دل قرآن

یہی شاعر ایک اور مدحیہ قصیدے میں لکھتا ہے:[16]

ہیچ عیبے نیست در پاکیزہ طبع او پدید

لفظ او بے عیب و بامعنی بکردار قرآن

ابو منصور ملان کی مدح میں اپنے شعر کی تعریف اس طرح کی ہے:[17]

گرچہ شعرم دُر بود، چوں دُر مدیح او بود

مردم دانا قریں دانند او را با قرآں

یہ عرض کردوں کہ مذکورہ بالا اساتذہ قرآن کے صحیح تلفظ سے واقف تھے۔ چنانچہ ان کے دواوین میں زیادہ تر درست تلفظ ہی ملتا ہے اور اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ لوگ ازراہِ جہالت قرآن کو قراں نظم کر گئے ہیں۔ اگر مرزا صاحب زندہ ہوتے تو ان سے پوچھا جاتا کہ حضرت، ناصر خسرو، حکیم سنائی اور قطران تبریزی کے بارے میں کیا ارشاد ہے کیا یہ بھی ''خران نامشخص'' ہی قرار پائیں گے؟

اصل بات یہ ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ بھی ہو، اس کے لیے قواعد و ضوابط کی تدوین و ترویج آہستہ آہستہ اور بتدریج ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدما کے یہاں زیادہ متوسطین کے یہاں کم اور متاخرین کے کلام میں کمتر لفظی ڈھیل نظر آتی ہے چنانچہ اردو میں یہی ہوا ہے۔ ولی سے داغ و امیر تک پہنچتے پہنچتے سیکڑوں لفظوں کی ہیئت بدل گئی اور دہائیوں الفاظ متروک قرار دے دیئے گئے اس لیے کسو، کبھو، ایدھر، اودھر، جاوے اور آوے وغیرہ الفاظ کسی شعر میں پائے جائیں، تو وہ گدھے کا کلام نہ ہوگا۔ کسی متقدم استاد ہی کا ہوگا۔



حواشی

(1) کلیات نظم فارسی 538، طبع نول کشور لکھنؤ 1279ھ
(2) ایضاً، 13
(3) کلیات نظم فارسی 17، طبع نول کشور لکھنؤ 1279ھ
(4) ایضاً 18
(5) عود ہندی 165، طبع مجتبائی دہلی 1258ھ و خطوط غالب 117/1، طبع الہ آباد 1941
(6) اردو معلیٰ 298 طبع دہلی 1285ھ عود ہندی 48 و خطوط غالب 135/1
(7) خطوط غالب 18/1
(8) عود ہندی 21
(9) عقد ثریا 46، طبع دہلی 1934
(10) تذکرہ کاملان رام پور طبع دلی 1929
(11) اردوئے معلیٰ 293 وخطوط غالب 293/1
(12) کلیات امیر ناصر خسرو 64 طبع تبریز 1280ھ
(13) دیوان منوچہری طبع تہران 1338
(14) دیوان حکیم سنائی طبع مصفاہ 35
(15) دیوان قطران 247، طبع تبریز 1333
(16) ایضاً 252
(17) ایضاً 343

غالب کے ثقلِ سماعت کی تاریخ

مخدومی پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی کا ایک مراسلہ مندرجہ بالا عنوان کے تحت ہماری زبان مورخہ یکم جولائی میں شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے غالب کے ثقلِ سماعت کی تاریخ بیان کی ہے۔ میں نے مکاتیب غالب (ص 195، طبع چہارم، 1946) میں اس پر کچھ مسالہ اکٹھا کیا تھا جو ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔ (عرشی)

آل محمد مارہروی نے دیوان تواریخ 1640 میں ایک قطعہ تاریخ لکھا ہے جس کا عنوان ہے "تاریخ کرشدن مرزا اسداللہ خاں المتخلص بہ غالب والمشہور بہ مرزا نوشہ دہلوی" خود قطعہ یہ ہے:

کان بہرے میرزا نوشہ کے آہ   بیٹھے بیٹھے یک بیک کیونکر ہوئے

دوستو تاریخ اس کی غیب سے   یوں سنی میں نے کہ "غالب کر ہوئے"

اس مادۂ تاریخ سے اعداد 1274 نکلتے ہیں جو سال ہجری ہے اور 22 اگست 1857 تا 17 اگست 1858 سے تطابق رکھتا ہے۔ لیکن جیسا کہ آئندہ عرض کروں گا، یہ تاریخ ایک غلط فہمی کی بنا پر نکالی گئی ہے۔ دراصل میرزا صاحب اس سے برسوں پہلے بہرے ہو چکے تھے، چنانچہ 10 دسمبر 1852 کو تفتہ کے نام کے خط میں لکھتے ہیں: "بوڑھا ہو گیا ہوں، بہرہ ہو گیا ہوں۔" (اردوی: 113) یک شنبہ 19 / دسمبر سنۂ بالا کو منشی نبی بخش کے خط میں، جن کی بینائی میں ضعف آگیا تھا، لکھتے ہیں کہ "کاروانِ مارا ہمیں شنیدن و دیدن و گفتن و رفتن متاع است، چرا بتاراج زود۔ یکی را گوش گرانست، تا ہمنشین چہ سراید؟ یکی را چشم نگرانست تا کہ می آید۔" (باغ دودر: 61 الف) یہ بہرے ہونے کی تاریخ سے متعلق ان کے قطعی اور تصریحی بیانات ہیں۔ لیکن ہم

ہماری زبان، 22 جولائی 1962

اس تاریخ کو اور پیچھے لے جا سکتے ہیں۔ ایک فارسی خط میں شفق کو تحریر کیا ہے: ''اکنون کہ دندان فرو ریخت، و گوش گراں گشت، موئے سپید ست دردی پُر آژنگ، دست بلرزہ اندر است و پائے درد کا بد'' (پنج آہنگ: 448 طبع دوم) اس خط میں جواں بخت کے سہرے کا قضیہ دہرایا ہے، میرزا صاحب کا سہرا، ذوق کا جواب اور میرزا صاحب کی معذرت، یہ سب دہلی اردو اخبار، مورخہ 6 جمادی الاولیٰ 1268ھ، (28 مارچ 1852) میں شائع ہوئے تھے۔ غالباً اس اخبار کو پڑھ کر شفق نے استفسار حال کیا، اور یہ سب کچھ اس واقعہ کے فوراً بعد پیش آیا، اس لیے کہ میرزا صاحب نے بیان واقعہ سے پہلے لکھا ہے، تا دیدہ دران از دور بنگرند کہ نامہ نگار را مژہ خون فشانست و دل دردمند۔'' ظاہر ہے کہ دل کی دردمندی اور مژہ کی خوں فشانی زیادہ دیر تک باقی نہیں رہ سکتی اور کچھ ہو بھی تو اتنی تو یقیناً نہ ہوگی کہ اسے ایسے پُردرد انداز سے بیان کیا جائے۔ لہٰذا میرزا صاحب کو 1852 کے آخر کی بجائے اب آغاز میں بہرہ ہونا چاہیے۔

سرور کے خط میں فرماتے ہیں: میں پانچ سات برس سے بہرہ ہو گیا ہوں (عود ص 11)، یہ خط ان کے نام کے خطوں میں دوسرا ہے، اور تیسرا خط پنجشنبہ 18/ نومبر 1858 کو لکھا گیا تھا، اس بنا پر اسے بھی 1858 ہی کا ہونا چاہیے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر میرزا صاحب کے اس تخمینے کے پیش نظر انھیں 1851 میں بھی ثقل سماعت کا مریض ہونا چاہیے۔

میرزا صاحب ایک فارسی قصیدے میں، جو واجد علی شاہ کی مدح میں ہے اور کلیات (ص 321) میں چھپ چکا ہے، فرماتے ہیں:

فغاں ز پیری در بخوری و گرانی گوش
کہ کرد ایں ہمہ دشوار، کار آساں را

یہ قصیدہ واجد علی شاہ کے مدحیہ قصیدوں میں دوسرا ہے، تیسرا قصیدہ لکھنؤ کی کربلائے معلیٰ میں تزک و احتشام کے ساتھ ضریح لے جانے سے متعلق ہے، ضریح کا واقعہ تاریخ اودھ (2/ 100) کے مطابق پنجشنبہ 26/ شعبان 1270ھ (25/ مئی 1854) کو پیش آیا تھا، لہٰذا میرزا صاحب نے قصیدہ سنہ 1854 ہی میں لکھا ہوگا، پہلے قصیدے کی تاریخ ابھی تک متعین نہیں ہو سکی ہے، دوسرا قصیدہ میری رائے میں 1849 کے آخر میں لکھا گیا ہے، اس لیے کہ اس میں میرزا صاحب فرماتے ہیں:

کہ گفتہ است در آئین بزم سور و سرور   کہ فرخی نبود روزہای آباں را

سن از درازی شبہائے قوس پندارم — کہ بہر انجمن آرد فلک زمستاں را
خوشا درازی شب زانکہ گر بود تاریک — درنگ در نظر افزوں بود چراغاں را
دگر بود شب مہ نیز بزم عیش آرای — بعرصہ دیر نگہدار ماہ تاباں را

ان شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ قصیدہ لکھتے وقت ماہِ آباں کی راتیں تھیں، اور آفتاب برج قوس میں براجمان تھا، آبان ایرانی سال کا آٹھواں مہینہ ہے اور انگریزی مہینوں میں سے نومبر کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے، پنج آہنگ (ص 412) طبع ثانی، میں میرزا صاحب کا ایک خط میرزا حیدر کے نام ہے، اس میں لکھتے ہیں کہ ''درسر آغاز سال گریختہ درمدح... سلطان عالم (واجد علی شاہ) قصیدۂ انشا کردم۔ عرضداشتی در نثر نیز رقم زدم و آں قصیدہ و عرضداشت بہ قطب الدولہ فرستادم، قطب الدولہ مردی کرد و قصیدہ و عرضداشت بنظر جہان بان دارا دربان درآورد... پسندیدۂ طبع بلند شہریار افتاد و بہ قطب الدولہ فرمان رفت کہ بہنگامِ دگر عرضداشت را دوبارہ بنظر گزراند... ناگاہ انجمن برہم خورد، وکار قطب الدولہ از پرکار افتاد، بیچارہ آن قصیدہ و آں عرضداشت را ہم چناں بسوے من برگرداند۔'' اس کے بعد مرزا حیدر سے درخواست کی ہے کہ آپ اس قصیدے اور عرضداشت کو پیش کر کے صلہ دلائیے۔

قطب الدولہ کے اخراج کا واقعہ تاریخ اودھ (ج2، 85) کے مطابق یک شنبہ 2/رجب 1266 ہجری (2/جون 1850) کو پیش آیا تھا، میرے نزدیک یہی قصیدۂ دوم تھا، جو قطب الدولہ کی معرفت پیش ہوا تھا، اس لیے کہ میرزا صاحب نے آغاز سال گزشتہ میں اس کے بھیجنے کا ذکر کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ جو قصیدہ جنوری میں بھیجا جائے گا، وہ نومبر اور دسمبر ہی میں لکھا جانا چاہیے۔

ان دلائل کے ثابت ہو جانے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ میرزا صاحب اس کے لکھتے وقت بہرے تھے اور چونکہ وہ نومبر سنہ 1849 میں لکھا گیا ہے، لہٰذا آخر سنہ مذکور میں انھیں اس مرض میں مبتلا ہونا چاہیے۔

میرزا صاحب نے ایک فارسی قصیدہ آزردہ کی مدح میں لکھا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں:

نالم از درد دل، اما چارہ چوں خواہم زکس
من کہ نتواند بگوش من رسد آدای من

اس شعر میں اپنے ضعف کا بمبالغہ بیان مقصود ہے، یعنی میرا حال کمزوری سے یہ ہو گیا

ہے کہ منہ سے آواز نہیں نکلتی، یا نکلتی ہے تو بے حد پست، حتیٰ کہ میں خود اسے نہیں سن سکتا، پھر ایسی حالت میں کسی سے کیا اعانت کی امید رکھوں، وہ میری کب سن سکے گا جو مدد کو آگے بڑھے مگر میرا خیال ہے کہ میرزا صاحب نے یہ مضمون اپنے بہرے پن کی حالت سے پیدا کیا ہو، تو کچھ بعید نہیں، اگر یہ خدشہ درست ہے، تو انھیں 1845 (1261ھ) سے قبل سے بہرہ ہونا چاہیے اس لیے کہ یہ قصیدہ سن مذکور کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہونے کے باعث اس سے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔

نتیجۂ بحث یہ ہے کہ میرزا صاحب 1852 میں بالیقین بہرے تھے، سنہ 1849 میں گمان غالب ہے کہ بہرے ہوں اور سنہ 1845 میں ان کے بہرے ہونے کا احتمال ہے۔ آل محمد مارہروی کو یوں غلط فہمی ہوئی کہ میرزا صاحب نے سرور کے 18/نومبر 1858 کے خط میں صاحب عالم مارہروی کو مخاطب کر کے لکھا تھا کہ ''اگرچہ 63 برس کی عمر میں بہرہ ہو گیا ہوں، پر بینائی میں فتور نہیں'' (عود: 13) اس سے میرزا صاحب کا مقصد صرف یہ تھا گو بہرہ ہوں، مگر اس بڑھاپے میں بھی نگاہ تیز ہے، آل محمد صاحب یہ سمجھے کہ 63 برس کی عمر میں بہرا پن شروع ہوا۔



غالب کا معیارِ سخن

تتبع اساتذہ

میرزا صاحب اساتذۂ زبان کے پیرو تھے، گو اردو کے بارے میں انھوں نے اپنے متعلق کہا ہے کہ ''اس امر کے مالک اور اہل زبان ہم ہیں۔'' لیکن نواب علی بہادر، والی باندہ کو یہی مشورہ دیا ہے کہ ''از ریختہ گویان گفتارِ میر و میرزا— درنظر داشتہ باشند۔''

(کلیات نثر، پنج آہنگ، ص 232)

فارسی میں خود بھی اہل زبان سے استناد کرتے ہیں اور شاگردوں کو بھی اِسی کی ہدایت فرماتے ہیں کہ ''لغت فارسی اور روزمرہ، فارسی ہو، تو اہلِ زبان کے کلام سے سند کریں۔'' (خطوط: 1/183) اور اس امر میں اپنے معاصرین سے استفادے کو بھی موجب عار نہیں جانتے۔

سرور کو لکھا ہے:

> ''حضرت کو یہ معلوم رہے کہ میں اہل زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرؔو دہلوی کے سب کا منکر ہوں جب تک قدما یا متاخرین میں مثل صائبؔ و کلیمؔ و اسیرؔ و حزیںؔ کے کلام میں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا، اُس کو نظم اور نثر میں نہیں لکھتا۔
>
> جن لوگوں کے محقق ہونے پر اتفاق ہے جمہور کو، اُن کا حال کیا گزارش کروں؟— ایک اس میں 'برہانِ قاطع' ہے۔''

میرزا تفتہ کو تحریر کرتے ہیں:

> ''اہل ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں۔ میاں فیضی کی

سالنامہ 'نگار' جنوری 1961

بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے، جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا، وہ لکھ دیا، نظامیؔ و سعدیؔ وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو، تو ہم اُس کو مانیں، ہندیوں کو کیوں مسلم الثبوت جانیں؟''

(اردو 359، لاہور ایڈیشن خطوط 1، 100)

بیخبر کو لکھا ہے:

''فقیر نے اساتذہ کے کلام میں کہیں یہ ترکیب نہیں دیکھی۔ آپ جب تک کلام اہل زبان میں نہ دیکھ لیں، اُس کو جائز نہ جانیے گا۔ مگر کلام سعدیؔ و نظامیؔ و حزیںؔ اور ان کے امثال و نظائر کا معتمد علیہ ہے، نہ آرزوؔ اور واقفؔ اور قتیلؔ وغیرہم کا۔'' (عود: 133)

ایک اور خط میں پھر سرور کو لکھا ہے:

''ہندوستان کے سخنوروں میں حضرت امیرؔ خسرو دہلوی، علیہ الرحمہ کے سوا کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا، خیر، فیضی بھی نغز گوئی میں مشہور ہے کلام اس کا پسندیدہ جمہور ہے۔

منتؔ اور مکینؔ اور واقفؔ اور قتیلؔ، یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے۔ کلام میں اُن کے مزا کہاں؟ ایرانیوں کی سی ادا کہاں؟

فارسی کی قاعدہ دانی میں اگر کلام ہے، اس میں پیروی قیاس وبائے عام ہے۔ وارستہ سیالکوٹی نے خان آرزوؔ کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے، اور ہر اعتراض بجا ہے، بایں ہمہ، وہ بھی جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے، منہ کی کھاتا ہے۔ مولوی احسان اللہ ممتاز کو صنایع لفظی میں دستگاہ اچھی تھی اور شیوہ و روش کو خوب برت گئے۔ فارسی وہ کیا جانیں۔ قاضی محمد صادق اخترؔ عالم ہوں گے۔ شاعری سے اُن کو کیا علاقہ!'' (عود: 43)

راہِ سخن کے غول

ہندی شاعروں اور ادیبوں کا نام میرزا صاحب نے راہ سخن کے غول رکھا تھا۔ خلیفہ شاہؔ محمد، مادھو رام غنیمتؔ اور قتیلؔ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نواب انور الدولہ بہادر شفقؔ کو لکھا ہے:

''یہ لوگ سخن کے غول ہیں، آدمی کے گمراہ کرنے والے۔ یہ فارسی کو کیا جانیں، ہاں طبع موزوں رکھتے تھے، شعر کہتے تھے:

ہرزہ مشاب و پئے جادہ شناساں بردار
اے کہ در راہ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت''

(اردوئے معلیٰ:299)

اصل الاصول

ان کی رائے میں فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسبت، طبیعت اور تتبع کلام اہلِ زبان ہے۔ سرور کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسبت طبیعت کی ہے، پھر تتبع کلام اہل زبان۔ لیکن نہ اشعار قتیل و واقف۔ جب رودکی و عنصری و خاقانی و رشید وطواط اور ان کے امثال و نظائر کا کلام بالاستیفا دیکھا جائے، اور ان کی ترکیبوں سے آشنائی بہم پہنچے، اور ذہن اعوجاج کی طرف نہ لے جائے، تب آدمی جانتا ہے کہ فارسی یہ ہے۔'' (اردوئے معلیٰ:8)

نواب علی بہادر کو اصلاح اشعار کے سلسلہ میں از راہ نصیحت لکھا ہے:

''اگر پژوہش ایں راز ومحرومی پردۂ ایں ساز آرزو دارند، از ریختہ گویان گفتار میر ومیرزا، و از زمزمۂ پارسی گویان، کلام صائب و عرفی و نظیری وحزیں درنظر داشتہ باشند، نہ درنظر داشتی کہ سواد ورق از دیدہ بدل نیاید، بلکہ ہمہ کوشش دران دود کہ جوہر لفظ راشناسند، و نہ درنظر را بنگرند وسرہ را از ناسرہ جدا کنند۔''

(کلیاتِ نثر، پنج آہنگ:232)

تتبع لہجہ

اسی طرح وہ اس کو بھی ناپسند کرتے تھے کہ اہل ایران کے لہجہ کا اتباع کیا جائے کہ یہ ایک خلقی وصف اور اس لیے ناقابل تتبع ہے۔ چنانچہ قدر بلگرامی کو لکھا ہے:

''تحریر میں اساتذہ کا تتبع کرو، نہ مغل کے لہجہ کا۔ لہجہ کا تتبع بھانڈوں کا کام

ہے، نہ دبیروں اور شاعروں کا ایسے تتبع کو میرا سلام۔"

(کلیاتِ نثر، پنج آہنگ: 1/179)

آغاز شعر گوئی

میرزا صاحب نے ابتدائی سن تمیز ہی سے شعر گوئی شروع کردی تھی۔ مگر اُس وقت کیا عمر تھی، اس بارے میں خود ان کے بیان میں اختلاف ہے، کلیات فارسی کے خاتمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"از روزی کہ شمارۂ سنین عمر از آحاد فراترک رفت، و رشتۂ حساب زحمت یازدھمین گرہ بخود برگرفت، اندیشہ در روا ردگام فرق برداشت وکریوہ ومغاک بادیہ وسخن پیمودن آغاز نہاد۔" (کلیات 553)

سلطان غلام محمد بہادر کو لکھتے ہیں:

"دردہ سالگی آثار موزونی طبع گرفت۔" (کلیات نثر، پنج آہنگ:249)

قدر بلگرامی کو 57ء میں تحریر کیا ہے:

"بارہ برس کی عمر سے کاغذ، نظم ونثر میں مانند اپنے نامہ اعمال کے سیاہ کررہا ہوں۔ باسٹھ برس کی عمر ہوئی۔ پچاس برس اس شیوے کی ورزش میں گزرے۔" (خطوط:1،177)

شاکر کو بھی یہی تخمینہ تحریر فرماتے ہیں:

"15 برس کی عمر سے 25 برس کی عمر تک مضامین خیال لکھا کیا۔"

(خطوط:198)

ان بیانوں کے پیش نظر، میرزا صاحب کی سخن سرائی کا آغاز 1222ھ (1807ء)۔ 1224ھ (1809ء) اور 1227ھ (1812ء) میں سے کسی ایک سال ہوا تھا۔ ان میں سے راجح قول یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ تقریباً دس برس کی عمر سے شعر گو تھے، کیونکہ کلیات فارسی کا اظہار، جو سب سے قدیم ہے یہی ثابت کرتا ہے، اور اس کی تائید ان کے ہم جولی لالہ کنہیا لال کے بیان سے ہوتی ہے، جسے خواجہ حالی مرحوم نے نقل کیا ہے۔ (عود:159)

ریختہ گوئی پہلا دور

میرزا صاحب کی شاعری کا آغاز ریختہ سے ہوا تھا۔ گل رعنا کے دیباچے میں فرماتے ہیں:

''درآغاز خار خار جگر کاوی شوقم ہمہ صرف نگارش اشعار اردو زبان بود۔''

(یادگار غالب:107)

نساخ کو لکھتے ہیں:

''خاکسار نے ابتدائی سن تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی ہے۔''

(کلیات نثر پنج آہنگ:59)

25 سال کی عمر تک زیادہ تر اردو ہی میں کہتے رہے۔ بعد ازاں فارسی زبان سے فطری لگاؤ کی بنا پر، فارسی میں کہنے لگے — شاکر کو تحریر کیا ہے:

''15 برس کی عمر سے 25 برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا، دس برس میں بڑا دیوان جمع ہوگیا۔'' (عود:159)

نواب شمس الامرا کو رقمطراز ہیں:

''تا بپارسی زبان ذوق سخن یافت، از اں وادی عنان اندیشہ برتافت... کما بیش سی سال ست، کہ اندیشہ پارسی سگال ست۔''

(کلیات نثر، پنج آہنگ:378)

یہ خط اپریل 1853 سے پہلے لکھا گیا تھا — کتاب خانۂ رام پور میں 'پنج آہنگ' کا مطبوعہ نسخہ محفوظ ہے جو مذکورۂ بالا تاریخ کو دہلی کے مطبع دارالسلام سے چھپ کر شایع ہوا تھا۔ اس ایڈیشن میں یہ خط شامل ہے اور اس میں غالب نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ گزشتہ 30 سال سے فارسی میں فکرِ سخن کرتے ہیں۔ اگر ہم اسے 1852 کا تسلیم کر کے مجموعہ میں سے 30 سال وضع کر دیں تو ریختہ گوئی کے خاتمہ اور پارسی سگالی کے آغاز کا سال 1826 قرار پائے گا اور چونکہ وہ 1797 میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے اس وقت اُن کی عمر 25 سال کی ہوگی جو شاکر کے نام کے خط میں ذکر کی جا چکی ہے۔

ریختہ گوئی: دوسرا دور

25 سال کی عمر کے بعد میرزا صاحب فارسی زبان کی نظم و نثر کی طرف زیادہ متوجہ

ہو گئے۔ اس زمانہ میں ریختہ کہنے کا بھی اتفاق ہوا، لیکن فارسی کے مقابلہ میں اُس کی مقدار نہ ہونے کے برابر ہے اسی لیے انھوں نے اس پوری مدت میں آپ کو'فارسی نگار' کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

1850 میں قلعہ سے تعلق پیدا ہوا، تو شاہ ظفر کی بدولت اُن کی ریختہ گوئی نے دوبارہ جنم لیا اور شاہی مشاعروں کے لیے مختلف طرحوں میں طبع آزمائی کرنے لگے۔

غدر کے بعد دلی پر آلام ومصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بادشاہ جلاوطن کیے گئے اور اُن کے ہواخواہ شہر بشہر مارے مارے پھرنے لگے۔ میرزا صاحب کا دل ٹوٹ گیا اور وہ شعروشاعری کو خیر باد کہہ کر زندگی کے دن پورے کرنے لگے۔

تاہم اس زمانہ میں بھی صاحبانِ کرم کے خیال سے کچھ کہنا پڑتا تھا، لیکن ایسے اشعار کی تعداد بہت تھوڑی ہے، اس لیے انھیں پچھلے دور کا تتمہ خیال کرنا چاہیے۔

فارسی نگاری

اگرچہ میرزا صاحب نے ابتدائی سن تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی، لیکن وہ آغاز ہی سے نظم ونثر فارسی کے عاشق تھے۔ اس لیے اُن کا ابتدائی اردو کلام، تخییل اور الفاظ دونوں میں فارسی کہلانے کا زیادہ مستحق ہے۔

بقول خود وہ پچیس سال کی عمر تک، بیدلؔ، شوکتؔ اور اسیرؔ کی طرز پر ریختہ لکھتے رہے۔ تمیز آنے پر طبیعت نے اس خارزار سے باہر نکلنے کی تدبیر سمجھائی اور اُنھوں نے نظیریؔ، عرفیؔ وغیرہ خداوندان سخن کے کلام کا مطالعہ کر کے، اُن کی راہ پر گامزنی شروع کی۔

تعریف سخن

میرزا صاحب سخن کی تعریف میں فرماتے ہیں:

''سخن... گراں ارز متاع عالم قدس است۔'' (کلیاتِ نثر، پنج آہنگ:307)

اس متاع قدس کو قدرت نے کیا کچھ اوصاف عطا کیے ہیں، اس کے متعلق دیباچۂ دیوان فارسی میں لکھتے ہیں:

''سخن رادوشیزگی نہاد، وپاکیزگی گوہر، وبرشتگی مضمون وگداختگی نفس وچاشنی

سپاس و نمک شکوہ و نشاط نغمہ، و اندوہ شیون، و روائی کار، و رسائی بار، و پردہ کشائی راز، و جلوہ فروشی نوید و سازگاری آفریں و دلخراشی نکوہش، و ہمواری صلا، و درشتی دور باش، و گزارشِ وعدہ، و سپارشِ پیام، و بار نامۂ بزم، و ہنگامۂ رزم حاصل۔" (کلیات فارسی:8)

تعریف شعر

لیکن محفل ادب میں جس 'سخن' کو یاد حاصل ہے، وہ ایک معشوقۂ پری پیکری ہے، تقطیع شعر اُس کا لباس اور مضامین اُس کا زیور ہے۔ دیدہ وروں نے شاہدِ سخن کو اس لباس اور اس زیور میں روکش راہ تمام پایا ہے۔"

اس شاہد کی تعریف، اس کے مدارجِ حسن اور اختلاف روش وطرزِ سخن گوئی اور اُس کے داخلی و خارجی اوصاف کی تاثیر کے متعلق فرماتے ہیں:

''گفتار موزوں کہ آں را شعر نامند، در ہر دل جائے دیگر، و در ہر دیدہ رنگی دیگر و سخن سرایان را ہر زخمہ جنبشی دیگر، و ہر ساز آہنگی دیگر دارد۔''

(کلیاتِ نثر، پنج آہنگ:242)

لیکن 'گفتار موزوں' کے الفاظ میں قدرے ابہام تھا، جس سے سیکڑوں دماغ گمراہ ہو گئے تھے، اس لیے مزید صراحت کرتے ہیں کہ:

''شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں ہے۔'' (خطوط:1،84)

اوصاف شعر

میرزا صاحب کے حسب ذیل بیانات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اُن کے نزدیک شعر کے لیے کیا اوصاف درکار ہیں ایک قصیدہ کی تعریف میں لکھتے ہیں:

''ہزار آفریں، کیا اچھا قصیدہ لکھا ہے! واہ، واہ! چشم بدور! تسلسل معانی سلاست الفاظ۔'' (خطوط:1،79)

مہر کے قصیدہ کے متعلق فرماتے ہیں:

''انشاء اللہ خاں کا بھی قصیدہ میں نے دیکھا ہے، تم نے بہت بڑھ کر لکھا ہے

اور اچھا سماں باندھا ہے۔ زبان پاکیزہ، مضامین اچھوتے، معانی نازک، مطالب کا بیان دلنشین۔" (اردوئے معلی: 265، خطوط 1، 298)

شفق کی ایک فارسی غزل کے متعلق تحریر کیا ہے:

"کیا پاکیزہ زبان ہے، اور کیا طرز بیان!"

(اردوئے معلی: 313، عود: 54، خطوط: 1، 132)

بیخبر کی غزل کی داد دیتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

"رام پور ہی میں تھا کہ اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر فروز ہوئی۔ کیا کہنا ہے۔ 'ابداع' اس کو کہتے ہیں۔ 'جدت طرز' اس کا نام ہے۔ جو ڈھنگ تازہ ایوان ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا، وہ تم بروئے کار لائے ہو۔"

(اردوئے معلی: 279، خطوط: 1، 298)

مہر کی غزل کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سحر ہوگی، خبر ہوگی، اس زمین میں وہ شعر، یعنی:

تمھارے واسطے دل سے مکاں کوئی نہیں بہتر
جو آنکھوں میں تمھیں رکھوں، تو ڈرتا ہوں، نظر ہوگی

کتنا خوب ہے، اور اردو کا کیا اچھا اسلوب ہے!"

(اردو معلی: 268، عود: 111، خطوط: 1، 305)

مہر کی مثنوی کے بارے میں فرماتے ہیں:

"مثنوی پہنچی، جھوٹ بولنا میرا شعار نہیں، کیا خوب بول چال ہے۔ انداز اچھا، بیان اچھا، روزمرہ صاف، حبشنوں کا استغاثہ، کیا کہوں کیا مزہ دے رہا ہے۔" (عود: 117، خطوط 1، 297)

تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"پر جو تم نے التزام کیا ہے ترصیع کی صنعت کا اور دولخت شعر کہنے کا اس میں ضرور نشست معنی بھی ملحوظ رکھا کرو۔" (خطوط: 18)

اپنی ایک غزل کے متعلق نساخ لکھنوی کو تحریر کیا ہے:

"غزلی کہ اندرین روزہا بتازگی در روش تازہ گفتہ ام، بعد عذر خواہی تقصیر کوتہ

قلمی بر حاشیہ مکتوب می نگارم۔" (کلیات نثر، پنج آہنگ، 113)

امیر اللہ سرورؔ کو حیدر علی افصحؔ کی غزل کے متعلق لکھتے ہیں:

"روشی پسندیدہ و طرزی گزیدہ دارد، وہمیں است شیوۂ مکرمی شیخ امام بخش ناسخؔ و خواجہ حیدر علی آتشؔ و دیگر تازہ خیالان لکھنؤ۔"

(کلیات نثر، پنج آہنگ: 125)

سرورؔ کے ایک شعر کی ان الفاظ میں داد دیتے ہیں:

"رجب علی بیگ نے جو 'افسانۂ عجائب' لکھا ہے، آغاز داستان کا شعر اب مجھ کو بہت مزا دیتا ہے:

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ یاد رکھنا، فسانہ ہیں ہم لوگ

مصرعہ ثانی کتنا گرم ہے، اور یاد رکھنا، فسانے کے واسطے کتنا مناسب۔"

(اردوئے معلی: 105، خطوط: 1، 38)

نواب باندہ کے اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"زہی لطف طبع، وحدت ذہن، وسلاست فکر، وحسن بیان، ہرگاہ در آغاز چنین بودہ اند، بشرط دوام ورزش و التزام مشق، حقا کہ دراندک مایہ مدت علم یکتائی خواہند افراشت۔" (کلیات نثر، پنج آہنگ: 232)

جنوںؔ بریلوی کو تحریر کیا ہے:

"عربی میں تعقید لفظی و معنوی دونوں معیوب ہیں، فارسی میں تعقید معنوی عیب اور تعقید لفظی جائز ہے، بلکہ فصیح اور ملیح۔ ریختہ تقلید ہے فارسی کی۔"

(خطوط: 1، 126)

ناسخؔ مرحوم کے متعلق فرماتے ہیں:

"مولانا ناسخ کہ در سخن طرح نوی ریختۂ اوست، دو ریختہ نقش بدیع انگیختہ او"

(کلیات نثر، پنج آہنگ 72)

انھیں کے بارے میں یہ بھی کہا ہے:

"سبحان اللہ! سخن بروزگار مخدوم بپایۂ بلند رسید، وار دو را رونق دیگر پدید آمد۔"

(کلیات نثر، پنج آہنگ، 113)

نساؔخ کو لکھا ہے:

''شیخ امام بخش طرز جلسہ کے موجد اور پرانی ناہموار روشوں کے ناسخ تھے۔''

(اردوئے معلی: 204، عود: 145)

خود اپنے کلام کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

''میرا فارسی دیوان جو دیکھے گا، وہ جانے گا کہ جملے کے جملے مقدر چھوڑ جاتا ہوں۔'' (خطوط: 1، 25)

لیکن میرزا صاحب کے نزدیک جملوں کو مقدر چھوڑنے کے لیے ضروری ہے کہ سننے والے کا ذہن حذف شدہ الفاظ کی طرف بسہولت منتقل ہو سکے، ورنہ وہ اس کو عیب شمار کرتے تھے۔ میر مہدی مجروؔح کو لکھا ہے:

می خواہم از خدا و نمی خواہم از خدا
دیدنِ حبیب را و ندیدنِ رقیب را

لف ونشر مرتب ہے:

'می خواہم از خدا دیدن حبیب   نمی خواہم از خدا ندیدن رقیب را

خوار و زار و خستہ و سوگوار۔'' (خطوط: 1، 276)

نساؔخ کے دیوان پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میں دروغ گو نہیں، خوشامد میری خو نہیں۔ دیوان فیض عنوان اسم بامسمیٰ ہے۔ دفتر بےمثال، اس کا نام بجا ہے۔ الفاظ متین، معانی بلند، مضمون عمدہ، بندش دل پسند۔'' (اردوئے معلی: 204، عود: 125)

عیوب شعر

محاسن شعر کے ساتھ عیوب پر میرزا صاحب کا نقطۂ نگاہ دریافت کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ جیسا کہ کئی جگہ ذکر کیا گیا ہے، وہ ابتداً بیدؔل کی پیروی میں کوشش کر کے ایسا خیال نظم کرتے تھے، جو عام دماغوں کی دسترس سے باہر ہو۔ لیکن آخر میں اس سے خود بھی احتراز کرنے لگے تھے اور شاگردوں کو بھی اس سعی ناشکور سے باز رکھتے تھے۔ جنوؔن بریلوی کو لکھتے ہیں:

"قطرۂ مے بس کہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اس مطلع میں خیال ہے دقیق، مگر کوہ کندن و کاہ برآوردن یعنی، لطف زیادہ نہیں۔" (خطوط: 1، 125)

اسی طرح میرزا صاحب کو یہ بھی ناپسند تھا کہ مطلع میں تخلص باندھا جائے۔ قدر کو لکھتے ہیں:

"مطلع میں نام اپنا لکھنا رسم نہیں ہے۔ میر کا تخلص اور صورت رکھتا ہے میر جی اور میر صاحب کر کے وہ اپنے کو لکھ جاتا ہے۔ اور کو اس بدعت کا تتبع نہ چاہیے۔" (خطوط: 1، 193)

دیوان کی پہلی غزل کے مطلع میں حروف والفاظ کی قید کے بھی قایل نہ تھے۔ قدر ہی کو لکھا ہے:

"آغاز دیوان کے شعر، یعنی مطلع میں ہرگز حروف و الفاظ کی قید نہیں ہے، ہاں ردیف الف کی، یہ امر قابل پرستش کے نہیں، بدیہی ہے۔ دیکھ لو اور سمجھ لو۔ یہ جو دیوان مشہور ہیں، حافظ و صائب و سلیم و کلیم، ان کے آغاز کی غزل کے مطلعے دیکھو اور حروف و الفاظ کا مقابلہ کرو، کبھی ایک صورت ایک ترکیب، ایک زمین، ایک بحر نہ پاؤں گے، چہ جائے اتحاد حروف و الفاظ؟ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔" (خطوط: 1، 194)

توارد کے متعلق میرزا صاحب کی یہ رائے تھی کہ اگر پس رو شاعر اپنے پیشرو سے مضمون آفرینی یا طرز ادا میں زیادہ لطف و خوبی پیدا کردے، تو یہ اُس کے لیے قابل فخر بات ہے۔ میرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:

"ایک مصرع میں تم کو محمد اسحاق شوکت بخاری سے توارد ہوا۔ یہ بھی محل فخر و شرف ہے کہ جہاں شوکت پہنچا، وہاں تم پہنچے۔ وہ مصرع یہ ہے:

چاک گردیدم و از حبیب بداماں رفتم

پہلا مصرع تمھارا، اگر اُس کے پہلے مصرع سے اچھا ہوتا، تو میرا دل اور زیادہ خوش ہوتا۔" (خطوط: 1، 79)

میرزا صاحب کو خواہ مخواہ قیود کا التزام بھی ناپسند تھا، تفتہ نے شاید اپنے قصاید کو حروف

تہجی پر مرتب کرنے کا ارادہ کیا تھا۔
انھیں لکھتے ہیں:

''خبردار، قصاید بقید حروف تہجی نہ جمع کرنا۔'' (خطوط: 1، 79)

غالباً کچھ محقق انگریزی الفاظ نیز اُن مصطلحات کو جو سرکاری دفاتر کی پیداوار تھے یا انگریزی تہذیب وتمدن کی بدولت مروج ہوئے تھے، ٹکسال باہر جانتے تھے اور اپنے روزمرہ میں اُن کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے۔ میرزا صاحب نے اس کے متعلق 1855 میں قدر بلگرامی کو لکھا ہے:

''چابی، لغت انگریزی ہے۔ اس زمانہ میں اس اسم کا شعر لانا جائز ہے، بلکہ مزا دیتا ہے۔ تار۔ بجلی اور دخانی جہاز کے مضامین میں نے اپنے یاروں کو دیے ہیں، اوروں نے بھی باندھے ہیں۔ روبکاری اور طلبی اور فوجداری اور سررشتہ داری، خود یہ الفاظ میں نے باندھے ہیں۔'' (خطوط: 1، 188)

لیکن عام طور پر میرزا صاحب انتخاب الفاظ میں بہت محتاط تھے۔ قاضی عبدالجمیل بریلوی کو 1864 میں ہدایت کی ہے کہ کایتھوں کی اردو سے بچیے۔ فرماتے ہیں:

''گھات میں مدعا برآری کی ہم نے غیروں کی غمگساری کی
تقدیم و تاخیر مصرعتیں کرکے رہنے دو، اس میں کوئی سقم نہیں، مدعا برآری، کایتھوں کا لفظ ہے۔ میں اس طرح کے الفاظ سے احتراز کرتا ہوں مگر چونکہ من حیث المعنی یہ لفظ ہے، مضائقہ نہیں۔'' (خطوط: 1، 125)

قصیدے کے اخیر میں ایسے الفاظ جو خاتمہ پر دلالت کرتے ہوں، نہ لانے کو بھی میرزا صاحب عیب جانتے تھے ایطا بھی اُن کے نزدیک عیب تھا۔ چنانچہ ایک مکتوب میں تفتہ کو بگڑ کر لکھا ہے:

''حضرت، اس غزل میں 'پروانہ، وپیانہ، وبتخانہ، تین قافیے اصلی ہیں۔ ودیوانہ، چونکہ علم قرار پاکر ایک لغت جداگانہ مشخص ہوگیا ہے، اس کو بھی قافیۂ اصلی سمجھ لیجیے۔ باقی 'غلامانہ' 'مستانہ' 'مردانہ' 'ترکانہ' 'دلیرانہ' 'شکرانہ' سب ناجائز و نامستحسن، ایطا اور ایطا بھی قبیح... یاد رہے ساری غزل میں ومردانہ، یا مستانہ، یا ان کے نظائر میں سے ایک جگہ آوے، دوسری بیت میں زنہار نہ

آوے۔ یہ غزل نظر ہوگئی۔" (خطوط:1، 98)

غزل کے اشعار کی زاید تعداد بھی پسند نہ تھی۔ فرماتے ہیں:

"ایک بات اور تمھارے خیال میں رہے، میری غزل پندرہ سولہ بیت کی بہت شاذ و نادر ہے، بارہ بیت سے زیادہ اور نو شعر سے کم نہیں ہوتی۔"

(اردوئے معلی: 309، خطوط: 1، 393)

میزان شعر

میرزا صاحب نے ایک میزان شعر مقرر کردی تھی۔ تا کہ اُس پر فارسی و اردو کے تمام شاعروں کے کلام کو پرکھا جا سکے۔ میزان یہ ہے کہ

(1) رودکی وفردوسی سے لے کر خاقانی و سنائی و انوری وغیرہم تک ایک گروہ ان حضرات کا کلام تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے۔

(2) پھر حضرت سعدی طرزِ خاص کے موجد ہوئے۔ سعدی و جامی و ہلالی، یہ اشخاص متعدد نہیں۔

(3) فغانی ایک اور شیوۂ خاص کا مبدع ہوا۔ خیالہائے نازک و معانی بلند لایا۔ اس شیوے کی تکمیل کی ظہوری ونظیری وعرفی ونوعی نے سبحان اللہ قالب سخن میں جان پڑگئی۔

(4) اس روش کو بعد اس کے صاحبانِ طبع نے سلاست کا چربا دیا۔ صائب وکلیم وسلیم وقدسی و حکیم شفائی، اس زمرے میں ہیں۔ رودکی واسدی وفردوسی، یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا اور سعدی کی طرز نے، بسبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا۔ فغانی کا انداز پھیلا، اور اُس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے۔ تو اب طرزیں تین ٹھہریں:

(1) خاقانی، اُس کے اقران (2) ظہوری، اُس کے امثال (3) صائب اُس کے نظایر۔

خالصتاً للہ! ممتاز واخز وغیرہم کا کلام، ان تینوں طرزوں میں کس طرز پر ہے؟ بے شبہ فرماؤ گے کہ یہ طرز اور ہی ہے۔ پس تو ہم نے جانا یہ طرز چوتھی ہے۔ کیا کہنا ہے! خوب طرز ہے! اچھی طرز ہے! مگر فارسی نہیں ہے، ہندی ہے دار الضرب شاہی کا سکہ نہیں ہے۔ ٹکسال باہر ہے۔ داد، داد! انصاف انصاف!

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار ز یک جام اند در بزمِ سخن مست

ولے با بادۂ بعضی حریفان خمار چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر، کہ در اشعار این قوم ورائے شاعری 'چیزے دگر' ہست

وہ 'چیزے دگر' پارسیوں کے حصہ میں آئی ہے۔ ہاں، اردو زبان میں اہل ہند نے وہ چیز پائی ہے۔ میر تقی، علیہ الرحمۃ۔

بدنام ہوگئے جانے بھی دو امتحان کو رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو
سودا: دکھلایئے، لیجا کے تجھے مصر کا بازار خواہاں نہیں، لیکن، کوئی واں جنس گراں کا
قایم: قایم اور تجھ سے طلب بوسے کی، کیونکر مانوں! ہے تو نادان، مگر اتنا بھی بدآموز نہیں
مومن خاں: تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ناسخ کے ہاں اکثر اور آتش کے ہاں بیش تر، یہ تیر و نشتر ہیں۔ مگر مجھے اُن کا کوئی شعر اس وقت یاد نہیں آتا۔"

اس طرح گفتار کا نام میرزا صاحب نے 'شیوۂ بیانی' رکھا تھا، اور شیوہ بیان شاعر کے لیے ان چار اوصاف کو لازم قرار دیا تھا:

"سخن عشق و عشق سخن، کلام حسن و حسن کلام۔" (کلیات نثر: 83)

سہل ممتنع

اگر مذکورہ بالا اوصاف کو ایک جامع و مانع لفظ سے ادا کرنا چاہیں، تو کہہ سکتے ہیں کہ شعر کی خوبی اور اُس کا حسن یہ ہے کہ "سہل ممتنع" ہو۔ میرزا صاحب نے بھی اسی صفت کو حسن بیان کی معراج قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> "سہل ممتنع اُس نظم کو کہتے ہیں کہ دیکھنے میں آسان نظر آئے اور اس کا جواب نہ ہوسکے۔ بالجملہ سہل ممتنع، کمال حسن کلام ہے اور بلاغت کی نہایت ہے۔ ممتنع، درحقیقت ممتنع النظیر ہے۔
>
> شیخ سعدی کے بیشتر فقرے اس صفت پر مشتمل ہیں اور رشید وطواط وغیرہ شعرائے سلف نظم میں اس شیوے کی رعایت منظور رکھتے ہیں۔ خودستائی ہوتی ہے۔ سخن فہم اگر غور کرے گا، تو فقیر کی نظم و نثر میں سہل ممتنع اکثر پائے گا۔
>
> (عود: 140)

اپنے اشعار کے متعلق میرزا صاحب کا یہ خیال اتنا پختہ ہو گیا تھا کہ وہ اُسے عام ریختہ اشعار سے جداگانہ قسم کا کلام مانتے تھے اور میر و میرزا کے کلام سے بھی بالاتر سمجھتے تھے۔ چنانچہ منشی نبی بخش حقیر کو یہ غزل:

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں، کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں؟!

بھیجی، تو اس کے ساتھ یہ بھی لکھا:

''خدا کے واسطے داد دینا! اگر ریختہ یہ ہے، تو میرزا کیا کہتے تھے؟ اگر وہ ریختہ تھا، تو پھر یہ کیا ہے؟'' (نادرات:26)

اور اتنا ہی نہیں، بلکہ اپنے اشعار ریختہ کو مذہبی اصطلاح میں سحر یا اعجاز بھی قرار دیتے تھے۔ چنانچہ انھیں حقیر کو یہ غزل:

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے
یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

بھیجتے ہوئے مستفسرانہ لکھا ہے:

''داد دینا کہ اگر ریختہ پایۂ سحر یا اعجاز کو پہنچے، تو اس کی صورت یہی ہوگی یا کچھ اور؟'' (نادرات:12)

بھٹئی یا مدح

جو نقاد مشرقی دربار کے سماجی اثرات سے واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ شعرائے مشرق کے لیے سلاطین کی مدح سے راہ گریز نہ تھی اور شاہی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہر شاعر کو الفاظ و معانی کے باغ لگانا پڑتے تھے۔

یہی جذبۂ افسوس ہے جس کے تحت وہ مدح کے اشعار نسبتاً کم لکھتے اور تشبیب و عرض حال وغیرہ پر زیادہ زور دیتے ہیں تا کہ مدح اپنے حدود سے گزر کر بھٹئی نہ بن جائے، تاہم انھوں نے مجبوراً بھٹئی بھی کی۔

لیکن انھیں ودائی اسباب کے تحت جو اُن کے پیش رووں کو لاحق ہوئے تھے یعنی جس نے کچھ دیا، یا جس سے کچھ ملنے کی اُمید بندھی، اُس کی شان میں قصیدہ لکھا، اور جب یہ اُمید

ٹوٹ گئی، اس رسم کو بند کر دیا۔ ظاہر ہے کہ بھٹئی ہی تھی۔ اسی لیے 1860 میں علائی کے نام کے خط میں اس کا خود بھی اعتراف کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''اشعار تازہ مانگتے ہو۔ کہاں سے لاؤں؟ عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورنمنٹ کا بھاٹ تھا۔ بھٹئی کرتا تھا۔ خلعت موقوف، بھٹئی متروک۔ نہ غزل نہ مدح۔'' (اردوئے معلیٰ:435، خطوط:1، 321)

ہزل و ہجو

میرزا صاحب کی سنجیدگی و خودداری نے اُن کے رواں دواں دماغ کو شاعری کی بلند سطح سے اترنے کی اجازت نہیں دی۔ اسی لیے وہ بڑی حد تک ہزل و ہجو سے اپنا دامن بچالے گئے۔ خود بھی فرماتے ہیں:

''ہزل و ہجو میرا آئین نہیں۔'' (اردوئے معلیٰ:435، خطوط:1، 321)

تاہم اُن کے کلام فارسی میں متعدد ہجویہ قطعات موجود ہیں۔ ان میں سے صرف ایک مطالعہ اُن کا انداز ہجو معلوم کرنے کے لیے کافی ہوگا — فرماتے ہیں:

کردۂ جہدے کہ در ویرانی کا شانہ ام — چرخ در آرایش ہنگامۂ عالم نکرد
گر بہ ہجوت راندہ باشم نکتہ ہا، برخود مپیچ — زانکہ حرفے زانچہ گفتم، خاطرم خرم نکرد
بیتے از استاد دیدم، ذوقگی بخشید، لیک — ہیچ در تسکین بیفزود و ز وحشت کم نکرد
ہمچو تو ناقابلے در صلب آدم دیدہ بود — زاں سبب ابلیس ملعون سجدہ برآدم نکرد

حاشا للہ، بودنت در صلب آدم تہمت است
پیش ہر کس گفتم ایں اندیشہ، باور ہم نکرد

(کلیات فارسی:17)

اس سے بجا طور پر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے انتہائی غم و غصے کے تحت دو چار اشخاص کی مذمت کر دی تھی۔ اس روش کو دوسرے شعرا کی طرح اپنا آئین نہیں بنایا۔ علاوہ ازیں ان میں کسی شخص کا نام بھی نہیں لیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب کا مقصود صرف دل کی بھڑاس نکالنا تھا، کسی کو بدنام کرنے اور بدنام رکھنے کے لیے ہجویہ شعر نہیں کہے تھے۔

ترکِ شعر گوئی

میرزا صاحب نے تقریباً 1861 میں سرورؔ کو لکھا ہے:

''میں اموات میں ہوں۔ مردہ شعر کیا کہے گا۔ غزل کا ڈھنگ بھول گیا۔ معشوق کس کو قرار دوں جو غزل کی روش ضمیر میں آئے؟ رہا قصیدہ، ممدوح کون ہے؟ ہائے! انوریؔ گویا میری زبان سے کہتا ہے:

ای دریغا! نیست ممدوحی سزا وار مدیح
ای دریغا! نیست معشوقی سزا وارِ غزل

صناعت شعر اعضاء و جوارح کا کام نہیں، دل چاہیے۔ دماغ چاہیے ذوق چاہیے، امنگ چاہیے، یہ سامان کہاں سے لاؤں جو شعر کہوں، چونسٹھ برس کی عمر، ولولۂ شباب کہاں؟ رعایت فن، اُس کے اسباب کہاں؟''

(اردوئے معلیٰ: 138، عود 32)

4 مارچ 1893 کو تفتہؔ کے خط میں لکھا ہے:

''شعر کام دل و دماغ کا ہے، وہ روپے کی فکر میں پریشان۔''

(خطوط: 1، 87)

واقعہ یہ ہے کہ جب تک میرزا صاحب مالی پریشانیوں میں مبتلا نہ ہوئے انھیں آزاد دل و دماغ، سرقانہ ذوق شعر اور طبیعت کی جدت پسند امنگ حاصل تھی۔

میرزا صاحب کی اس پرکیف زندگی کا خاتمہ پنشن کے مقدمے کے آغاز پر ہوگیا۔ تاہم ابھی اُن کی شاعری کا شباب ولولہ و مستی سے بیگانہ نہیں ہوا تھا، ہاں، جب کلکتہ سے ناکام واپس ہوئے اور پھر جنوری 1831 میں مقدمہ اُن کے خلاف فیصل ہوا، تو مستقبل کے خوفناک تصور نے اُن کے دل و دماغ کو سخت اذیت پہنچائی اور پہلی بار اُن کی طبیعت نے فکر شعر و سخن سے تنفر کا اظہار کیا۔ اب وہ غزل کہتے تھے، مگر دوستوں کے اصرار پر، اور قصاید بھی لکھتے تھے، مگر مالی پریشانیوں کو دفع کرنے کے لیے۔

1850 میں قلعۂ معلیٰ سے تعلق قائم ہوا تو میرزا صاحب کی شاعری میں پھر حرکت محسوس ہوئی، لیکن کچھ تو پژمردگی طبع کی وجہ سے اور زیادہ تر شاہ ظفرؔ کے مذاقِ سخن کے اتباع میں انھوں

نے اردو زبان میں زاید کہا۔ تاہم جو طبیعت افسردہ ہوکر مردہ ہو چلی تھی، اور جو دماغ جوانی سے گزر کر پیری کے حدود میں داخل ہوگیا تھا، وہ دوسروں کے سہارے کہاں تک ہمت اور جوش کا مظاہرہ کرسکتا تھا، میرزا صاحب نے اس زمانہ میں بہت کچھ کہا، اور خوب خوب کہا۔ مگر یہ سب مجبوری سے کہا، اگر وہ اپنے آپ کو مالی مشکلات میں گرفتار نہ پاتے، تو کبھی اس مشقت کو برداشت نہ کرتے۔ 24 ستمبر 1855 کو حقیر کو لکھتے ہیں:

''میں نے قصیدہ لکھنا موقوف کیا کیا، مجھ سے لکھا ہی نہیں جاتا... افسوس! تم کو میرے حال کی خبر نہیں۔ اگر دیکھو تو جانو'' ع:
''جس دل پہ ناز تھا وہ دل نہیں رہا'' کوئی دم ایسا نہیں ہے کہ مجھ کو دمِ واپسیں کا خیال نہ ہو'' (نادرات غالب: 80)

قدر بلگرامی کو 23 فروری 1857 کو تحریر فرماتے ہیں:

''باسٹھ برس کی عمر ہوئی۔ پچاس برس اس شیوے کی ورزش میں گزرے اب جسم و جان میں تاب و تواں نہیں۔'' (خطوط: 1، 177)

1858 کے مصائب جھیلنے کے بعد میرزا صاحب کی حالت یہ ہوگئی تھی کہ 11 اپریل 1858 کو لکھتے ہیں:

''بناوٹ نہ سمجھنا، شعر مجھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ میں نے کیونکر کہا تھا۔'' (خطوط: 33)

انھیں کو پھر لکھتے ہیں:

''میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ ہر شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گئے۔ مگر ہاں، اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر، یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ ہے۔ سو گاہ گاہ جب دل الٹنے لگتا ہے، تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے:

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں، تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں:

اے مرگِ ناگہاں! تجھے کیا انتظار ہے؟"

(خطوط:38)

جنوؔن بریلوی نے فارسی اشعار کی فرمائش کی تھی۔ اس کے جواب میں 8 ستمبر 1859 کو لکھتے ہیں:

"فارسی کیا لکھوں، یہاں ترکی تمام ہے۔ اخوان واحباب یا مقبول یا مفقود الخبر۔ ہزاروں کا ماتمدار ہوں، آپ غمزدہ اور آپ غمگسار ہوں۔ اس سے قطع نظر کہ تباہ اور خراب ہوں، مرنا سر پر کھڑا ہے، پا بر کاب ہوں۔" (خطوط: 1، 117)

اسی سال تفتہؔ کو ذرا صفائی کے ساتھ لکھا ہے:

"بات یہ ہے کہ تم مشقِ سخن کر رہے ہو، اور میں مشقِ فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم کو اور نظیرؔی کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے، اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے، ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدؔی و حافظؔ کے برابر مشہور رہیں گے ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا، کہ ہم تم کو ہوگا۔" (خطوط: 1، 68)

23 مئی 1861 کو مجروؔح کے خط میں انتہائی دردناک الفاظ میں فرماتے ہیں:

"نظام الدین ممنوؔن کہاں؟ ذوق کہاں؟ مومؔن کہاں؟ ایک آزردہ سو خاموش، دوسرا غالبؔ، سو بیخود و مدہوش۔ نہ سخنوری رہی نہ سخندانی کس برتے پرتتاپانی۔ ہائے دلی! وائے دلی! بھاڑ میں جائے دلی؟"

(اردوئے معلیٰ: 144، عود 36)

27 جولائی 1862 کے بعد کسی تاریخ کو علائی کو لکھتے ہیں:

"بھائی، تمھارا باپ بدگمان ہے، یعنی مجھ کو زندہ سمجھتا ہے۔ میرا سلام کہو اور یہ شعر پڑھ کر سناؤ:

گمان زیست بود بر منت ز بیدردی

بداست مرگ، ولی بدتر از گمان تو نیست

مجھے کافور و کفن کی فکر ہے، وہ ستمگر شعر و سخن کا طالب ہے۔ زندہ ہوتا، تو وہیں

کیوں نہ چلا آتا۔ مجھ پر سے یہ تکلیف اٹھوالو، اور تم اس زمین میں چند شعر
لکھ کر بھیج دو۔ میں اصلاح دے کر بھیج دوں گا۔ عصائے پیر بجائے پیر۔''
(خطوط:1، 87)

اگلے سال تک ترک شعر گوئی نے تنفر کی شکل اختیار کر لی اور 19 جون 1863 کو میرزا صاحب نے جنوں بریلوی کو صاف لکھ دیا کہ:

''کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، روح سے نفرت۔''
(انشائے نور چشم:5)

اور جب تفتہ نے کسی غزل کی اصلاح کے سلسلہ میں لکھا کہ آپ مجھے ایک مطلع لکھ دیجیے تو انھیں طنزیہ لکھا:

''سبحان اللہ! تم جانتے ہو کہ میں اب دو مصرعے موزوں کرنے پر قادر ہوں،
جو مجھ سے مطلع مانگتے ہو۔'' (اردوئے معلیٰ:169، عو:80، خطوط:1، 268)

1864 میں میرزا صاحب کی یہ حالت ہوگئی کہ انھوں نے تفتہ کو لکھا کہ:

''شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی۔'' (خطوط 1، 96)

اور پھر ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

''کس ملعون نے سبب ذوق شعر اشعار کی اصلاح منظور رکھی؟ اگر میں شعر
سے بیزار ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار!'' (خطوط:92)



تدوینِ اشعارِ غالب

میرزا صاحب نے ایک خط میں لکھا ہے کہ:

''میرا کلام، کیا نظم، کیا نثر، کیا اردو، کیا فارسی کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔'' (اردوئے معلیٰ، ص 137)

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابتداءً خود انھوں نے ہی اپنا کلام جمع کیا تھا اور اُن ہی کے مسودات سے دیوانِ ریختہ مرتب ہوا، اور ان ہی سے 'گلِ رعنا' کی ترتیب عمل میں آئی۔

اردو کلام کو بترتیبِ ردیف جمع کرنے کا کام ماہِ صفر سنہ 1237 ہجری (آخر اکتوبر سنہ 1821) سے قبل انجام کو پہنچ چکا تھا جو 'نسخۂ حمیدیہ' کی تاریخِ کتابت ہے، آئندہ اسی نسخے میں کمی و بیشی ہو کر موجودہ دیوان وجود میں آیا۔

فارسی نظم کا کچھ حصہ 'گل رعنا' کی شکل میں کلکتہ کے اندر مرتب ہو چکا تھا مگر مکمل دیوان فارسی، دیباچۂ دیوان اُردو کے بیان کے مطابق، سفر کلکتہ (سنہ 1830) تک غیر مرتب مسودے کی شکل میں تھا۔[1]

پنج آہنگ کے دیباچہ میں علی بخش خاں لکھتے ہیں:

''در آغاز سال یک ہزار و دو صد و پنجاہ و یک ہجری شمس الدین خاں را بقضائی آسمانی آں پیش آمد کہ ہیچ آفریدہ مبیناد! و آن خود از غایت شہرت

---

[1] محمد اکرم صاحب کے خیال میں دیوان ریختہ کا فارسی دیباچہ کلکتہ میں لکھا گیا۔ اسی بنا پر میں نے یہ خیال قائم کیا ہے کہ سفر کلکتہ تک فارسی دیوان کی ترتیب عمل میں نہیں آئی تھی باقی ابھی تک مجھے اس میں تامل ہے کہ حکیم احسن اللہ خان بہادر کے نام کا وہ خط جس میں دیباچہ بھیجنے کی اطلاع درج ہے، کلکتہ سے ارسال کیا گیا تھا اس لیے میں اپنے مستخرجہ نتیجہ پر مصر نہیں ہوں۔

امین الادب، لوہارو، جون 1944

> احتیاج ندارد و بعد آں ہنگامہ ہمدراں ہنگام از جے پور بدہلی رسیدم، و بکاشانۂ
> برادر والا شان و آمرزگار مہربان، مولانا غالبؔ زاد افضالہ فرود آمدم... در آں
> ایام دیوان فیض عنوان کہ مسمیٰ 'بہ میخانۂ آرزو سرانجام' است، تازہ فراہم آمدہ
> و پیرایۂ تمام پوشیدہ بود'' (پنج آہنگ)

اس عبارت کے الفاظ ''در آن ایام... تازہ فراہم آمدہ'' سے بظاہر یہ معلوم ہوتا کہ سنہ 1251 ہجری (سنہ 1835) مراد ہیں۔ لیکن کتاب خانۂ رام پور کے قلمی نسخوں میں خود میرزا صاحب نے کلیاتِ فارسی کے خاتمہ کی تاریخ سنہ 1253ھ (سنہ 1837) لکھی ہے نیز بانکی پور کے کتاب خانے کے قلمی نسخے میں بھی، جس کی تاریخ کتابت ربیع الآخر سنہ 1254 ہجری ہے، یہی سنہ مذکور ہے اس لیے اتمام کلیات کا سنہ یہی قرار پائے گا۔

بہر حال اردو اور فارسی کلام کی جمع و ترتیب کا ابتدائی کام میرزا صاحب ہی کے ہاتھوں انجام کو پہنچا اور انھیں اپنے کلام کی اشاعت کے لیے دوسروں سے مسودے یا مبیضے مانگنا نہیں پڑے، مگر جب افکار و آلام کی کش مکش اور ناقدردانیٔ ابنائے زماں کی گیرد دار نے اُنھیں پیہم شکستہ خاطر کیا، تو یہ کام نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر اور حسین مرزا صاحب وغیرہ نے اپنے ذمے لے لیا۔ سنہ 1857 کے ہنگامے سے پہلے تک یہ مجموعے محفوظ تھے۔ چنانچہ جنوری سنہ 1855 میں میرزا صاحب نے سید بدرالدین احمد کو لکھا ہے:

> ''آپ ہندی اور فارسی غزلیں مانگتے ہیں۔ فارسی غزل تو شاید ایک بھی نہیں کہی،
> ہاں ہندی غزلیں قلعے کے مشاعرے میں دو چار لکھی تھیں، سو وہ یا تو تمھارے
> دوست حسین میرزا صاحب کے پاس ہوں گی یا ضیاء الدین خان صاحب کے
> پاس۔ میرے پاس کہاں؟ آدمی کو یہاں اتنا توقف نہیں کہ وہاں سے دیوان منگوا
> کر نقل اُتروا کر بھیج دوں۔'' (اردوئے معلیٰ: 259، عود: 108، خطوط: 1، 306)

لیکن غدر میں یہ سارا ذخیرہ لٹ گیا اور میرزا صاحب اپنا کلام دیکھنے کو خود بھی ترسنے لگے۔ مہر کو بڑے رقت آمیز الفاظ میں لکھتے ہیں:

> ''میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ ضیاء الدین حسن خاں اور حسین
> میرزا جمع کر لیتے تھے جو میں نے کہا اُنھوں نے لکھ لیا، ان دونوں کے گھر
> لٹ گئے، ہزاروں روپے کے کتاب خانے برباد ہوئے۔ اب میں اپنا کلام

دیکھنے کو ترستا ہوں، کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے۔ ایک غزل میری کہیں سے لکھوالایا، اس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا۔ یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔'' (اردوئے معلٰی: 363، خطوط 1: 389) اس واقعے کو صاحب عالم مارہروی کے نام خطوں میں۔ (اردوئے معلٰی 203، عود: 29) اور یوسف علی خاں عزیز کے نام کے خطوں میں بھی دہرایا گیا ہے۔ (اردو: 206، عود: 65، خطوط 1: 175)

دسمبر سنہ 1858 میں منشی شیونراین کو لکھتے ہیں:

''کیا کہوں تم سے؟ ضیاء الدین خاں جاگیردار لوہارو، میرے سبھی بھائی اور میرے شاگرد رشید ہیں۔ جو نظم و نثر میں، میں نے کچھ لکھا، وہ انھوں نے لیا اور جمع کیا، چنانچہ کلیاتِ فارسی چون بچپن جزو، اور پنج آہنگ اور مہر نیمروز اور دیوان ریختہ سب مل کر سوسوا سو جزو مطلّے اور مذہب اور انگریزی اَبری کی جلدیں الگ الگ، کوئی ڈیڑھ سو دو سو روپے کے صرف میں بنوائیں، میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب یکجا فراہم ہے۔ پھر ایک شاہزادہ نے اس مجموعِ نظم و نثر کی نقل لی، اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا، کہاں سے یہ فتنہ برپا ہوا اور شہر لٹے! وہ دونوں جگہ کا کتاب خانہ خوان یغما ہوگیا، ہر چند میں نے آدمی دوڑائے۔ کہیں سے ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی وہ سب قلمی ہیں۔''

غدر کی آگ بجھی، تو میرزا صاحب کے دل کی افسردگی میں اضافہ ہوگیا اور وہ فنِ شاعری ہی سے نفرت کرنے لگے، اس لیے دوبارہ کلام ... جمع کرنے کا خیال آیا تو اُنھوں نے صرف اتنا کیا کہ منشی شیونرائن کو محولۂ بالا مکتوب کے آخر میں لکھا:

''غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ قلمی فارسی کا کلیات، قلمی ہندی کلیات، قلمی پنج آہنگ، قلمی مہر نیمروز، اگر کہیں ان میں سے کوئی نسخہ بکتا ہوا آوے تو اِس کو میرے واسطے خرید لینا، اور مجھ کو اطلاع کرنا۔ میں قیمت بھیج کر منگوالوں گا۔''

مگر ان لٹے ہوئے نسخوں میں سے کوئی ایک بھی دوبارہ دستیاب نہیں ہوا۔ آخر مجبور ہو کر پھر ایک شاگرد نے ہی فراہمی کلام کا بیڑا اٹھایا۔ میرزا صاحب نے اِن بزرگ کا نام نہیں لیا ہے، قاضی عبدالجلیل صاحب کو 22 فروری سنہ 1861 کو لکھتے ہیں:

”یہ شہر بہت غارت زدہ ہے، نہ اشخاص باقی نہ امکنہ۔ کتاب فروشوں سے کہہ دوں گا، اگر میری نظم ونثر کے رسالوں میں سے کوئی رسالہ آجائے گا، تو وہ مول لے کر خدمت میں بھیج دیا جائے گا۔ دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت، آہ ایک دوست کے پاس بقیۃ النہیب والغارۃ کچھ میرا کلام موجود ہے اس سے یہ غزل لکھوا کر بھیج دوں گا۔“

اِسی سال ستمبر سنہ 1861 (11 ربیع الاوّل سنہ 1278ھ) میں ذکا کو تحریر فرماتے ہیں:

”ہر آئینہ چوں پنج آہنگ، و مہر نیمروز، دستنبو دارند، انچہ اکنوں فرستم، ہماں مجموعۂ نظم پارسی تواند بود، کہ جامہ گرد آور خود ہیچگانہ نداشت، وشہریان ہرچہ داشتند دریں رستخیز نمونہ آشوب، بہ یغمارفت پس از تباہی این شہر آراستہ، و فرونشستن آن گرد برخاستہ، یکے از جاہمندان کہ نامہ نگار را از خویشاوند است، گرد پژوھشی برآمد، تاچوں ژندۂ پارہ پارہ بہم دوختہ قریب پنجاہ جزو فراز آورد۔“ (پنج آہنگ: 247 واردوئے معلیٰ: 130 خطوط: 1، 11)

یہ دوست جو جاہمند اور غالب کے ’خویشاوند‘ تھے، نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر نیر ہیں اس لیے کہ میرزا صاحب نے ستمبر سنہ 1863 سید بدرالدین احمد کو لکھا ہے:

”منشی نول کشور نے شہاب الدین خاں کو لکھ کر کلیات فارسی جو ضیاء الدین خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا، منگا لیا، اور چھاپنا شروع کیا، وہ پچاس جزو ہیں یعنی کوئی مصرعہ میرا اس سے خارج نہیں۔“

(اردوئے معلیٰ 130، خطوط: 1، 111)

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نیر اور حسین میرزا کے علاوہ بھی بعض شاگردوں کے پاس میرزا صاحب کا مجموعۂ اشعارِ فارسی محفوظ تھا۔ چنانچہ تفضّل حسین خاں کو لکھتے ہیں:

”کیوں صاحب، یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی واستادی سب پر پانی پھر گیا؟ اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی، اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے، تم کیا غضب ڈھاتے، میرا کلام، خرید آٹھ دس روپے کی۔ سو وہ بھی میں یہ نہیں کہتا کہ مجھ کو دے ڈالو، تم کو مبارک رہے! مجھ کو مستعار دے دو، میں اُس کو دیکھ لوں جو میرے پاس نہیں ہے، اس کی نقل کرلوں، پھر تم کو واپس بھیج دوں، اِس طرح کی طلب پر نہ دینا، دلیل اس کی ہے کہ مجھ کو جھوٹا جانتے ہو، میرا

اعتبار نہیں، یا یہ کہ مجھ کو آزار دینا اور ستانا بدل منظور ہے۔ وہ کتاب ابھی
میرے آدمی کو دے دو، واللہ باللہ! میں ان میں سے جو میرے پاس نہیں ہے نقل
کر کے تم کو بھیج دوں گا، اگر تم کو واپس نہ دوں تو مجھ پر لعنت! اور اگر تم میری
قسم کو نہ مانو اور کتاب حامل رقعہ کو نہ دو، تو تم کو آفریں۔'' (اردوئے معلیٰ، 247)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تفضل حسین کے پاس دیوانِ فارسی موجود تھا، جسے انھوں نے آٹھ یا دس روپے میں خریدا تھا، نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر کے نام کے ایک مفصل خط سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب شہاب الدین خان بہادر کے پاس بھی ایک نسخہ تھا، فرماتے ہیں:

''جناب قبلہ و کعبہ! آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے؟ روز آپ
کے مطالعہ میں نہیں رہتا۔ بغیر اس کے دیکھے آپ کا کھانا نہ ہضم ہوتا ہو، یہ بھی
نہیں، پھر کیوں نہیں دیتے؟ ایک جلد ہزار جلد بن جائے، میرا کلام شہرت
پائے، میرا دل خوش ہو، تمھاری تعریف کا قصیدہ اہل عالم دیکھیں تمھارے
بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گزرے، اتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں؟
رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ، یہ خفقان ہے، کتاب کیوں تلف ہوگی؟
احیاناً اگر ایسا ہوا اور دلی لکھنؤ کے عرضِ راہ میں ڈاک لُٹ گئی، تو میں فوراً
بسبیل ڈاک رام پور جاؤں گا، اور نواب فخر الدین مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا
دیوان تم کو لادوں گا، اگر یہ کہتے ہو کہ اب وہاں سے لے کر بھیج دو، وہ نہ
کہیں گے کہ وہیں سے کیوں نہیں بھیجتے ہاں یہ لکھوں کہ نواب ضیاء الدین
خاں صاحب نہیں لیتے، تو کیا وہ نہیں کہہ سکتے کہ جب وہ تمھارے بھائی اور
تمھارے شاگرد ہو کر نہیں دیتے، تو میں اتنی دور سے کیوں دوں؟ اگر تم یہ
کہتے ہو کہ تفضّل سے لے کر بھیج دو، وہ اگر نہ دیں تو میں کیا کروں؟ اور اگر
دیں تو میرے کس کام کا؟ پہلے تو ناتمام، پھر ناقص بعض بعض قصائد ان میں
سے اوروں کے نام کر دیے گئے ہیں اور اس میں اسی ممدوحِ سابق کے نام پر
ہیں۔ شہاب الدین خاں کا دیوان جو یوسف میرزا لے گیا ہے، اس میں یہ
دونوں قباحتیں موجود، تیسری یہ کہ سراسر غلط۔ ہر شعر غلط، ہر مصرعہ غلط، یہ کام
تمھاری امداد کے بغیر انجام نہ پائے گا، اور تمھارا کچھ نقصان نہیں۔ ہاں،

احتمالِ نقصان، وہ بھی از روئے وسوسہ و وہم۔ اِس صورت میں میں تلافی کا
کفیل جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں، بہر حال راضی ہو جاؤ، اور مجھ کو لکھو، تو میں
طالب کو اطلاع دوں، اور طلب اُس کی جب دوبارہ ہو تو کتاب بھیج دوں۔
رحم و کرم کا طالب 'غالب' (اردوئے معلیٰ: 289)

ان تحریروں سے یہ امر بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ خود میرزا صاحب کے پاس بھی اپنا فارسی کلام موجود تھا۔ لہٰذا میرزا صاحب کا سنہ 1859 میں یہ ارشاد کہ:

''بندہ پرور، میرا کلام، کیا نظم، کیا نثر، کیا اردو، کیا فارسی، کبھی کسی عہد میں
میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا کہ وہ مسودات
مجھ سے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے سو ان کے لاکھوں روپے کے گھر لٹ گئے
جس میں ہزاروں روپے کے کتاب خانے بھی گئے اس میں وہ مجموعہ ہائے
پریشاں بھی غارت ہوئے۔ میں خود اس مثنوی کے واسطے خون درجگر ہوں،
ہائے کیا چیز تھی!'' (اردوئے معلیٰ: 137، عودِ 27)

ہماری زبان کے روزمرہ استعاروں کی ایک مثال ہے جس کا مقصود صرف یہ ہے کہ میرزا صاحب کے پاس جو مجموعہ تھا، وہ ان کے تمام ذخیرۂ کلام کو جامع نہ تھا اِسی لیے کلیات فارسی کے نولکشوری ایڈیشن کی تیاری کے وقت انھیں اس کی تکمیل کی کوشش کرنا پڑی تھی اس کے بعد جو کچھ کہا ہے اس کے متعلق جولائی سنہ 1865 میں بےخبر کو لکھا ہے:

''اب میں نظم و نثر کا مسودہ نہیں رکھتا، دل اس فن سے نفور ہے، دو ایک
دوستوں کے پاس کی نقل ہے، ان کو اس وقت کہلا بھیجا ہے، اگر آج آ گیا تو
کل اور اگر کل آیا تو پرسوں بھیج دوں گا، بھائی امین الدین خاں صاحب کے
اسرار سے خسرو کی غزل پر ایک غزل لکھی ہے، علاء الدین خاں نے اس کی
نقل ان کو بھیج دی ہیں دیوان پر نہیں چڑھاتا مسودہ بھیجتا ہوں تقدیم و تاخیر
ہندسوں کے مطابق ملحوظ رہے۔'' (اردوئے معلیٰ: 28)

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ صرف آخر عمر میں میرزا صاحب نے مسودے رکھنا چھوڑ دیے تھے۔ ورنہ پہلے حتی الامکان اپنا کلام اپنے پاس بھی رکھتے تھے۔

○

غالب کی شعرگوئی اور ان کے دواوین

میرزا صاحب نے ابتداے سنِ تمیز میں شعرگوئی شروع کردی تھی مگر اس وقت کتنی عمر تھی، اس بارے میں خود ان کے بیان میں اختلاف ہے۔ شاہزادہ محمد سلطان بہادر کو لکھتے ہیں:

''روشن تر ک این کہ در دہ سالگی آثارِ موزونی طبع پیدائی گرفت۔''

(پنج آہنگ:249)

کلیاتِ فارسی کے خاتمے میں فرماتے ہیں:

از روزی کہ شمارِ سنین عمر از احاد فراترک رفت، ورشتہ حساب زحمتِ یازدھمین گرہ بخود برگرفت، اندیشہ در رواروگام فراخ برداشت، وکریوہ ومغاکِ بادیہ سخن پیمودن آغاز نہاد۔''

(ایضاً، 67 وکلیات:553)

قدر بلگرامی کو 57 میں تحریر کیا ہے:

''بارہ برس کی عمر سے کاغذ، نظم ونثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں۔ باسٹھ برس کی عمر ہوئی۔ پچاس برس اِس شیوے کی ورزش میں گزرے۔''

(خطوطِ غالب، 1، 177)

انھیں کو پھر 68 میں لکھتے ہیں:

''پندرہ برس کی عمر سے شعر کہتا ہوں۔ ساٹھ برس بکا۔ نہ مدح کا صلا ملا، نہ غزل کی داد۔''

(خطوط غالب:198)

شاکر کو بھی یہی تخمینہ تحریر فرماتے ہیں:

''پندرہ برس کی عمر سے 25 برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔'' (عود:159)

علی گڑھ میگزین، غالب نمبر 49-1948

علائی کو 1862 میں لکھا ہے:

''پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی، میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل:

پلا دے اُوک سے، ساقی، جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

(اردوئے معلیٰ: 442 و خطوط: 1، 342)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ 1812 کے لگ بھگ یہ غزل لکھی گئی تھی۔ چونکہ میرزا صاحب 1797 میں پیدا ہوئے تھے، جس کی بنا پر اس وقت ان کی عمر پندرہ برس کی ہوگی لہٰذا قیاس درست ہوگا کہ پندرہ برس کی عمر میں میرزا صاحب شعر کہتے تھے۔

گزشتہ بیانوں کے پیش نظر میرزا صاحب کی سخن سرائی کا آغاز 1222ھ (1807) 1224ھ (1809) اور 1227ھ (1812) میں سے کسی ایک سال میں ہوا ہے۔ چوں کہ علائی کے نام کے محولہ خط میں انھوں نے اپنی پندرہ سال کی عمر میں کہی ہوئی غزل کے دو شعر لکھے ہیں، جو میری دانست میں آغاز شعر گوئی میں بمشکل کہے جاسکتے ہیں، اس لیے قرین قیاس یہ ہے کہ وہ پندرہ سال کی عمر سے قبل ہی یہ شغل اختیار کر چکے تھے، اور غالباً ان کی عمر اس وقت دس سال کی تھی جیسا کہ کلیات کے خاتمے میں لکھا ہے۔

ریختہ گوئی: پہلا دور

ابتداءً میرزا صاحب اُردو زبان میں شعر کہتے تھے، نساخ کو لکھتے ہیں:

''خاکسار نے ابتدائی سنِ تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی ہے۔''

(اردو: 204، عود: 125)

شاکر کو تحریر فرماتے ہیں:

''ابتدائی فکرِ سخن میں..... ریختہ لکھتا تھا۔'' (عود: 159)

نواب شمس الامرا، وزیر اعظم حیدر آباد کو ایک فارسی خط میں لکھا ہے:

درآغاز ریختہ گفتی، و بہ اُردو زبان غزل سرائی بودی۔'' (پنج آہنگ: 193)

گلِ رعنا کے دیباچے میں بھی یہی اعتراف کیا ہے کہ:

''در آغاز خار خارِ جگر کاوی شوقم ہمہ صرفِ نگارشِ اشعارِ اردو زبان بود۔''

(کلیات نثر فارسی:59)

25 سال کی عمر تک، میرزا صاحب اردو میں شعر کہتے رہے۔ بعد ازاں فارسی زبان سے فطری لگاؤ کی بنا پر، فارسی میں کہنے لگے، شاکر کو تحریر کیا ہے:

''15 برس کی عمر سے 25 برس کی عمر تک مضامینِ خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔'' (پنج آہنگ:156)

نواب شمس الامرا کو رقمطراز ہیں:

''تا پارسی زبان ذوقِ سخن یافت، ازاں وادی عنانِ اندیشہ برتاخت... کما بیش سی سال ست کہ اندیشہ پارسی سگال ست۔'' (پنج آہنگ:378)

یہ عریضہ اپریل 1853 سے پہلے لکھا گیا تھا۔ اِس لیے کہ کتاب خانۂ رام پور میں ''پنج آہنگ'' کا ایک مطبوعہ نسخہ محفوظ ہے، جو مذکورۂ بالا تاریخ کو دہلی کے مطبع دارالسلام سے چھپ کر شائع ہوا تھا اور اس ایڈیشن میں یہ عریضہ شامل ہے۔ اِس میں غالب نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ گزشتہ 30 سال سے فارسی میں فکرِ سخن کرتے ہیں۔ اگر ہم اس عریضہ کو 1852 کا تسلیم کر کے مجموعے میں سے 30 سال وضع کر دیں، تو ریختہ گوئی کے خاتمے، اور پارسی سگالی کے آغاز کا سال 1822 قرار پائے گا اور چونکہ وہ 1797 میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے اس وقت ان کی عمر 25 سال کی ہوگی، جو شاکر کے نام کے خط میں ذکر کی جا چکی ہے۔

ریختہ گوئی: دوسرا دور

25 سال کی عمر کے بعد، میرزا صاحب فارسی زبان کی نظم و نثر کی طرف متوجہ ہوئے اور تقریباً 25، 30 سال تک، آتشِ پارسی ہی سے اپنے دل و دماغ کو گرم اور آسودہ رکھتے رہے۔ اس زمانہ میں، ریختہ کہنے کا بھی اتفاق ہوا لیکن فارسی کے مقابل میں اس کی مقدار نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی لیے اس پوری مدت میں اپنے آپ کو ''فارسی نگار'' کی حیثیت سے ملک کے سامنے پیش کیا ہے۔ 1850 میں، قلعہ سے تعلق پیدا ہوا، تو شاہِ ظفر کی بدولت ان کی ریختہ گوئی نے دوبارہ جنم لیا، اور یہ شاہی مشاعروں کے لیے مختلف طرحوں میں طبع آزمائی کرنے لگے، چنانچہ نواب علی بہادر، والیِ باندا، کو لکھتے ہیں:

''ہر چند از دیر باز بہ گفتن ریختہ نمی گرایم، و بہ پارسی زبان سخن می سرائیم، لیکن چوں رضائی خاطر حضرت ظل الٰہی دران ست کہ ایں گونہ گفتار بداں حضرتِ فلک رفعت ارمغان می بردہ باشم، ناچار گاہ گاہ ریختہ ہمی گویم۔'' (پنج آہنگ:233)

نساخ کو تحریر فرماتے ہیں:

''پھر اوسطِ عمر میں، بادشاہِ دہلی کا نوکر ہو کر، چند روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی ہے۔'' (اردو:205، عود:126)

سید بدر الدین کو اپنے مکتوب مورخہ 3/جنوری 1855 (14/ربیع الثانی 71) میں لکھا ہے:

''آپ ہندی اور فارسی غزلیں مانگتے ہیں۔ فارسی غزل تو شاید ایک بھی نہیں کہی۔ ہاں، ہندی غزلیں قلعہ کے مشاعرے میں دو چار لکھی تھیں۔''

(اردو:127، خطوط:1، 109)

غدر کے بعد دہلی پر آلام و مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بادشاہ جلاوطن کیے گئے اور ان کے ہوا خواہ، یا شہر بشہر مارے مارے پھرنے لگے اور یا پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔ ان ستم رسیدہ دلی والوں میں میرزا صاحب کے احباب بھی تھے، سرپرست بھی تھے شاگرد بھی تھے۔ ان کی جدائی نے میرزا صاحب کا دل توڑ دیا اور یہ شعر و شاعری کو خیر باد کہہ کر، زندگی کے دِن پورے کرنے لگے۔ شہزادہ بشیر الدین میسوری کو لکھتے ہیں:

نامہ نگار خود از برباد سرِ سخن سنجی ندارد، نہ گہر در ترازو و نہ زور در بازو۔ شصت و شش مرحلہ از سرِ عمرِ سبک سیر پیمودہ آمد۔ پنجاہ سال ہنگامۂ مہرورزی و عشق بازی بانکو محضرانِ دہلی گرم داشتہ ام۔ تادرین مدت، چہ مایہ دوستانِ یکدل فراہم آمدہ باشند۔ ناگاہ چرخِ تیز گردان، پیوندِ روحانی را مدانساں برید، کہ خون از رگِ جان فروچکید۔ ازاں بے مرعزیراں کہ ہمہ را نیارم شمرد، دریں تیر باراں حوادث و ناسزا کارزار نماندند مگر خستہ چند۔''

اینک من و بداغ کشتگان نژند سوختن، و برحال خستگان خون گریستن خستۂ دہرۂ دہرم، و ماتمدار شہر و اہل شہر۔'' (پنج آہنگ:243)

اس زمانے میں بھی بعض اوقات، دنیاداری کے خیال سے کچھ نہ کچھ کہنا پڑتا تھا۔ چنانچہ

ان کے متعدد اردو اشعار نواب فردوس مکان اور نواب خلد آشیان کو مخاطب کر کے لکھے گئے لیکن ان اشعار کی تعداد بہت تھوڑی ہے، اس لیے انھیں پچھلے دور کا تتمہ خیال کرنا چاہیے۔

فارسی نگاری

اگرچہ میرزا صاحب نے ابتدائی سنِ تمیز میں، اردو زبان میں سخن سرائی کی، لیکن وہ آغاز سے نظم و نثر فارسی کے عاشق و مائل اور تیغ اصفہانی کے گھائل تھے۔ اس لیے ان کا ابتدائی اردو کلام، تخیل اور الفاظ دونوں میں فارسی کہلانے کا زیادہ مستحق ہے۔

بقولِ خود وہ پچیس سال کی عمر تک، بیدلؔ، شوکتؔ، اور اسیرؔ کی طرز پر ریختہ لکھتے رہے۔ تمیز آنے پر طبیعت نے اس خارزار سے باہر نکلنے کی تدبیر سمجھائی اور انھوں نے نظیریؔ، عرفیؔ، وغیرہ خداوندان سخن کے کلام کا مطالعہ کر کے، ان کی راہ پر گامزنی شروع کی، کلیاتِ فارسی کے خاتمے میں فرماتے ہیں:

> ''تا ہمدران تگاپو، پیش خرامان رانجستگی از روشِ ہمقدمی کہ، درمن یافتند، مہر بجنبید، و دل از آزرم بدرد آمد، اندوہِ آدلر گیہائی من خوردند، و آموز گارانہ درمن نگرستند، شیخ علی حزین بخندۂ زیرلبی، بیراہہ روی ہای مرا درنظرم جلوہ گر ساختہ، و زہرنگاہ طالبؔ آملی، و برقِ چشم عرفیؔ شیرازی مادہ آن ہرزہ جنبش ہائے ناروا در پای رہ پیمائی من سوخت۔ ظہوریؔ، بسرگرمیِ گرائی نفس، حرزی ببازو وتوشۂ بکرم بست۔ ونظیریؔ لا ابالی حرام بہنجار خاصۂ خودم بچالش آورد۔''
>
> (کلیاتِ غالب: 554 و پنج آہنگ، 68)

لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرزا صاحب اس عمر سے پہلے ہی فارسی میں اشعار کہنے لگے تھے چنانچہ بھوپال کے قلمی دیوان اردو کا آغاز ایک فارسی قصیدے سے ہوا ہے۔ چونکہ اردو کہتے وقت بھی گویا فارسی ہی میں سوچتے اور لکھتے تھے، اس لیے انھوں نے مذکورہ عمر کو پہنچ کر، اس اختلافِ ذوق کی رہنمائی میں، اردو زبان کا رسمی پردہ بھی شاہدِ سخن کے چہرہ سے اٹھا دیا، اور یکسر فارسی میں کہنے لگے، یہی وجہ ہے کہ ان کے فارسی کلام میں بیدلؔ وغیرہ کے اثرات کم نظر آتے ہیں۔

نواب شمس الامراء کے محولۂ بالا خط میں جو تقریباً 1852 میں لکھا گیا تھا، میرزا صاحب

نے دعویٰ کیا ہے کہ ''کما بیش سی سال ست کہ اندیشہ پارسی سگال ست'' اس بنا پر ان کی باقاعدہ فارسی گوئی کا آغاز 1822 (1238ھ) میں تسلیم کرنا پڑے گا، جسے پچھلی بحث میں، ریختہ گوئی کے پہلے دور کا خاتمہ ثابت کیا جاچکا ہے۔

طباعتِ دیوان اردو

جس طرح میرزا صاحب کی شعرگوئی کا آغاز ریختہ سے ہوا، طباعت میں بھی دیوان ریختہ ہی متقدم رہا۔ یہی نہیں، بلکہ فارسی دیوان کے مقابلے میں، میرزا صاحب کی زندگی میں بھی اوران کے مرنے کے بعد بھی، اشاعت بھی اسی کی زیادہ ہوئی۔

یہاں اس کے سب سے پہلے ایڈیشن کا تذکرہ مناسب ہوگا۔ اس کی اشاعت کے خاتمے سے قبل میرزا صاحب نے میجر جان جاکوب بہادر کو لکھا تھا:

> ''نہاں محانار کہ نقشِ مطبع سیدالاخبار انگیختہ طبع یکے از دوستان روحانی نیست۔
> همانا کارفرمائے ایں نو آئین کدہ، ایں می سگالد کہ دریں کارگاہ نقشہائے بدیع
> انگیزدوفروریختہ ھائے خامۂ غالبؔ بےنوارا بقالبِ انطباع فروریزد، ازاں
> جملہ دیوان ریختہ کہ درتمامی ناتمام است، عجب نیست کہ ہم دریں ماہ بتمامی و
> آنگاہ بنظرگاہِ سامی رسد۔'' (کلیات نثر:174)

یہ مطبع سرسید مرحوم کے بھائی، سید محمد خاں بہادر نے دہلی میں قایم کیا تھا اور سید المطابع یا مطبع سید الاخبار کے نام سے مشہور تھا، شعبان 1257ھ مطابق اکتوبر 1841 میں اس مطبع 1257ھ سے میرزا صاحب کا دیوان چھپ کر شائع ہوا۔ پبلک لائبریری رامپور میں اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے، اس کے سرِورق پر حسبِ ذیل عبارت اس طرح پانچ سطروں میں لکھی ہے:

دیوان اسد اللہ خانصاحب غالب تخلص
میرزا نوشہ صاحب مشہور کا دیوان دہلی میں سید محمد خاں بہادر کے چھاپہ خانہ کے
لیتھوگرافک پریس میں شہر شعبان
1257ھ مطابق ماہ اکتوبر 1841 کو سید عبدالغفور کے
اہتمام میں چھاپا ہوا۔

صفحات کی تعداد 108 ہے، آخر میں ایک ورق اور شامل ہے جس کے پہلے صفحے پر 15 غلطیوں کا ایک غلط نامہ دیا گیا ہے، مگر کاتب نے اس پر مسلسل یا نئے ہندسے نہیں ڈالے ہیں، ہر صفحے میں 15 سطریں ہیں، غزلوں کے درمیان کی ایک سطر کاتب نے سادہ چھوڑ دی ہے جس کے باعث سے ہر صفحے میں مکتوبی سطریں پندرہ سے بہت کم ہیں۔ کاغذ پرانی وضع کا دیسی بانس کا بنا ہوا ہے۔ کتاب کا ناپ 5:1/4x8:1/2 انچ اور کتاب کا 3:1/2x6:1/6 ہے، خط معمولی نستعلیق ہے، اور پوری کتاب جدولوں سے خالی ہے۔

مضامین کی ترتیب یہ ہے:

صفحہ 1: سرنامہ (اس کی پوری عبارت نقل کی جاچکی ہے)

صفحہ 2: سادہ ہے۔

صفحہ 3-5: دیباچۂ فارسی، اس کے آخر میں کوئی تاریخ نہیں ہے

صفحہ 5 سطر 4: ''یا اسد اللہ الغالب''

صفحہ 5 سطر 5: غزلیات ردیف الف (لیکن یہ الفاظ نسخے میں محذوف ہیں۔ تعداد اشعار 229)

صفحہ 25: ردیف الباء الموحدہ (تعداد اشعار: 12)

صفحہ 26: ردیف التاء المثناۃ الفوقانیہ (تعداد اشعار: 19)

صفحہ 28: ردیف الجیم المعجمۃ التازیہ (تعداد اشعار: 4)

صفحہ 29: جیم الفارسی (لفظ ردیف محذوف ہے۔ تعداد اشعار: 6)

صفحہ 29: ردیف الدال المہملہ (تعداد اشعار: 8)

صفحہ 30: ردیف الراء المہملہ (تعداد اشعار: 29)

صفحہ 33: ردیف الزاء المعجمہ (تعداد اشعار: 20)

صفحہ 35: ردیف السین المہملہ (تعداد اشعار: 7)

صفحہ 36: ردیف الشین المعجمہ (تعداد اشعار: 2)

صفحہ 36: ردیف العین المہملہ (تعداد اشعار: 8)

صفحہ 37: ردیف الفاء (تعداد اشعار: 2)

صفحہ 37: ردیف الکاف تازیہ (الف لام ''التازیہ'' محذوف۔ تعداد اشعار: 15)

صفحہ 38: کاف فارسی (لفظ ردیف وغیرہ محذوف۔ تعداد اشعار: 2)

صفحہ 38: ردیف لام (الف لام محذوف۔ تعداد اشعار: 9)

صفحہ 39: ردیف المیم (تعداد اشعار: 8)

صفحہ 40: ردیف النون (تعداد اشعار: 127)

صفحہ 52: ردیف الواوَ (یہ عنوان پورا محذوف ہے۔ تعداد اشعار: 38)

صفحہ 55: ردیف الہاء (تعداد اشعار: 3)

صفحہ 55: ردیف الیاء (تعداد اشعار: 441 لیکن اس ردیف میں کلکتے کی تعریف والے قطعے کے 3 شعر سہواً چھپ گئے ہیں، اس لیے تکرارِ اشعار کو کم کرنے کے بعد صحیح تعداد 438 ہوتی ہے)۔

صفحہ 94: سطرِ آخر ''تمام شد غزلیات''

صفحہ 95: ''منتخب قصیدۂ منقبت علی مرتضٰی علیہ السلام۔'' (تعداد اشعار: 25)

صفحہ 97: ''انتخابِ قصیدۂ منقبت علی مرتضٰی علیہ السلام۔'' (تعداد اشعار: 33)

صفحہ 99 س 8: ''قطعات''

صفحہ 99 س 9: ''قطعہ در نمایشِ عنوانِ دل آویزی گفتار، و آسان کردنِ اندوہِ پشیمانی بر دل دلدار'' (تعداد اشعار: 2)

صفحہ 99: ''چمن سرمایہ کردنِ گفتار بستایشِ کلکتہ، کہ اگر فردوس نتواں گفت، ارم است، البتہ'' (تعداد اشعار: 4)

صفحہ 100: ''بادوست از سپاس عطاے ہدیہ سخن راندن، و متاعِ گزیدہ سخن در برابر آن افشاندن'' (تعداد اشعار: 13)

صفحہ 101 س 6: ''رباعیات'' (تعداد اشعار: 20)

صفحہ 103 س 7: تقریظ (نوشتہ نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیر) یہ تقریظ ''سنہ ہزار و دو بست و پنجہ و چہار و ہجریہ نبویہ'' (1254ھ مطابق 1838ء) میں لکھی گئی ہے۔ تعدادِ اشعار کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''ہمگی اشعار شعری شعار غزل و قصیدہ و قطعہ و رباعی ہزار و نو دو ہشت اندیافتم۔''

لیکن یہی تقریظ سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید میں نقل کرتے ہوئے سنہ 1254ھ اور

تعدادِ اشعار ''یک ہزار و ہفتاد و اند'' درج کی ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ترتیب دیوان کے وقت اشعار کی تعداد 1070 سے کچھ اوپر تھی، طباعت کے وقت اس میں اضافہ ہو کر کل اشعار 1090 سے کچھ زیادہ ہو گئے تھے، اس لیے تاریخ میں تغیر کیے بغیر تعداد میں ترمیم کر دی گئی۔

''ہمگی اشعار شعری شعار'' والی عبارت کے الفاظ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ نیر نے اصل میں ''ہزار و نود و اند'' لکھا ہوگا ''اند'' فارسی میں عربی کے لفظ ''بضع'' کی طرح 3 سے 9 تک اعداد کے قایم مقام استعمال ہوتا ہے۔ کتاب کے چھپ جانے کے [بعد] کاتب یا مصحح نے اشعار گن کر لفظِ ''ہشت'' ایزاد کیا ہے۔ اس قیاس کی وجہ یہ ہے کہ ''اند'' اکائی کے لیے لکھا گیا تھا، جب ہشتِ اکائی کی جگہ پُر کر دی، تو اس لفظ کی ضرورت باقی نہیں رہی اور بے ضرورت لفظ کا استعمال نیر جیسے ادیب سے ناممکن ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ خود اشعار کی یہ تعداد بھی درست نہیں ہے۔ کتاب میں کل اشعار 1095 ہیں۔ میرزا صاحب کے قطعہ:

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں
اک تیر مرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے

کے 3 بیعت، حصہ غزلیات کی ''ردیف الیاء'' میں سہواً، مکرر چھپ گئے ہیں، جس کے سبب سے میزان میں 3 اعداد کا اضافہ ہو کر حاصل 1098 نکلا ہے، چونکہ نیر کے متعلق تصحیح کتاب میں حصہ لینے کا کوئی حوالہ نسخے میں نہیں ہے، اس بنا پر یہ حسابی غلطی بھی اُن کے سر تھوپنا نازیبا ہے۔

اس ایڈیشن کا ایک نسخہ خان بہادر ابو محمد صاحب مرحوم کے پاس بھی محفوظ تھا، جس کے ایک صفحہ کا عکس اکرام صاحب نے غالبؔ نامے میں دیا ہے۔ اب یہ نسخہ ان کے صاحبزادے کی ملکیت ہے۔ خوش قسمتی سے اس کی ایک نقل، جو کسی شوقین نے اپنے لیے کی تھی، کتاب خانہ رامپور میں محفوظ ہے۔ خوش قسمتی سے ناقل نے سرِ ورق سے نقل شروع کر کے نیر کی تقریظ پر کتاب کو ختم کیا ہے (صرف دیباچے کا ابتدائی حصہ اور ردیف الیاء کی چند غزلیں، کتاب کے اوراق گم ہو جانے کے باعث کم ہو گئی ہیں) خط شکستہ ہے، اور اشعار کو بیاض کے انداز پر لکھا گیا ہے۔ اصل مطبوعہ نسخے سے مقابلہ کرنے پر اندازہ ہوا کہ نقل کرنے والے نے بڑی احتیاط سے اِس کام کو انجام دیا ہے اور اپنی طرف سے کسی طرح کی کمی بیشی نہیں دی ہے۔

پنج آہنگ کے ایک مکتوب (ص 182) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ایڈیشن کی ایک جلد میرزا صاحب نے امین الدولہ آغا علی خاں بن معتمد الدولہ آغا میر کو تحفتاً کانپور بھیجی تھی۔

دیوانِ فارسی، میخانۂ آرزو

میرزا صاحب نے دیوانِ اردو کے دیباچے میں وعدہ کیا تھا کہ اِس کام سے فارغ ہو کر، دیوانِ فارسی مرتب کریں گے۔ کلکتے سے واپس آکر انھوں نے سرمایۂ فارسی اکٹھا کرنا شروع کیا اور اس سفینہ کا نام ''میخانۂ آرزو'' قرار دیا۔ علی بخش خاں رنجوؔر نے ''پنج آہنگ'' کے دیباچے میں لکھا ہے:

> ''در آغازِ سالِ یک ہزار و دوصد و پنجاہ و یک ہجری، شمس الدین احمد خاں را بہ قضائے آسمانی آں پیش آمد کہ ہیچ آفریدہ مبیناد [کذا]... و بعد آن ہنگامہ در آن ہنگام از جے پور بدہلی رسیدم... دراں ایام، دیوانِ فیضِ عنوان کہ مسمیٰ بہ ''میخانہ آرزو'' سرانجام است، تازہ فراہم آمدہ و پیرایۂ اتمام پوشیدہ بود۔''
>
> (پنج آہنگ:6)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ 1251ھ (1835) کے لگ بھگ دیوان مرتب ہو چکا تھا۔ کلیات فارسی کے شروع میں دیباچہ اور آخر میں تقریظ کے عنوان سے خاتمہ لکھا گیا ہے، جو رنجور کے بیان کے مطابق ''میخانہ آرزو'' ہی کا سروپا ہیں۔ اس دیباچے میں میرزا صاحب فرماتے ہیں:

> ''اندیشہ نسخہ و گمان نسگالد کہ غالبؔ، از دانش بے بہرہ، بدستہ بستنِ این گلہائے خرزہرہ، آہنگِ خود آرائی و اندازِ انگشت نمائی دارد. بلکہ خون گرمیِ ابرام والا برادر... امین الدین احمد خاں بہادر... مرا بدیں کار داشتہ و ہمتم را بہ پنبہ دوریِ ایں کہین دلق گماشتہ است۔'' (کلیاتِ فارسی:8 مخطوطہ)

تقریظ میں لکھتے ہیں:

> ''امروز کہ از ہجرت خاتم الانبیا، علیہ التحیۃ والثنا، یک ہزار و دوصد و پنجاہ و سہ سال گزشتہ، در صدِ نگارِ طالعِ من، باندازہِ خراشِ پیکِ آسمانی، در مشاہدۂ آثارِ سالِ چہل و یکم است، ہنوز شخصِ اندیشہ، کجخسرِ و ایں جام افلاطونِ ایں خم است۔''
>
> (ایضاً:280، و پنج آہنگ:157)

ان بیانوں سے واضح ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے اپنا فارسی دیوان، نواب امین الدین احمد خاں بہادر، والیِ لوہارو، کی فرمائش پر مرتب کیا اور 1253ھ (1837) میں، جب کہ ان کی عمر کا اکتالیسواں سال شروع ہو چکا تھا، اس کام کو انجام تک پہنچایا۔

پنج آہنگ کے نسخۂ مطبوعہ 1853 میں اس تقریظ کی جو نقل چھپی ہے، اس میں فارسی قطعہ، مثنوی، قصیدہ، غزل، اور رباعی کے اشعار کی مجموعی تعداد 6 ہزار بتائی گئی ہے لیکن کلیات فارسی کے قلمی نسخے (نمبری 411) میں یہ تعداد بڑھ کر 6672 ہوگئی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ترتیب کے وقت دیوان میں ہزار ابیات تھے۔ جب پہلی طباعت کی نوبت آئی تو اس تعداد میں 6672 اشعار کا اضافہ ہو گیا، لیکن اصولاً مرزا صاحب کو تاریخِ تحریر خاتمہ میں بھی تغیر کرنا چاہیے تھا، جیسا کہ مطبع نول کشور لکھنؤ میں دیوان کی طباعت کے وقت انھوں نے کیا ہے مگر کسی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔

طباعت دیوان: فارسی

جیسا کہ ابھی بیان ہوا میرزا صاحب نے 1253ھ (1837) میں دیوان فارسی مرتب کر لیا تھا، مگر اس کی طباعت کا انتظام عرصے تک نہیں ہو سکا، تا آنکہ دہلی میں ان کے ایک مخصوص دوست نے چھاپے خانہ قایم کر کے یہ ارادہ کیا کہ اس میں دیوانِ غالب، اردو اور فارسی طبع کریں۔ اردو دیوان 1841 میں چھپ گیا، مگر فارسی دیوان کی طباعت بعض وجوہ سے ملتوی کر دی گئی۔ اس وجہ کے متعلق میرزا صاحب نے میجر جان جاکوب کو لکھا ہے:

> ہمچنین "پنج آہنگ" و دیوانِ فارسی کہ طرازِش ہر یکے وابستہ بفراہم آمدنِ
> درخواسہائے خریدارانست، ہنگام خود پیہم بخدمت خواہد رسید۔"
>
> (کلیات نثر:174)

دیوانِ ریختہ کا مطبعِ سید الاخبار میں انطباع اکتوبر 1841 (شعبان 1257ھ) میں واقع ہوا ہے، اس بنا پر یہ خط اسی سنہ بلکہ اسی مہینے کا لکھا ہونا چاہیے۔

ستمبر 1863 میں میرزا صاحب کے مطبوعہ دیوانِ فارسی کے بارے میں تحریر کیا ہے:

> "فارسی کا دیوان بیس پچیس برس کا عرصہ ہوا جب چھپا تھا۔ پھر نہیں چھپا۔"
>
> (اردوئے معلیٰ:130، مخطوطہ 111)

اس خطہ سے دو باتیں روشنی میں آتی ہیں: پہلی یہ کہ نول کشور پریس میں دیوان کے طبع ہونے سے قبل، فارسی دیوانِ غالب صرف ایک بار چھپا تھا اور دوسری یہ کہ 1863 میں اس طباعت پر 20 یا 25 سال گزر چکے تھے۔ اس بیان کے لحاظ سے دیوانِ فارسی کی پہلی طباعت 1838 یا 1843 میں عمل میں آئی ہوگی۔ ان دونوں تخمینوں میں پہلا درست نہیں ہے، اس لیے کہ ابھی خود میرزا صاحب کے فارسی خط سے ثابت ہو چکا ہے کہ 1841 تک دیوان فارسی طبع نہیں ہوا تھا۔ دوسرا تخمینہ اس بنا پر درست نہیں کہ ''فہرست کتابخانہائے شاہ اودھ'' (صفحہ 410) میں ڈاکٹر اشپرنگر نے میرزا صاحب کے مطبوعہ دیوانِ فارسی کے ایک نسخے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دہلی کے پتھر کے چھاپے خانے میں 1261ھ کو پچاس (50) صفحوں پر چھپ کر شائع ہوا۔ چونکہ یہ ہجری سنہ عیسوی سال 1846 کے مطابق ہے، لہٰذا 1843 میں اس کا چھاپا جانا صحیح نہ ہوا۔

اگرچہ اشپرنگر نے مطبع کا نام نہیں لکھا ہے، لیکن یہ امر یقینی ہے کہ میرزا صاحب کا کلیات نظمِ فارسی پہلی بار دہلی کے مطبع دارالسلام سے 1261ھ (مئی 1847) میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ اپریل 1853 سے قبل یا بعد میرزا صاحب نے امین الدولہ آغا علی خاں ابن معتمد الدولہ آغا میر، نواب حشمت جنگ بہادر، اور نواب باندہ کے خطوط میں جس ایڈیشن کا ذکر کیا ہے، وہ یہی نسخۂ مطبوعہ 1847 ہے۔

غدر کے ہنگامے سے برسوں پہلے یہ نسخہ کمیاب ہوگیا تھا، چنانچہ نواب علی بہادر کے محولہ بالا خط میں میرزا صاحب نے یہی لکھا ہے کہ:

''بہ پذیرفتن فرمان، مردم را سو سوگماشتم۔ رفتند و جستند۔ دیوانِ فارسی و
دیوانِ ریختہ فراچنگ نیامد'' (پنج آہنگ:333)

عام طور پر نہیں ملتا صرف ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کے پاس اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔ آج بھی یہ نسخہ وہاں کتابخانۂ عالیہ رامپور میں ایک قلمی نسخہ ہے جس کی تقریظ میں میرزا صاحب نے 1253ھ تاریخ اتمام لکھی ہے۔ اس میں صفحہ 23 پر میجر جان جاکوب کے تعمیر کیے ہوئے کنویں کی تاریخ ''چشمۂ فیض ابدی'' بھی پائی جاتی ہے، جس سے 1255ھ/1839 مستخرج ہوتے ہیں۔

صفحہ 157 سے ایک قصیدہ شروع ہوتا ہے جس کا عنوان ہے: ''در مدح جہاں پناہ، امجد علی شاہ اورنگ نشین اودھ دام ملکہ۔ امجد علی شاہ 6/ ربیع الاثانی 1258 ہجری (7 مئی

1842) کو تخت نشین ہوئے، اور 26/صفر 1263ھ (فروری 1847) کو فوت ہو گئے۔

اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کتاب خانہ رامپور کا یہ قلمی نسخہ 1261ھ کے مطبوعہ نسخے کی نقل ہے، یا یہ دونوں نسخے ایک ہی مسودے سے منقول ہیں، اور تقریظ کے سنین 1253ھ میں، 1863 والے نولکشوری نسخے کی طرح، ردوبدل نہیں کیا گیا ہے۔ اس قیاس کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے، جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ میرزا صاحب کی غزل: ''اے ذوق نوا سنجی بازم بخروش آور'' جو 4/اکتوبر 1855 کی رات کو لکھی گئی تھی، اس نسخے میں موجود نہیں ہے۔

اس فیصلے پر صرف یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ رامپور کے اُس قلمی نسخے کے صفحہ 187 پر نواب وزیر الدولہ وزیر محمد خاں بہادر والی ٹونک کی مدح کا قصیدہ درج ہے، جو مولانا مہر کے خیال میں 1278ھ (1861) کو ٹونک بھیجا گیا تھا، پھر یہ نسخہ 1261ھ والے مخطوطہ سے کیا علاقہ رکھ سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وزیر الدولہ والا قصیدہ صرف اسی نسخے میں نہیں، کلیات فارسی کے اس نسخے میں بھی موجود ہے جو نواب فخر الدین خاں مرحوم کا نوشتہ ہے اور 30/مارچ 1861 کو رامپور پہنچ گیا تھا۔ 1278ھ تقریباً 7 جولائی 1861 کو شروع ہوا تھا جس کا یہ مطلب ہے کہ 30 مارچ 1861 کو رمضان 1277ھ ہوگا۔ اگر یہ قصیدہ 1278ھ (1861) میں ٹونک جاتا تو اس نسخے میں اس کا ہونا ممکن نہ تھا۔ اسی طرح ٹونک کا دوسرا قصیدہ بھی اس مافی الذکر نسخے میں موجود ہے۔ لہٰذا اس کو بھی 1277ھ سے قبل کا ہونا چاہیے۔

غدر کے بعد دیوان فارسی کے صرف دو مکمل نسخے تیار ہو سکتے تھے، جن میں سے ایک نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیر کے پاس تھا اور غالباً اس کی نقل مارچ 1861 میں میرزا صاحب نے نواب فردوس مکان کو رامپور ارسال کر دی تھی، اسی سال منشی نول کشور نے اس کی طباعت کا ارادہ کیا، میرزا صاحب نے 17 محرم 1278ھ (26 جولائی 1861) کو میر مہدی مجروح کو اس کی اطلاع ان الفاظ میں دی:

> ''کلیاتِ نظم فارسی کے چھاپنے کی بھی تدبیر ہو رہی ہے۔ اگر ڈول بن گیا تو وہ بھی چھاپا جائے گا۔'' (اردوئے معلیٰ: 186، خطوط: 1، 282)

11/ربیع الاوّل سنہ مذکور کو حبیب اللہ ذکا کو لکھا:

> ''اینک در بند آنم کہ بہ بند الطباعش در آورند کہ درین صورت فراوان و خواستاران را یافتن آن آسان خواہد بود۔'' (کلیات نثر فارسی: 247)

میرزا صاحب نے مطبع کے لیے نسخہ مہیا کرنے کی تدبیر یہ سوچی کہ تفضل حسین خاں سے ان کا نسخہ مستعار لے کر اپنے دیوان کی تکمیل کر لیں اور اُسے لکھنؤ بھیج دیں۔ انھوں نے پس و پیش کے بعد نسخہ دیا، تو وہ ناقص و ناتمام نکلا (اردوئے معلیٰ 247)۔ رامپور سے دیوان منگانا مناسب نہ تھا، آخر نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر کو ایک سحر آفریں خط لکھ کر راضی کر لیا کہ وہ اپنا نسخہ لکھنؤ بھیج دیں (اردوئے معلیٰ 289)۔ سید بدرالدین احمد کو ستمبر 1863 میں میرزا صاحب نے لکھا ہے:

''ہاں، سالِ گزشتہ منشی نولکشور نے شہاب الدین خاں کو لکھ کر کلیاتِ فارسی، جو ضیاء الدین خاں نے غدر کے بعد بڑی محبت سے جمع کیا تھا، وہ منگالیا، اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس جزو ہیں۔'' (اردوئے معلیٰ:113 و خطوط 1، 111)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسودہ براست نواب شہاب الدین خاں بہادر نے لکھنؤ بھیج دیا تھا، اور 1862 میں اس کی طباعت شروع ہوئی تھی۔

5 مئی 1862 کو میرزا صاحب نے قدر بلگرامی کو ایک خط لکھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں طباعت کا کام رک گیا تھا، چونکہ میرزا صاحب کو اس کی وجہ معلوم نہ تھی، اس لیے انھیں تردد تھا، نیز یہاں سے کوئی قصیدہ اور تاریخ طباعتِ کلیات بھی ارسال کیے گئے تھے، ان کا حال بھی معلوم نہ ہو سکا تھا، نہ تصحیح وغیرہ کے متعلق کچھ پتہ تھا۔ میرزا صاحب نے ان الفاظ میں اپنے مدعا کو ظاہر کیا:

''جناب منشی صاحب سے میرا سلام کہیے، اور یہ رقعہ ان کو پڑھا کر عرض کیجیے کہ غالب پوچھتا ہے کہ فارسی کے کلیات کا چھاپا ملتوی ہے یا جاری ہے، ملتوی ہے تو کب تک کھلے گا، جاری ہے تو تصحیح کس طور پر ہے، قصیدے اور تاریخ کلیات کا مطبع میں پتہ لگا یا نہیں، اگر وہ دونوں کاغذ گم ہو گئے ہوں تو ثانیاً بھیج دوں۔'' (خطوط 1، 191)

اس خط کے جواب میں جو کچھ لکھا گیا تھا، اس کے بعض مطالب میرزا صاحب نے مجروح کو 15 / ذیقعدہ 1279ھ مطابق 15 مئی 1862 کو تاریخ کلیات وصول کر کے لکھا ہے:

''کلیات کے چھاپے کی حقیقت سنو۔ 60 صفحے چھاپے گئے تھے کہ مولوی ہادی علی مصحح بیمار ہو گئے۔ کاپی نگار رخصتی اپنے گھر گیا۔ اب دیکھیے کب چھاپا شروع

ہو۔" (اردوئے معلیٰ:164 و خطوط:1، 276)

24 مئی 1862 کو قدر کے خط میں جو لکھا ہے، بعض دوسرے مطالب پر اس سے روشنی پڑتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"کلیات کے انطباع کی تاریخ میں کیوں کر لکھوں؟ اہلِ مطبع کو خدا منشی صاحب کے سایۂ عطوفت میں سلامت رکھے! کہ لیں گے۔ چھاپا 78ھ میں شروع ہوا، 79ھ میں تمام ہوگا، مولوی ہادی علی صاحب کے مطبع میں آنے کا حال تم لکھو، اور کلیات کے کاپی نگار کے آنے کا بھی حال معلوم کر کے لکھو۔"

(خطوط:1، 192)

غالبًا اگلے مہینے تک کام روانہ ہوا، میرزا صاحب کی افسردہ طبیعت پر اس تاخیر کا اتنا اثر ہوا کہ پنجشنبہ 19 جون 1862 کو نواب علاء الدین احمد خاں بہادر علائی کو لکھتے ہیں:

"کلیات کے انطباع کا اختتام اپنی زیست میں مجھ کو نظر نہیں آتا۔"

(اردوئے معلیٰ:411 و خطوط:1، 340)

اِس تاریخ کے بعد سے آئندہ سال کے ماہ جون تک کلیاتِ فارسی کی طباعت کا ذکر میرزا صاحب کے موجودہ ذخیرۂ مکتوبات میں نہیں ملتا۔ 11 جون 1863 کو علائی کے نام ایک خط میں لکھا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں:

"کلیات کے باب میں جو عرض کر چکا ہوں۔ برہمانیم کہ ہستیم و ہماں خواہر بود۔ جب میں دس پندرہ جلدیں منگا لوں گا، ایک بھائی کو اور ایک تم کو ارمغان بھیجوں گا، اگر بھائی کو جلدی ہے تو لکھنؤ میں اودھ اخبار کا مطبع مالک اس کا منشی نول کشور مشہور، جتنی جلدیں چاہیں۔ لکھنؤ سے منگالیں۔ میں بہر حال دو جلدیں جس وقت موقع ہوگا، بھیج دوں گا۔"

(اردوئے معلیٰ:429 و خطوط:1، 351)

اس سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ 11 جون 1863 سے قبل کلیات کا چھاپا تمام ہو گیا تھا۔ 12 اگست کو مجروح کو لکھا ہے:

"کلیاتِ فارسی کا پہنچنا مجھ کو معلوم ہوا۔ میاں، اس میں اغلاط بہت ہیں۔"

(خطوط:1، 285)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگست میں کتاب چھپ کر اس کا ایک نسخہ براہِ راست لکھنؤ سے میر مہدی مجروح کے پاس پہنچ چکا تھا، میرزا صاحب کے پاس اس کا پہلا نسخہ علائی کے توسط سے ستمبر میں پہنچا۔ چنانچہ 20/ 1863 * کو انھیں لکھتے ہیں:

''جانا، عالیشانا! پہلے خط اور پھر بتوسط برخوردار علی حسین خاں مجلد کلیاتِ فارسی پہنچی۔ خیریت ہے کہ چار روپے قیمت کتاب اور چار آنے محصول ڈاک قالب انطباع میں آ کر پانچ روپے قیمت اور پانچ آنے محصول قرار پاوے۔ خیر جہاں سو، وہاں سوا سے۔ میرا حال تمھیں اور تمہارا حال مجھے معلوم ہے۔

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

اب کے چھٹے میں شاید نہ دے سکوں۔ نومبر سنہ حال میں پچاس روپے تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔'' (خطوط غالب 1، 406، اردوئے معلیٰ: 426)

میرزا صاحب نے یہ نسخہ سر سالار جنگ اول کی خدمت میں موید الدین خاں کے توسط سے روانہ کر دیا۔ اس کے متعلق 25 ستمبر 1863 کو ذکا کو لکھتے ہیں:

''صاحب تاریخ انطباع کلیات خوب لکھی ہے، مگر ہزار حیف! کہ بعد از اتمامِ انطباع پہنچی اور کتاب کی رونق افزا نہ ہوئی، آپ سے یہ چاہتا ہوں کہ آپ مولوی صاحب سے ملیں اور ان کو یہ خط اپنے نام کا دکھائیں اور میری طرف سے بعدِ سلام میرے کلیات کے پارسل کا ان کے پاس، اور ان کے ذریعہ عنایت سے اس مجلد کا حضرتِ فلک رفعت نواب افتخار الملک بہادر کی نظر سے گزرنا اور جو کچھ اس گزرنے کے بعد واقع ہو، دریافت کر کے لکھیں۔''

(اردوئے معلیٰ: 39)

مگر میرزا صاحب اس کے ایک سے زائد نسخے منگانا چاہتے تھے اور اس کام کا انجام روپے کے بغیر ممکن نہ تھا، حسن اتفاق سے منشی نول کشور دلی آئے۔ میرزا صاحب اور ان سے بات چیت میں یہ طے ہوا کہ میرزا صاحب 20 نسخوں کی قیمت 3 روپے 4 آنے فی جلد کے حساب سے ادا کر کے منگا لیں اس کے متعلق میرزا صاحب نے 3 دسمبر 1863 کو علائی کو لکھا ہے:

---

* غالب نے یہ خط 20 ستمبر 1863 کو لکھا تھا۔

''شفیق مکرم ولطف مجسم، منشی نول کشور صاحب بہ سبیلِ ڈاک یہاں آئے۔ مجھ سے اور تمہارے چچا اور تمہارے بھائی شہاب الدین خاں سے ملے، خالق نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے۔ گویا بجائے خود قران السعدین ہیں۔

تم سے میں نے کچھ نہ کہا تھا، اور کلیات کے دس مجلد کی قیمت پچاس روپے مان لیے تھے۔ اب ان سے جو ذکر آیا، تو انھوں نے پہلی قیمتِ مشتہرۂ اخبار یعنی قبول کی، یعنی تین روپے چار آنے فی جلد۔ اس صورت میں دس مجلد کے بتیس روپے آٹھ آنے میں دوں اور بتیس روپے آٹھ آنے تم۔ ہمگی پینسٹھ روپے مطبع اودھ اخبار میں پہنچانے چاہئیں۔ میں دسمبر ماہِ حال کی دسویں گیارہویں کو طالب ہوں گا۔ کہو 32 (روپے) 8 (آنے) علی حسین خاں کو دے دوں۔ کہو لکھنؤ بھیج دوں۔''

(اردوئے معلیٰ: 405 وخطوط: 1، 354)

اور غالباً اس تصفیے کے بعد ہی سید بدرالدین احمد کو بھی لکھتے ہیں:

''اب سنا ہے کہ وہ چھپ کر تمام ہوگیا ہے۔ روپے کی فکر میں ہوں۔ ہاتھ آجائے، تو 65 (روپے) بھیج کر بیس جلدیں منگواؤں، جب آجائیں گی، ایک آپ کو بھیج دوں گا۔'' (ایضاً: 130، وایضاً: 1، 111)

13 دسمبر کو پھر ایک خط علائی کو لکھا ہے، جس میں اپنے حصے کی رقم ہنڈی کے ذریعہ ارسال کرنے کا وعدہ کیا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ:

''نہ دن یاد ہے نہ تاریخ آج چوتھا یا بھئی شاید بھول گیا ہوں پانچواں دن ہے کہ منشی نول کشور بہ سواریِ ڈاک رہگرائے لکھنؤ ہوئے۔ کل پہنچ گئے ہوں یا آج پہنچ جائیں۔ آج روز یکشنبہ 13 دسمبر کی ہے۔''

(اردوئے معلیٰ: 43)

اس لیے اغلب ہے کہ انھوں نے لکھنؤ پہنچ کر جب ہنڈوی کے ذریعہ قیمت وصول کرلی ہوگی، تب کلیات کے بیس نسخے بھیجے ہوں گے، اور اس لیے بعید نہیں کہ آغاز 1864 میں یہ نسخے میرزا صاحب کو ملے ہوں۔

30 مئی 1864 کے ایک خط میں علائی کو لکھا ہے:

''اے میری جان! مثنوی ابرِ گہر بار کون سی فکر تازہ تھی کہ میں تجھ کو بھیجتا کلیات میں موجود ہے۔ معہذا شہاب الدین خاں نے بھیج دی۔ میں مکرر کیا بھیجتا۔''

(اردوئے معلیٰ: 427 وخطوط: 1، 358)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخ سے قبل ان کے پاس کلیات کے نسخے پہنچ گئے تھے۔ اس ایڈیشن کے بعد میرزا صاحب کی حیات میں پھر کلیاتِ فارسی کی طباعت کی نوبت نہیں آئی۔

31/دسمبر 1948



دیوانِ غالب (اُردو) کے ابتدائی مطبوعہ نسخے

رسالہ جامعہ کے مئی سنہ رواں کے شمارے میں ایک مضمون فرید آبادی صاحب کا بعنوان ''دیوانِ غالب اردو کا ایک نایاب نسخہ'' شائع ہوا ہے۔ صاحب مضمون نے بڑی کاوش اور جستجو سے اسے مرتب کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ اپنے پیش رووں کی ساری غلط فہمیوں کو دور کردیں مگر اس سلسلے میں خود موصوف کو بھی بعض غلط فہمیاں ہوئی ہیں جو واقعات کے قطعاً خلاف ہیں اور اس لیے ان کی بابت کچھ عرض کر دینا ضروری ہے تاکہ یہ مرض متعدی نہ ہو جائے۔ حقیر عرشی نے ''انتخاب غالب'' کے لیے ایک دیباچہ مرتب کیا تھا اور اس میں میرزا صاحب کے بیانوں کی روشنی میں ان کی شعر و شاعری سے بمقدور مفصل و مکمل بحث کی تھی۔ موجودہ جنگ کے برکات نے مجبور کیا کہ کاغذ دستیاب نہ ہونے کی باعث اس مقدمے کی طباعت کو ملتوی کردیا جائے۔ اس مقدمے کا وہ حصہ جو طباعت دیوان سے متعلق ہے، زیر بحث مسئلے پر برہان قاطع ہے۔ اس لیے میں اسے معمولی تغیر کے ساتھ شائع کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ چونکہ اس مضمون کے پڑھنے سے فرید آبادی صاحب، مالک رام صاحب اور اکرام صاحب کے شکوک و شبہات کا از خود ازالہ ہو جاتا ہے اس لیے میں نے ان حضرات کے نام لینے اور ان کے اقوال نقل کرکے تردید کرنے سے احتراز کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ سب محققین اس جسارت کو معاف فرما دیں گے اور ناظرین فرید آبادی صاحب کے خلاصہ کو جو آخر مضمون میں انھوں نے لکھ دیا ہے ذہن نشیں کرکے اس مضمون کو ملاحظہ کریں گے۔

آخر تمہید میں جملۂ معترضہ کے طور پر یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ یہ ''انتخاب غالب'' خود مرزا صاحب کا خود کردہ انتخاب کلام فارسی و اردو ہے۔ صورت یہ درپیش آئی تھی کہ نواب خلد آشیاں نے اساتذۂ فارسی و اردو کے منتخب اشعار کی بیاض ترتیب دینے کا عزم فرمایا تھا اور اسی

رسالہ جامعہ، ستمبر 1942

سلسلے میں مرزا صاحب سے فرمائش کی تھی کہ وہ اپنے کلام کا خود انتخاب کر کے بھیج دیں۔ ستمبر 1866 میں میرزا صاحب نے اس ارشاد کی تعمیل میں دیوان فارسی اور دیوان اردو کا انتخاب کچھ خود لکھ کر اور زیادہ دوسروں سے نقل کرا کے ارسال کیا تھا جو کتاب خانے میں موجود تھا۔

مکاتیب غالبؔ میں اس سلسلے کی پوری مراسلت شائع ہو چکی ہے۔ اس جگہ حاشیہ میں یہ خیال بھی ظاہر کر دیا گیا تھا کہ عنقریب اس انتخاب کو چھاپا جائے گا۔ چنانچہ اس ارادہ کی بحمداللہ تکمیل ہو چکی ہے اور زیادہ سے زیادہ آئندہ دو ماہ کے اندر یہ نسخہ بازار میں آجائے گا چونکہ اس سے ہمیں یہ اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ آخر عمر میں میرزا صاحب کا ذوق شعر کیا تھا اور وہ اپنے کون کون سے اشعار کو پسند کرتے تھے اسی بنا پر اس کتاب کا مطالعہ ہر اس شخص کے لیے لازم ہوگا جو میرزا صاحب پر کوئی کام کرنا چاہتا ہے یا میرزا صاحب کے خود چنے ہوئے اشعار کو پسند کرنے کی طرف مائل ہو۔ (امتیاز علی عرشی)

طباعت دیوانِ اردو

جس طرح میرزا صاحب کی شعرگوئی کا آغاز ریختہ سے ہوا ہے اسی طرح طباعت دواوین میں بھی دیوان ریختہ کو تقدم حاصل ہے۔ نیز یہی دیوان ان کی زندگی میں بار بار چھپ کر شائع ہوتا رہا اور آج تک برابر چھپ رہا ہے۔

ان ایڈیشنوں میں سے ان نسخوں کا ذکر تاریخی حیثیت سے زیادہ مفید اور دلچسپ ہوگا، جو میرزا صاحب کی زندگی میں خود ان کی ایما سے شائع ہوئے تھے۔ جہاں تک تحقیق ہو سکی ہے میرزا صاحب کی زندگی میں ان کا اردو دیوان چار بار چھپ کر شائع ہوا ہے*۔ یہ چاروں ایڈیشن آج بھی کتاب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔

پہلا ایڈیشن:

ان میں سے پہلا نسخہ مطبع سیدالاخبار دہلی میں چھپ کر شائع ہوا تھا، میرزا صاحب نے ختم طباعت سے کچھ پہلے میجر جان جاکوب کو لکھا ہے:-

"نہاں نماناد کہ نقش مطبع سیدالاخبار انگیختۂ طبع یکے از دوستان روحانی منست۔

* غالب کا دیوان ان کی زندگی میں پانچ بار شائع ہوا تھا۔ اس کی تفصیل میں نے مقدمے میں لکھی ہے۔ (مرتب)

ہمانا کارفرمائے ایں نو آئین کدہ، ایں می سگالد کہ درین کارگاہ نقشہائے بدیع
انگیز دو فرو ریختہ ھائے خامۂ غالبؔ بے نوا را بقالبِ انطباع فرو ریزد، ازاں
جملہ دیوان ریختہ کہ در تمامی ناتمام است، عجب نیست کہ ہم دریں ماہ بتمامی و
آنگاہ بنظرگاہِ سامی رسد۔" (پنج آہنگ)

یہ مطبع سرسید مرحوم کے بھائی، سید محمد خاں بہادر نے دہلی میں قائم کیا تھا اور سید المطابع یا مطبع سید الاخبار کے نام سے مشہور تھا۔ شعبان 1257ھ مطابق اکتوبر 1841 میں اس مطبع سے میرزا صاحب کا دیوان چھپ کر شائع ہوا۔ پبلک لائبریری رامپور میں اس اڈیشن کا ایک نسخہ محفوظ ہے جس کے سرِورق پر حسب ذیل عبارت اس طرح پانچ سطروں میں لکھی ہے:

دیوان اسد اللہ خاں صاحب غالب تخلص
مرزا نوشہ صاحب مشہور کا دہلی میں سید محمد خاں بہادر کے چھاپہ خانہ کے
لیتھوگرافک پریس میں شہر شعبان
1257 ہجری مطابق ماہ اکتوبر 1841 عیسوی کو سید عبدالغفور کے
اہتمام میں چھاپا ہوا۔"

صفحات کی تعداد 108 ہے۔ آخر میں ایک ورق اور شامل ہے جس کے پہلے صفحے پر 15 غلطیوں کا ایک غلط نامہ دیا گیا ہے مگر کاتب نے اس پر مسلسل یا نئے ہندسے نہیں ڈالے ہیں۔ ہر صفحہ میں 15 سطریں ہیں ہر دو غزلوں کے درمیان کی ایک سطر کاتب نے سادہ چھوڑ دی ہے جس کے باعث سے ہر صفحے میں مکتوبی سطریں پندرہ سے کم رہ گئی ہیں۔ کاغذ پرانی وضع کا دیسی بانس کا بنا ہوا ہے۔ کتاب کا طول وعرض 5:1/4x8:1/2 انچ اور کتابت کا 3:1/2x6:1/4 انچ ہے۔ خط بہت معمولی نستعلیق ہے اور پوری کتاب جدولوں سے خالی ہے۔

مضامین کی ترتیب یہ ہے:

ص1: سفرنامہ (اس کی پوری عبارت نقل کی جاچکی ہے۔)
ص2: (سادہ ہے)
ص3-5: (دیباچۂ فارسی۔ اس کے آخر میں کوئی تاریخ نہیں ہے)۔
ص5: سطر 4: "یا اسد اللہ الغالب"
" سطر 5: غزلیات ردیف الف (لیکن یہ الفاظ نسخے میں محذوف ہیں) تعداد اشعار: 229)

ص25: ردیف الباء الموحدہ: (تعداد اشعار:12)

ص26: ردیف التاء المثناۃ الفوقانیہ (تعداد اشعار:19)

ص28: ردیف الجیم المعجمۃ التازیہ (تعداد اشعار:4)

ص29: جیم الفارسی (لفظ ردیف محذوف ہے۔تعداد اشعار:6)

ص29: ردیف الدال المہملہ (تعداد اشعار:8)

ص30: ردیف الراء المہملہ (تعداد اشعار:39)

ص33: ردیف الزاء المعجمہ (تعداد اشعار:20)

ص35: ردیف السین المہملہ (تعداد اشعار:7)

ص36: ردیف الشین المعجمہ (تعداد اشعار:2)

" ردیف العین المہملہ (تعداد اشعار:8)

ص37: ردیف الفاء (تعداد اشعار:2)

" ردیف الکاف تازیہ (الف لام ''التازیہ'' محذوف ہے۔تعداد اشعار:15)

ص38: کاف فارسی (لفظ ردیف وغیرہ محذوف۔تعداد اشعار:2)

" ردیف لام (الف لام محذوف۔تعداد اشعار:9)

ص39: ردیف المیم (تعداد اشعار:8)

ص40: ردیف النون (تعداد اشعار:127)

ص52: ردیف الواؤ (یہ عنوان پورا محذوف ہے۔تعداد اشعار:38)

ص55: ردیف الہاء (تعداد اشعار:3)

" ردیف الیاء (تعداد اشعار: 441۔لیکن اس ردیف میں کلکتے کی تعریف والے قطعے کے 3 شعر سہواً چھپ گئے ہیں۔ اس لیے تکرار اشعار کو کم کرنے کے بعد صحیح تعداد: 438 ہوتی ہے)

ص94: سطر آخر ''تمام شد غزلیات''

ص95: ''منتخب قصیدۂ منقبت علی مرتضٰی علیہ السلام'' (تعداد اشعار:25)

ص97: ''انتخاب قصیدۂ منقبت علی مرتضٰی علیہ السلام'' (تعداد اشعار:23)

ص99: س8: ''قطعات''

ص99: "س9: ''قطعہ در نمایشِ عنوان دلآویزی گفتار و آسان کردنِ اندوہ پشیمانی بر دلِ دلدار، تعداد اشعار: 2)

ص99: ''چمن سرمایہ کردن گفتار بستایش کلکتہ کہ اگر فردوس نتواں گفت ارم است البتہ۔ تعداد اشعار 4)

ص100: ''بادوست از سپاس عطای ہدیہ سخن راندن، و متاع گزیدۂ سخن در برابرِ آں افشاندن۔'' تعداد اشعار: 13)

ص101: س6 ''رباعیات'' (تعداد اشعار: 20)

ص103: س7: تقریظ (نوشتہ نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیّر)

یہ تقریظ سنہ ہزار و دویست و پنجہ و چہار ہجریہ نبویہ'' (1254ھ مطابق 1838) میں لکھی گئی ہے اور تعداد اشعار کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''ہمگی اشعار شعری شعار غزل و قصیدہ و قطعہ و رباعی ہزار و نود و ہشت اند یافتم۔''

لیکن سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید[1] میں اس تقریظ کو نقل کرتے ہوئے 1254ھ کے ساتھ تعداد اشعار ''یک ہزار ہفتاد و اند'' درج کی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ترتیب دیوانِ ریختہ کے وقت اشعار کی کل تعداد 1072 سے کچھ اوپر تھی جب طباعت کے وقت اس میں اضافہ ہو کر کل اشعار 1090 سے کچھ زیادہ ہو گئے تو تعداد میں ترمیم کر دی گئی۔ اصولاً یہاں تاریخ بھی بدلنا چاہیے تھی لیکن کسی وجہ سے ایسا نہیں ہوا۔

اس عبارت کے الفاظ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ نیّر نے اصل میں ''ہزار و نود و اند'' لکھا تھا۔ لفظ 'ہشت' کتاب کے چھپ جانے کے بعد کاتب یا مصحح نے اشعار گن کر ایزاد کیا ہے۔ اس قیاس کی وجہ یہ ہے کہ 'اند' بمعنی چند اکائی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جب ''ہشت'' نے اکائی کی جگہ پُر کر دی تو اس لفظ کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور بے ضرورت لفظ کا غلط استعمال نیّر جیسے ادیب سے ناممکن ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ خود اشعار کی یہ تعداد بھی درست نہیں۔ کتاب میں کل اشعار 1095 ہیں۔ میرزا صاحب کے قطعہ:

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

---

1. کتاب مذکورہ: باب 4، 158-155، طبع اوّل 1263ھ مطابق 1847 نسخہ، صولت پبلک لائبریری، رامپور

کے تین بیت حصۂ غزلیات کی ردیف الیا میں سہواً مکرر چھپ گئے ہیں جس کے سبب سے میزان میں 3، اعداد کا اضافہ ہوکر حاصل 1098 نکلا ہے۔ چونکہ نیّر کے متعلق تصحیح کتاب میں حصہ لینے کا کوئی حوالہ نسخے میں نہیں ہے اس لیے یہ حسابی غلطی بھی اُن کے سر تھوپنا نازیبا ہے۔

اس مطبوعہ نسخے کی ایک پرانی نقل کتاب خانۂ عالیہ رامپور میں موجود ہے۔ خوش قسمتی سے ناقل نے سرورق کی عبارت سے شروع کر کے نیّر کی تقریظ پر کتاب کو ختم کیا ہے (صرف دیباچے کا ابتدائی حصہ اور ردیف یا کی کچھ غزلیں اصل کتاب کے اوراق گم ہوجانے کے سبب سے کم ہوگئی ہیں) خط شکستہ ہے اور اشعار کو بیاض کے انداز پر لکھا گیا ہے۔ کاتب نے بڑی احتیاط سے نقل کا فریضہ انجام دیا ہے اور اپنی طرف سے کوئی کمی بیشی نہیں ہونے دی ہے۔ اس لیے یہ ہو بہو نقل اصل مطبوعہ نسخے کے برابر اہمیت رکھتی ہے۔

دوسرا ایڈیشن

اس کے چھ سال بعد مئی 1847 میں نئے اشعار کے اضافہ کے ساتھ منتخب دیوان ریختہ مطبع السلام دہلی میں چھپ کر شائع ہوا جس میں اس دیوان سے پہلے کلیات غالب فارسی بھی چھپ چکا تھا۔ دیوان اردو کے اس ایڈیشن کے سرورق پر حسب ذیل عبارت چھپی تھی:

''دیوانِ اردو تصنیف مشتری اوج حق پژوہی و خدادانی، رصد بند فلک البروج معارف سبحانی افصح فصحائے دوراں، شاہنشہِ شعرائے ہند و ایران و ہندوستان، دقاق غوامض و رموز سخن سنجی و نکتہ دانی، خلاق مضامین و معانی، سرآمد ارباب فضل و کمال، مہر سپہر نبالت و اجلال جناب مستطاب، منبع القاب، میرزا اسد اللہ خان بہادر ادام اللہ برکاتہم وحسناتہم المتخلص بغالبؔ و اسدؔ، بہ تصحیح ومقابلۂ جناب مصدر الدرح در مطبع دار السلام دہلی واقع محلہ حوض قاضی بنیۂ اقل العباد عنایت حسین در ماہِ مئی 1847 باہتمام نور الدین احمد لکھنوی علیہ انطباع پوشید۔''

پہلے ایڈیشن میں اور اس نسخے میں ترتیب مضامین یکساں رہی۔ مگر غزلوں کی ردیفوں کے عنوانات حذف کر دیے گئے اور قصاید کے عنوان کی عبارتوں میں بھی رد و بدل کیا گیا۔ چنانچہ پہلے قصیدہ کا عنوان یہ قرار پایا ''افزایش آبروئے گوہر سخن بہ ثنائے ابوالایمہ حضرت علی مرتضیٰ علیہ التحیۃ والثنا۔'' دوسرے کا عنوان رہا ''ایضاً فی المنقبت۔''

نیّر کی تقریظ میں تاریخ 1254ھ ہی رہی مگر اشعار کی تعداد ''یک ہزار و یک صد داند'' بنا دی گئی گویا چھ برس کے اندر میرزا صاحب نے زیادہ سے زیادہ پانچ اور نو کل چودہ شعر کہے تھے جو اس نسخے میں بڑھا دیے گئے۔ دونوں ایڈیشنوں کے مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب تجمل حسین خاں کی مدحیہ غزل کا جس کے 14 شعر ہیں، اضافہ ہوا ہے۔ بقیہ اشعار جوں کے توں ہیں۔

یہ نسخہ 7x10½، 4¼x8¼ سائز کے 15 سطری 98 صفحوں پر چھپا تھا۔ کاغذ باریک انگریزی سفید اور خط معمولی نستعلیق تھا۔ ہر غزل کے آغاز میں عنوان پر لفظ ''غزل یا ولہ'' لکھا گیا تھا۔

اس ایڈیشن کا ایک نسخہ دہلی یونیورسٹی کے کتاب خانے میں محفوظ ہے۔ رجسٹرار صاحب دہلی یونیورسٹی کی مہربانی سے یہ نسخہ کتاب خانے کو مستعار مل گیا تھا جس کی ہو بہو نقل اسی سائز اور اسی مسطر اور اسی املا میں کتاب خانے کے لیے کرائی گئی ہے مگر سوء اتفاق سے اس نسخے میں صفحات 5 تا 8 کم تھے۔ اس لیے ہماری نقل میں بھی یہ کمی باقی رہ گئی ہے۔ چونکہ 1841 والے ایڈیشن میں اور اس ایڈیشن میں صرف ایک آخری غزل کی کمی بیشی ہے بقیہ حصہ یکساں ہے اور اُس ایڈیشن کی نقل ہمارے پاس موجود ہے، اسی بنا پر اس کمی سے چنداں ہرج واقع نہیں ہوتا۔

حال ہی میں رسالہ جامعہ کے ماہ مئی کے پرچے سے معلوم ہوا کہ سید اسد علی صاحب انوری فرید آبادی کے پاس بھی اِس کا ایک نسخہ موجود ہے۔

تیسرا ایڈیشن

مگر غدر کے پہلے ہی یہ ایڈیشن بھی بازار میں ختم ہوگیا۔ چنانچہ نواب باندہ کو میرزا صاحب نے 1853 کے لگ بھگ لکھا ہے۔

> ''دیوان فارسی و دیوان ریختہ و دیگر از نظم و نثر ہرچہ فرو ریختۂ کلک لا ابالی خرامِ منست کافر باشم اگر یک ورق نزدِ من یا خود نسخۂ از ان من باشد۔ ہمہ ماں مسودہ ھا بردند، و فراہم کردند و جابجا بکالبد طبع فرو ریختند و آنہا سوداگراں بردند و بشہر ہائے دور دست فروختند بہ پذیرفتن فرمان، مردماں را سو بسو گماشتم، رفتند وجستند دیوان فارسی و دیوان ریختہ فراچنگ نیامد۔'' (پنج آہنگ 233)

لیکن شہر کے بعض ذاتی کتاب خانوں میں اس کے نسخے محفوظ تھے جن سے بوقت

ضرورت میرزا صاحب کام لیا کرتے تھے۔ جیسا قاضی عبدالجلیل بریلوی کو 29 اپریل 1859 کو لکھتے ہیں:

''دیوان ریختہ چھاپے کا یہاں کہیں کہیں ہے اپنے حافظے پر اعتماد نکر کر اس کو بھی دیکھا۔ وہ غزل نہ نکلی۔'' (اردو:212،عود:166،خطوط:1، 115)

غدر میں میرزا صاحب کے کلام کے قلمی نسخے جو نیر اور حسین میرزا کے پاس تھے لٹ گئے۔ 1857 میں اس فتنے کے پیدا ہونے سے کچھ دن پہلے میرزا صاحب نے اردو کلیات کا ایک قلمی نسخہ نواب فردوس مکاں ناظم کو تحفے میں بھیجا تھا وہ رامپور کے کتاب خانے میں محفوظ تھا۔ دلی کے بعض احباب کے پاس مطبوعہ نسخے کے علاوہ تازہ غیر مطبوعہ کلام بھی تھا۔ جسے انھوں نے حواشی پر درج کر لیا تھا۔ چنانچہ اپریل 1859 میں منشی شیونرائن نے غالباً اخبار میں چھاپنے کے لیے میرزا صاحب سے کچھ اردو کلام طلب کیا اس کے جواب میں میرزا صاحب نے 19 اپریل کو تحریر کیا ہے:

''صاحب میں ہندی غزلیں بھیجوں کہاں سے؟ اردو کے دیوان چھاپے کے ناقص ہیں، بہت غزلیں اس میں نہیں ہیں، قلمی دیوان جو اتم و اکمل تھے وہ لٹ گئے یہاں سب کو کہہ رکھا ہے کہ جہاں بکتا ہوا نظر آجائے لے لو۔ تم کو بھی لکھ بھیجا... ایک دوست کے پاس اردو کا دیوان چھاپے سے کچھ زیادہ ہے۔ اس نے کہیں کہیں سے مسودات متفرق بھی بہم پہنچا لیے ہیں۔ چنانچہ ''پنہاں ہو گئیں'' یہ غزل مجھ کو اسی سے ہاتھ آگئی ہے۔ اب میں نے اس کو لکھا ہے اور تم کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ خط لکھ کر رہنے دوں گا۔ جب اس کے پاس سے ایک دو غزل آجائے گی تو اسی خط میں ملفوف کر کے بھیج دوں گا۔''

(اردو:369،خطوط:1، 393)

منشی شیونرائن اور انھیں جیسے مخلص تلامذہ اور احباب کی دلچسپی میرزا صاحب کے دیوان ریختہ کی سہ بارہ طباعت کا موجب ہوئی۔ اس کی تفصیل خود میرزا صاحب نے رامپور سے دہلی واپس جا کر اپریل 1860 میں شیونراین کو اس طرح لکھی ہے:

میاں! دیوان کے میرٹھ میں چھاپے جانے کی حقیقت سن لو، تب کچھ کلام کرو۔ میں رامپور میں تھا کہ ایک خط پہنچا۔ سرنامہ پر لکھا تھا ''عرضداشت

عظیم الدین احمد متمقام میرٹھ''
واللہ باللہ! اگر میں جانتا ہوں کہ عظیم الدین کون ہے اور کیا پیشہ رکھتا ہے۔ بہرحال پڑھا۔ معلوم ہوا کہ ہندی دیوان اپنی سوداگری اور فائدہ اٹھانے کے لیے چھاپا چاہتے ہیں۔ خیر چپ ہورہا۔ جب میں رامپور سے میرٹھ آیا بھائی مصطفیٰ خاں صاحب کے یہاں اترا وہاں منشی ممتاز علی صاحب میرے دوست قدیم مجکو ملے۔ انھوں نے کہا کہ اپنا اردو کا دیوان مجکو بھیج دیجیے گا۔ عظیم الدین ایک کتاب فروش اس کو چھاپا چاہتا ہے۔
اب تم سنو! دیوان ریختہ اتم و اکمل کہاں تھا مگر ہاں میں نے غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رامپور بھیج دیا تھا۔ اب جو دلی سے رامپور جانے لگا تو بھائی نواب ضیاء الدین خاں صاحب نے مجکو تاکید کردی تھی کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے اردو دیوان لے کر کسی کاتب سے لکھوا کر مجکو بھیج دینا۔ میں نے رامپور میں کاتب سے لکھوا کر بسبیل ڈاک ضیاء الدین خاں کو دلی بھیج دیا تھا۔''
آمدم بر سرِ مدعائے سابق، اب جو منشی ممتاز علی صاحب نے مجھ سے کہا تو مجھے یہ کہتے بن آئی کہ اچھا دیوان تو میں ضیاء الدین خاں سے لے کر بھیج دوں گا مگر کاپی کی تصحیح کا ذمہ کون کرتا ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں نے کہا کہ میں۔ اب کہو میں کیا کرتا۔ دلی آ کر ضیاء الدین خاں سے دیوان لے کر ایک آدمی کے ہات نواب مصطفیٰ خاں کے پاس بھیج دیا۔ اگر میں اپنی خواہش سے چھپواتا تو اپنے گھر کا مطبع چھوڑ کر پرائے چھاپے خانے میں کتاب کیوں بھجواتا۔ آج اسی وقت میں نے تم کو یہ خط لکھا اور اسی وقت بھائی مصطفےٰ خاں صاحب کو ایک خط بھیجا ہے اور ان کو لکھا ہے۔ اگر چھاپا شروع نہ ہوا تو نہ چھاپا جائے اور دیوان جلد میرے پاس بھیجا جائے۔ اگر دیوان آ گیا تو فوراً تمھارے پاس بھیج دوں گا اور اگر وہاں کاپی شروع ہوگئی ہے تو میں ناچار ہوں میرا کچھ قصور نہیں ہے اور اگر (اس) سرگزشت کو بھی سن کر مجکو گنہ گار ٹھیراؤ تو اچھا، میرا بھائی میری تقصیر معاف کیجیو۔ رمضان اور عید کا قصہ لگا ہوا ہے یقین ہے کاپی

شروع نہ ہوئی ہو اور دیوان میرے پاس آئے اور تم کو پہنچ جائے۔
(اردو 381، خطوط 1، 403)

9 مئی 1860 تک یہ دیوان میرٹھ سے واپس نہیں آیا تھا۔ یوسف مرزا کو میرزا صاحب نے لکھا ہے:

میرا اردو دیوان میرٹھ کو گیا۔ سکندر شاہ لے گئے۔ مصطفیٰ خاں کو دے آئے۔ ڈاک میں اس کی رسید آگئی۔" (اردو: 332، خطوط: 1، 170)

دوشنبہ 11 جون کو سیاح کو بگڑ کر لکھا ہے:

"دیوان کا چھاپا کیسا، وہ شخص نا آشنا موسوم بہ عظیم الدین جس نے مجھ سے دیوان منگا بھیجا۔ آدمی نہیں ہے بھوت ہے پلید ہے، غول ہے، قصہ مختصر سخت نامعقول ہے، مجکو اس کے طور پر انطباع دیوان نامطبوع ہے۔ اب میں اس سے دیوان مانگ رہا ہوں اور وہ نہیں دیتا۔ خدا کرے بات آجائے۔ تم دعا مانگو۔" (اردو: 16)

اس اثنا میں دیوان کا مسودہ میرٹھ سے واپس آگیا۔ 25 جون کو اس کا پارسل میرزا صاحب نے شیونرائن کو ارسال کر کے لکھا:

"صاحب! میں تمھارا گناہگار ہوں۔ تمھاری کتاب میں نے دبا رکھی ہے۔ بڑی کوشش اور محنت سے اس کو وہاں نہ چھپنے دیا اور منگوا لیا۔ آج پیر کے دن 25 جون کو پارسل کی ڈاک میں روانہ کیا ہے لو اب میری تقصیر معاف کرو اور مجھ سے راضی ہو جاؤ اور اپنی رضامندی کی مجھے اطلاع دو۔"

یہ کتاب یعنی دیوانِ ریختہ تم کو میں نے دے ڈالا۔ اب اس کے مالک تم ہو۔ میں نہیں کہتا کہ چھاپو۔ میں نہیں کہتا کہ نہ چھاپو۔ جو تمھاری خوشی ہو سو کرو۔ اگر چھاپو تو بیس جلد کا خریدار مجھ کو لکھ لو اور اچھا، میرا میاں، ذرا تصحیح کا بہت خیال رکھیو۔" (خطوط: 1، 404، اردو)

اور عید کے دن 30 جون 1860 کو سیاح کو تحریر کیا:

"میں بہت خوشی سے تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ اردو کا دیوان غاصب نا انصاف سے ہاتھ آگیا اور میں نے نور چشم منشی نراین کو بھیج دیا یقین کلی ہے کہ چھاپیں

گے۔ جہاں تم ہو گے ایک نسخہ تم کو پہنچ جائے گا۔" (اردو:26)

غلامی کو اس خط کے دو دن بعد لکھا:

"اردو کا دیوان رامپور سے لایا ہوں۔ وہ آگرہ گیا ہے۔ وہاں منطبع ہو گا۔"

(اردو:439، خطوط:1، 321)

شیونراین نے اس مسودے کی جامعیت میں شبہے کا اظہار کیا۔ اس کے جواب میں میرزا صاحب نے 3 جولائی 1860 کو لکھا:

"میاں، تمھاری باتوں پر ہنسی آتی ہے۔ یہ دیوان جو میں نے تم کو بھیجا ہے اتم و اکمل ہے۔ وہ اور کون سی دو چار غزلیں ہیں جو مرزا یوسف علی خاں عزیز کے پاس ہیں اور اس دیوان میں نہیں۔ اس طرف سے آپ اپنی خاطر جمع رکھیں کہ کوئی مصرع میرا اس دیوان سے باہر نہیں۔" (خطوط:1، 405)

کسی وجہ سے شیونرائن نے اس کی طباعت میں تاخیر کی میرزا صاحب نے محمد حسین خاں تحسین کو اس کے چھاپنے کی اجازت دے دی۔ غالباً یہ مسئلہ نیّر کی سفارش پر طے ہوا اور انھیں نے اپنا مسودہ جس کی تکمیل نسخۂ رامپور کی جا چکی تھی عطا کیا۔[1] ورنہ میرزا صاحب کو اُن کے مطبع میں دیوان چھپوانے کی خواہش نہ تھی جیسا کہ خود انھوں نے اس نسخے کے خاتمۂ طبع میں لکھا ہے۔

20 محرم 1278ھ (آخر جولائی 1861) کو یہ نسخہ 4:3/4x8:3/4 انچ ناپ کے 25 سطری مسطر پر 88 صفحات میں طبع ہوا۔ اس کے شروع میں فارسی دیباچہ۔ اس کے بعد ص 3 سے ص 70 تک غزلیات اور اسی صفحے کی سولھویں سطر سے ص 77 تک قصاید ہیں۔ آموں کی تعریف

---

[1] اس قیاس کی چند وجہیں ہیں۔ پہلی یہ کہ نسخۂ رامپور کی ترتیب مضامین اس کے برخلاف ہے۔ دوسری یہ کہ غزلوں کی ترتیب بھی بدلی ہوئی ہے۔ تیسری یہ کہ احمدی ایڈیشن میں لفظ کسی کی جگہ کسو لکھا گیا ہے جس کی خاتمے میں میرزا صاحب نے شکایت بھی کی ہے اس کے برخلاف نسخۂ رامپور میں ہر جگہ کسی استعمال ہوا ہے، بجز مقامات قافیہ کے۔ چوتھی یہ کہ احمدی ایڈیشن میں یہ شعر پایا جاتا ہے:

مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شہر عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو

نسخۂ ارمپور میں یہ شعر نہیں ہے علاوہ بریں احمدی ایڈیشن اور نسخۂ رامپور میں دیگر لفظی اختلافات بھی جا بجا پائے جاتے ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ ان دونوں میں اصل و نقل کا فرق نہیں ہے۔

والی مثنوی ص 77 کی بارہویں سطر سے ص 78 کے آخر صفحہ سے تیسری سطر تک ہے۔ اس کے بعد قطعات ہیں جو ص 84 کی دوسری سطر پر ختم ہو گئے ہیں۔ ان کے بعد ص 86 کی پہلی سطر تک رباعیاں ہیں۔ رباعیوں کے بعد نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر کی فارسی تقریظ ہے۔ اس میں تاریخ بدل کر 1854/1271ھ اور تعداد اشعار ''یک ہزار و شش صد و نو و پنج داند'' درج کی گئی ہے۔ چونکہ اصل میں الفاظ ''نو ند داند'' تھے جن پر کاتبِ نسخہ نے لفظ پنج اپنی طرف سے بڑھا دیا تھا۔ اس بنا پر غلط نامے میں لفظ پنج کو حذف کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

لیکن اس مطبوعہ نسخے میں 1695 کے بجائے 1796 اشعار ہیں۔ اس لیے قیاس یہ ہے کہ تقریظ کے اندر مذکورہ تعداد اُس وقت ہوگی جب اس کی تاریخ بدل کر 1271ھ (1854) کی گئی تھی نہ معلوم کیوں طباعت کے وقت یہ تاریخ اور تعداد دونوں بحالہا باقی رکھی گئی ہیں۔ حالانکہ نسخۂ رامپور سے جو شعر بڑھائے گئے تھے ان کی وجہ سے کل تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا جس کو تقریظ میں ظاہر کرنا چاہیے تھا۔

ص 88 کے تقریباً وسط میں تقریظ کے بعد تیرؔ اور عزیزؔ کے قطعات تاریخ طباعت ہیں جن سے 1278ھ مستخرج ہوتے ہیں۔ ان کے بعد ''عبارت خاتمہ دیوان'' کے تحت میرزا صاحب کی یہ تحریر ہے:

> ''داد کا طالب غالب گزارش کرتا ہے کہ یہ دیوان اردو تیسری بار چھاپا گیا ہے۔ مخلص و داد آئین سید قمر الدین کی کارفرمائی اور خان صاحب الطاف نشاں محمد حسین خاں کی دانائی مقتضی اس کی ہوئی کہ دس جزو کا رسالہ ساڑھے پانچ جزو میں منطبع ہوا۔ اگرچہ انطباع میری خواہش سے نہیں لیکن ہر کاپی میری نظر سے گزرتی رہی ہے اور اغلاط کی تصحیح ہوتی رہی ہے۔ یقین ہے کہ کسی جگہ حرف غلط نہ رہا ہو مگر ہاں ایک لفظ میری منطق کے خلاف، نہ ایک جگہ بلکہ سو جگہ چھاپا گیا ہے کہاں تک بدلتا؟ ناچار جابجا یونہی چھوڑ دیا یعنی 'کسو' بکاف مکسور و سین مضموم و واؤ معروف۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ لفظ صحیح نہیں۔ البتہ فصیح نہیں۔ قافیہ کی رعایت سے اگر لکھا جائے تو عیب نہیں، ورنہ فصیح بلکہ افصح ''کسی'' ہے۔ واو کی جگہ یائے تحتانی۔ میرے دیوان میں ایک جگہ قافیہ کسو بہ واؤ اور سب جگہ کسی بہ یائے تحتانی ہے۔

اس کا اظہار ضرور تھا۔ کوئی یہ نہ کہے کہ یہ کیا آشفتہ بیانی ہے۔ اللہ بس، ماسوائے ہوس۔"

اس کے بعد لکھا ہے:

"مطبع احمدی میں واقع دِلہای امو جان کے اہتمام سے بیسویں محرم الحرام 1278ھ کو مطبوع ہوا۔"

اس ایڈیشن میں میرزا صاحب نے اپنے کلام میں کچھ ضروری ترمیم بھی کی تھی اور چونکہ وہ ترمیم طباعت کے بعد ذہن میں آئی تھی۔ اس لیے اسے غلط نامے میں ظاہر کرنا پڑا ہے، مثلاً میرزا صاحب کا مصرع اس طرح تھا: دود کی طرح رہا سایہ گریزاں مجھ سے۔" اس کو بنایا ہے: "صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے۔" بالکل یہی الفاظ ایک رباعی میں بھی باندھے گئے تھے۔ فرماتے ہیں یعنی؛ ہر بار کاغذ باد کی طرح ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لیے۔ لیکن یہ مقام میرزا صاحب کی نظر سے رہ گیا۔ اس لیے یہاں اصلاح نہیں ہوسکی۔ [1]

لفظ "کسو" کے متعلق میرزا صاحب کا ارشاد بھی ترمیم کے اندر ہی داخل سمجھنا چاہیے۔ یعنی پہلے میرزا صاحب نے "کسو" ہی لکھا تھا، مگر بعد میں جدید محاورے کے ماتحت "کسی" بنایا ہے چنانچہ نسخۂ رامپور میں جہاں کہیں "کسو" تھا۔ وہاں مقابلے کے وقت خود میرزا صاحب نے اصلاح کردی ہے۔

اس ایڈیشن کا چھاپا تمام ہوجانے کے فوراً بعد میرزا صاحب نے مجروح کو لکھا تھا:

"کلیات اردو کا چھاپا تمام ہوا۔ اغلب ہے کہ اس ہفتے میں، غایت اس مہینے میں ایک نسخہ بسبیل ڈاک تم کو پہنچ جائے گا۔" (اردو:186)

8 اگست 1861، (30 محرم 1278ھ) کو پھر لکھا:

"دیوان اردو چھپ چکا۔ ہائے لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا اس کو آسمان پر چڑھا دیا۔ حُسن خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلی پر اور اس کے پانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت؛ صاحب دیوان کو اس طرح یاد کرنا

---

[1] اس اصلاح کے سلسلے میں میرزا صاحب کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو: "طرح بفتح اول وسکون ثانی بمعنی فریب ہے، اور تصویر کے خاکے کو بھی کہتے ہیں اور بمعنی آسائش دنیا بھی مجاز ہے۔ مرادف طرز و روش بھی طرح ہے بفتحتین۔ اس کا تفرقہ منظور رہا کرے۔" (اردو:30، بنام سرور)

جیسے کوئی کتے کو آواز دے۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں۔ کاپی نگار اور تھا متوسط
جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا وہ اور تھا۔ اب جو دیوان چھپ چکے
حق التصنیف ایک مجکو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ غلط جوں کے توں ہیں۔
یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔ ناچار غلط نامہ لکھا وہ چھپا۔ بہر حال خوش و ناخوش
کئی جلدیں مول لوں گا۔ اگر خدا چاہے تو اسی ہفتہ میں تین جلد اصحابِ ثلثہ
کے پاس پہنچ جائیں۔ نہ میں خوش ہوا ہوں، نہ تم خوش ہوگے۔"
اور یہ جو لکھتے ہو یہاں خریدار ہیں، قیمت لکھ بھیجو میں دلال نہیں، سوداگر
نہیں، مہتمم مطبع نہیں۔ مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خاں، مہتمم مرزا امو جان
مطبع شاہدرے میں، محمد حسین دلّی شہر رائے مان کے کوچے میں مصوروں کی
حویلی کے پاس قیمت کتاب 6 آنے محصول ڈاک خریدار کے ذمے۔"

(اردو:154، خطوط:1، 273)

آخر اگست 1861، (مطابق آخر صفر 1278ھ) میں ایک نسخہ میرزا صاحب نے نواب افتخار الملک بہادر نائب والئ حیدر آباد (سر سالار جنگ اوّل) کی خدمت میں ارمغان بھیجا تھا:

ذکا کو فارسی خط میں سہ شنبہ 11 ربیع الاوّل کو اس کی اطلاع دی ہے۔

(پنج آہنگ:246)

چوتھا ایڈیشن

غالباً میرزا صاحب نے محمد حسین خاں مالک مطبع احمدی دہلی کے روبرو اپنے اس مذکورہ بالا خیال کا اظہار کیا اور وہ اس پر آمادہ ہوئے کہ میرزا صاحب ایک مطبوعہ نسخے کی تصحیح کر دیں اور محمد حسین اُسے کسی دوسرے مطبع میں طبع کرا دیں۔ میرزا صاحب نے ایک نسخے کی تصحیح کر کے اس کی پشت پر یہ رقعہ لکھ بھیجا:

"جناب محمد حسین خاں کو میرا اسلام پہنچے۔ دو رات دن کی محنت میں میں نے
اس نسخے کو صحیح کیا ہے۔ غلط نامہ بھی اس میں درج کر دیا ہے گویا اب غلط نامہ
بیکار ہو گیا ہے۔ خاتمے کی عبارت، کیا میرا بیان، کیا میر قمر الدین کا اظہار اب

> کچھ ضرور نہیں۔ کس واسطے کہ اب یہ کتاب اور مطبع میں چھپے گی۔ یہ مجلد
> گویا مسودہ ہے اس کو بھیج دیجیے۔" (غالب:302)

محمد حسین خاں نے اس مسودے کو کانپور کے مطبع نظامی کو بھیجا۔ یہ ابتدائی سال کا قصہ معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اس دیوان کا دوسرا ایڈیشن کانپور کے مطبع نظامی میں طبع ہوا تو اس کے خاتمہ الطبع میں یہ لکھا گیا تھا:

> "بخدمت ارباب سخن عرض کرتا ہے امیدوار رحمت وغفران محمد عبدالرحمٰن بن
> حاجی محمد روشن خاں طیب اللہ ثراہ، کہ اس کے پہلے دیوان بلاغت نشان
> جناب نواب اسد اللہ خاں غالبؔ کا دہلی میں چھپا۔ لیکن بسبب سہو ونسیان
> کے بعض مقام میں تغیر وتبدل ہوا اس لیے جناب مجمع لطف بیکراں محمد حسین
> خاں صاحب دہلوی نے بعد نظر ثانی اور تصحیح جناب مصنف کے ایک نسخہ میرے
> پاس بھیجا۔ میں نے بافضال ایزدی مطابق اس نسخے کے شہر ذیحجہ 1278ھ
> (جون 1862) مطبع نظامی واقع شہر کانپور میں صحت تمام اور درستی کمال سے
> چھاپا۔ امید کہ جب ناظرین اس کے مطالعہ سے حلاوت سخن کی پائیں مہتمم کو
> دعائے خیر سے یاد فرمائیں۔" (نظامی (کانپور) ایڈیشن:104)

اس نسخہ کا سائز احمدی کی برابر، مگر کتابت کا مسطرا کیس سطری رہا۔ خط قدرے جلی اور نسبتاً عمدہ نستعلیق اور کاغذ موٹا بانس کا لگایا گیا اور پوری کتاب 104 صفحات میں تمام ہوئی۔ ترتیب مضامین بالکل احمدی کی تھی مگر ایک تو اس میں نیرؔ کی تقریظ شامل نہیں کی گئی اور دوسرے حسب ذیل دو غزلیں اضافہ کی گئیں جو نسخۂ رامپور اور احمدی ایڈیشن کسی میں نہیں پائی جاتیں:

(1) کیوں کہ اُس بت سے رکھوں جان عزیز (3 شعر)

(2) بہت سہی غم گیتی، شراب کم کیا ہے (3 شعر)

چونکہ اس کی اصل خود غالبؔ کی تصحیح کردہ تھی بنا بریں مذکورۂ سابق رباعی میں بھی لفظ "طرح" کو "صورت کاغذ باد" بنا دیا گیا تھا، اور ہر جگہ کسو کی اصلاح کر دی گئی تھی۔ البتہ ایک فاحش غلطی اس میں رہ گئی، اور وہ یہ کہ میرزا صاحب کا بہترین شعر:

> گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئی
> اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

اس طرح مسخ کیا گیا:

ع: گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری خوشامد سے

نیز اور اغلاط بھی جگہ جگہ رہ گئے، جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ پروف اور کاپی کی تصحیح غور سے نہیں کی گئی۔ ہاں ایک بات اس میں یہ ضرور مفید نظر آتی ہے کہ غزلوں پر مسلسل شمار کے ہندسے ڈالے ہیں لیکن اس شمار میں ''کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز'' پر نمبر شمار چھوٹ گیا ہے۔

خدا جانے میرزا صاحب کو یہ ایڈیشن پسند آیا یا نہیں۔ سید بدرالدین کو ستمبر 1863 میں صرف یہ لکھا ہے:

''رہا دیوان، اگر ریختہ کا منتخب کہتے ہو تو وہ اس عرصے میں دلی اور کانپور دو جگہ چھاپا گیا، اور تیسری جگہ آگرے میں چھپ رہا ہے۔'' (غالب:296)

اس سے پسندیدگی و عدم پسندیدگی کا مطلق اظہار نہیں ہوتا۔

چونکہ میرزا صاحب نے نسخۂ رامپور کی نقل میرٹھ سے واپس منگا کر منشی شیونراین کو بھیج دی تھی اور ان کی تاخیر سے یہ سمجھ کر دلی اور کانپور میں دیوان چھپوا لیا تھا کہ وہ طباعت کا خیال ترک کر چکے ہیں۔ اس لیے جب آخر 1861 یا آغاز 1862 میں میرزا صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ آگرے میں بھی دیوان چھپ رہا ہے تو وہ اس پر متاسف ہوئے اور شیونراین کی خفگی کا ازالہ کرنے کے لیے میر نیاز علی صاحب کی معرفت معذرت کی۔ انھوں نے اچھی وکالت نہ کی اور شیونراین نے دیوان واپس کرنے کے خیال کو میرزا صاحب پر ظاہر کیا۔ اس کے جواب میں 10 جنوری 1862 کو میرزا صاحب نے انھیں لکھا:

''میاں! میں جانتا ہوں کہ مولوی سید نیاز علی صاحب نے وکالت اچھی نہیں کی۔ میرا مدعا یہ تھا کہ وہ تم پر اس امر کو ظاہر کر دیں کہ دلی میں ہندی دیوان کا چھپنا پہلے اس سے شروع ہوا کہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب تمھارا بھیجا ہوا فرمہ مجکو دیں اور وہ جو میں نے یہاں کے مطبع میں چھاپنے کی اجازت دی تھی یہ سمجھ کر دی تھی کہ اب تمھارا ارادہ اس کے چھاپنے کا نہیں غور کرو میرٹھ کے چھاپے خانے والے محمد عظیم نے کس عجز و الحاح سے دیوان لیا تھا اور میں نے نظر تمھاری ناخوشی پر بجبر اس سے پھیر لیا۔ یہ کیوں کر ہوسکتا تھا کہ اور کو چھاپنے کی اجازت دوں۔ تم

نے جو خط لکھنا موقوف کیا، میں سمجھاتم خفا ہو۔ میں نے مولوی نیاز علی صاحب
سے کہا کہ برخوردار شیونراین سے میری تقصیر معاف کروا دینا۔
بھائی خدا کی قسم! میں تم کو اپنا فرزند دلبند سمجھتا ہوں، اس دیوان اور تصویر
کا ذکر کیا ضرور ہے۔ رامپور سے وہ دیوان صرف تمھارے واسطے لکھوا کر
لایا۔ دلی میں تصویر بہزار جستجو بہم پہنچ کر مول لی۔"

(اردو:385، خطوط:1، 457)

اس خط کے لفظ فرمہ سے یہ مترشح ہے کہ آگرے میں طباعت دیوان کا کام 1861 ہی میں شروع ہو گیا تھا لیکن ستمبر 1863 میں میرزا صاحب نے سید بدرالدین صاحب کو جو خط لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مہینے میں کتاب زیرِ طباعت تھی، نیز یہ دیوان جب آگرے سے چھپ کر شایع ہوا تو اس کے سرورق پر کتاب کے نام 'دیوان غالب' کے اوپر 1863 لکھا گیا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ نسخہ آغاز 1863 میں چھپنا شروع ہوا اور یہ کہ میرزا صاحب کے خط میں ''فرمہ'' سے کاپی مراد ہے ورنہ جو فرمہ جنوری 1862 سے قبل چھپ جائے اس پر 1863 کسی طرح نہیں بنایا جا سکتا تھا۔

بہرحال یہ نسخہ ستمبر 1863 کے بعد چھپ کر شائع ہوا۔ اس کے مضامین کی ترتیب نسخۂ رامپور کے مطابق رکھی گئی:

''دیباچۂ فارسی (سیاہ لوح کے نیچے) قطعات (سیاہ لوح کے نیچے) مثنوی،
قصاید، غزلیات، رباعیات، تقریظ نیّر بزبان فارسی۔''

اس کا سائز مذکورہ بالا نسخوں سے قدرے بڑا، مسطر 15 سطری ہے کاغذ دیسی مشین کا بنا ہوا اور خط قدرے جلی نستعلیق ہے۔

نیّر کی تقریظ میں 1271ھ اور تعداد اشعار یک ہزار و ہفصد و نود واند'' مگر نسخے میں اشعار کی واقعی تعداد 1795 ہے، جو نسخۂ خطبۂ رامپور کے بالکل مطابق ہے، اس تعداد میں بمقابلۂ نسخۂ احمدی ایک عدد کی کمی اس وجہ سے ہو گئی ہے کہ نسخۂ رامپور میں یہ شعر نہیں ہے:

مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

اسی لیے اس کی نقل نسخۂ آگرہ سے بھی ساقط ہو گیا ہے:

باقی لفظ ''ہفصد'' خود نیر کی ترمیم نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ غالباً منشی شیو نراین نے اشعار شمار کر کے یہ تغیر کیا ہے۔ ورنہ نیر نسخۂ احمدی کی تقریظ میں بھی یہ تغیر کر دیتے۔

اس دیوان کے بعد پھر میرزا صاحب کی زندگی میں دیوانِ اردو کا کوئی ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔ کتاب خانۂ عالیۂ ریاست رامپور میں بحمداللہ ابتدائی دو ایڈیشنوں کی نقلیں اور آخری ایڈیشنوں کے اصل نسخے محفوظ ہیں۔



مقدمۂ دیوانِ غالبؔ فارسی

(مرتبۂ عرشی) کے چند اوراق

[برسوں سے غالبؔ کے فارسی دیوان کی تصحیح و ترتیب کا کام پیش نظر ہے، تا کہ فارسی کلام کا صحیح متن بلحاظِ ترتیبِ تاریخی اہلِ ذوق تک پہنچایا جاسکے مگر ابھی یہ کام دوسرے ضروری کاموں کی وجہ سے تکمیل کو نہیں پہنچا۔ نیز تین چار سال ہوئے، معلوم ہوا کہ جناب مالک رام کے سامنے بھی ترتیبِ کلامِ فارسی ہے۔ اس لیے بھی فی الحال یہ کام ملتوی کردیا گیا۔ اس کے مقدمہ کے مباحث کا وہ حصہ جس میں کلامِ فارسی کی تدوین و طباعت زیرِ بحث آئی ہے، شائع کیا جاتا ہے]

آغازِ فارسی گوئی

اگرچہ مرزا صاحب نے ابتدائے سنِ تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی، لیکن وہ آغاز ہی سے نظم و نثر فارسی کے عاشق و مائل اور تیغ اصفہانی کے گھائل تھے۔[1] اس لیے ان کا ابتدائی اردو کلام تخیل اور الفاظ دونوں میں فارسی کہلانے کا زیادہ مستحق ہے۔

بقول خود، وہ پچیس برس کی عمر تک بیدلؔ، شوکتؔ اور اسیرؔ کی طرز پر ریختہ لکھتے رہے۔[2] تمیز آنے پر طبیعت نے اس خارزار سے باہر نکلنے کی تدبیر سمجھائی اور انھوں نے نظیریؔ، عرفیؔ وغیرہ خداوندانِ سخن کے کلام کا مطالعہ کر کے ان کی راہ پر گامزنی شروع کی۔ کلیات فارسی کے خاتمے میں فرماتے ہیں:[3]

”تاہمدرانِ تگاپو، پیش خرامان رابخجستگیِ ارزشِ ہمقدمی، کہ درمن یافتند،

1. اردوئے معلیٰ 204 و عودِ ہندی 125   2. عود 159
3. کلیات فارسی نظم 544 و پنج آہنگ 68

شاعر، بمبئی، غالبؔ نمبر 1969

> مہر بجنبید، و دل از آزرم بدرد آمد۔ اندوہ آوارگی ہائے من خوردند، و آموزگارانہ درمن نگرستند۔ شیخ علی حزیں بخندۂ زیرِ لبی، بیراہ رویہائے مرا درنظرم جلوہ گر ساخت، و زہر نگاہِ طالبِ آملی و برقِ چشم عرفی شیرازی مادۂ آں ہرزہ جنبش ہائے ناروا در پائے رہ پیمائے من سوخت۔ ظہوری بسر گرمیِ گیرائی نفس، حرزے ببازو و توشۂ بکمرم بست، و نظیریِ لاابالی خرام، بہنجار خاصۂ خودم بچالش آورد۔"

لیکن واقعہ یہ ہے کہ مرزا صاحب اِس عمر سے پہلے ہی فارسی میں کہنے لگے تھے۔ چنانچہ خواجہ حالی نے اُن کی طالب علمی کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ:

> "انھوں نے فارسی میں کچھ اشعار بطور غزل کے موزوں کیے تھے جن کی ردیف میں 'کہ چہ' بجائے 'یعنی چہ' کے استعمال کیا تھا۔ جب انھوں نے وہ اشعار اپنے استاد شیخ معظم کو سنائے تو انھوں نے کہا کہ یہ کیا مہمل ردیف اختیار کی ہے۔ ایسے بے معنی شعر کہنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ مرزا یہ سن کر خاموش ہو رہے۔ ایک روز ملا ظہوری کے کلام میں ایک شعر ان کی نظر پڑ گیا جس کے آخر میں لفظ 'کہ چہ' یعنی چہ کہ معنی میں آیا تھا۔ وہ کتاب لے کر دوڑے ہوئے استاد کے پاس گئے اور وہ شعر دکھایا۔ شیخ معظم اس کو دیکھ کر حیران ہو گئے اور مرزا سے کہا کہ تم کو فارسی زبان سے خداداد مناسبت ہے۔ تم ضرور فکرِ شعر کیا کرو اور کسی کے اعتراض کی کچھ پروانہ کرو۔"[1]

مزید برآں بھوپال کے قلمی دیوانِ اردو کا آغاز ایک فارسی قصیدے سے ہوا ہے۔ چونکہ اردو کہتے وقت بھی گویا فارسی ہی میں سوچتے اور لکھتے تھے اس لیے انھوں نے مذکورہ عمر کو پہنچ کر اس اختلاف ذوق کی رہنمائی میں شاہد سخن کے چہرے سے اردو زبان کا رہی پردہ بھی اٹھا دیا اور یکسر فارسی میں کہنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فارسی کلام میں بیدل وغیرہ کے اثرات کم نظر آتے ہیں۔

نواب شمس الامرا کے نام ایک خط میں جو تقریباً 1852 میں لکھا گیا تھا، مرزا صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ "کمابیش سی سالست کہ اندیشہ پارسی سگالست۔"[2] اِس بنا پر ان کی باقاعدہ فارسی گوئی کا آغاز 1822 (1238ھ) میں تسلیم کرنا پڑے گا۔

فارسی نظم کا کچھ حصہ گلِ رعنا کی شکل میں کلکتے کے اندر ہی مرتب ہو چکا تھا، مگر مکمل

---

1. یادگارِ غالب 97
2. پنج آہنگ 174

دیوان فارسی دیباچۂ دیوان اردو کے بیان کے مطابق سفر کلکتہ تک غیر مرتب مسودے کی شکل میں تھا۔

میخانۂ آرزو سرانجام

مرزا صاحب نے دیوانِ اردو کے دیباچے میں وعدہ کیا تھا کہ اِس کام سے فارغ ہوکر دیوان فارسی مرتب کریں گے۔ کلکتے سے واپس آکر انھوں نے سرمایۂ فارسی اکٹھا کرنا شروع کیا اور اس سفینے کا نام 'میخانۂ آرزو سرانجام' قرار دیا— علی بخش خاں رنجور نے پنج آہنگ کے دیباچے میں لکھا ہے:1

''در آغاز سال یک ہزار و دوصد و پنجاہ و یک ہجری، شمس الدین احمد خاں رالبقضائے آسانی آں پیش آمد کہ ہیچ آفریدہ مبیناد[کذا] ...وبعد آں ہنگامہ دراں ہنگام از جے پور بدہلی رسیدم..... دراں ایام دیوان فیض عنوان کہ مسمی بہ 'میخانۂ آرزو سرانجام' است تازہ فراہم آمدہ و پیرایۂ اتمام پوشیدہ بود۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ 1251ھ (1835) کے بعد دیوان مرتب ہوا تھا۔

کلیاتِ فارسی کے شروع میں دیباچہ اور آخر میں تقریظ کے عنوان سے خاتمہ لکھا گیا ہے، جو رنجور کے بیان کے مطابق 'میخانۂ آرزو سرانجام' ہی کا سرو پا ہیں۔

اس دیباچے میں مرزا صاحب فرماتے ہیں:2

''اندیشہ نسنجد و گمان نسگالد کہ غالب از دانش بے بہرہ بدستہ بستن ایں گلہائے خرزہرہ، آہنگِ خود آرائی و انداز انگشت نمائی دارد۔ بلکہ خون گرمیِ ابرام والا برادر..... امین الدین احمد خاں بہادر... مرا بدیں کار داشتہ، وہمتم را بہ پتبہ دوزیِ ایں کہن دلق گماشتہ است۔

تقریظ میں لکھتے ہیں:3

''تا امروز کہ از ہجرت خاتم الانبیا علیہ التحیۃ والثنا یک ہزار و دوصد و پنجاہ و سہ سال گزشتہ درصد نگار طالع من، باندازۂ خرامشِ پیک آسمانی درمشاہدۂ آثار

---

1. پنج آہنگ 4 — 2. کلیاتِ فارسی 18 مخطوطہ

3. ایضاً، 280 و پنج آہنگ 157

سالِ چہل و یکم است، ہنوز شخصِ اندیشہ کیخسرو ایں جام و فلاطونِ ایں خم است۔"

ان بیانوں سے واضح ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے اپنا فارسی دیوان نواب امین الدین احمد خاں بہادر، والیِ لوہارو کی فرمائش پر مرتب کیا اور 1253ھ (1837) میں جب کہ ان کی عمر کا اکتالیسواں سال شروع ہو چکا تھا، اس کو انجام تک پہنچایا۔

مرزا صاحب کی عمر کو مدنظر رکھ کر حساب لگایا جائے تو ترتیب دیوان سے فراغت رجب 1253ھ کے کچھ بعد ہو جانا چاہیے، کیونکہ اس ماہ و سال کی 8 تاریخ سے ان کی عمر کا اکتالیسواں سال شروع ہوتا ہے۔

کتاب خانہ انجمن ترقی اردو کراچی میں ایک مخطوطۂ دیوان محفوظ ہے۔ اُس پر ایک مقالہ جناب مسلم ضیائی صاحب نے رسالۂ اردو جنوری 68ء میں تحریر فرمایا ہے۔ اس نسخے کے ترقیمے میں 10 شعبان 1253ھ تاریخِ اختتام بتائی گئی ہے۔ اگر یہ تاریخ درست ہو تو مذکورۂ بالا نسخہ دیوان فارسی کا قدیم ترین نسخہ تسلیم کیا جائے گا مگر میری نظر میں یہ تاریخ بعد کو بڑھائی گئی ہے، کیونکہ خاتمۂ کاتب با تمام انجامید پر تمام ہو جاتا ہے، اس کے بعد تاریخ تحریر کا اضافہ بے جوڑ سا ہے۔

اس خیال کی تائید اِس سے ہوتی ہے کہ خود مسلم ضیائی صاحب نے فرمایا ہے کہ اس میں لارڈ آکلینڈ کی مدح کا وہ قصیدہ موجود ہے، جو اواخر دسمبر 1937 مطابق اواخر رمضان 1253ھ میں لکھا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جو قصیدہ رمضان کے آخر میں تصنیف کیا گیا ہو، وہ 10 شعبان کے لکھے ہوئے نسخے میں کیسے جگہ پا سکتا ہے۔

پنج آہنگ کے نسخۂ مطبوعہ 1853 میں مذکورۂ قبل تقریظ کی جو نقل چھپی، اُس میں فارسی قطعہ، مثنوی، قصیدہ، غزل اور رباعی کے اشعار کی مجموعی تعداد 6 ہزار بتائی گئی ہے لیکن کلیات فارسی کے قلمی نسخے (مخزونۂ رضا لائبریری نمبر 411) میں یہ تعداد بڑھ کر 6672 ہوگئی ہے۔ اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ترتیب کے وقت دیوان میں چھ ہزار ابیات تھے۔ جب پہلی طباعت کی نوبت آئی تو اس تعداد میں 672 اشعار کا اضافہ ہوگیا۔ لیکن اصولاً مرزا صاحب کو تاریخِ تحریر کے خاتمہ میں بھی تغیر کرنا چاہیے تھا، جیسا کہ مطبع نولکشور لکھنؤ میں دیوان کی طبعیت کے وقت انھوں نے کیا ہے، مگر کسی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔

تدوینِ کلام

مرزا صاحب نے ایک خط میں لکھا ہے کہ ”میرا کلام کیا نظم، کیا نثر، کیا اردو، کیا فارسی، کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔“[1] لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابتداء خود انھوں نے ہی اپنا کلام جمع کیا ہے اور اُن ہی کے مسوّدات سے دیوان ریختہ مرتب ہوا اور ان ہی سے ’گل رعنا‘ کی ترتیب عمل میں آئی۔

اردو کلام کو بترتیبِ ردیف جمع کرنے کا کام ماہِ صفر 1237ھ (آخر اکتوبر 1821) سے قبل انجام کو پہنچ چکا تھا۔ جو ’نسخۂ حمیدیہ‘ کی تاریخِ کتابت ہے، آئندہ اسی نسخے میں کمی بیشی ہو کر موجودہ دیوان وجود میں آیا۔

جیسا کہ ابھی گزرا، فارسی نظم کا کچھ حصہ ’گلِ رعنا‘ کی شکل میں کلکتہ کے اندر مرتب ہو چکا تھا، مگر مکمل دیوان فارسی دیباچۂ دیوان اردو کے بیان کے مطابق سفر کلکتہ (1830) تک غیر مرتب مسودے کی شکل میں تھا۔

علی بخش خاں دیباچہ نگار پنج آہنگ کے مذکورۂ قبل اقتباس کے الفاظ ’درآں ایام‘ اور ’تازہ فراہم آمدہ‘ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ 1251ھ (1835ء) مراد ہیں، لیکن کتاب خانہ رام پور کے قلمی نسخوں میں خود مرزا صاحب نے کلیات فارسی کے خاتمے کی تاریخ 1253ھ (1837ء) لکھی ہے۔ نیز بانکی پور کے کتاب خانے کے قلمی نسخے میں بھی جس کی تاریخِ کتابت ربیع الآخر 1254ھ ہے۔ یہی سنہ مذکور ہے، اس لیے اتمام کلیات کا سنہ یہی قرار پائے گا۔

بہرحال اردو اور فارسی کلام کی جمع و ترتیب کا ابتدائی کام مرزا صاحب ہی کے ہاتھوں انجام کو پہنچا اور انھیں اپنے کلام کی اشاعت کے لیے دوسروں سے مسوّدے یا مبیضے مانگنا نہیں پڑے مگر جب افکار و آلام کی کشمکش اور ناقدردانی، ابنائے زماں کی گیرودار نے انھیں پیہم شکستہ خاطر کیا تو یہ کام نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر اور حسین مرزا صاحب وغیرہ نے اپنے ذمے لے لیا۔ 1857 کے ہنگامے سے پہلے تک یہ مجموعے محفوظ تھے۔ چنانچہ جنوری 1855 میں مرزا صاحب نے سید بدرالدین احمد کو لکھا ہے:[2]

---

1 اردوئے معلیٰ: 137

2 اردوئے معلیٰ 1256، عود: 108، خطوط: 1، 306

''آپ ہندی اور فارسی غزلیں مانگتے ہیں۔ فارسی غزل تو شاید ایک بھی نہیں کہی، ہاں ہندی غزلیں قلعے کے مشاعرے میں دو چار لکھی تھیں، سو وہ یا تو تمھارے دوست حسین مرزا صاحب کے پاس ہو گی یا ضیاء الدین خاں صاحب کے پاس۔ میرے پاس کہاں؟ آدمی کو یہاں اتنا توقف نہیں کہ وہاں سے دیوان منگوا کر نقل اتروا کر بھیج دوں۔''

لیکن 1857 میں یہ سارا ذخیرہ لٹ گیا اور مرزا صاحب اپنا کلام دیکھنے کو خود بھی ترسنے لگے۔ مہر کو بڑے رقت آمیز الفاظ میں لکھتے ہیں:[1]

''میرا کلام میرے پاس کبھی نہیں رہا۔ ضیاء الدین احمد خاں اور حسین میرزا جمع کر لیتے تھے۔ جو میں نے کہا، انھوں نے لکھ لیا۔ ان دونوں کے گھر لُٹ گئے۔ ہزاروں روپے کے کتاب خانے برباد ہوئے۔ اب میں اپنا کلام دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے، ایک غزل میری کہیں سے لکھوالیا۔ اس نے وہ کاغذ مجھ کو دکھایا یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔''

دسمبر 1858 میں منشی شیونرائن کو لکھتے ہیں:

''کیا کہوں تم سے؟ ضیاء الدین خاں جاگیردار لوہارو میرے سبھی بھائی اور میرے شاگرد رشید ہیں۔ جو نظم و نثر میں میں نے کچھ لکھا، وہ انھوں نے لیا اور جمع کیا۔ چنانچہ کلیات فارسی چون پچپن جزو اور پنج آہنگ اور مہر نیمروز اور دیوان ریختہ سب مل کر سو سوا سو جزو مطلا اور مذہب اور انگریزی ابری کی جلدیں الگ الگ، کوئی ڈیڑھ سو دو سو روپے کے صرف میں بنوائیں۔ میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب یکجا فراہم ہے۔ پھر ایک شاہزادے نے اس مجموع نظم و نثر کی نقل لی۔ اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا۔ کہاں سے یہ فتنہ برپا ہوا اور شہر لٹے! وہ دونوں جگہ کا کتاب خانہ خوان یغما ہوگیا۔ ہر چند میں نے

---

1. اردوئے معلّٰی: 363، خطوط: 1، 389۔ اس واقعے کو صاحب عالم مارہروی کے نام خطوں میں (اردوئے معلّٰی 203، عود: 29) اور یوسف علی خاں عزیز کے نام کے خطوں میں بھی دہرایا گیا ہے۔ اردوئے معلّٰی: 206، عود: 65، خطوط 1، 175)

آدمی دوڑائے کہیں سے ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی۔ وہ سب قلمی ہیں۔

1857 کی آگ بجھی تو میرزا صاحب کے دل کی افسردگی میں اضافہ ہوگیا اور وہ فن شاعری ہی سے نفرت کرنے لگے۔ اِس لیے دوبارہ کلام جمع کرنے کا خیال آیا تو انھوں نے صرف اتنا کیا کہ منشی شیونرائن کو محولہ بالا مکتوب کے آخر میں لکھا:

''غرض اِس تحریر سے یہ ہے کہ قلمی فارسی کا کلیات، قلمی ہندی کا کلیات، قلمی پنج آہنگ، قلمی مہر نیمروز، اگر کہیں ان میں سے کوئی نسخہ بکتا ہوا آوے تو اس کو میرے واسطے خرید لینا اور مجھ کو اطلاع کرنا۔ میں قیمت بھیج کر منگوالوں گا۔''

مگر ان لٹے ہوئے نسخوں میں سے کوئی ایک بھی دوبارہ دستیاب نہیں ہوا۔ آخر مجبور ہوکر پھر ایک شاگرد ہی نے فراہمی کلام کا بیڑا اٹھایا۔ میرزا صاحب نے ان بزرگ کا نام نہیں لیا ہے۔ قاضی عبدالجلیل صاحب کو 23 فروری 1861 کو لکھتے ہیں:

''یہ شہر بہت غارت زدہ ہے۔ نہ اشخاص باقی نہ امکنہ۔ کتاب فروشوں سے کہہ دوں گا، اگر میری نظم و نثر کے رسالوں میں سے کوئی رسالہ آجائے گا تو وہ مول لے کر خدمت میں بھیج دیا جائے گا۔ دل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت۔ آہ ایک دوست کے پاس بقیۃ النہیب والغارۃ کچھ میرا کلام موجود ہے، اس سے یہ غزل لکھوا کر بھیج دوں گا۔''

اسی سال ستمبر 1861 (11 ربیع الاوّل 1278ھ) میں ذکا کو تحریر فرماتے ہیں:[1]

''ہر آئینہ چوں پنج آہنگ و مہر نیمروز و دستنبو دارند، انچہ اکنوں فرستم، ہماں مجموعہ نظم پارسی تواند بود کہ جامہ گرد آور خود، ہیچگاہ نداشت و شہریان ہر چہ داشتند دراں رستخیز نمونہ آشوب، یغما رفت پس از تباہی ایں شہر آراستہ، و فرونشستنِ آں گرد برخاستہ، یکی از جاھمدان کہ نامہ نگار راز خویشاوند است گرد پژدہشی برآمد، تاچوں ژندۂ پارہ پارہ بہم دوختہ قریب پنجاہ جزو فراز آورد۔''

یہ دوست جو جاہمند اور غالب کے خویشاوند تھے، نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیر ہیں، اس لیے کہ میرزا صاحب نے ستمبر 1863ء میں سید بدرالدین احمد کو لکھا ہے:[2]

1. پنج آہنگ: 347 و اردوئے معلّٰی: 13۔ خطوط: 1، 11 2. اردوئے معلّٰی: 130۔ خطوط 1، 111

> ''منشی نولکشور نے شہاب الدین خاں کولکھ کرکلیاتِ فارسی جوضیاء الدین خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا، منگا لی اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس جزو ہیں یعنی کوئی مصرع میرا اس سے خارج نہیں۔''

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نیر اور حسین میرزا کے علاوہ بھی بعض شاگردوں کے پاس میرزا صاحب کا مجموعۂ اشعارِ فارسی محفوظ تھا۔ چنانچہ تفضل حسین خاں کو لکھتے ہیں:[1]

> ''کیوں صاحب، چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی و استادی سب پر پانی پھر گیا؟ اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈھاتے۔ میرا کلام، خرید آٹھ دس روپے کی سورہ بھی میں یہ نہیں کہتا کہ مجھ کو دے ڈالو، تم کو مبارک رہے! مجھ کو مستعار دے دو۔ میں اس کو دیکھ لوں۔ جو میرے پاس نہیں ہے، اس کی نقل کرلوں پھر تم کو واپس بھیج دوں۔ اس طرح کی طلب پر نہ دینا دلیل اس بات کی ہے کہ مجھ کو جھوٹا جانتے ہو، میرا اعتبار نہیں۔ یا یہ کہ مجھ کو آزار دینا اور ستانا بدل منظور ہے۔ وہ کتاب ابھی میرے آدمی کو دے دو۔ واللہ باللہ! میں ان میں سے جو میرے پاس نہیں ہے نقل کر کے تم کو بھیج دوں گا۔ اگر تم کو واپس نہ دوں تو مجھ پر لعنت اور اگر تم میری قسم کو نہ مانو اور کتاب حامل رقعہ کو نہ دو تو تم کو آفریں!''

اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ تفضل حسین خاں کے پاس دیوان فارسی موجود تھا جسے انھوں نے آٹھ یا دس روپے میں خریدا تھا۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر کے نام کے ایک مفصل خط سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب شہاب الدین خاں بہادر کے پاس ایک نسخہ تھا۔ فرماتے ہیں:[2]

> ''جناب قبلہ و کعبہ! آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے؟ روز آپ کے مطالعے میں نہیں رہتا۔ بغیر اس کے دیکھے، آپ کا کھانا نہ ہضم ہوتا ہو یہ بھی نہیں۔ پھر کیوں نہیں دیتے؟ ایک جلد ہزار جلد بن جائے، میرا کلام شہرت پائے۔ میرا دل خوش ہو۔ تمھاری تعریف کا قصیدہ اہلِ عالم دیکھیں۔ تمھارے بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گزرے۔ اتنے فوائد کیا

1. اردوئے معلیٰ 247 2. ایضاً، 289

تھوڑے ہیں؟ رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ، یہ خفقان ہے۔ کتاب کیوں تلف ہوگی؟ احیاناً اگر ایسا ہوا اور دلی لکھنؤ کے عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی تو میں فوراً بسبیل ڈاک رام پور جاؤں گا اور وہ نواب فخر الدین مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لا دوں گا۔ اگر یہ کہتے ہو کہ اب وہاں سے لے کر بھیج دو۔ وہ نہ کہیں گے کہ وہیں سے کیوں نہیں بھیجتے، یا یہ لکھوں کہ نواب ضیاء الدین خاں صاحب نہیں دیتے تو کیا وہ نہیں کہہ سکتے کہ جب وہ تمھارے بھائی اور تمھارے شاگرد ہو کر نہیں دیتے تو میں اتنی دور سے کیوں دوں؟ اگر تم یہ کہتے ہو کہ تفضل سے لے کر بھیج دو۔ وہ اگر نہ دیں تو میں کیا کروں؟ اور اگر دیں تو میرے کس کام کا؟ پہلے تو ناتمام، پھر ناقص، بعض بعض قصائد ان میں سے اوروں کے نام کر دیے گئے ہیں اور اس میں اسی ممدوح سابق کے نام پر ہیں۔ شہاب الدین خاں کا دیوان جو یوسف مرزا لے گیا ہے، اس میں یہ دونوں قباحتیں موجود۔ تیسری یہ کہ سراسر غلط ہر شعر غلط، ہر مصرع غلط۔ یہ کام تمھاری امداد کے بغیر انجام نہ پائے گا اور تمھارا کچھ نقصان نہیں۔ ہاں احتمالِ نقصان وہ بھی ازروئے وسوسہ و وہم۔ اس صورت میں میں تلافی کا کفیل، جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں۔ بہرحال راضی ہو جاؤ اور مجھ کو لکھو تو میں طالبؔ کو اطلاع دوں اور طلب اس کی جب دوبار ہو تو کتاب بھیج دوں۔ رحم و کرم کا طالب غالبؔ۔"

ان تحریروں سے یہ امر بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ خود میرزا صاحب کے پاس بھی اپنا فارسی کلام موجود تھا۔ لہٰذا میرزا صاحب کا 1859 میں یہ ارشاد کہ:[1]

"بندہ پرور میرا کلام کیا نظم، کیا نثر، کیا اردو کیا فارسی کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اِس کا التزام تھا کہ وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے، سو ان کے لاکھوں روپے کے گھر لٹ گئے جس میں ہزاروں روپے کے کتاب خانے بھی گئے۔ اس میں وہ مجموعہ ہائے پریشاں بھی غارت ہوئے۔ میں خود اس مثنوی کے واسطے خون درجگر ہوں۔ ہائے کیا چیز تھی!

1. اردوئے معلیٰ 137۔ عود 27

ہماری زبان کے روزمرہ استعاروں کی ایک مثال ہے جس کا مقصود صرف یہ ہے کہ میرزا صاحب کے پاس جو مجموعہ تھا، وہ ان کے تمام ذخیرۂ کلام کو جامع نہ تھا، اسی لیے کلیاتِ فارسی کے نولکشوری ایڈیشن کی تیاری کے وقت انھیں اس کی تکمیل کی کوشش کرنا پڑی تھی۔[1] اس کے بعد جو کچھ کہا ہے اس کے متعلق جولائی 1865 میں بیخبر کو لکھا ہے:

''اب میں نظم ونثر کا مسودہ نہیں رکھتا۔ دل اس فن سے نفور ہے۔ دو ایک دوستوں کے پاس اس کی نقل ہے۔ ان کو اس وقت کہلا بھیجا ہے۔ اگر آج آگیا تو کل اور اگر کل آیا تو پرسوں بھیج دوں گا۔ بھائی امین الدین خاں صاحب کے اصرار سے خسرو کی غزل پر ایک غزل لکھی ہے۔ علاء الدین خاں نے اس کی نقل ان کو بھیج دی۔ میں دیوان پر نہیں چڑھاتا، مسودہ بھیجتا ہوں۔ تقدیم وتاخیر ہندسوں کے مطابق ملحوظ رہے۔''

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ صرف آخر عمر میں میرزا صاحب نے مسودے رکھنا چھوڑ دیئے تھے ورنہ پہلے حتی الامکان اپنا کلام اپنے پاس بھی رکھتے تھے۔

طباعتِ دیوان

جیسا کہ بیان ہوا تھا، مرزا صاحب نے 1253ھ (1837ء) میں دیوان فارسی مرتب کرلیا تھا مگر اُس کی طباعت کا انتظام عرصے تک نہیں ہوسکا، تا آنکہ دہلی میں اُن کے ایک مخصوص دوست نے چھاپہ خانہ قائم کرکے یہ ارادہ کیا کہ اس میں دیوانِ غالب اردو اور دیوان غالب فارسی طبع کریں۔ اردو دیوان 1841 میں چھپ گیا مگر فارسی دیوان کی طباعت بعض وجوہ سے ملتوی کردی گئی۔ اس وجہ کے متعلق میرزا صاحب نے میجر جان جاکوب کو لکھا ہے:[2]

''ہم چنیں پنج آہنگ و دیوان فارسی کہ طرازش ہر یکے وابستہ بفراہم آمدن درخواست ہائے خریداران ست بہنگام خود پئے ہم بخدمت خواہد رسید۔''

دیوان ریختہ کا مطبع سید الاخبار میں انطباع اکتوبر 1841 (شعبان 1257ھ) میں واقع ہوا ہے۔ اس بنا پر یہ خط اسی سنہ بلکہ اسی مہینے کا لکھا ہوا ہونا چاہیے۔

1. خوش قسمتی سے یہ نسخہ جس سے منشی نولکشور نے پریس کے لیے کاپی لکھوائی تھی، لوہارو میں محفوظ تھا۔ وہاں سے رضا لائبریری منتقل ہوگیا ہے۔
2. کلیاتِ نثر 174

ستمبر 1863 میں میرزا صاحب نے دیوان فارسی مطبوع کے بارے میں تحریر کیا ہے:[1]

''فارسی کا دیوان بیس برس کا عرصہ ہوا چھپا تھا۔ پھر نہیں چھپا۔''

اِس خط سے دو باتیں روشنی میں آتی ہیں۔ پہلی یہ کہ نولکشور پریس میں دیوان کے طبع ہونے سے قبل فارسی دیوانِ غالب صرف ایک بار چھپا تھا اور دوسری یہ کہ 1863 میں اس طباعت پر بیس یا پچیس سال گزر چکے تھے۔ اس بیان کے لحاظ سے دیوان فارسی کی پہلی طباعت 1838 یا 1843 میں عمل میں آئی ہوگی۔ ان دونوں تخمینوں میں سے پہلا درست نہیں ہے، اس لیے کہ ابھی خود میرزا صاحب کے فارسی خط سے ثابت ہو چکا ہے کہ 1841 تک دیوان فارسی طبع نہیں ہوا تھا۔ دوسرا تخمینہ اس بنا پر درست نہیں کہ فہرست کتاب خانہائے شاہ اودھ (ص 410) میں ڈاکٹر اشپرنگر نے میرزا صاحب کے مطبوعہ دیوان فارسی کے ایک نسخے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دہلی کے پتھر کے چھاپے خانے میں 1261 کو 8vo سائز کے 506 صفحوں پر چھپ کر شائع ہوا۔ چونکہ یہ ہجری سنہ عیسوی سال 1846 سے مطابق ہے، لہٰذا 1843 میں اس کا چھاپا جانا صحیح نہ ہوا۔

اگر چہ اشپرنگر نے مطبع کا نام نہیں لکھا ہے، لیکن یہ امر یقینی ہے کہ میرزا صاحب کا کلیات نظم فارسی پہلی بار دہلی کے مطبع دارالسلام سے 1261ھ (مئی 1847ء) میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ اپریل 1853 سے قبل یا بعد میرزا صاحب نے امین الدولہ آغا علی خاں ابن معتمدالدولہ آغا میر[2]، نواب حشمت جنگ بہادر[3] اور نواب باندہ[4] کے خطوط میں جس ایڈیشن کا ذکر کیا ہے، وہ یہی نسخہ مطبوعۂ 1847 ہے۔

1857 کے ہنگامے سے برسوں پہلے یہ نسخہ کمیاب ہو گیا تھا۔ چنانچہ نواب علی بہادر باندہ کے نام محولہ بالا خط میں میرزا صاحب نے یہی لکھا ہے کہ:

''بپذیرفتن فرمان، مردم را سو بسو گماشتم رفتند و جستند دیوان فارسی و دیوان ریختہ فراچنگ نیامد۔''

آج بھی یہ نسخہ عام طور پر نہیں ملتا۔ اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب (الہ آباد) کے پاس محفوظ ہے۔ ہاں کتاب خانہ عالیہ رام پور میں ایک قلمی نسخہ ہے جس کی تقریظ میں میرزا

---

1. اردوئے معلّٰی 130 و خطوط 1/ 111۔
2. پنج آہنگ 182
3. ایضاً، 211
4. ایضاً 233

صاحب نے 1253ھ تاریخ اتمام لکھی ہے، اس میں صفحہ 23 پر میجر جان کو جا کوب کے تعمیر کیے ہوئے کنویں کی تاریخ 'چشمۂ فیضِ ابدی' بھی پائی جاتی ہے، جس سے 1839ء (1255ھ) مستخرج ہوتے ہیں۔ صفحہ 157 سے ایک قصیدہ شروع ہوتا ہے جس کا عنوان ہے ''در مدح جہاں پناہ، امجد علی شاہ اورنگ نشیں اودھ دام ملکہ۔'' امجد علی شاہ 6 ربیع الثانی 1258ھ (7 مئی 1842) کو تخت نشیں ہوئے اور 26 صفر 1263ھ کو فوت ہوگئے۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ کتاب خانۂ رام پور کا یہ قلمی نسخہ 1261 کے مطبوعہ نسخے کی نقل ہے، یا دونوں نسخے ایک ہی مسودے سے منقول ہیں اور تقریظ کے سنین 1253ھ میں 1863 والے نولکشوری نسخے کی طرح رد و بدل نہیں کیا گیا ہے۔

شورشِ 1857 کے بعد دیوان کے صرف دو مکمل نسخے تیار ہوسکے تھے جن میں سے ایک نواب ضیاء الدین خاں بہادر نیرؔ کے پاس تھا اور غالباً اس کی نقل مارچ 1861 میں میرزا صاحب نے اپنے شاگرد نواب یوسف علی خاں ناظم کو رام پور ارسال کردی تھی۔[1] اسی سال منشی نولکشور نے اس کی طباعت کا ارادہ کیا۔ میرزا صاحب نے 17 محرم 1278ھ (26 جولائی 1865) کو میر مہدی مجروحؔ کو اس کی اطلاع ان الفاظ میں دی:[2]

''کلیاتِ نظم فارسی کے چھاپنے کی بھی تدبیر ہو رہی ہے۔ اگر ڈول بن گیا تو وہ بھی چھاپا جائے گا۔''

11 ربیع الاوّل سنۂ مذکور کو حبیب اللہ ذکاؔ کو لکھا:[3]

''اینک در بند آنم کہ بہ بند انطباعش در آورند کہ درین صورت متاع فراوان و خواستاران یافتن آن آسان خواہد بود۔''

میرزا صاحب نے مطبع کے لیے نسخہ مہیا کرنے کی یہ تدبیر سوچی کہ تفضّل حسین خاں سے ان کا نسخہ مستعار لے کر اپنے دیوان کی تکمیل کرلیں اور اسے لکھنؤ بھیج دیں۔ انھوں نے پس و پیش کے بعد نسخہ دیا تو وہ ناقص و ناتمام نکلا۔ رام پور سے دیوان منگانا مناسب نہ تھا۔ آخر نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر کو ایک سحر آفریں خط لکھ راضی کرلیا کہ وہ اپنا نسخہ لکھنؤ بھیج دیں۔[5] جیسا کہ پہلے بھی مذکور ہوچکا ہے، سید بدرالدین احمد کو ستمبر 1863 میں میرزا صاحب نے لکھا تھا:[6]

---

1. مکاتیب غالب 28 2. اردوئے معلیٰ 186 و خطوط 1/272
3. کلیات نثر فارسی 247 4. اردوئے معلیٰ 247 5. ایضاً، 289 6. ایضاً 13 و خطوط 1/111

''ہاں، سال گذشتہ میں منشی نولکشور نے شہاب الدین خاں کو لکھ کر کلیات فارسی جو ضیاء الدین خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا، وہ منگالیا اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس جزو ہیں۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسودہ براہِ راست نواب شہاب الدین احمد خاں بہادر نے لکھنؤ بھیج دیا تھا اور 1862 میں اس کی طباعت شروع ہوئی تھی۔

5 مئی 1862 کو میرزا صاحب نے قدرؔ بلگرامی کو ایک خط لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں طباعت کا کام رک گیا تھا۔ چونکہ میرزا صاحب کو اس کی وجہ معلوم نہ تھی اس لیے انھیں تردد تھا نیز یہاں سے کوئی قصیدہ اور تاریخ طباعت کلیات بھی ارسال کیے گئے تھے، ان کا حال بھی معلوم نہ ہو سکا تھا۔ نہ تصحیح وغیرہ کے متعلق کچھ تھا۔ میرزا نے ان الفاظ میں اپنے مدعا کو ظاہر کیا:[1]

''جناب منشی صاحب سے میرا سلام کہیے اور یہ رقعہ ان کو پڑھا کر عرض کیجیے کہ غالبؔ پوچھتا ہے کہ فارسی کے کلیات کا چھاپا ملتوی ہے یا جاری ہے۔ ملتوی ہے تو کب تک کھلے گا۔ جاری ہے تو تصحیح کس طور پر ہے۔ قصیدے اور تاریخ کلیات کا مطبع میں پتہ لگا یا نہیں؟ اگر وہ دونوں کاغذ گم ہو گئے ہوں تو نئی بھیج دوں۔''

اس خط کے جواب میں جو کچھ لکھا گیا تھا، اس کے بعض مطالب میرزا صاحب نے مجروحؔ کو 15/ ذیقعدہ 1279ھ (15/ مئی 1861ء) کو تاریخ کلیات وصول کر کے لکھے ہیں:[2]

''کلیات کے چھاپے کی حقیقت سنو۔ ساٹھ صفحے چھاپے گئے تھے کہ مولوی ہادی علی مصحح بیمار ہو گئے۔ کاپی نگار رخصتی اپنے گھر گیا۔ اب دیکھیے کب چھاپا شروع ہو۔''

24/ مئی 1862 کو قدرؔ کے خط میں جو لکھا ہے، بعض دوسرے مطالب پر اُس سے روشنی پڑتی ہے۔ فرماتے ہیں:[3]

''کلیات کے انطباع کی تاریخ میں کیونکر لکھوں؟ اہل مطبع کو خدا منشی صاحب

---

1. خطوط 1/ 111 2. اردوئے معلیٰ 164 وخطوط 1/ 276
3. خطوط 1/ 198

کے سایۂ عطوفت میں سلامت رکھیے کہہ لیں گے۔ چھاپا 78ھ میں شروع
ہوا، 79ھ میں تمام ہوگا۔ مولوی ہادی علی صاحب کے مطبع میں آنے کا حال تم
لکھواور کلیات کے کاپی نگار کے آنے کا بھی حال معلوم کر کے لکھو۔"

غالباً اگلے مہینے تک کام جاری نہ ہوا۔ میرزا صاحب کی افسردہ طبیعت پر اِس تاخیر کا اتنا اثر ہوا کہ پنجشنبہ 19 جون 1862 کو نواب علاء الدین احمد خان بہادر علائی کو لکھتے ہیں:[1]

"کلیات کے انطباع کا انتقام اپنی زیست میں مجکو نظر نہیں آتا۔"

اس تاریخ کے بعد سے آئندہ سال کے ماہ جون تک کلیات فارسی کی طباعت کا کام میرزا صاحب کے موجودہ ذخیرۂ مکتوبات میں نہیں ملتا۔ 11/جون 1863 کو علائی کے نام ایک خط لکھا ہے، اس میں فرماتے ہیں:[2]

"کلیات کے باب میں جو عرض کر چکا ہوں۔ بر ہمانیم کہ ہستیم و ہماں خواہد بود۔ جب میں دس پندرہ جلدیں منگالوں گا۔ ایک بھائی کو اور ایک تم کو ارمغاں بھیجوں گا۔ اگر بھائی کو جلدی ہے تو لکھنؤ میں اودھ اخبار کا مطبع مالک رام کے منشی نولکشور مشہور۔ جتنی جلدیں چاہیں لکھنؤ سے منگالیں۔ میں بہر حال دو جلدیں جس وقت موقع ہوگا بھیج دوں گا۔"

اِس سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ 11/جون 1863 سے قبل کلیات کا چھاپا ختم ہوگیا تھا۔ 22/اگست کو مجروح کو لکھا ہے:[3]

"کلیات فارسی کا پہنچنا مجکو معلوم ہوا۔ میاں اس میں اغلاط بہت ہیں۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگست میں کتاب چھپ کر اس کا ایک نسخہ براہِ راست لکھنؤ سے میر مہدی مجروح کے پاس پہنچ چکا تھا۔ میرزا صاحب کے پاس اس کا پہلا نسخہ علائی کے توسط سے ستمبر میں پہنچا۔ چنانچہ 20 ستمبر 1863 کو انھیں لکھتے ہیں:[4]

"جانا، عالی شانا، پہلے خط اور پھر بتوسط برخوردار علی حسین خاں مجلد کلیات فارسی پہنچی۔ حیرت ہے کہ چار روپے قیمت کتاب اور چار آنے محصول ڈاک۔ قالب انطباع میں آکر پانچ روپے قیمت اور پانچ آنے محصول قرار

---

1. اردوئے معلّیٰ 411 وخطوط 1/340
2. ایضاً 429، خطوط 1/351
3. خطوط 1/285
4. اردوئے معلّیٰ 436

پاوے۔ خیر جہاں سو، وہاں سوا سے۔ میرا حال تمھیں اور تمھارا حال مجھے
معلوم ہے:

این ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر

اب کے چھٹے میں شاید نہ دے سکوں۔ نومبر سنہ حال میں پچاس روپے
تمھارے پاس پہنچ جائیں گے۔''

میرزا صاحب نے یہ نسخہ سر سالار جنگ اوّل کی خدمت میں مولوی موید الدین خاں کے توسط سے روانہ کردیا۔ اس کے متعلق 25 ستمبر 1863 کو ذکاؔ کو لکھتے ہیں:[1]

''صاحب تاریخ انطباع کلیات خوب لکھی ہے، مگر ہزار حیف! کہ بعد از اتمام انطباع پہنچی اور کتاب کی رونق افزا نہ ہوئی۔ آپ سے یہ چاہتا ہوں کہ آپ مولوی صاحب سے ملیں اور ان کو یہ خط اپنے نام کا دکھائیں اور میری طرف سے بعد سلام میرے کلیات کے پارسل کا ان کے پاس اور ان کے ذریعۂ عنایت سے اس مجلد کا حضرت فلک رفعت نواب مختار الملک بہادر کی نظر سے گزرنے اور جو کچھ اس کے گزرنے کے بعد واقع ہو، دریافت کرکے لکھیں۔''

مگر میرزا صاحب اس کے ایک سے زائد نسخے منگانا چاہتے تھے اور اس کام کا انجام روپے کے بغیر ممکن نہ تھا۔ حسنِ اتفاق سے منشی نولکشور دہلی آئے۔ میرزا صاحب اور اُن سے بات چیت میں یہ طے ہوا کہ میرزا صاحب 20 نسخوں کی قیمت 3 روپے 4 آنے فی جلد کے حساب سے ادا کرکے منگالیں۔ اس کے متعلق میرزا صاحب نے 3/دسمبر 1863 کو علائی کو لکھا ہے:[2]

''شفیقِ مکرم والطافِ مجسم منشی نولکشور صاحب بسبیل ڈاک یہاں آئے۔ مجھ سے اور تمھارے چچا اور تمھارے بھائی شہاب الدین خاں سے ملے۔ خالق نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے۔ گویا بجائے خود قران السعدین ہیں۔''

تم سے میں نے کچھ نہ کہا تھا اور کلیات کے دس مجلد کی قیمت پچاس روپے مان لیے تھے۔ اب ان سے جو ذکر آیا تو انھوں نے پہلی قیمت مشتہرۂ اخبار لینی قبول کی۔ یعنی 3 روپے 4 آنے فی جلد۔ اس صورت میں دس مجلد کے

---

1 اردوئے معلیٰ 39   2 اردوئے معلیٰ 405 وخطوط 1/ 354

32 رُپے 8 آنے میں دوں اور 32 رُپے 8 آنے تم۔

ہمگی 65 روپے مطبع اودھ اخبار میں پہنچانے چاہئیں۔ میں دسمبر ماہ حال کی دسویں گیارہویں کو طالب ہوں گا، کہو 32 (رُپے) 8 (آنے) علی حسین خاں کو دے دوں، کہو لکھنؤ بھیج دوں۔"

اور غالباً اِس تصفیے کے بعد ہی سید بدرالدین احمد کو بھی لکھتے ہیں:1

"اب سنا ہے کہ وہ چھپ کر تمام ہوگیا ہے۔ روپے کی فکر میں ہوں۔ ہاتھ آجائے تو 65 (رُپے) بھیج کر بیس جلدیں منگواؤں جب آجائیں گی، ایک آپ کو بھیج دوں گا۔

دسمبر کو پھر ایک خط علائی کو لکھا ہے، جس میں اپنے حصے کی رقم ہنڈی کے ذریعے ارسال کرنے کا وعدہ کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ:2

"نہ دن یاد ہے، نہ تاریخ، آج چوتھا، یا بھئی شاید بھول گیا ہوں پانچواں دن ہے کہ منشی نولکشور بسواریٔ ڈاک رہگرائے لکھنؤ ہوئے۔ کل پہنچ گئے ہوں یا آج پہنچ جائیں۔ آج روز یکشنبہ 13 دسمبر کی ہے۔"

اس لیے اغلب یہ ہے کہ انھوں نے لکھنؤ پہنچ کر جب ہنڈوی کے ذریعے قیمت وصول کرلی ہوگی۔ تب کلیات کے بیس نسخے بھیجے اس لیے بعید نہیں کہ آغاز 1864 میں یہ نسخے میرزا صاحب کو ملے ہوں۔

30 مئی 1864 کے ایک خط میں علائی کو لکھا ہے:3

"اے میری جان! مثنوی ابرِ گہربار کون سی فکر تازہ تھی کہ میں تجھ کو بھیجتا۔ کلیات میں موجود ہے۔ مع ہذا شہاب الدین خاں نے بھیج دی، میں مکرر کیا بھیجتا۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخ سے قبل ہی اُن کے پاس کلیات کے نسخے پہنچ گئے تھے۔ اِس ایڈیشن کے بعد میرزا صاحب کی حیات میں پھر کلیات فارسی کی طباعت کی نوبت نہیں آئی۔



1۔ اردوئے معلّٰی 130 وخطوط 1/111 2۔ اردوئے معلّٰی 433

3۔ اردوئے معلّٰی ۔ وخطوط 1/358

دیوانِ غالب اردو (نسخۂ عرشی)

میرے مرتبہ دیوان غالب پر جناب مالک رام صاحب نے رسالۂ فکر ونظر علی گڑھ، ج2 نمبر1 جنوری 61ء میں جس دل سوزی اور دیدہ ریزی سے تبصرہ کیا ہے، اس کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔ ان کی تحریر میں ایک ہمدرد رفیق کار کی روح جلوہ گر ہے، اس لیے اس سے میرا حوصلہ بھی بڑھا اور آئندہ کے لیے رہنمائی بھی ملی۔ مگر اس تبصرے میں بعض مسائل توضیح طلب ہیں، اس لیے ذیل میں ان کے بارے میں اپنے معروضے پیش کرتا ہوں:

(1)

متداول دیوان کی ترتیب وتہذیب دہلی میں ہوئی یا کلکتے میں، اس بارے میں تبصرہ نگار کا خیال ہے کہ:

(الف) یہ انتخاب کلکتے میں
(ب) گلِ رعنا کے بعد عمل میں آیا۔

سوء اتفاق سے گلِ رعنا کی ترتیب کا سال و ماہ معلوم نہیں۔ لیکن میرزا صاحب 19 فروری 1828ھ کو کلکتے پہنچے، اور 28 نومبر 1829 کو دہلی واپس آئے تھے۔ لہٰذا دیوان کے انتخاب کا کام 1829 کے ابتدائی کسی مہینے میں انجام دیا جانا چاہیے۔

میری رائے اس کے برعکس یہ ہے کہ دیوان متداول کا انتخاب دہلی میں 1248ھ (1833) میں کیا گیا تھا۔ اس رائے کی بنیاد دیباچہ ''دیوان کی تاریخ 24 ذیقعدہ 1248ھ (14 مئی 1833) ہے، جو مولانا نظامی بدایونی نے دیوان کے ایک مخطوطے میں پائی، اور دیوان

نوائے ادب، بمبئی، اکتوبر 1964

غالب مع شرح نظامی کے اس ایڈیشن میں چھاپی جو 1918 میں مرتب ہوا اور تقریباً اسی سال بازار میں بھی آ گیا تھا۔

تبصرہ نگار نے اپنی رائے کی بنیاد میرزا صاحب کے اس خط پر رکھی ہے جو حکیم احسن اللہ خان بہادر کو لکھا گیا تھا اور اس کے ساتھ دیوان ریختہ کا دیباچہ اور گلِ رعنا کا مقدمہ اور خاتمہ بھیجے گئے تھے۔

یہ امر یقینی ہے کہ خط میں نہ مقام کتابت کا ذکر ہے، نہ تاریخ کا، صرف خواجہ حالی مرحوم لکھتے ہیں کہ یہ کلکتے سے بھیجا گیا تھا، اور اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اس کا زمانہ کتابت فروری 1828 اور نومبر 1829 کے مابین ہے۔

میں یہ تسلیم کیے لیتا ہوں کہ مذکورہ خط کلکتے ہی سے لکھا گیا تھا، اور اسے بھی مانے لیتا ہوں کہ اسی سفر میں یہ دیباچہ لکھا گیا تھا، مگر اس خط کی عبارت سے یہ کب اور کیسے ثابت ہوا کہ:

(الف) یہ دیباچہ موجودہ متداول منتخب دیوان کے لیے لکھا گیا تھا اور

(ب) یہ کہ متداول دیوان کی ترتیب کلکتے میں عمل میں آئی اور

(ج) یہ ترتیب گل رعنا کے متصل بعد کا کام ہے۔

یہ سب جانتے ہیں کہ میرزا صاحب نے سفر کلکتہ سے پہلے اپنے دیوانِ قدیم کا (جو آج کل نسخۂ بھوپال یا مطبوعہ شکل میں نسخۂ حمیدیہ کہلاتا ہے) انتخاب کیا تھا، اور اس کے بہت سے اشعار ہی نہیں بلکہ پوری پوری غزلیں غلط اور خارج قرار دے دی تھیں اس انتخاب کی ایک کاپی لاہور میں محفوظ اور آج کل نسخۂ شیرانی کے نام سے مشہور ہے۔ زیر بحث دیباچے کے مندرجات میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جو متداول انتخاب کے ساتھ مخصوص ہو اور نسخۂ شیرانی میں نہ پائی جاتی ہو۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ دیباچہ انتخابِ اوّل (نسخۂ شیرانی) کے لیے لکھا گیا تھا، اور کلکتے ہی میں لکھا گیا تھا، جب دہلی میں متداول انتخاب عمل میں آیا، تو اس پر بھی اس دیباچے کے مندرجات پوری طرح صادق آتے تھے، اس لیے میرزا صاحب نے اس میں کوئی تبدل وتغیر نہ کیا، صرف تاریخ بدل دی، یا اس میں تاریخ نہ تھی، تو اس کا اضافہ کر دیا۔

تبصرہ نگار نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ''انھوں نے اس زمانے (قیام کلکتہ) میں یقیناً پورا انتخاب کیا ہوگا، یعنی اپنے تمام اردو کلام کا نمائندہ انتخاب، کیونکہ جب وہ انتخاب کر ہی رہے تھے، تو کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے مولوی سراج الدین احمد ہی کی خواہش کو مدنظر رکھا،

اور صرف 455 شعر (گلِ رعنا کا اردو حصہ) ہی انتخاب کیے۔ ان کے دوسرے احباب بھی تو کتنے زمانے سے اُن سے آسان کہنے کی فرمائش کر رہے تھے۔ پس انھوں نے اسی موقع پر پہلے مکمل انتخاب کیا، مشکل اشعار ترک کر دیے اور آسان شعر لے لیے۔ یہ انتخاب کم وبیش وہی رہا ہوگا جو رامپوری نسخۂ قدیم (مکتوبہ 1833) کے مشتملات ہیں، یعنی 1067 شعر، اور چونکہ یہ انتخاب طویل تھا، انھوں نے اس میں سے صرف 455 شعر گل رعنا میں شامل کر لیے، غرض ان کا مکمل انتخاب دیوانِ ریختہ کہلایا۔"

اس بارے میں میری گذارش یہ ہے کہ (الف) گل رعنا پہلے مرتب ہوئی، (ب) اور دیوان متداول کا انتخاب اس کے بعد عمل میں آیا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ:

(1) گلِ رعنا میں ایسے متعدد پرانے شعر پائے جاتے ہیں جو متداول دیوان میں نہیں ہیں۔ اگر گلِ رعنا کی بنیاد یہ دیوان ہوتا، تو چاہیے تھا کہ معاملہ برعکس ہوتا، یعنی دیوان متداول میں ایسے شعر پائے جاتے جو گلِ رعنا میں نہ ہوتے مثلاً چند شعر پیش کرتا ہوں:

کس قدر خاک ہوا ہے دل مجنوں یارب نقش ہر ذرہ سویدای بیاباں نکلا

شب کہ ذوق گفتگو سے تیری دل بیتاب تھا شوخی وحشت سے افسانہ فسونِ خواب تھا
واں ہجومِ نغمہ ہای سازِ عشرت تھا، اسد ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا

ہم نے وحشت کدۂ بزم جہاں میں جوں شمع شعلۂ عشق کو اپنا سر و ساماں سمجھا

اے وائے غفلتِ نگہِ شوق، ورنہ یاں ہر پارہ سنگ لختِ دلِ کوہِ طور تھا

واعظ * یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزای بہار سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا

مندرجہ بالا شعر گلِ رعنا میں ہیں، اور متداول دیوان میں نہیں۔

دیوان قدیم کی کچھ غزلیں ایسی ہیں جن کا کوئی ایک شعر بھی متداول دیوان میں نہیں لیا گیا ہے، مگر گلِ رعنا میں ان کے اشعار موجود ہیں۔ اگر متداول دیوان مقدم اور گل رعنا موخر

* نسخۂ نظامی میں "ربط" ہے۔

ہوتا، تو معاملہ برعکس ہونا چاہیے تھا مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ یہ اشعار:

برہن شرم ہے باوصف شوخی اہتمام اس کا — نگیں میں جوں شرارِ سنگ ناپیدا ہے نام اس کا
مسی آلودہ ہے مہرِ نوازش نامہ، ظاہر ہے — کہ داغ آرزوی بوسہ دیتا ہے پیام اس کا
بامید نگاہ خاص ہوں محمل کشِ حسرت — مبادا ہو عناں گیر تغافل لطف عام اس کا

وحشتِ نالہ بواماندگی وحشت ہے — جرس قافلہ یاں دل ہے گرانباروں کا
پھر وہ سوی چمن آتا ہے، خدا خیر کرے — رنگ اُڑتا ہے گلستاں کے ہوا داروں کا
جلوہ مایوس نہیں دل نگرانی، غافل — چشمِ امید ہے روزن تری دیواروں کا

قیس بھاگا شہر سے شرمندہ ہوکر سوے دشت — بن گیا تقلید سے میری یہ سودائی عبث

کون آیا جو چمن بے تابِ استقبال ہے — جنبشِ موجِ صبا ہے شوخی رفتار باغ
آتشِ رنگِ رخِ ہر گل کو بخشے ہے فروغ — ہے دمِ سردِ صبا سے، گرمی بازار باغ

ایسی غزلوں کے ہیں جن کا کوئی ایک شعر بھی دیوان متداول میں نہیں ہے۔ اگر گل رعنا کو دیوان متداول سے انتخاب کیا گیا ہوتا، تو کیا گل رعنا میں وہ شعر آسکتے تھے جو اس کی اصل میں نہ ہوتے؟

بہت سے اشعار ایسے ہیں جن کا متن گل رعنا میں دیوان متداول سے مختلف ہے، مثلاً:

تھی نو آموز فنا ہمتِ دشوار پسند — سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آسان نکلا

اس مصرعہ کا اوّل گل رعنا میں یوں ہے: ''ہے نو آموز فنا ہمت دشواری شوق''

شب کہ برقِ سوز دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا

گل رعنا میں پہلا مصرع یوں ہے: شب کہ برقِ سوز دل سے زہرہ از بس آب تھا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمع کشتہ، درخورِ محفل نہیں رہا

گل رعنا میں دوسرے مصرع کا پہلا لفظ ہے: ''جوں''

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا، مگر اسد
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

گل رعنا میں پہلا مصرع یوں ہے: بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا ہوں، پر اسد

کیا کہوں بیماریٔ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دل، بے منتِ کیموس تھا

گل رعنا میں ہے:

پوچھ مت بیماریٔ غم کی فراغت کا بیاں

نسخۂ عرشی کے باب ''اختلاف نسخ'' میں اور بہت سی مثالیں موجود ہیں جنھیں دیکھا جاسکتا ہے۔ ان مواقع پر گل رعنا اور دیوان متداول کا اختلاف کیوں ہے، اس کا ایک جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ دیوان متداول میں سے گل رعنا کا حصہ، اردو انتخاب کرتے وقت مرزا صاحب نے اپنے اشعار میں اصلاح کردی تھی۔ بالفاظِ دیگر گل رعنا کا متن متاخر اور اصلاحی ہے، اور دیوان متداول مقدم اور متروک، لیکن ایسا کہنا درست نہ ہوگا، اس لیے کہ ان جگہوں پر گل رعنا کا متن دیوان کے انتخابِ اول، یعنی نسخۂ شیرانی، کے مطابق ہے۔ لہٰذا نسخۂ شیرانی ہی پر گل رعنا کی بنا ہونا چاہیے، دیوان متداول پر نہیں، اور اس صورت میں دیوان متداول کی ترتیب گل رعنا کے بعد عمل میں آنا چاہیے، نہ کہ اس سے پہلے۔

اس بات کے ثابت ہوجانے کے بعد کہ دیوانِ متداول کی ترتیب گلِ رعنا کے بعد عمل میں آئی، یہ مسئلہ حل طلب رہ جاتا ہے کہ یہ کام کب کیا گیا، چونکہ دیوان کے ایک نسخے میں 24 ذیقعدہ سنہ 1248ھ موجود ہے، اور کوئی اور تاریخ دیوان یا اور کسی کتاب میں مذکور نہیں، اس لیے اس نص جلی کو قیاس کے زور پر رد نہیں کیا جاسکتا۔

یہاں ضمناً ایک بات اور عرض کردوں، شیخ محمد اکرام صاحب نے جو لکھا ہے کہ دیوان کے دیباچے کی تاریخ رامپور کے نسخے میں ہے، یہ بات درست نہیں ہے، دراصل مولانا نظامی کا وہ بیان دہرایا ہے جو انھوں نے اپنے دوسرے اڈیشن کے دیباچۂ مورخہ 14 جون سنہ 1918 میں درج کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''اس مرتبہ اس سے بھی زیادہ پرانا ایک قلمی نسخہ ہاتھ آیا جو اس اصل دیوان سے نقل کیا گیا ہے جس کو پہلی مرتبہ غالب نے سنہ 1248ھ میں مرتب کیا تھا۔

یہ نقل جو ہمیں دستیاب ہوئی ہے اس زمانے کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ایک دیباچہ بزبان فارسی مصنف نے لکھا ہے جس کو ناظرین کے مطالعے کے لیے اس دیوان کے شروع میں بجنسہ درج کیا گیا ہے۔

اس دیباچے کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان اردو، فارسی سے پہلے مصنف نے 1248ھ میں ترتیب دیا، لیکن اس میں مصنف کی بعض مشہور غزلیں نہیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 1248ھ کے بعد دوسرا نسخہ مرزا نے ان غزلیات کو شامل کر کے جو سال مذکورہ کے بعد تصنیف ہوئیں، ترتیب دیا ہے، اور وہی اب تک رائج ہے۔ اگر اس قلمی نسخے کی جو 1248ھ کا لکھا ہوا ہے، مطابقت کی جائے، تو بعض مشہور غزلیں نکال دینی پڑیں گے، مثلاً یہ غزل: ''لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور'' جس کا مضمون تاریخی واقعے پر مشتمل ہے، اور جو یقیناً غالب کی مصنفہ ہے، اس لیے اس قلمی دیوان سے صرف یہ مدد لی گئی کہ بعض خفیف غلطیاں جو مطبوعہ دیوانوں میں پائی گئیں درست کر لی گئیں۔'' (دیوانِ غالب مع شرح نظامی طبع ششم ص 61)

مولانا نظامی کے اس بیان کے پیش نظر میں نے یہ طے کیا تھا کہ ہمارا سب سے پرانا قلمی نسخہ (جسے نسخۂ عرشی میں قب کہا گیا ہے) بھی اسی پہلے ایڈیشن کی نقل ہے، اور بہت ممکن ہے کہ اکرام صاحب کو میں نے یہ لکھا ہو کہ وہ پہلا ایڈیشن ہمارے یہاں محفوظ ہے۔ موصوف نے اس سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ تاریخ والی کاپی رام پور میں موجود ہے۔

مولانا نظامی کو یہ نسخہ کہاں سے ملا تھا، اس کا ذکر نہ انھوں نے اپنے نسخے کے کسی دیباچے میں کیا ہے، نہ ان کے صاحبزادۂ گرامی جناب احمد الدین نظامی کو اس کا علم ہے، مگر میں نے خود کہیں دیکھا ہے کہ انھیں یہ نسخہ منشی احمد علی شوق قدوائی مرحوم سے ملا تھا۔ منشی صاحب اس زمانے میں سرکار رام پور میں مقیم تھے۔ یہ بیان میں نے کہاں دیکھا ہے، باوجود حافظے پر زور دینے کے یاد نہیں آتا۔ مگر اس اطلاع پر مجھے اتنا وثوق تھا کہ میں نے نسخۂ عرشی کی اپنی کاپی میں اسے لکھ بھی لیا تھا، سوءِ اتفاق سے حوالہ وہاں بھی درج نہیں ہے۔ خدا کرے نسخۂ عرشی کی اشاعت دوم سے پہلے ہی اس کا ماخذ یاد آجائے۔

(2)

تبصرہ نگار نے لکھا ہے کہ ''عرشی صاحب نے اس (نوائے سروش) کے متن کی بنیاد اس قلمی نسخے پر رکھی ہے، جو خود میرزا نے بڑے اہتمام سے لکھوا کے فردوس مکاں نواب یوسف علی خاں ناظم کی خدمت میں شاید مئی 1857 میں بھیجا تھا، اور اب رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ اس سے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ دیوان کا یہ آخری مستند ایڈیشن ہے (دیباچہ ص 73) اس لیے اسے بطور متن استعمال کیا گیا ہے۔''

اس کے کہ تبصرہ نگار نے پرانی کتابوں کی ترغیب کے تین اصول لکھ کر ارشاد فرمایا ہے کہ ''یہ بڑا وسیع فن ہے، اور آگے اس کی بہت فروغ ہیں، اور تفصیلات ہیں، لیکن بنیادی اصول یہی ہیں، یہ علمی دنیا میں معروف ہیں اور سب جگہ انھیں پر عمل ہو رہا ہے۔ جناب عرشی صاحب نے اس سے انحراف کیا ہے، اور جو وجہ انھوں نے پیش کی ہے وہ بھی درست نہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ 1857 کا قلمی نسخہ دیوان کا آخری مستند ایڈیشن ہے۔

اس مخطوطے کے بعد دیوان کے تین ایڈیشن طبع اور شائع ہوئے۔ ان میں سے تیسرا ایڈیشن (1863) چونکہ اسی 1857 کے مخطوطے پر مبنی ہے، اس لیے وہ قابل توجہ نہیں۔ دوسرے دونوں ایڈیشن (1861 نیز 1862) خود غالب کے دیکھے ہوئے ہیں۔ ان کے متن میں بھی 1857 کے مخطوطے کے متن سے اختلاف ہے، اور شعروں کے تعداد میں بھی۔ اس صورت میں اصولاً 1862 کے مطبوعہ ایڈیشن کو متن میں جگہ ملنا چاہیے تھی اور بقیہ تمام قلمی اور مطبوعہ نسخے اختلاف متن کے لیے استعمال ہونا چاہیے تھے۔''

موصوف کے اس ارشاد کے سلسلے میں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ میں نے ان معروف اصولوں سے ہرگز انحراف نہیں کیا، بلکہ انھیں کو پیش نظر رکھ کر دیوان مرتب کیا ہے اور اگر ایک دو جگہ اس کے خلاف نظر آتا ہے تو وہ یا میرا سہو ہے، یا کسی خاص مقصد سے عمل میں لایا گیا ہے۔ مثلاً مطبع نظامی کانپور کے نسخے میں چھپا ہے:

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری خوشامد سے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

از روئے قاعدہ چاہیے تھا کہ میں اپنے مرتبہ متن میں ''میری خوشامد سے'' کو جگہ دیتا اور ''مری جو شامت آئی'' کو اختلاف نسخ میں لکھتا کیونکہ نظامی ایڈیشن وہ آخری طباعت ہے جو

میرزا صاحب کی تصحیح سے شائع ہوئی ہے لیکن میں نے ہی نہیں خود تبصرہ نگار نے بھی اپنے مرتبہ دیوان میں یہ الفاظ نہیں چھاپے۔

اسی طرح نسخۂ نظامی میں ہے: زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا (بجائے ''بھرنے تک'')

آہ کو چاہیے ایک عمر اثر ہونے تک (بجائے ''ہوتے تک'') ص 29

ہر بنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوںناب (ہر جگہ پورے دیوان میں ''بجائے خوناب'') ص 11

جفا میں اوس کی ہے انداز کارفرما کا (بجائے ''اس کی'') ص 13

ننگ سجدے سے میرے سنگ آستاں اپنا (بجائے ''ننگ سجدہ'') ص 18

برشگال گریہ عاشق ہے دیکھا چاہیے (ہر جگہ بجائے ''برشکال'') ص 35

کہیں حکایت صبر گریز پا کہیے (بجائے ''کبھی'') ص 75

بھر کے بھیجیں ہیں سر بھر گلاس (بجائے ''بھیجے'') ص 93

چرخ کجباز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل (بجائے ''تا کا'') ص 94

وہ میوہائے تازۂ شیریں کہ واہ واہ (بجائے ''میوہ ہائے'') ص 95

وہ بادہائے ناب گوارا کہ ہاے ہاے (بادہ ہائے'') ص 95

میرے ایہام بہ ہوتی ہے تصدق توضیح (بجائے ''ابہام'') ص 95

قاصر ہے شکایت میں تری میری عبارت (بجائے ''ستایش میں'') ص 98

ہے نوآموزِ فنا ہمت دشوار پسند (بجائے ''تھی'') ص 4

پہلو اندیشہ وقف بسترِ سنجاب تھا (بجائے ''پہلوی اندیشہ'') ص 8

افسوس کہ دیدان کا کیا رزق فلک نے (بجائے ''دندان'') ص 20

فنا کو سونپ کر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا (بجائے ''سونپ، گر'') ص 36

نقش پا میں ہے تپِ گرمی رفتار ہنوز (بجائے ''تب'') ص 27

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد گامِ نہنگ (بجائے ''کام'') ص 29

دل میں چھری چھبو، مژہ گر خونچکاں نہیں (بجائے ''چبھو'') ص 34

رو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھکے (بجائے ''تھمے'') ص 36

دونو جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا (بجائے ''دونوں'') ص 38

کیا وہ بھی بیگنہ کش وحق ناسپاس ہیں (بجائے ''حق ناشناس'') ص
چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگ گل پر آب (بجائے ''گل پہ'') ص80
پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بخونِ دل (بجائے ''بھر رہا ہوں'') ص82

ان میں سے اکثر مقامات پر میں نے ہی نہیں خود تبصرہ نگار نے بھی اپنے مرتبہ دیوان میں نسخۂ نظامی کی پیروی نہیں کی، اگر میں اور وہ دونوں اس قاعدے پر جمے رہتے کہ آخری ایڈیشن کی قرأت ہی متن میں پیش کی جاسکتی ہے، تو اہلِ ذوق اور اہلِ نقد دونوں کی نظر میں یہ اصرار بجائے متن کو بہتر شکل میں مرتب کرنے کے اس کی تخریب کا باعث بن جاتا۔

اگر میں یہاں پہ یہ عرض کروں، تو بیجا نہ ہوگا کہ میں نے اس امر کے سمجھنے کی بھی سعی کی ہے کہ میرزا صاحب نے آخری زمانے میں اپنے کلام میں جو اصلاح کی ہے، اس کو خوش ذوقی کے پیمانے سے بھی ناپوں، اگر میری دانست میں ان کی یہ سعی خوب کو خوب تر بنانے والی معلوم ہوئی ہے، تو اسے متن میں رکھا ہے، ورنہ متن کے اندر پرانے لفظوں کو برقرار رکھ کر اختلاف نسخ میں اصلاح کا تذکرہ کردیا ہے۔ بظاہر یہ اصولِ ترتیب وتصحیح سے انحراف ہے، مگر آخر اصول میں کسی قدر لچک بھی تو ہوا کرتی ہے۔

اس کی مثال میں صرف ایک اصلاح کا ذکر کرتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ میرزا صاحب کا مشہور شعر ہے:

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں، گو آئے

نسخۂ رام پور جدید کی نقل پر نظر ثانی کرتے ہوئے میرزا صاحب نے پہلے مصرع کو یوں کردیا:

ہے زلزلہ و صرصر و سیلاب عالم کا

میری دانست میں اس شعر پر یہ ان کی آخری اصلاح ہے۔ مگر مجھے محبوب کے لیے تباہ کاری و بربادی کا یہ نقشہ پسند نہ آیا۔ محبوب کی شوخی طبع اور سیماب مزاجی کے ذکر میں جو لطف ہے، وہ اس کے ظلم وجور کے بیان میں کہاں۔ اس بات کو انھوں نے دوسری جگہ یوں کہا ہے:

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے، تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

اسی لیے میں نے پرانے لفظوں کو متن میں اور آخری الفاظ کو اختلاف نسخ میں جگہ دی ہے، اور متوقع ہوں کہ میرے اصول متعارفہ سے اس انحراف کو خود تبصرہ نگار بھی پسند فرمائیں گے۔

(3)

یہ بات بحث طلب نہیں کہ نسخۂ نظامی کی اصل نسخۂ احمدی ہے، اور نسخۂ احمدی کی اصل کوئی ایسا نسخہ تھا جو غالب کی ملک میں نہ تھا، اور نہ اس وقت تک غالب کو اس کے وجود کا علم تھا جب تک وہ رام پور سے یہاں کے نسخے کی نقل لے کر نہ گئے۔ دہلی والا وہ نسخہ جس سے نسخۂ احمدی چھپا ہے بظاہر حسین مرزا کا نسخہ معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ مسئلہ سر دست بحث طلب نہیں، یہاں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ جس نسخے سے نسخۂ احمدی چھپا تھا، وہ اپنے متن اور ترتیب دونوں کے اعتبار سے دیوان کا آخری ایڈیشن نہ تھا، بلکہ 1847 کا مطبوعہ نسخہ یا اسی کی اصل تھی، جس میں بعد کی کہی ہوئی غزلیں وقتاً فوقتاً بڑھائی جاتی رہی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ نسخۂ احمدی کا متن جہاں کہیں نسخۂ رام پور سے مختلف ہے، وہاں وہ 1847 کے نسخے کے مطابق ہے۔

نسخۂ رام پور کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اسے لفظی، معنوی اور ترتیبی ہر لحاظ سے خوب تر بنانے کی سعی کی تھی، اور اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ 1248ھ والے ایڈیشن کے بعد ان کے دیوان کا وہ ایڈیشن ہے جو انھوں نے خود مرتب کیا تھا، ان دونوں نسخوں کے درمیان کے جتنے نسخے ہیں، وہ ایڈیشن نہیں کہلا سکتے بلکہ وہ پچھلے ایڈیشن کا گویا ری پرنٹ ہیں جن میں نئی غزلیں اضافہ کر دی گئی ہیں۔

ذیل میں نسخۂ رام پور کی خصوصیات پیش کرتا ہوں، اس سے اندازہ کیا جا سکے گا کہ یہ نسخہ صحیح معنی میں آخری ایڈیشن ہے اور اس کا پورا حق رکھتا ہے کہ اس کو نئے نسخے کی بنیاد قرار دیا جائے۔

ترتیب اصناف سخن

غالب نے 1248ھ (1833) میں جب موجودہ انتخاب مرتب کیا تو اس کے اندر اصناف کلام کی ترتیب یہ رکھی: غزلیات، قصائد، قطعہ، رباعیات، جب 1841 میں پہلی بار دیوان کی طباعت ہوئی، تو اس میں بھی یہی ترتیب رہی، یہی ترتیب احمدی اور اس کی نقل نظامی کی بھی ہے اور اسی کو آج تک سب مطبوعہ نسخوں میں برقرار رکھا گیا ہے۔

اس کے برخلاف نسخۂ رام پور میں اس ترتیب کو بدل کر یوں کر دیا گیا: قطعات، مثنوی، قصائد، غزلیات، رباعیات یہ ترتیب ان کے کلیاتِ فارسی کے مطابق اور اردو کے سب پچھلے مخطوطوں اور مطبوعہ نسخوں کے خلاف ہے۔ صرف منشی شیونراین کا مطبوعہ نسخہ اس سے اس لیے مستثنیٰ ہے کہ وہ اس نسخۂ رام پور کی نقل ہے۔

اب یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ دیوان اردو کی ترتیب دو بار ہوئی: پہلے 1248ھ (1833) میں اور دوسری بار 1271ھ (1855) میں، اور 1271ھ کی ترتیب زمانے کے لحاظ سے متاخر ہونے کے ساتھ ان کے فارسی دیوان کی ترتیب ہی نہیں، بلکہ رواج عام کے بھی مطابق ہے، اس لیے وہی اس کی مستحق ہے کہ کسی تحقیقی ایڈیشن میں اختیار کی جائے۔

چونکہ آخر زمانے میں غالب بہت شکستہ خاطر اور بیمار رہنے لگے تھے، اس لیے نسخۂ احمدی کی طباعت کے وقت ان کا اس کی پرانی ترتیب کو نہ بدلنا ان کی آخری تجویز نہیں کہلا سکتا۔ یہ صرف حالات کے دباؤ کے تحت پیش آمدہ سہل انگاری ہے اور بس۔

طریقِ املا

نسخۂ رام پور جس کاتب کا لکھا ہوا ہے، مرزا صاحب کے فارسی اور اردو مصنفات کے عمومی کاتب وہی صاحب ہیں۔ چنانچہ رضا لائبریری میں ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تین فارسی دیوان موجود ہیں۔ انھوں نے دیوانِ اردو کی بھی ایک سے زائد نقلیں مختلف زمانوں میں تیار کی تھیں۔ چنانچہ تقسیم ہند سے پہلے ایک نسخہ خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی کے پاس خود میں نے دیکھا تھا، ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں محفوظ ہے۔ اگر یہ وہی خواجہ صاحب کا نسخہ نہیں ہے، تو اس کا یہ مطلب ہے کہ میں اس کاتب کے قلم کے تین دیوان اردو دیکھ چکا ہوں۔ لاہور کے نسخے کا عکس رضا لائبریری رامپور کے لیے حاصل کر لیا گیا تھا، اور جو نسخۂ عرشی کی تیاری کے وقت میرے سامنے تھا۔

مدعا یہ ہے کہ میں نے دیوانِ غالب کے جتنے نسخے دیکھے ہیں، خواہ وہ قلمی تھے یا مطبوعہ، ان سب سے نسخۂ رام پور املائی اعتبار سے برتر ہے۔ اس میں کاتب نے الفاظ کی کتابت چند خصوصیتوں کو نظر میں رکھ کر کی ہے، اور جیسا کہ آئندہ ظاہر ہوگا، وہ خصوصیات ایسی ہیں کہ ان کے ہوتے نسخۂ مذکور کو دوسرے نسخوں کے مقابلے میں ترقی یافتہ یا خوب تر کہنا چاہیے۔ مثلاً:

1. لفظ ''ایک'' کی ی جہاں پڑھنے میں نہیں آتی، وہاں ''ی'' کا شوشہ تو لکھا گیا ہے، مگر نقطے اڑا دیئے گئے ہیں، اور اس کی کتابت یوں کی ہے ''اںک''
2. الفاظ ''میری'' اور ''تیری'' اور ''میرا'' اور ''تیرا'' کی ''ی'' جہاں ملفوظی نہیں ہے، وہ بھی بدون نقاط لکھی گئی ہے۔
3. ہای مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ کی جمع جب ''ھا'' سے بنائی ہے، تو پہلی ''ہ'' بالالتزام لکھی ہے، اور اگر کسی جگہ کاتب سے سہو ہوا ہے، تو غالب نے اپنے قلم سے اس غلطی کی اصلاح کر دی ہے۔ چنانچہ اس نسخے میں خندہ ھا، بادہ ھا، میوہ ھا وغیرہ ملے گا، جب کہ دوسرے نسخوں میں اس کی خلاف ورزی بھی نظر آئے گی۔
4. نسخۂ احمدی اور نسخۂ نظامی میں لفظ ''تھمے'' کو ''تھنبے'' اور ''تھنبھے'' لکھا گیا ہے۔ یہ دونوں شکلیں ''تھمے'' کے مقابلے میں پس ماندہ ہیں۔
5. غالب کی ادھیڑ عمر تک دلی والے ''کسو'' بولتے تھے۔ انھوں نے بھی جگہ جگہ یہی لفظ استعمال کیا اور لکھوایا تھا، بعد ازاں اس کی شکل ''کسی'' مروج ہوگئی، تو انھوں نے بھی ''کسو'' کو ترک کر دیا، اور اس ترک کے بعد نہ خود لکھا نہ اپنے یہاں لکھنے دیا۔

احمدی کی اصل میں یہ لفظ اپنی پرانی شکل کے ساتھ لکھا ہوا تھا، اس لیے اُس میں ''کسو'' ہی چھپا۔ اس پر مرزا صاحب کو خاتمۃ الطبع میں لکھنا پڑا کہ یہ اب میری بولی نہیں ہے، اس لیے جہاں کہیں قافیے میں ہو اسے چھوڑ کر ہر جگہ ''کسی'' بنا لیا جائے۔

نسخۂ رام پور میں بالالتزام ہر جگہ ''کسی'' لکھا گیا ہے اور اگر کسی جگہ کاتب نے ازراہِ سہو پرانا املا لکھ دیا تھا، تو غالب نے اپنے قلم سے اُسے درست کر دیا ہے۔

6. لفظ ''دونوں'' کا املا نسخہ ہای احمدی و نظامی میں ''دونو'' ہے، جو غلط ہے، اور نسخۂ رام پور میں بھی یونہی تھا۔ غالب نے اپنے قلم سے آخر میں نون بڑھایا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نسخۂ احمدی کی اصل کا املا غالب کا پسندیدہ نہ تھا اس لیے انھوں نے اپنے قلم سے درست کرنا ضروری جانا۔
7. یہی صورت لفظ ''پانو'' کے املا کی ہے کہ احمدی اور نظامی نسخوں میں اسے ''پانوں'' لکھا ہے جو غالب کی رائے میں غلط ہے اور اسی لیے انھوں نے ''پانو'' ردیف کی غزل کو حرف الواو میں درج کیا ہے۔

8. یہاں لفظ ''ماہتاب'' کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے جو اس شعر میں آیا ہے:

غالب، چھٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

یہ لفظ احمدی و نظامی میں اسی طرح ملا کر لکھا گیا ہے، نسخۂ رام پور کے کاتب نے بھی اسے یونہی مرکب لکھا تھا مگر غالب نے خود اسے ''ماہ تاب'' بنایا۔ ارباب علم ان دونوں لفظوں کے فرق سے واقف ہیں۔ اس لیے وہ یہ تسلیم کریں گے کہ غالب نے اس شعر میں ماہتاب کو ''ماہ تاب'' بنا کر املائی اصلاح ہی کی ہے۔

9. اسی طرح ''ہ'' پر ختم ہونے والے لفظ کو محرف ہونے کی حالت میں احمدی و نظامی نسخوں میں بالعموم ''ہ'' کے ساتھ ہی لکھا ہے۔ مگر نسخۂ رام پور میں ان کے برخلاف مذکورہ حالت میں ''ہ'' کو ''ی'' سے بدل دیا ہے، اور اگر کہیں اس کے خلاف نظر آتا ہے، تو وہ بالیقین سہو کاتب ہے۔

10. احمدی و نظامی نسخوں میں ہے ''مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا'' لفظ ''خرچ'' کی اصل ''خرج'' ہے، جو عربی زبان کا ایک لفظ ہے اور جیم کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ غالب نے اسے بحالت ترکیب چ سے لکھنا نادرست جانا، اور اس لیے نسخۂ رام پور میں اسے ''جمع و خرج'' لکھوایا۔

ترمیمیں

سابق سطور میں ایسی بہت سی ترمیمیں گزر چکی ہیں، جو ثابت کرتی ہیں کہ نسخۂ رام پور آخری ایڈیشن ہے۔ ذیل میں دو چار اور ایسی ترمیمات پیش کرتا ہوں جو اسی نسخے کے ساتھ مخصوص ہیں، مثلاً:

1. احمدی اور نظامی نسخوں میں ہے: شایان دست و بازوی قاتل نہیں رہا۔ نسخۂ رام پور میں ''بازو'' کی جگہ ''خنجر'' رکھا گیا ہے۔
2. مذکورہ نسخوں میں ہے: ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں، کھاویں گے کیا۔ نسخۂ رام پور میں ''رہیں'' کی جگہ ''رہے'' لکھا گیا ہے۔
3. مذکورہ نسخوں میں ہے: وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں۔ نسخۂ رام پور میں ''کہ

کہتے تھے“ کی جگہ ”جو کہتے تھے“ ہے۔

4. مذکورہ نسخوں میں ہے: سوزش باطن کے ہیں احباب فکر، ورنہ پان۔ نسخۂ رام پور میں ”سوزش“ کی جگہ ”شورش“ ہے۔

5. مذکورہ نسخوں میں ہے: ”شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے“۔ نسخۂ رام پور میں ’نہ ہووے‘ کی جگہ ”نہ رہوے“ ہے۔

6. مذکورہ نسخوں میں ہے: ”تب چاک گریباں کا مزہ ہے، دل نالاں۔“ نسخۂ رام پور میں ”نالاں“ کی جگہ ”ناداں“ ہے۔

7. مذکورہ نسخوں میں ہے: ”کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آجاے رحم“۔ نسخۂ رام پور میں ”کہ اس کو“ کی جگہ ”جو اس کو“ ہے۔

8. مذکورہ نسخوں میں ہے: ”ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق“۔ نسخۂ رام پور میں ”منھ پر رونق“ کی جگہ ”رونق منہ پر“ ہے۔

9. مذکورہ نسخوں میں ہے۔ ”وہ بدخو اور میری داستان عشق طولانی“۔ نسخہ رام پور میں ”داستان عشق“ کی جگہ ”داستان شوق“ ہے۔

10. مذکورہ نسخوں میں ہے ”باغِ معنی کی دکھاوں گا بہار“۔ نسخۂ رام پور میں ”دکھاووں گا“ کی جگہ ”دکھاؤں گا“ ہے۔

ان ترجموں میں سے اکثر کے بارے میں اہلِ ذوق کو یہ ماننا پڑے گا کہ دیوان کے لفظی یا معنوی حسن میں انھوں نے بالیقین اضافہ کیا ہے، اور اس لیے آئندہ ایڈیشنوں میں انھیں کو غالب کی آخری قرأت کے طور پر برقرار رکھنا چاہیے۔

O

غالب کا خود نقل کردہ نسخۂ دیوان اردو

غالب کی یہ انتہائی خوش قسمتی ہے کہ انتقال پر سو برس گزر جانے کے باوجود ہر سال اس کے یا اس کے کلام کے بارے میں ہماری، معلومات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

ابھی کچھ دن پہلے تک غالب دوستوں کا علم یہ تھا کہ دیوانِ غالب اردو کا سب سے پرانا مخطوطہ وہ ہے جو ریاست بھوپال کے سرکاری کتاب خانہ میں دستیاب ہوا اور مفتی انوار الحق مرحوم کی تصحیح و ترتیب کے ساتھ 1921 میں چھاپ کر شائع کیا گیا تھا۔ اس کی کتاب حافظ معین الدین خوشنویس نے 5 صفر 1227ھ (یکم نومبر 1821) کو انجام کو پہنچائی تھی۔

غالب کی اپنی تحریروں کے مطابق وہ رجب 1212ھ[1] (دسمبر 1797) میں پیدا ہوئے تھے، اس حساب سے نسخۂ بھوپال میں جو کلام مندرج ہوا وہ ان کی تقریباً 24 برس کی عمر تک کا کہا ہوا تھا، چونکہ اس نسخے میں تصحیح، ترمیم اور حذف و اضافہ اشعار و غزلیات کا عمل جا بہ جا کیا گیا تھا، اس لیے اس کی اہمیت بہت تھی۔ میں نے جنوری 44ء میں ناگوپر سے واپسی پر دو روز بھوپال میں قیام کر کے اس کے نوٹ لیے تھے، جن کا حوالہ نسخۂ عرشی میں موجود ہے اور جن کی بنیاد پر میں ایک مضمون بھی لکھ چکا ہوں۔

غالب کاروں کی بدقسمتی کہ ریاست کے مرجر کے زمانے میں یہ جوہر نایاب گم ہو گیا۔ انّا للہ۔

---

1. یہاں ضمناً یہ عرض کرتا چلوں کہ مرزا صاحب نے اپنی تاریخ پیدائش یکشنبہ 8 رجب 1212 بتائی ہے۔ نیز کلیات فارسی میں شائع شدہ زائچے میں اسے آغاز 1898 کے مطابق کہا ہے، از روئے حساب نہ تو 8 رجب کو یکشنبہ پڑتا ہے، اور نہ یہ تاریخ آغاز 1898 کے مطابق ہوتی ہے۔ مختلف اہل علم نے اس بارے میں مختلف توجیہیں کی ہیں، میری دانست میں مرزا صاحب کی تاریخِ پیدائش ہشتم بلکہ ہژدہم رجب ہے۔ اس تاریخ کو یکشنبہ بھی تھا اور یہ 7 جنوری 1898 کے مطابق ہوتی ہے، جو بقولِ غالب آغاز سال قرار دیا جا سکتا ہے۔

آج کل، جولائی 1969

اہلِ علم کا خیال تھا کہ مذکورہ نسخہ پہلا مردف دیوان ہے، جو غالب نے اپنی ابتدائی بیاض سے مرتب کیا۔ چنانچہ عمدہ منتخبہ وغیرہ کے ان شعروں کے بارے میں جو اس نسخے میں نہ تھے یہ گمان کیا گیا یا نسخۂ مذکور میں انھیں شامل نہیں کیا گیا اور یا اس کے ترتیب کے بعد کہے گئے تھے۔

چند دن ہوئے امروہہ کے ایک نوادر فروش توفیق احمد صاحب قادری چشتی کو کہیں سے دیوانِ غالب کا اس سے بھی زیادہ نادر اور اہم نسخہ دستیاب ہوا ہے۔ اس نسخے میں 63 ورق ہیں۔ غزلوں کا اندراج بیشتر ترچھا بیاض نما ہے۔ مکتوبہ حصے کا طول 4ء6 اور عرض 2ء4 انچ ہے۔ اگر حاشیے کو بھی ناپ میں شامل کر لیا جائے، تو طول 9 انچ اور عرض 2ء6 انچ ہے، ابھی حال میں اکبر علی خاں سلمہ نے اس مخطوطہ کا نسخۂ حمیدیہ سے مقابلہ کرنے سے پہلے نئی جلد بندی کرائی اور نیا حوضہ ڈلوایا اس طرح یہ مخطوطہ زیادہ محفوظ ہو گیا چنانچہ نئی جلد بندی کے باعث طول 5ء12 انچ اور عرض 7ء9 انچ ہو گیا ہے، اس میں غزلوں کی تعداد 254 ہے۔ ان میں سے 240 متن میں مندرج ہیں۔ اردو رباعیاں گیارہ ہیں، مگر خدا جانے کیوں، 13 فارسی رباعیاں بھی اُردو رباعیوں سے قبل تحریر کر دی ہیں۔

غزلوں میں سے 20 غیر مطبوعہ ہیں۔ ان میں سے کچھ پر خط تنسیخ کھینچ دیا گیا ہے، جو اس کی علامت ہے کہ اس سے جو نسخہ نقل کیا جائے، اس میں یہ غزلیں شامل نہ ہوں، مگر ایک قلمزد غزل آئندہ نقل ہوئی ہے۔ نسخہ زیر بحث میں مطبوعہ غزلوں کے کچھ نئے شعر بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ بارہ فارسی رباعیاں ہیں، جو کلیات نظم فارسی کے کسی قلمی یا مطبوعہ نسخے میں موجود نہیں۔ ان میں اس انداز کی بھی ہیں:

گفتم کہ اسد، گفت: دلِ آشفتۂ من   گفتم: نفسش، گفت، بخونِ خفتۂ من
گفتم سخنش بایں نزاکت گفتن   گفت: این ہمہ مدعائے ما گفتہ من

مرد آن کہ بوہم خود ہراساں نبود   دربند طلسم نفع و نقصان نبود
ہمواری وضع را تغافل شرط است   اے مدعیان، کریم نے مدن نبود

یہ اُردو رباعیاں پہلی بار اس نسخے سے غالب دوستوں کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں:

بے گریہ کمال تر جبینی ہے مجھے   در بزمِ وفا خجل نشینی ہے مجھے

محروم صدا رہا بغیر ازیک بار ابریشم ساز موئے چینی ہے مجھے

گلخن شرر اہتمام بستر ہے آج یعنی تب عشق شعلہ پرور ہے آج
ہوں درد ہلاک نامہ بر سے بیمار قارورہ مرا خونِ کبوتر ہے آج

جن غزلوں کو متروک قرار دے دیا ہے، ان کے چیدہ چیدہ شعر ملاحظہ کیجیے:

تنک ظرفوں کا رتبہ جہد سے بڑھ کر نہیں ہوتا حباب مے بصد بالیدنی ساغر نہیں ہوتا
نہ رکھ چشم حصولِ نفع صحبتہائے مُمسک سے لب خشکِ صدف آب گہر سے تر نہیں ہوتا

عمر بھر ہوش نہ یک جا ہوے میرے کہ اسدؔ میں پرستندۂ روئے صنمِ چند رہا

عیاں کیفیتِ میخانہ ہے جوئے گلستاں میں کہ مے عکسِ شفق ہے، اور ساغر ہے حباب اُس کا

کہاں ہے دیدۂ روشن کہ دیکھے بے حجابانہ نقاب یار ہے از پردہ ہائے چشم نابینا

آتی نہیں نیند اے شب تار افسانۂ زلف یار سر کر

پریشانی اسد درپردہ ہے سامان جمعیت کہ ہے آبادی صحرا ہجوم خانہ بردوشاں

چمن دہر میں ہوں سبزۂ بیگانہ اسد واے اے بیخودی و تہمت آرامیدن

رہنے دو گرفتار بزندانِ خموشی چھیڑو نہ مجھ افسردۂ دز دیدہ نفس کو

اشک چکیدہ رنگ پریدہ ہر طرح ہوں میں ازخود رمیدہ
جوشِ جنوں سے جوں کسوتِ گل سر تا بپا ہوں جیب دریدہ
یارو، اسد کا نام و نشاں کیا بیدل فقیر آفت رسیدہ

کرے کیا دعویٰ آزادیِ عشق گرفتارِ الم ہائے زمانہ
دیکھ اے اسد بریدہ، باطن کہ ظاہرا ہر ایک ذرّہ غیرتِ صد آفتاب ہے

پے یہ مقصد بردنی ہے خضر مے سے، اے اسد جادۂ منزل ہے خط ساغرِ گل کے تلے

دیکھا نہیں ہے ہم نے یہ عشقِ بتاں، اسؔد غیر از شکستہ حالی و حسرت کشیدگی

تماشائے جہاں مفت نظر ہے کہ یہ گلزار باغ رہ گزر ہے
ہوئی یک عمر صرف مشق نالہ اثر موقوف بر عمرِ دگر ہے

اس بیان سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ نو دریافت نسخہ از روے زمانہ نسخۂ حمیدیہ سے مقدم ہے، اس دعوے کا مزید ثبوت یہ ہے کہ جو غزلیں نسخۂ مذکور اور حمیدیہ میں مشترک ہیں، اُن کے مختلف شعروں کا متن زیر بحث نسخے میں پہلے اور تھا، بعد میں مرزا صاحب نے ترمیم کر دی۔ حمیدیہ میں وہ شعر ان ترمیم شدہ الفاظ کے ساتھ لکھ گئے ہیں، مثلاً:

(1) حمیدیہ میں ہے:

مرے دل نے مرے تارِ نفس سے غالب
ساز پہ رشتۂ پئے نغمۂ بیدل باندھا

نو دریافت نسخے میں مصرع اوّل پہلے یوں تھا:

''وہ نفس ہوں کہ اسد زمزمہ فرصتِ نے''

پھر اسے قلم زد کر کے دوسرے مصرع کے نیچے لکھا، ''وہ نفس ہوں کہ اسؔد مطربِ دل نے مجھ سے'' حمیدیہ کا مصرع ان دونوں کی اصلاح کے بعد کہا گیا ہے، بہر حال دوسرا مصرع نسخہ مذکور میں پہلے اس طرح تھا: رشتہ بر ساز پئے نغمۂ بیدل باندھا'' بعد ازاں اسے حمیدیہ کے مصرع ثانی کے مطابق کر دیا، جب کہ حمیدیہ میں متن اوّل نہیں، متن ثانی ہے تو اس کا مطلب نکلتا ہے کہ حمیدیہ کا متن بعد کا ہے۔

(2) حمیدیہ کا شعر ہے:

اسیرِ بے زباں ہوں، کاش کے صیادِ بے پروا
بدام جوہرِ آئینہ ہو جائے شکار اپنا

موجودہ نسخے میں پہلے مصرع اوّل یوں تھا:

''گرفتارانِ اُلفت بیزباں ہیں کاش صیادے'' پھر اسے قلمزد کر کے حاشیے پر لکھا ہے، ''اسیرِ بے زبانی ہوئی مگر صیاد بے پروا'' اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ حمیدیہ میں تبارہ اصلاح ہوئی ہے۔

(3) حمیدیہ میں ہے:

تمنائے زباں کو سپاس بیزبانی ہے
تھا جس سے تقاضا شکوۂ بیدست، پانی کا

نسخۂ امروہہ میں پہلے ''بیزبانی ہا'' تھا۔ اسے کاٹ کر ''بے زبانی ہے'' بنایا ہے دوسرے مصرع میں موجودہ نسخے کے اندر ''مٹا'' کی جگہ ''گیا ہے'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بعد کی اصلاح ہے۔

(4) حمیدیہ میں ہے:

اُگے اک پنبۂ روزن سے بھی چشم سفید آخر
حیا کو انتظارِ جلوہ ریزی کے نگیں پایا

نسخہ نو دریافت میں پہلے یوں تھا ''اُگے چشم سفید از پنبۂ روزن، تماشا ہے'' پھر آخری الفاظ قلمزد کر کے جو متن قرار دیا۔ حمیدیہ میں وہی نقل ہوا ہے۔

(5) حمیدیہ میں ہے:

لکھی یاروں کی بدمستی نے میخانے کی پامالی
ہوئی قطرہ فشانی ہائے سے یارانِ سنگ آخر

نسخۂ مذکور میں مصرع اوّل پہلے یوں تھا:

''زبدمستی مینوشاں ہوا ویرانہ مے خانہ''

اسے قلمزد کر کے حاشیے پر وہ مصرع لکھا ہے جو حمیدیہ کے متن میں ہے:

اس نسخے کے حمیدیہ سے اقدم ہونے کی ایک اور دلیل ہے کہ اس کی ہر غزل میں اسد تخلص لکھا گیا ہے۔ غالب تخلص کی کوئی ایک غزل بھی متن کے اندر نظر نہیں آتی۔ اس کے برخلاف حمیدیہ میں دونوں تخلص استعمال ہوئے ہیں۔ ہاں اس نسخے کے کچھ مقطعوں میں میرزا صاحب نے اصلاح کر کے بجائے اسؔد کے غالب تخلص ڈالا ہے، حمیدیہ میں یہ مقطعے غالب

تخلص کے ساتھ نقل ہوئے ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ حمیدیہ عمر میں چھوٹا ہے، مثلاً:

(1) نسخۂ مذکور میں پہلے تھا:

شمع ہوں تو بزم میں جا پاؤں مانند اسؔد
بے محل، اے مجلس آرائے نجف جلتا ہوں میں

بعدازاں مانند اسؔد کو قلم زد کر کے اوپر لکھا: ''غالب کی طرح''۔ حمیدیہ میں یہ آخری شکل ملتی ہے۔

(2) نسخۂ مذکور میں پہلے تھا:

جنونِ فرقتِ یارانِ خستہ ہے کہ اسؔد
بہ رنگِ دشت دل پرغبار رکھتے ہیں

بعدازاں ''کہ اسد'' کی جگہ غالب بنا دیا۔ حمیدیہ میں غالب ہی ہے۔

(3) نسخۂ مذکور میں پہلے تھا:

اسد وہ گل کرے جس گلستاں میں فرمائی
چٹخنا غنچہ، گل کا صدائے خندۂ دل ہے

اس کے بعد پہلے مصرع کو قلم زد کر کے حاشیے پر لکھا ہے۔

''وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب''

حمیدیہ میں یہی مصرع نقل ہوا۔

(4) مذکورہ نسخے میں پہلے تھا:

وہ دیکھ کے حسن اپنا ہوتا ہے اسؔد مغرور
صد جلوۂ آئینہ یک صبح جدائی ہے

پھر ''اسد مغرور'' کو قلم زد کر کے بین السطور میں لکھا: اپنا مغرور ہوا غالب۔ حمیدیہ میں یہی الفاظ ملتے ہیں۔

(5) نسخۂ مذکور میں تھا:

''اسد، اس فصل میں کوتاہی نشو و نما سمجھو
اگر گل بہ قد شمشاد پیراہن نہ ہوجائے

پھر اس کو یوں کر دیا:

سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما غالب
اگر گل سرو کی قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

اوپر جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس کے پڑھنے والوں کو یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ نسخۂ مذکور زمانے کے لحاظ سے حمیدیہ سے پرانا ہے اور یہ کہ اس میں غالب کی ترمیمیں بھی ہیں۔ جس کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ یہ خود شاعر کا نسخہ ہے یہاں دو مجھے دلچسپ باتیں کہنا ہیں:

پہلی یہ کہ برخلاف حمیدیہ اس نسخے کی تمام اصلاحیں بالیقین غالب کے معروف خط میں خود اپنے ہاتھ کی ہیں، دوسری بات یہ کہ نہ صرف اس کی ترمیمیں اور اصلاحیں بلکہ پورا نسخہ شاعر کے قلم کا نوشتہ ہے، چنانچہ نسخے کے آخر میں حسب ذیل عبارت ملتی ہے:

''بتاریخ چہار دہم رجب المرجب یوم سہ شنبہ سنہ ہجری وقت دو پہر روز باقی
ماندہ فقیر بیدل اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ متخلص بہ اسد عفی عنہ از تحریر
دیوان حسرت عنوان خود فراغت یافتہ بہ فکر کاوش مضامین دیگر رجوع بجناب
روح میرزا علیہ الرحمۃ آوردفقط۔''

اس عبارت سے صراحت کے ساتھ معلوم ہو جاتا ہے کہ نسخہ زیر بحث کا کاتب خود غالب ہے اور یہ ایسا شرف ہے جو اس کے قلمی نسخہ ہائے دیوان میں سے کسی کو بھی حاصل نہیں ہوا۔

اس خاتمے کے اوپر لفظ سنہ کے اوپر ہند سے لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ غالب نے ایسا کیوں کیا، اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی، الا یہ کہ کتاب ختم کرتے وقت سرخوشی کے عالم میں ہوں، اور سنہ یاد نہ رہا ہو، بہر حال انھوں نے دن تاریخ اور ماہ کی صراحت کر دی ہے کہ منگل کے دن 14 رجب کو اس کام سے فراغت پائی۔ ہمارے علم میں یہ تو آچکا ہے کہ یہ نسخہ صفر 1237ھ (1841) سے پہلے کا ہے، جو حمیدیہ کی تاریخ کتابت ہے۔ خود اس دیوان کے ورق 41الف کے بائیں حاشیے میں بخط غالب تحریر ہے۔ ''لعل خاں بتاریخ اول صفر 1225ھ۔ درمایہ 8 آنہ۔'' اس تحریر سے جہاں ان کی جوانی کے ایک ملازم کا نام اور تنخواہ کا علم ہوتا ہے، وہاں یہ بھی یقین ہو جاتا ہے کہ دیوان مذکور یکم صفر 1235ھ سے پہلے کا مکتوبہ ہے۔ جنتری بتاتی ہے کہ سنہ سے چار برس پہلے 1231ھ میں منگل کے دن رجب کی 14 تاریخ تھی، لہٰذا ہم باطمینان یہ کہہ سکتے ہیں کہ نسخہ مذکور میرزا صاحب نے منگل 14 رجب 1231ھ کو تمام کیا، جو 11 جون 1816 کے مطابق ہے۔

یہ بات اوپر بیان کی جا چکی ہے کہ میرزا صاحب رجب 1212ھ میں پیدا ہوئے تھے اور اس دیوان کے اہتمام کے وقت ان کی عمر قمری حساب سے 19 برس کی ہوگی۔ دیوان کی غزلوں کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اتنی کم عمری میں خاصے مقامات پر شاعر کا تخیل کتنا گہرا اور طرز ادا کتنی دلآویز اور پختہ ہے۔ اگر حمیدیہ گم نہ ہوا ہوتا تب بھی یہ نسخہ اس لیے قابل قدر تسلیم کیا جاتا کہ یہ اقدم بھی تھا اور خود بقلم شاعر بھی، لیکن اب تو صرف یہی نسخہ ہے جو ہر لحاظ سے بے بہا اور نایاب ہے۔



دیوانِ غالب نسخۂ بدایوں — ایک نادر مخطوطہ

پہلے تو یہ بتادوں کہ یہ موتی جناب احید الدین نظامی صاحب مالک نظامی پریس، بدایوں کی دریافت ہے اور موصوف صاحبزادے ہیں جناب مولانا نظام الدین حسین نظامی مرحوم کے، جنھوں نے دیوان غالب اردو سادہ و باشرح کے متعدد بہترین نسخے شائع فرما کر ملک پر بہت بڑا ادبی احسان کیا تھا۔ سب سے پہلے آپ ہی نے غالب کے اردو دیوان کے فارسی دیباچے کی تاریخ ایک رام پوری نسخے کی مدد[1] سے 1248ھ متعین کی تھی۔ یہ نسخہ احمد علی شوق قدوائی کے پاس تھا۔ نامی پریس کان پور کے حسنِ طباعت کا جو اعلیٰ معیار آپ نے قائم کیا تھا وہ آج بھی قابل داد و ستائش ہے۔

دیوان غالب کا یہ نسخہ جسے میں آئندہ نسخۂ بدایوں کے نام سے پکاروں گا، 1ء1x8ء5 انچ ناپ کا ہے۔ روشنائی کالی عنوان اور جدول شنجرفی اور باریکا لاجوردی ہے۔ کاغذ بانس کا دیسی بنا ہوا ہے۔ ہر ورق میں رکاب بھی ہے اور ورق داغ بھی۔ خط شکست آمیز نستعلیق ہے۔ معمولی کرم خوردگی بھی پائی جاتی ہے۔ جلد پرانی مگر عام حالت اچھی ہے۔

سرورق پر مہر ہے جس میں ''محمد ذوالفقار الدین 1252ھ کندہ ہے۔ ورق 1۔ الف پر ''قصیدۂ فارسی در مدح شاہزادہ سلیم'' شروع ہوتا ہے اور ورق 2۔ ب پر ختم ہوا ہے۔ قصیدے کے 55 شعر ہیں اور مطلع حسب ذیل ہے:

دریں زمانہ کہ کلک رصد نگار حکیم
ہزار و دو صد و پنجاہ راند در تقویم

---

1. ملاحظہ ہو غالب (اردو) از ڈاکٹر سید عبداللطیف حیدرآبادی، مترجمہ سید معین الدین قریشی طبع 1932، ص 135

نیا دور، 26 جنوری 1971

یہ قصیدہ کلیات غالب فارسی کے تمام مخطوطوں اور مطبوعہ ایڈیشنوں میں موجود ہے لیکن نسخۂ بانکی پور نوشتہ (1254ھ) (1838) نسخۂ مطبوعہ 1261ھ (1845) نسخۂ رام پور (لوہارو کلکشن) مکتوبہ 1264ھ (1848) میں اس کا عنوان ہے ''در مدح عرش آرام گاہ محمد اکبر شاہ بادشاہ طاب ثراہ۔'' ہوسکتا ہے کہ نسخۂ بدایوں کا عنوان خود غالب کا مجوزہ ہو اور وہ اس لیے کہ اس میں شاہ سے پہلے شاہزادے کی مدح کی گئی ہے ورنہ خود شاعر نے مدح شاہزادہ سے پہلے اسی تقدیم کی وجہ ظاہر کردی ہے۔

ورق 3۔ الف پر فارسی کا ایک خط ہے جس کا عنوان ہے ''سواد نامہ کہ بہ نواب اکبر علی خاں نوشتہ شد۔'' یہ خط پنج آہنگ میں چھپ چکا ہے اور وہاں اس کا عنوان ہے ''نامہ بنام نامی نواب سید علی اکبر خاں متولی امام باڑہ ہوگلی بندر (آغاز: آہنگ پنج)

ورق 4۔ اس پر ایک فارسی نظم ہے جو انھوں نے بلی کی ثنا و صفت میں لکھی تھی اس کا پہلا بیت ہے:

دارم بجہاں گربۂ پاکیزہ نہادے

کرمبال پری زاد بود موج رم او

قطعہ 11 اشعار کا ہے اور اس عنوان سے نقل کیا گیا ہے ''دست نوازش بہ پشت گربۂ مسکین فرود آوردن و بلا بہ دلاغ از آزار جاندارش باز داشتن۔'' نسخۂ رام پور 1264ھ میں اسی عنوان کے ساتھ اور دوسرے نسخوں میں بے عنوان موجود ہے۔ تعداد اشعار سب میں نسخۂ بدایوں کے مطابق ہے۔

ورق 5۔ الف سے (جس پر نیا ایک کا ہندسہ ڈالا گیا ہے) لکیر دار لوح کے نیچے دیوان کا آغاز ہوا ہے۔ اوپر سے بائیں کونے میں باریکا کے اندر ''لع ص 59 ورق جز و اوّل دیوان ہندی مرزا اسداللہ خاں غالب'' لکھا ہے اور اس نوٹ کے نیچے مذکورۂ بالا مہر ثبت ہے۔ دیباچۂ دیوان نئے ورق داغ کے مطابق 2۔ الف کے حاشیے پر بھی نقل کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل دیوان کو نقل کرنے کے بعد اسے لکھا گیا تھا۔

اشعار کا آغاز بجائے بسم اللہ کے ''ھواللہ'' سے ہوا ہے اور مضامین کی ترتیب مطابق ذیل ہے:

ردیف			
ردیف	الالف (بدون عنوان)	ورق	5 الف
"	البا الموحدہ "	"	13 ب
"	التاء المثناۃ الفوقانیہ	"	14 الف
"	الجیم المعجمہ التازیہ	"	15 الف
"	جیم فارسی	"	15 الف
"	الدال المہملہ	"	15 ب
"	الراء المعجمہ	"	16 الف
"	السین المہملہ	"	19 الف
"	السین المعجمہ	"	19 ب
"	الفا	"	20 الف
"	الکاف التازیہ	"	20 الف
"	کاف فارسی	"	21 الف
"	اللام	"	21 الف
"	المیم	"	21 ب
"	النون	"	22 الف
"	الواو	"	28 الف
"	الھا	"	29 ب
"	الیا	"	29 ب

اس کے بعد ورق 52 ب کالم میں لکھا ہے ''تمام شد دیوان ریختہ۔'' کالم 2 سے قصائد شروع ہوئے ہیں۔ پہلا قصیدہ ہے ''ساز یک ذرہ نہیں ساز چمن سے بیکار۔'' اس کا عنوان ہے ''منتخب قصیدہ منقبت حضرت مرتضیٰ علی علیہ السلام۔ ورق 53 الف کالم 2 سے دوسرا قصیدہ بہ عنوان ''انتخاب قصیدہ منقبت حضرت مرتضیٰ علی علیہ السلام'' شروع ہو کر 54 ب پر ختم ہوا ہے۔ اس کا مطلع ''دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں'' حاشیے پر مندرج ہے۔ یہی صورت رامپور کے پرانے قلمی نسخے کی بھی ہے کہ اس میں یہ مطلع سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ میں نے اپنے قلم سے حاشیے پر اضافہ کر دیا ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسے نسخۂ بدایوں کی ترتیب کے بعد لکھ کر قصیدے میں بڑھایا گیا تھا۔

ورق 54 ب تا 55 پر ہے ''قطعہ در تمدیح چکنی ڈلی کہ دوستے بر کفِ دست نہادہ از مہربانی دادہ بود۔'' مذکورہ بالا نسخۂ رام پور قدیم میں بھی یہی عنوان ملتا ہے۔

ورق 55 ب سے 56 الف تک رباعیاں ہیں۔ ان کی تعداد 8 ہے۔ 56 ب سادہ ہے، 57 الف سادہ ہے، 57 ب سے 59ب کی سطر 2 تک نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیر و درخشاں شاگرد غالب کی مشہور فارسی تقریظِ دیوان ہے۔

آخر میں 8 ورق پر حکیم مومن خاں مرحوم کا ساقی نامہ ہے جس کا پہلا شعر ہے:

کھولیو ساقی منہ کو سبو کے　　　پیتے ہیں کب سے گھونٹ لہو کے

تعداد اشعار:

اس نسخے کے اشعار کی تفصیل درج ذیل ہے:

غزلیات:	الف	226	ف	2
	ب	12	ک	15
	ت	19	گ	2
	ج	4	ل	9
	چ	6	م	8
	د	9	ن	123
	ر	29	و	29
	ز	20	ہ	3
	س	7	ی	435
	ش	2	——	——
	ع	8	میزان	978
قصائد:				60
قطعات				13
رباعیات				16
			میزان کل	1067

اشعار کی یہ تعداد متن تک محدود ہے۔ کچھ شعر نسخے کے حاشیوں پر بھی لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کی تعداد یہ ہے:

غزلیات	ردیف	الف	4
"	"	نون	4
"	"	واو	9
"	"	ی	9
قصائد			1
قطعات			2
رباعیات			4

1100=1067+33

اس صورت میں متن وحواشی دونوں کی تعداد اشعار 1100 ہوجاتی ہے۔ جیسا کہ میں نے نسخۂ عرشی کے دیباچے میں 83 میں بیان کیا ہے، رام پور کے سب سے پرانے مخطوطۂ دیوان میں اشعار کی تعداد 1067 ہے۔ اس نسخے میں ردیف البا کا یہ شعر موجود نہیں ہے:

شرح ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل
رہبر قطرہ بدریا ہے خوشاموج شراب

چونکہ یہ شعر نسخۂ بھوپال کے حاشیے اور نسخۂ شیرانی کے متن دونوں میں ملتا ہے جو نسخۂ رام پور سے پرانے ہیں، اس لیے اس شعر کو کاتب کے سہو سے محذوف مانا جائے گا اور اس صورت میں نسخۂ رام پور کے اشعار کی کل تعداد 1068 ہوگی۔

لیکن جیسا کہ اوپر کے نقشے سے ظاہر ہوتا ہے، نسخۂ بدایوں کا متن 1067 شعروں پر مشتمل ہے۔ اس سے بظاہر یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ نسخۂ بدایوں، رام پور کے قدیم نسخے سے عمر میں بڑا ہے۔ لیکن واقعہ اس کے برعکس ہے جیسا کہ آئندہ میں واضح کروں گا۔ اس کمی کی وجہ نسخۂ بدایوں کے کاتب کا ایک سہو ہے۔ اس نے ردیف ن کی ایک 4 شعر کی غزل جس کا مطلع ہے:

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

متن میں نہیں لکھی ہے اور غلطی سے آگاہ ہونے کے بعد حاشیے میں اس کا اضافہ کیا ہے۔

اگر یہ 4 شعر متن میں ہوتے تو نسخۂ بدایوں کی تعداد اشعار نون بھی 127 ہو جاتی ہے اور اس اضافے سے کل شعر 1071 تک پہنچ جاتے۔

زمانہ ترتیب:

اس نسخے میں نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیر رخشاں کی لکھی ہوئی فارسی تقریظ بھی پائی جاتی ہے۔تقریظ کا سال تالیف 1254ھ ہے جو مارچ 1838 سے شروع ہوکر 1839 کے مارچ ہی پر ختم ہوتا ہے، متن میں ایسی کوئی نظم موجود نہیں جو اس سال کے بعد لکھی گئی ہو۔لہٰذا یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ اسی سال کا مرتبہ نسخہ ہے۔

آیا یہ وہی اصل نسخہ ہے جو نیر کی تقریظ کے ساتھ پہلی بار تیار ہوا تھا، اس کا جواب میری دانست میں ''نہیں'' ہے کیونکہ اس میں اس قسم کی املائی غلطیاں ہیں جو نیر کو برداشت نہیں کرنا چاہئیں۔لیکن یہ ہے اسی کی نقل اور نقل بھی میری دانست میں میرزا صاحب کے ان دوست نے کرائی تھی جن کے بارے میں انھوں نے اپنے متعدد خطوں میں لکھا ہے کہ وہ میرا کلام جمع کرتے رہتے ہیں یعنی حسین میرزا۔اس خیال کی بنیاد اس مہر پر ہے جو اس میں ثبت ہے اور جس میں ''محمد ذوالفقار الدین 1252ھ'' کندہ ہے کیونکہ حسین میرزا کا بڑا نام یہی تھا۔اس کی تائید حواشی کے مندرجات سے بھی ہوتی ہے، اس طرح کہ یہ نئے نئے شعر وہی حاشیوں پر لکھتا رہے گا جسے مرزا صاحب کے کلام کو جمع کرنے کا شوق ہوگا۔

مذکورۂ بالا امور کے تسلیم کر لینے کے بعد یہ نسخہ تاریخی ترتیب میں نسخۂ رامپور قدیم کے بعد آتا ہے کیونکہ نسخۂ رام پور میں نہ تو نیر کی تقریظ ہے اور نہ اس میں وہ دو نئے اشعار ہیں جو نسخۂ بدایوں کی خصوصیات کے تحت آرہے ہیں۔

خصوصیات:

اس نسخے کی کچھ خصوصیات بھی ہیں، مثلاً:

الف: اس میں پرانے رسم خط کے مطابق اعراب بالحروف کا طریقہ برتا گیا ہے۔چنانچہ دکھا کو دیکھا، منہ کو مونہہ لکھا ہے۔کئی جگہ نے کو نیں (نون غنہ در آخر) بھی لکھا ہے۔گھبرانا کو ایک جگہ گھبڑانا لکھا ہے جو اسی لفظ کا ایک لہجہ ہے۔

ب: اس میں دو شعر تمام دوسرے نسخوں سے زائد ہیں اور وہ یہ ہیں۔آخری شعر مطبوعہ ہے:

اور تو رکھنے کو ہم دہر میں کیا رکھتے تھے
مگر اک شعر میں انداز رسا رکھتے تھے
اس کا یہ حال کہ کوئی نہ ادا سنج ملا
آپ لکھتے تھے ہم اور آپ اٹھا رکھتے تھے
زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

بعد کے نسخوں میں غالب نے صرف مقطع برقرار رکھا اور پہلے دونوں شعر حذف کر دیے۔
جہاں تک شعروں کی خوبی کا تعلق ہے، اپنے اندازِ بیان وطرزِ فکر دونوں کے لحاظ سے یہ رکھنے کے قابل تھے لیکن پھر بھی انھیں کاٹ دینے کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتی کہ ان کی موجودگی مقطع کے مضمون کو محدود کر دیتی ہے اور صرف مقطع شکایت کی تعیین نہ ہونے کے باعث آفاقی و ہمہ گیر رہتا ہے۔

ج: اس نسخے میں تقریباً 33 شعر حاشیوں پر مندرج ہیں جو بظاہر اس کی علامت ہے کہ یہ ترتیب نسخہ کے بعد کہے گئے تھے۔ اس امر واقعی سے جہاں یہ بات مستفاد ہوتی ہے کہ نسخے کا تعلق غالب کے کسی قریبی دوست یا عزیز سے تھا، یہ بھی پتا چل جاتا ہے کہ وہ اشعار تاریخی اعتبار سے کس زمانے سے علاقہ رکھتے ہیں۔ وہ اشعار یہ ہیں:

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں 4 شعر
واں اس کو ہول دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار 2 شعر
دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو 9 شعر
تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا 2 شعر
ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے 3 شعر
لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جادے مجھے 4 شعر
گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری 2 شعر
بھیجی ہے جو مجکو شاہ جمجاہ نے دال 2 شعر
ہیں شہ میں صفات ذوالجلال باہم 2 شعر

ان اشعار میں سے پہلے 6 شعر رام پور کے قدیم نسخے کے متن میں موجود ہیں۔ چونکہ وہ

نسخہ ازروئے تاریخ زیرِنظر نسخے سے پرانا ہے، اس لیے میری دانست میں یہ کاتب نسخہ کا سہو تھا جس کی حاشیے میں تصحیح کر دی گئی ہے۔

ہ: یہ بھی عرض کردوں کہ رامپور کے نسخۂ قدیم کی طرح قصیدے کا یہ مطلع:

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

زیرِنظر نسخے کے متن میں کبھی نہیں ہے بلکہ یہاں حاشیے پر لکھا ہوا ملتا ہے جس سے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ مطلع 1833 اور 1841 کے درمیان کسی وقت لکھا گیا ہے۔

آخر میں غالب کی محولۂ بالا رباعی کی تاریخ کے متعلق اپنی تحقیق بھی عرض کردوں اس کا چوتھا مصرع ہے:

ہے اب کے شب قدر و دوالی باہم

اس مصرعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس سال یہ رباعی لکھی گئی تھی، ہندو مسلم کے یہ تہوار جمع ہو گئے تھے۔ یہ بات مسلم ہے کہ دوالی ہمیشہ کاتک کی آخری کسی تاریخ کو ہوتی ہے جب کہ چاند چھپ چکا ہوتا ہے اور شب قدر عام طور پر رمضان کی 27 تاریخ کو تسلیم کی جاتی ہے۔ ان امور کے پیش نظر علم ہیئت کی مقررہ تاریخوں پر غور کیا جائے تو متعین ہو جاتا ہے کہ ہندو مسلم تقریبوں کا یہ اجتماع 27 رمضان 1257ھ مطابق 28 کاتک سنہ 1889 بکرمی موافق 12 نومبر 1841 کو ہوا تھا۔ لہٰذا یہ رباعی 12 نومبر 1841 کو یا اس سے ایک دو دن پہلے لکھی گئی ہوگی۔

اس نتیجے سے ایک اور نتیجہ بھی نکلتا ہے اور وہ یہ کہ دیوان کا پہلا ایڈیشن اپنے سرورق کے اعتبار سے ''شہر شعبان 1257ھ مطابق ماہ اکتوبر 1841ء کو... چھاپا ہوا'' تھا لیکن اس اشاعت میں مذکورۂ بالا رباعی بھی داخل ہے۔ لہٰذا بجائے ماہ اکتوبر کے 12 نومبر کے بعد چھاپا تمام ہونا چاہیے اور اس صورت میں سرورق کی تاریخ کو آغاز کتابت نسخہ کی تاریخ قرار دینا چاہیے۔ اس آخری خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ سرورق کا نمبر صفحوں کی عددی ترتیب میں شامل ہے، جداگانہ نمبر کے ساتھ نہیں چھپا ہے۔ اگر یہ صفحہ اصل کی کتابت کے بعد لکھا گیا ہوتا تو اپنا جداگانہ نمبر صفحہ بھی رکھتا ہوتا جیسا کہ عموماً ہوا کرتا ہے۔ ان ارباب و وجوہ کی بنا پر نسخۂ بدایوں غالب پر کام کرنے والوں کے لیے دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی۔

○

مجلسِ یادگار غالب کا شائع کردہ دیوانِ غالب

1969 میں پاکستان کے غالب دوستوں نے دیوان غالب کا ایک نسخہ مجلسِ یادگارِ غالب پنجاب یونی ورسٹی، لاہور کی طرف سے شائع کیا تھا۔ اس کی تصحیح و ترتیب کا اہم فریضہ مولانا حامد علی خاں، مدیر موسسہ مطبوعات فرینکلن لاہور نے انجام دیا ہے۔ موصوف نے اپنے ''حرف آغاز'' میں لکھا ہے:

> ''یہ کام شروع کرنے سے پہلے جتنا مشکل نظر آیا تھا، شروع کر دینے کے بعد اس سے دس گنا زیادہ مشکل اور دس گنے زیادہ وقت اور ذمہ داری کا متقاضی نظر آیا کیونکہ قدیم و جدید متداول نسخے سب کے سب باہم دگر بے حد مختلف ثابت ہوئے اور ان میں اغلاط متن اور اختلافِ ترتیبِ غزلیات و اشعار کی وہ ریل پیل نظر آئی کہ سر چکرا گیا۔''

اس کے بعد فرمایا ہے کہ:

> ''عموماً ایک ایک مختلف فیہ شعر اور ایک ایک مختلف فیہ لفظ کی صحت کا فیصلہ کرنے کے لیے بہ نظر احتیاط دس دس پندرہ پندرہ قدیم و جدید نسخوں کا مقابلہ کرنا، اور بسا اوقات شرحوں اور لغت کی مستند کتابوں کا سہارا بھی ڈھونڈنا پڑا۔ یہ کام بڑی احتیاط سے کیا گیا ہے۔''

اس کے بعد تحریر کیا ہے:

> ''پیش نظر نسخے کی امتیازی خصوصیت صحتِ متن، صحت ترتیب اور حسنِ کتابت

1. دستنبو قلمی صفحہ 15 کا حاشیہ، نیز ملاحظہ ہو فرہنگِ غالب مرتبہ عرشی، صفحہ 136

تحریک، غالب نمبر، اپریل 1974

وطباعت ہے۔“

جہاں تک آخری خصوصیت کا تعلق ہے، واقعہ یہ ہے کہ کتاب کو دیکھ کر آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہوتا ہے۔ لیکن صحتِ متن کو جانچیے تو سعدی کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے:

نہ سعدی دریں گل فرو رفت بس
کہ آناں کہ بر روے دریا روند

چنانچہ مصحح نے خود وضاحت کردی ہے کہ ”یہ کہہ دینا مناسب ہے کہ اس نسخے کو بھی باایں ہمہ کاوش و کاہش حرفِ آخر سمجھ لینا بہت بڑا اِدعا ہوگا... البتہ یہ دعویٰ شاید بے جا نہ ہو کہ یہ نسخہ کسی آیندہ محقق متنِ دیوانِ غالب کے لیے ذوق وشوق کا ایک نیا باب ضرور کھول دے گا۔“

چونکہ اس نسخے کی ترتیب نسخۂ نظامی کانپور کے مطابق ہے جو خود غالب کا نسخہ ہے۔ اس لیے اس سے قطعِ نظر کر کے آئندہ صفحات میں اس نسخے کی صحتِ متن کا جائزہ لیا جاتا ہے:

(1) غالب نے دیوان اردو کا دیباچہ فارسی میں لکھا ہے۔ اس کا ایک فقرہ زیرِ نظر نسخے میں یوں چھپا ہے: ”نہ چو بہای سنگروب خوردہ“ مطلّح نے سنگروب پر حاشیہ لکھا ہے: متداول نسخوں میں یہاں لفظ ”ژوپ“ چھپا ہے جو کسی لغات میں نہیں ملا۔ پروفیسر عابدی کا خیال ہے کہ غالب نے سنگ ژوپ کے بجائے سنگ روب لکھا ہوگا۔“

جہاں تک فریضۂ مصحح کا تقاضہ ہے، متن میں وہی لفظ رکھنا چاہیے تھا جو تمام قلمی ومطبوعہ نسخوں میں پایا جاتا ہے۔ حاشیے میں پروفیسر عابدی صاحب کا قیاس درج کردیا جاتا تو مضائقہ نہ تھا۔ رہا لفظ ژوپ تو اگرچہ متداول لغات میں اس کا مذکور نہیں، مگر غالب نے اسے دستنبو میں بھی استعمال کیا ہے، لکھتے ہیں: ”وتوپ از در ژوپ تندر خروش گرد اگر فرو چیدہ در بے آرامی اژروے پاداری آرامیدہ اند۔“ مطبوعہ نسخے کے حاشیے میں اسے حل نہیں کیا ہے۔ مگر جو قلمی نسخہ نواب یوسف علی خاں ناظمؔ کو بھیجا تھا، اس کے حواشی میں مشکل الفاظ کا حل اپنے قلم سے کیا ہے۔ اس حل میں ”ژوپ“ کے معنی ضرب لکھے ہیں۔[1] اس صورت میں دیباچے کے الفاظ ”سنگ ژوپ خوردہ“ کا ترجمہ ہوگا پتھر کی مار کھایا ہوا یا وہ جس پر پتھر کی چوٹ پڑی ہو اور ”سنگ روب خوردہ“ بے معنی فقرہ رہے گا۔

(2) فارسی املا کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ ”الف یا واؤ“ میں سے کسی ایک پر ختم ہونے والا لفظ

1۔ دستنبو قلمی، ص 15 کا حاشیہ۔ نیز ملاحظہ ہو فرہنگ غالب مرتبہ عرشی، ص 136

مضاف یا موصوف ہو تو، اس کے آخر میں علامتِ اضافت وصفت کے بطور حرف یا بڑھاتے ہیں، جیسے سخت جانیہاے تنہائی، یا موے آتشدیدہ اور اگر مضاف یا موصوف کا آخری حرف ہای مختفی ہو، تو حرفِ ہمزہ کا اضافہ کرتے ہیں جیسے سینۂ شمشیر اور جو مضاف یا موصوف کا آخری حرف ''ی'' یا ''ہائے مظہرہ'' ہو، تو دوسرے حروف پر ختم ہونے والے الفاظ کی طرح انھیں مکسور پڑھتے ہیں، جیسے تنگیِ چشم، یا نگہِ ناز۔

اس دیوان میں اس کی خلاف ورزی نظر آتی ہے۔ چنانچہ جوئے شیر، تنگیِ دل، چارہ سازیِ وحشت، تماشائے بہ یک کف برون، ہوائے سیرِ گل قسم کا املا قدم قدم پر نظر آتا ہے۔

مصحح نے دیوان کے اس شعر پر:

تو اور سوئے غیر نظر ہاے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہاے دراز کا (ص11)

یہ حاشیہ لکھا ہے: متن میں ہر جگہ چھوٹی آواز کی 'ے' بلا ہمزہ لکھی گئی ہے۔ مثال کے لیے تیسرے شعر میں ملاحظہ ہو، سوے اور نظر ہاے۔ لیکن لمبی آواز کی ''ے'' میں ہمزہ ہے۔ مثلاً اسی شعر کے دوسرے مصرع میں 'مژہ ہائے'۔''

میری دانست میں یہ حاشیہ یہاں کی جگہ پہلے صفحے پر ہونا چاہیے تھا اور چونکہ چھوٹی آواز اور لمبی آواز کی ی میں املائی فرق مصحح کی جدت تھی۔ اس لیے حاشیے یا مقدمے میں اپنے اس ضابطے کی وضاحت کرنا تھی۔

(3) جن الفاظ کے تلفظ میں پڑھنے والا غلطی کر سکتا ہے، اس پر ضروری حد تک زبر، زیر اور پیش لگانا چاہیے۔ مصحح نے بھی پڑھنے والوں کو تلفظ کی غلطی سے بچانے کے لیے ایسا کیا ہے۔ مگر اس میں افراط سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً باہَر، تُحفہ، اَور، تُجھ لیتا ہُوں، تُم وغیرہ۔ اس افراط حرکت کی ایک توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ کاتبِ نسخہ نے خالی جگہوں کو بھرنے کے لیے ایسا کیا تھا۔ مصحح نے بھی حسنِ کتابت کے پیش نظر اسے قبول کر لیا۔

(4) لفظِ ''ہوا'' کو جو ''ہونا'' کا ماضی ہے، ہر جگہ ''ہوا'' (بضم با اور باضافہ ہمزہ بر واؤ) لکھا ہے۔ اس کے صیغۂ جمع کو ہوئے۔ (ص 15) لکھا ہے۔ یہ دونوں شکلیں محلِ نظر ہیں، اور غالب کے پسندیدہ املا کے تو بہر حال خلاف ہیں۔

(5) اسی طرح اس مصرع میں ''خوں نابہ'' لکھا ہے:

''ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا (ص 14)

حالانکہ صحیح ''خونابہ'' ہے۔ جو خون اور آبہ سے مل کر بنا ہے۔

مصرع: ''ہر بنِ مو سے دم ذکر نہ ٹپکے خوناب'' (ص 21) میں بھی دونوں درست نہیں۔

(6) جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا۔ (ص 25)

پر حاشیہ ہے، ''نسخۂ نظامی'' نیز دوسرے پیش نظر قدیم و جدید نسخوں میں یہاں ''اِس'' کے بجائے ''اُس'' درج ہے۔ ''اس'' کا اشارہ فلک کی طرف ہے — کارفرما محبوب ہے۔''

اس حاشیے کی تعلیم محلِ نظر ہے، کیونکہ نسخۂ نظامی کے علاوہ عہد غالب کے ہر نسخے میں ''اِس'' ہے۔ علاوہ ازیں بصورت موجودہ مصحح کو یہ بتانا چاہیے تھا کہ تصحیح قیاسی ہے ورنہ ماخذ کا ذکر فرماتے۔

(7) نہ بندھے تشنگی ذوق کے مضمون غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا
(ص 26)

اس پر حاشیہ ہے، بعض جدید نسخوں میں یہاں شوق درج ہے۔ مگر غالب ہی کے کلام سے ثبوت ملتا ہے کہ بعض مقامات پر جہاں آج کل ہم شوق استعمال کرتے ہیں، وہاں غالب نے ذوق لکھا۔''

مصحح کا یہ ارشاد بھی قابلِ غور ہے کہ کیونکہ قدیم نسخوں میں ذوق کی جگہ ''شوق'' ہے۔ ''ذوق'' صرف ''نسخۂ احمدی'' میں تھا۔ نظامی اس کی نقل ہے۔ بعد کے نسخے نظامی پر مبنی ہیں۔ لہٰذا احمدی کا لفظ ان میں بھی بار پا گیا۔

(8) منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا
(ص 36)

لفظ اُدھر پر مصحح کا حاشیہ ہے: اکثر نسخوں میں اُدھر کی جگہ اِدھر چھپا ہے، نسخۂ حمیدیہ میں ''پرے'' چھپا ہے۔ شعر کا مفہوم اُدھر یا پرے سے ادا ہوتا ہے۔ اِدھر لکھنے والوں نے اس شعر کی جو شرحیں لکھی ہیں وہ تسلی بخش نہیں ہیں۔ (نسخۂ نظامی: ادھر'')

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ صرف نسخۂ حمیدیہ میں نہیں، بلکہ عہد غالب کے تمام قلمی و

مطبوعہ نسخوں میں ادھر بکسرِ الف ہی ملتا ہے۔ لہٰذا بغیر معتبر سند کے متن میں ایسا تغیر مناسب نہ تھا جس سے مرادِ شاعر ہی بدل جائے۔ رہا نسخۂ حمیدیہ تو وہ اغلاطِ کتابت سے پُر ہے، اس لیے اُس کی قرأت کو شہادت میں پیش کرنا مقبول نہ ہوگا اور نہ یہ بات جائز ہوگی کہ اپنی تسلی کی خاطر غالب کا یقینی لفظ بدل دیا جائے جب کہ خود مصحح نے (ص 63) لکھا ہے کہ اپنی پسند غالب کے کلام کو عمداً بدل ڈالنے کا حق ہمیں نہیں دیتی۔

ذیل میں پروفیسر شاداں بلگرامی کی شرح (ص 186) میں سے اس شعر کا مطلب لکھتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں: ''انسان اشرف المخلوقات ہے اور اُس کا پایہ عرش سے بھی بلند ہے۔ لہٰذا جنابِ غالب فرماتے ہیں کہ اگر ہمارا مکان عرش سے نیچے ہوتا تو ہم ایک منظرِ عالی بنا کے اس پر سے اپنی اور دوسری اشیاء کی حقیقت کا معائنہ کر لیتے اور اپنا مرتبہ سمجھ سکتے۔ مگر ہمارا مکان تو عرش سے بھی اونچا ہے۔ اب اس سے اونچا مقام کہاں سے لائیں۔ جو وہاں ایک منظر بنا کے اپنے مرتبے کو دیکھ لیتے اور اپنی حقیقت کو سمجھ کے اس کے موافق کاربند ہوتے۔

تمنا کسی عزیز اور مرغوب شے کی ہوتی ہے۔ پھر عرش سے نیچے مکان ہونے کی تمنا کیوں کی؟ چونکہ مکان کے نیچے ہونے سے ایک مقصدِ اعلیٰ کے حاصل ہونے کی امید ہے، اس لیے کاش کے حرف تمنا لائے۔''

اس شرح کے آخری پیراگراف سے پڑھنے والے کی تسلیِ خاطر ہو جانا چاہیے۔

(9) یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آئی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں غالب زبس تکرارِ دوست (ص 43)

تمام نسخوں میں جن میں نسخۂ نظامی بھی شامل ہے۔ ''پسند آتی'' ہے اور یہی مناسب بھی ہے۔ ''آئی'' سہوِ کتابت ہے، اور غالباً نسخۂ حمیدیہ کے ذریعے اس مصرع میں داخل ہوا ہے۔ مصحح نے یہ لفظ اختیار کیا تھا، تو حاشیے میں اس کی سند لکھنا چاہیے تھی:

(10) مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں
بہ روئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ (ص 45)

لفظِ سفرہ پر حاشیہ ہے: ''صحیح تلفظ سینِ مضموم سے ہے۔ مگر بعض لوگ اس تلفظ میں 'ذم کا پہلو دیکھتے ہیں، اور سفرہ بہ سینِ مفتوح بولتے ہیں۔''

بظاہر مصحح نے ''بعض لوگ'' سے اپنے عہد کے کچھ اہلِ علم مراد لیے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ

ہے کہ انھوں نے غیاث اللغات کی اس عبارت کا خلاصہ لکھ دیا ہے: ''بدان کہ چوں سفر را کہ بمعنی دستار خوان است با سفرہ کہ بمعنی مقصد باشد، در تلفظ التباس واقع شدہ باعثِ استکراہِ طبائع گردید، لہٰذا سفرہ را کہ بمعنی دستار خوان است، ناچار بفتح مقرر کردند بجہتِ رفعِ التباس۔ و برای معنیِ دیگر بضم معین داشتہ اندحیاں کہ بود۔''

رہا سفرہ کا بمعنی مقصد ہونا تو ایران میں بھی بطورِ کنایہ صرف متاخرین کے یہاں استعمال ہوا ہے، متقدمین بمعنیِ اول ہی لکھتے ہیں، اس لیے یہاں اس نوٹ کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ اس وضاحت نے خواہ مخواہ ذہن کو مذموم پہلو کی طرف متوجہ کر دیا:

(11) کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لب ساقی میں صلا میرے بعد (ص46)

مصرع ثانی کے لفظ ''میں'' پر حاشیہ لکھا ہے۔ نسخۂ نظامی، نسخۂ عرشی، نسخۂ حسرت موہانی اور بعض دیگر نسخوں میں یہاں ''میں'' ہی چھپا ہے۔ نسخۂ حمیدیہ میں ''پہ'' درج ہے۔ ظاہراً 'میں' سہو کتابت ہے لیکن اگر غالب نے ''میں'' ہی کہا تھا، تو اس کی مراد یہ ہوگی کہ غلبۂ غم کے باعث صلا لبوں پر نہ آسکی، لبوں میں رہ گئی۔''

اس حاشیے میں مصحح کا لفظِ ''میں'' کو سہو کتابت قرار دینا درست نہیں۔ غالب کا لفظ یہی ہے۔ ''پہ'' نسخۂ حمیدیہ'' کے کاتب کا سہو ہے۔

(12) مرتا ہوں اس آواز پہ، ہر چند سر اڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

مصرع اوّل کے لفظِ ''اس'' پر حاشیہ لکھا ہے: متن میں اس، اُس، اِن، اُن وغیرہ کے اعراب لگانے میں بھی بہت احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ نسخۂ نظامی (1863) میں اِس، اِن وغیرہ کا اندراج بلا کسرہ ہے، مگر اُس، اُن وغیرہ کو اوس اون لکھا ہے۔ اس غزل میں نیز پیش نظر نسخے کے باقی تمام مندرجات میں نسخۂ نظامی کی بہ احتیاط پیروی کی گئی ہے۔ اس سے صرف وہیں انحراف کیا گیا ہے جہاں غالباً سہو کاتب کے باعث معنوی سقم پیدا ہوتا ہے۔''

(13) خوش حال اس حریفِ سیہ مست کا کہ جو
رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بپاے گل

اس شعر پر حاشیہ لکھا ہے: ''عام طور سے مروجہ نسخوں میں اس، اُس، اِسے، اُسے اعراب

سے خالی ہیں۔ راقم نے 1862 کے نسخۂ نظامی کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اعراب اُس میں بھی نہیں ملتے۔ مگر اُس میں ''اُس'' کو اوس اور اِس کو اس لکھا ہے۔ اسی طرح ''اُسے'' کو اوسے لکھا ہے اور ''اِسے'' کو اسے، ذوقِ سلیم ان اعرابوں کی تصدیق کرتا ہے۔''

میں عرض کرتا ہوں کہ اوّل تو یہ ایک حاشیہ ہونا چاہیے تھا، دوسرے اس ایک کو بھی ص 3 کے اس شعر پر لکھا جانا تھا:

حالِ دل نہیں معلوم، لیکن اِس قدر یعنی الخ

(14) فروغِ حسن سے ہوتی ہے حل مشکل عاشق
نہ نکلے شمع کے پا سے، نکالے گر نہ خار آتش (ص59)

مصحح نے ''ہوتی'' پر حاشیہ لکھا ہے ''ممکن ہے غالب نے یہاں ''ہوتا ہے'' کہا ہو، اور ہوتی ہے سہو مرتبین ہو۔'' لیکن واقعہ اس کے برخلاف ہے، یعنی یہ غالب کا سہو ہو سکتا ہے، ورنہ کسی نسخے میں تو ''ہوتا ہے'' لکھا ملتا۔ مخطوطۂ رام پور قدیم میں مصرع اس طرح ہے۔ ''فروغ حسن ہوتی ہے حل ہر مشکل عاشق'' بظاہر یہ کاتب کی اصلاح معلوم ہوتی ہے۔ میرے نزدیک یا تو غالب کی زبان پر یہ لفظ مونث تھا یا مضاف الیہ (لفظ مشکل) کی تانیث کا مضاف (لفظ حل) کی تذکیر پر غالب آجانا اس کا سبب ہے۔ چنانچہ مصرع پڑھیے، تو ذہن مشکل کی تانیث کی وجہ سے ''ہوتی ہے'' کو نامانوس نہیں مانتا۔

(15) دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خط و خال کہاں (ص68)

مصحح نے ''خط'' پر حاشیہ لکھا ہے ''ممکن ہے غالب نے خد و خال کہا ہو۔'' لیکن جس اعتراض سے غالب کو بچانے کے لیے انھوں نے امکان کا سہارا لیا ہے، وہ اعتراض اس مصرع پر بھی وارد ہوتا ہے اور ناقابل جواب ہے:

ع آمد خط سے ہوا ہے سرد جو بازار دوست

(16) رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن (ص73)

مصحح نے ''لاوے'' پر حاشیہ لکھا ہے ''لائے۔'' مگر یہ نہیں بتایا کہ یہ کس نسخے کی قرأت ہے۔ جہاں تک غالب کے عہد کے نسخوں کا تعلق ہے، ان میں سے کسی میں بھی ''لائے'' نہیں۔ مصحح نے صفحہ 63 کے حاشیے میں لکھا ہے کہ اپنی پسند غالب کے کلام کو عمداً بدل ڈالنے کا

حق ہمیں نہیں دیتی۔ اس لیے یہاں لاوے، ہی لکھنا چاہیے تھا جیسا کہ مصحح نے کیا بھی ہے اور بغیر سند بتائے حاشیے میں لائے کا ذکر نہ کرتے تو بہتر تھا۔

(17) تھیں بنات النعشِ گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں (ص80)

مصحح نے بنات النعش پر حاشیہ لکھا ہے: ''جنازے کے آگے آگے چلنے والی ماتم دار لڑکیاں؟ یہاں یہ لفظ غالباً ابن کی جمع کے طور پر استعمال نہیں ہوا۔ غالب نے صیغۂ تانیث استعمال کیا ہے۔''

میں نے اس لفظ کے عربی ہونے کی بنا پر اقرب الموارد اور المنجد کو دیکھا۔ بعد ازاں غیاث اللغات اور فرہنگ حسین عمید مطالعہ کیں۔ آخر میں اشٹائن گاس سے بھی تصدیق کرلی۔ جو معنی مصحح نے لکھے ہیں، وہ ان کتابوں میں نہیں ملے صاحب غیاث اللغات نے جو لکھا ہے، وہ یہاں لکھے دیتا ہوں:

بنات النعش ستارہ اند قریب پایۂ شرقی نعش ونعش چہار ستارہ وارو بصورتِ چار پائی و بنات ونعش مجموع ہفت ستارہ اند قریب قطب شمالی وآن ہر ہمہ برگردِ قطب می گردند۔

اپنی طرف سے یہ عرض کردوں کہ بقولِ اقرب الموارد بنات نعش کا واحد ابنِ نعش ہے، بنتِ نعش نہیں۔

(18) بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یہاں
طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں (ص91)

لفظ ''یہاں'' پر مصحح نے حاشیہ لکھا ہے: ''بعض نسخوں میں ''اوریاں'' چھپا ہے۔ نسخۂ نظامی 1862 میں ''اور یہاں'' درج ہے۔''

میں عرض کرتا ہوں کہ مصحح نے اس لفظ کو یہاں بروزن وہاں پڑھا ہے۔ جو غالب کے نزدیک غیر فصیح ہے۔ انھیں اس کو یہاں یہ ہائی مخلوط التلفظ پڑھنا چاہیے۔ جیسا کہ غالب نے نواب یوسف علی خاں ناظم کی ایک غزل پر نوٹ کیا ہے۔ بعد میں غالب بدونِ ہائے ہوز ''یاں'' لکھنے لگے تھے، اس لیے میں نے نسخۂ عرشی میں ان کے اس آخری املا کو اختیار کیا ہے۔

(19) ودیعت خانۂ بیداد کاوشہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے، مرا ہر قطرہ خوں تن میں (ص92)

مصحح نے لفظ ''مرا'' پر حاشیہ لکھا ہے۔ ''اکثر قدیم و جدید نسخوں میں ''مرا'' کی جگہ ''مرے'' چھپا ہے، اور شارحین نے بلا چون و چرا اسی طرح اس کی تشریح کردی۔ قدیم نسخوں میں سے صرف نسخہ حمیدیہ میں ''مرا'' چھپا ہے اور یہ درست معلوم ہوتا ہے ممکن ہے غالب نے بھی یہی لکھا ہو کیونکہ اس سے شعر بہت صاف ہو جاتا ہے ورنہ یہ تعقید بدرجہ طیب معلوم ہوتی ہے۔ نسخہ حمیدیہ طبع اوّل میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ ''مرے'' کو کاٹ کر کاپی یا پتھر پر ''مرا'' بنایا گیا ہے۔ بہر حال چونکہ اس طرح شر صاف ہو جاتا ہے، ہم نے بھی بعض دوسرے جدید مرتبین کی طرح ''مرا'' کو ترجیح دی۔

میں عرض کرتا ہوں کہ یہاں مصحح نے خود اپنے مسلمہ قاعدے سے تجاوز فرمایا ہے۔ چونکہ غالب کے عہد کے تمام مخطوطہ اور مطبوعہ نسخوں میں ''مرے'' ہے اس لیے متن میں اسی کو جگہ دینا چاہیے تھی اور غالب کے الفاظ کو اپنی پسند کا تابع نہ کرنا تھا۔ رہا اس کا حمیدیہ میں پایا جانا، تو اول تو مطبوعہ حمیدیہ کا اعتبار نہیں، اور...... * کر یہاں گم ہو چکا ہے۔ اس لیے یہ امکان زیادہ ہے کہ کسی خوش ذوق نے تعقیدِ لفظی دور کرنے کے خیال سے ''مرے'' کو ''مرا'' بنا دیا ہو اور اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ نسخہ بھوپال میں بھی ''مرا'' ہی تھا، تو چونکہ نسخہ شیرانی سے نسخۂ نظامی کان پور تک سب میں ''مرے'' ہے، اس لیے اسے غالب کی ترمیم واصلاح قرار دیا جائے گا۔ باقی اس تعقید کو تا بدرجۂ عیب ماننا بھی درست نہیں، ورنہ غالب کے اور بہت سے شعروں کو عیب دار ماننا پڑے گا۔

مزید برآں ''مرے'' کی صورت میں مصرع کی نثر ہوگی:

''مرے تن میں ہر قطرۂ خونِ نگیں نامِ شاہد ہے''

اور لفظ ''مرا'' کے ساتھ یہ نثر ٹھہرے گی۔

''مرا ہر قطرۂ خون تن میں نگینِ نامِ شاہد ہے۔''

ان دونوں نثروں کے پڑھنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ غالب کا مطلب یہ ہے کہ میرے بدن کا ہر قطرہ خون ''معشوق کے نام کا نگین ہے'' وہ یہ نہیں کہنا چاہتا کہ میرا ہر قطرۂ خون بدن کے اندر شاہد کے نام کا نگین ہے۔ اس لیے ''مرے'' قابل ترجیح ہے۔

---

* خراب پرنٹ ہونے کے سبب لفظ پڑھا نہیں جاسکا۔ (مرتب)

(20) دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

اس پر مصحح نے حاشیہ لکھا ہے: ''قدیم نسخوں میں یہاں ''غیر'' ہی چھپا ہے۔ قدیم نسخۂ نظامی میں بھی غیر ہے۔ نسخۂ حمیدیہ میں ''غیر کوئی'' چھپا ہے۔ عرشی، حسرت، مالک رام نے بھی متن میں ''غیر'' ہی رکھا ہے۔ مہر صاحب نے ''کوئی'' کو ترجیح دی ہے مگر اس طرح پہلے دونوں شعروں میں ''کوئی ہمیں'' کا ٹکڑا بہ تکرار آجاتا ہے۔ اگر صرف یہی شعر مدنظر ہو تو البتہ ''کوئی'' پسندیدہ معلوم ہوتا ہے۔''

میری دانست میں یہ حاشیہ بیکار ہے۔ جب عہدِ غالب کے سب نسخوں میں غیر ہے، تو کسی شخص کی پسندیدگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(21) ہوا چرچا جو میرے پانو کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں جنبش جوہر نے آہن کو (ص 99)

مصحح نے لفظ ''پانو'' پر حاشیہ لکھا ہے: ''پانوں، پاؤں۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ یہ کن نسخوں میں ہے۔ علاوہ ازیں وَ میں صرف ہمزہ بھی نہ ہونا چاہیے۔

اگلے صفحے پر پانو ردیف کی غزل پر حاشیہ لکھا ہے: پاؤں کا یہ املا اب قریب قریب متروک ہے۔'' میری دانست میں ان دونوں حاشیوں کو ص 23 کے اس شعر پر ہونا چاہیے تھا:

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہوجائے گا

(22) کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق ناشناس ہیں
مانا کہ تم بشر نہیں، خورشید و ماہ ہو (ص 102)

''ناشناس'' پر حاشیہ لکھا ہے: ''نسخۂ نظامی طبع اوّل میں، 'حق ناسپاس' چھپا ہے۔ ایک آدھ اور قدیم نسخے میں بھی یوں ہی ملا ہے۔ مگر بعض دوسرے قدیم نسخوں میں ناشناس بھی چھپا ہے۔''

میں عرض کرتا ہوں کہ سوائے نسخۂ نظامی کے اور کسی قدیم نسخے میں 'ناسپاس'' میری نظر سے نہیں گزرا۔

(23) پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو بیمار دار
اور اگر مرجایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو (ص 105)

اس شعر کے مصرعِ اوّل میں ''لفظ بیمار دار'' پر ایک طویل حاشیہ لکھا ہے، جو یہ ہے:
''بعض مابعد نسخوں میں ''بیماردار'' کی جگہ ''تیماردار'' چھپا ہے۔ مگر نسخۂ نظامی مطبوعۂ 1862 اور اُس کے قریبی عہد کے جو آٹھ نسخے میری نظر سے گزرے ان سب میں بیمار دار چھپا ہے۔ مالک رام صاحب اور عرشی صاحب کے نسبتاً جدید نسخوں میں بھی ''بیماردار'' ہی درج ہے۔ بہ ظاہر یہی غالب کا لفظ ثابت ہوتا ہے۔ نسخۂ حمیدیہ طبع اوّل میں ''تیماردار'' کا اندراج شاید سہو کتابت ہے۔ نسخۂ مہر میں بھی ''تیماردار'' ممکن ہے یہیں سے لیا گیا ہو۔ بعض اور اصحاب نے بھی اپنے نسخوں میں ''تیماردار'' غالباً اس لیے لکھا ہے کہ آج کل یہ لفظ اردو میں عام طور سے مستعمل ہے مگر 'بیماردار' اس مفہوم میں قابلِ ترجیح ہے کیونکہ اس کا ایک یہی مقرر مفہوم ہے جو تیمار اور تیماردار کا نہیں چنانچہ فارسی میں ان الفاظ کے دوسرے مفاہم بھی ہیں۔ علاوہ ازیں غالب کا کوئی لفظ عمداً بدلنے سے احتراز واجب ہے۔ یہی حاشیہ غالب کے اس شعر پر بھی حرف بحرف صادق آتا ہے:

لو، ہم مریضِ عشق کے بیمار دار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

میری دانست میں یہ حاشیہ ص 44 کے مذکورۂ بالا شعر پر ہونا چاہیے تھا۔

(24) مینا ہے مے ہے سروِ نشاطِ بہار ہے
بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے (ص122)

اس شعر پر بھی ایک لمبا حاشیہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں ''اٹھارہ سے زائد قدیم و جدید نسخوں کے باہمدگر مقابلے سے معلوم ہوا کہ بیشتر نسخوں میں یہ شعر اسی طرح چھپا ہے جس طرح اوپر درج ہوا۔ الخ۔

میں عرض کرتا ہوں کہ تعیینِ قرأتِ متن میں جدید نسخوں کا اعتبار بغیر سند کے خطرناک ہے اور قدیم نسخوں میں سے صرف نظامیِ قدیم میں متن کی طرح ہے اور کسی میں نہیں۔ لہٰذا مصحح کا آگے یہ لکھنا درست نہیں کہ ''بہار سے'' ایک آدھ قدیم نسخے میں ہے۔ رہے وہ معنی جو مصحح نے لکھے ہیں ''جوشِ نشاط میں مینائے مے بہار کا سروِ سرمست دکھائی دیتا ہے۔'' تو صرف کھینچ تان ہے۔ اگر مصحح اس پر دوبارہ غور فرمائیں گے تو اس مطلب سے رجوع کرلیں گے:

(25) یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز، نہ جوش و خروش ہے (ص138)

''سوز'' پر مصحح نے یہ حاشیہ لکھا ہے: ''نسخۂ نظامی اور اکثر دوسرے نسخوں میں ''سوز'' ہی چھپا ہے۔ ایک نسخے میں شاید سہو کتابت سے ''سور'' چھپ گیا ہے۔ اب بعض حضرات سور ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔''

میں عرض کرتا ہوں کہ عہدِ غالب کے تمام نسخوں میں ''سور'' ہے۔ نظامی کے کاتب کو شاید سور کے معنی معلوم نہ ہوں گے، اس لیے یہ لفظ سور بہر حال اس نے پہلی بار ''سوز'' لکھا ہے۔ بعد ازاں اس نسخے کو جس نے اصل بنایا اس نے یہ غلطی دہرادی چونکہ آج کل کے بہت سے حضرات بھی یہ نہیں جانتے کہ سور کے معنی بھی سرور ہیں اس لیے وہ سوز پڑھتے۔

(26) گریہ نکالے ہے تیری بزم سے مجھ کو
ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے (ص139)

مصحح نے لفظ ''تیری'' پر حاشیہ لکھا ہے۔ ''نسخۂ نظامی نیز دیگر تمام قدیم و جدید نسخوں میں ''تری'' چھپا ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ صرف نسخۂ حسرت موہانی، نسخہ بیخود دہلوی اور نسخۂ مطبع مجیدی مطبوعہ 1916 میں صحیح صورت نظر آتی ہے۔ بہ صورتِ دیگر یہ مصرع بحر سے خارج ہو جاتا ہے۔

میں دو باتیں عرض کرتا ہوں۔ پہلی یہ کہ یہ اعتراض سب سے پہلے نظم طباطبائی نے اپنی شرح میں بایں الفاظ پیش کیا ہے:

''یہ وزن مانوس اوزان میں سے نہیں ہے۔ اس وجہ سے کاتب نے اپنے وزنِ مانوس کی طرف پہلے مصرع کو کھینچ لیا ہے۔ اور سب نسخوں میں ''تری'' بغیر یا چھپا ہوا ہے لیکن اس میں یہ قباحت ہے کہ دوسرا رکن فاعلات ہونا چاہیے تھا اس کی جگہ پر مفتعلن ہو جاتا ہے۔ تو ضرور ہے کہ ''تیری'' کہا ہوگا مصنف نے۔ اور اس صورت میں وزن مستقیم رہتا ہے کہ ''تیری'' میں آخر کی ''ی'' کو گرادیں اور درمیان کی ''ی'' باقی رکھیں۔''

مصحح کو طباطبائی کا حوالہ دینا چاہیے تھا۔ اس سے بات کا وزن بڑھ جاتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایک مخطوطے میں جو غالب کا تصحیح کردہ ہے، تیری لکھا گیا ہے:

(27) ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے (ص160)

اس کے دوسرے مصرع پر مصحح نے یہ حاشیہ لکھا ہے:

''نسخۂ نظامی، نسخۂ عرشی اور نسخۂ مالک رام میں یہ مصرع ''تو'' کے بغیر چھپا ہے۔ ایک

خستہ حال پرانے نسخے میں بھی جو شاید مطبع احمدی دہلی میں چھپا تھا ''تو'' نہیں ہے۔ باقی تمام قدیم و جدید نسخوں میں جو نظر سے گزرے ''تو'' موجود ہے۔ طباطبائی نے اس مصرع کو ''تو'' کے ساتھ شائع کر کے ''سی'' پر عروضی اعتراض کیا ہے مگر پھر خود ہی اعتراض کو رد کر دیا ہے۔''

میں عرض کرتا ہوں کہ یہ غزل سب سے پہلے نسخۂ شیرانی میں ملتی ہے اور اس نسخہ ہی میں نہیں بلکہ غالب کی زندگی کے تمام قلمی و مطبوعہ نسخوں میں ''تو'' نہیں ہے۔ غالباً سب سے پہلے نسخۂ حمیدیہ میں ''تو'' نے بار پایا اور پھر عروض نہ جاننے کے باعث دیوان کے دیگر مرتبوں نے اسے قبول کر لیا۔

رہا مصحح کا یہ ارشاد کہ طباطبائی نے یہ مصرع ''تو'' کے ساتھ شائع کیا ہے اور ''سی'' پر عروضی اعتراض کر کے خود اسے رد کر دیا ہے۔ تو یہ ''سی'' محل نظر ہے۔ طباطبائی کے الفاظ یہ ہیں: ''سی کی ی'' مجہول جگہ واقع ہوئی ہے، یہ مقام حرفِ متحرک کا ہے، یعنی فعول مفاعلن فعولن میں مفاعلن کی میم کی جگہ ی واقع ہوئی ہے اور ي ساکن ہے تو گویا کہ مفاعلن کے میم کو مصنف نے ساکن کر لیا ہے، یعنی مفعول مفاعلن کے بدلے مفعولم فاعلن اب ہو گیا ہے، جسے مفعولن فاعلن سمجھنا چاہیے۔ یہ زحاف کو اردو فارسی میں نامانوس معلوم ہوتا ہے، مگر سب لایا کرتے ہیں۔ نسیم لکھنوی کی مثنوی اسی وزن میں ہے، اور جابجا اس زحاف کو لائے ہیں:

تھا اک کحال پیرِ دیریں
عیسیٰ کی میں نے آنکھیں دیکھیں

اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ طباطبائی کے نسخے میں بھی ''تو'' نہ تھا، ورنہ وہ اس مصرع کا وزن مفعولن فاعلن فعولن بتا کر مصرع 'بغیر تو کے صحیح قرار نہ دیتے۔

پروفیسر شاداں بلگرامی نے اپنی شرح (روح المطالب ص 443) میں بدون تو مصرع لکھ کر فرمایا ہے: ''یہ بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف یا مقصور ہے بروزن مفعول مفاعلن فعولن یا فعولان۔ مگر مصرع ثانی کا وزن مفعولن فاعلن ہوتا ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ جب وزن میں کہیں پر تین متحرک متوالی آ جائیں، تو درمیانی متحرک کو ساکن کر دیتے ہیں۔ اس کا نام زحافِ تسکینِ اوسط ہے۔ یہاں مفعول مفاعلن میں تین متحرک متوالی (ل، م، ف) واقع ہوئے ہیں۔ میم درمیانی کو ساکن کیا، تو مفعولم فاعلن ہو گیا۔ اس کو وزن کے مناسب مفعولن فاعلن سے بدل لیا۔ (تقطیع) پر تج سی یہ مفعولن کو ء شے، فاعلن۔ جناب حسرت اور آسی ایک (تو)

بڑھا کر وزنِ متعارف میں لے آئے مگر غالب کے تصحیح کردہ نسخے میں (تو) نہیں ہے اس کے بڑھانے سے 'سی' کی (ی) اور (تو) کا (واو) دونوں تقطیع سے جاتے رہے، اور مصرع پھولدار ہوگیا۔"

(28) کبھی تو اس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے
که ایک عمر سے حسرت پرست بالیں ہے (ص162)

مصحح نے "دل شوریدہ" پر حاشیہ لکھا ہے: "نسخۂ عرشی میں غالباً بالیں کی رعایت سے سرِ شوریدہ درج کیا گیا ہے۔ مگر دوسرے قدیم و جدید نسخوں میں جو نظر سے گزرے، دلِ شوریدہ ہی چھپا ہے، طباطبائی نے متن میں دلِ شوریدہ درج کر کے احتمال ظاہر کیا ہے کہ غالب نے سرشوریدہ ہی لکھا ہوگا۔ پھر لکھتے ہیں کہ "معنی شعر دونوں طرح ظاہر ہیں۔" یہاں چونکہ سہو کا احتمال کم ہے، اس لیے متن میں دل ہی درج کیا گیا ہے۔"

میں عرض کرتا ہوں کہ مصحح نے نسخۂ عرشی کے اختلافِ نسخ کو ملاحظہ نہیں کیا، ورنہ دو باتیں معلوم ہو جاتیں۔ پہلی یہ کہ عہد غالب کے صرف دو مطبوعہ نسخوں، احمدیہ اور نظامیہ میں دل ہے، بقیہ میں سر ہی لکھا ہے۔ دوسری یہ کہ رام پور کے خوش خط نسخے میں کاتب نے دل لکھا تھا۔ غالب نے اسے چھیل کر اپنے ہاتھ سے "سر" بنایا ہے۔ لہٰذا یہ لفظ سابق لفظ کے لیے ناسخ ہوگیا۔

(29) زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے، کیا کہیے (ص163)

اس شعر کے مصرع ثانی کے لفظ "ہی" پر حاشیہ لکھا ہے: "نسخۂ نظامی، نسخۂ حمیدیہ اور متعدد دوسرے قدیم نسخوں، نیز طباطبائی، حسرت موہانی، بیخود دہلوی، مہر وغیرہم کے نسخوں میں "ہی" چھپا ہے مگر نسخۂ عرشی میں "بھی" درج ہے جو غالباً منشی شیونرائن کے نسخے کی تقلید میں ہے۔"

میں عرض کرتا ہوں کہ نسخۂ عرشی میں "بھی" کا اندراج اُس خوش خط نسخے کی بنا پر ہے، جو غالب کا تصحیح کردہ ہے اور نواب ناظم کو بھیجا گیا تھا۔

(30) کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آجائے رحم
واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے (ص169)

مصحح نے پہلے مصرع پر یہ حاشیہ لکھا ہے: "نسخہ عرشی میں ""کہ" کی جگہ "جو" چھپا ہے۔ نسخۂ نظامی میں "کہ" درج ہے۔"

میں عرض کرتا ہوں کہ غالب کے عہد کے تمام نسخوں میں ''جو'' ہے، صرف احمدی اور اُس کے اتباع میں نظامی میں ''کہ'' چھپ گیا ہے۔

(31) سوزش باطن کے ہیں احباب منکر، ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے (ص173)

مصحح نے ''سوزش'' پر حاشیہ لکھا ہے: ''نسخۂ عرشی'' اور دیگر موقر نسخوں میں یہاں ''سوزش'' کی جگہ ''شورش'' چھپا ہے۔ شاعر نے یقیناً سوزشِ باطن ہی کہا ہوگا کیونکہ احباب اس کے لبہائے شداں کو دیکھ کر اس کے غم پنہاں کا انکار کرتے ہیں۔ خندہ آشنا لبوں کا تقابل سوزش باطن سے ہوسکتا ہے۔ شورش باطن کا ذکر یہاں غیر متعلق سا ہے۔ نسخۂ نظامی (1862) میں ''سوزش باطن'' ہی درج ہے۔''

میں عرض کرتا ہوں کہ عہد غالب کے تمام نسخوں میں باستثنائے احمدی و نظامی ''شورش'' ہی ملتا ہے، لہٰذا یہ دونوں دعوے کہ غالب نے یقیناً سوزش کہا ہوگا اور شورش یہاں غیر متعلق سا ہے محل نظرِ ہیں، کیونکہ شورشِ باطنی سے جس اندرونی تلاطم وطوفانی جذبات کا اظہار ہوتا ہے، ''سوزش'' اس کے بیان سے قاصر ہے۔

(32) گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے (ص189)

مصحح نے اس پر حاشیہ لکھا ہے: ''یہ عجیب بات ہے کہ نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ نظامی (1862) میں نیز متعدد دوسرے قدیم نسخوں میں یہ مصرع ایک ہی طور پر مہمل چھپا ہے یعنی۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری خوشامد سے

میری دانست میں مصرع کو مہمل کی جگہ بے سند کہنا زیادہ اچھا ہے ورنہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ایک طرف مصرع ثانی ہے ''مری جو شامت آئے'' کی ضرورت پوری ہوتی ہے اور دوسری جانب گدا سمجھنے کی وجہ بیان ہو جاتی ہے۔

(33) پھر غزل کی روش پہ چل نکلا
توسنِ طبع چاہتا تھا لگام (ص195)

مصحح نے حاشیہ لکھا ہے، ''اگر مروجہ نسخوں میں ''چاہتا ہے لگام'' چھپا ہے۔ نسخۂ نظامی میں ''چاہتا ہے لگام'' درج ہے اور یہی صحیح ہے۔''

میں عرض کرتا ہوں کہ صرف نسخۂ نظامی میں نہیں غالب کے عہد کے تمام قلمی و مطبوعہ نسخوں میں ''چاہتا'' ہے۔

(34) کاتب حکم نے بہ موجب حکم
اس رقم کو دیا طرازِ دوام (ص217)

اس پر مصحح نے حاشیہ لکھا ہے: ''نسخۂ نظامی کی تقلید میں مستند نسخوں میں بھی یہاں ''اُس'' چھپا ہے۔ نسخۂ نظامی میں یہ سہوِ کاتب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ''اِس رقم'' میں اشارۂ قریبی تحریر مابعد یعنی آخری شعر کی طرف ہے۔ نظر بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔''

میں عرض کرتا ہوں کہ نظامی ہی میں نہیں، عہدِ غالب کے تمام نسخوں میں ''اوس'' ہے اور اس اشارۂ بعید کا مشار الیہ اس سے پہلا یہ شعر ہے:

تیری توقیعِ سلطنت کو بھی
دی بدستور صورتِ ارقام

اور آخری شعر دعائیہ ہے۔ اس لیے یہاں سہو کتابت کا کوئی خدشہ نہیں۔

(35) ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے (ص220)

اس پر مصحح نے حاشیہ لکھا ہے: تمام مروجہ نسخوں میں غالباً سہوِ کتابت کے باعث لفظِ ثواب ہی چھپا ہے۔ غالب نے یہاں یقیناً صواب لکھا ہوگا، ورنہ شعر بے لطف رہ جاتا ہے۔ قلمِ سرنوشت کا ٹیڑھا لفظ خود لفظِ صواب کے حق میں دلیلِ قاطع ہے۔''

میں عرض کرتا ہوں کہ جہاں تک غالب کے عہد کے قلمی و مطبوعہ نسخوں کا تعلق ہے، کسی ایک میں بھی صواب نہیں، اس لیے یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ غالب نے یہاں یقیناً ثواب لکھا ہوگا اور چونکہ شعر کا مدعا اور مطلب دونوں لفظوں کے ساتھ ایک رہتا ہے، اس صورت میں بے لطفی چاہے محسوس ہو، مگر اہمال و بے معنی ہونے کا احتمال پیدا نہیں ہوتا۔

ان معروضات کے باوجود میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ غالب کی صد سالہ تقریبات پر دیوانِ غالب اردو کے جتنے ایڈیشن شائع ہوئے، ان میں یہ سب سے ممتاز ہے۔

○

دیوانِ غالب کا ایک نادر انتخاب

رضا لائبریری میں دیوان مومن کا ایک بیش قیمت نسخہ محفوظ ہے، جو مومن کا دیکھا ہوا اور اُن کا اصلاحی ہے۔

اس نسخے کے شروع اور آخر میں متعدد اوراق شامل ہیں۔ شروع کے ورقوں کی تعداد 21 ہے۔ ان میں 15 ب تک ہندی کے کبت وغیرہ مندرج ہیں۔ ورق 16 ب سے دیوان غالب اردو کا انتخاب شروع ہوتا ہے، جو ورق 21 ب پر ختم ہوگیا ہے۔ یہ انتخاب غزلیات کا ہے۔ ورق 22 ب سے دیوان مومن کا آغاز ہوا ہے اور یہ دیوان ورق 129 الف پر ختم ہوگیا ہے۔ بیچ میں ورق 129 الف سے *120 ب تک ضغت تخلص ایک شاعر کے مخمس اور کسی ہندی شاعر کا ایک کبت درج ہوا ہے۔ ورق 129 ب پر غالب کا چکنی ڈلی سے متعلق قطعہ لکھا گیا ہے۔ جس کے آخر میں ایک رباعی ہے۔ اس کے بعد کے ورقوں میں فارسی، اردو ہندی کے مختلف شعر اور قطعات تاریخ اور مختلف امراض کے مجرب نسخے ملتے ہیں۔ نیز نواب ہدایت علی خاں صاحب کے حسابات بھی مندرج ہیں، موصوف الذکر نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم شاگرد غالب کے حقیقی چچیرے بھائی اور مومن خاں کے شاگرد تھے۔ ہندی کے بھی بڑے شاعر شمار کیے جاتے تھے۔ امیر مینائی نے انتخاب یادگار (صفحہ 264) میں غربت تخلص کے تحت ان کا ذکر کیا ہے۔

اس صحبت میں انتخاب دیوانِ غالب کے بارے میں کچھ عرض کر کے وہ انتخاب آپ کی خدمت میں پیش کر دینا ہے۔ یہ انتخاب معمولی شکستہ آمیز خط میں کسی نامعلوم الاسم کاتب نے نقل کیا ہے۔ کاتب کم سواد نظر آتا ہے، اس لیے کہ اس نے دو جگہ اسد کا املا 'ص' سے لکھا ہے۔

---

* یہ صفحہ 130 ہونا چاہیے (مرتب)

نقوش لاہور (غالب نمبر) اکتوبر 1969

انتخاب کے 6 ورقوں میں شنجرف سے مسطر کشی کر کے درمیان میں شعر لکھے ہیں۔

کچھ شعر حاشیوں میں بھی درج ہیں، ان حواشی میں نیز متن کے اندر بھی متعدد اشعار بے محل لکھے گئے ہیں، جس کی وجہ سوائے سہو کے اور کوئی نظر نہیں آتی۔

یہ انتخاب دیوان کے کس نسخے پر مبنی ہے، اس بارے میں قیاس یہ ہے کہ اس میں ایسا کوئی شعر نہیں ہے، جو 1248ھ کے مرتبہ دیوان کے بعد کے نسخے کا ہو، لہٰذا اسے 1248ھ یا اس کے قریب کے کسی نسخے پر مبنی ہونا چاہیے۔ اس کی تائید میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انتخاب کے سرورق پر 1836 تحریر ہے جو 1252ھ کے مطابق ہے اور مخطوطۂ بدایوں جواب لیاقت میوزیم کراچی میں محفوظ ہے، 1254ھ (1838) کا مرتبہ ہے۔ لہٰذا اسی انتخاب کا مخطوطۂ بدایوں سے کم از کم دو برس پہلے مرتب ہوجانا چاہیے۔

1248ھ (1833) کے نسخے کی نقل سے اس انتخاب کا مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ ان دونوں کے متون میں دو ایک جگہ اہم اختلاف بھی ہے۔ مثلاً 1248ھ کے نسخے میں ہے:

تو اور سوے غیر نظر ہاے تیز تیز میں اور دکھ تری مژہ ہاے دراز کا

یہی قرأت بعد کے تمام نسخوں میں ملتی ہے۔ مگر اس انتخاب میں ''نظر ہاے'' کی جگہ ''نگہ ہاے'' ہے۔ ممکن تھا کہ اس اختلاف کو کاتب کا سہو قرار دے دیا جاتا۔ مگر غالب کے ''گل رعنا'' اور شیفتہ کے ''گلشن بے خار'' میں بھی ''نگہ ہاے'' ملتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس انتخاب کی بنا جس نسخے پر ہے، وہ ہمارے نسخے کی جگہ شیفتہ کے نسخۂ دیوان غالب کے مطابق تھا۔

اسی طرح انتخاب کی غزلوں کی ترتیب تو 1248ھ کے نسخے کے مطابق ہے مگر اشعار کی ترتیب جگہ جگہ مختلف ہے۔ یہ بھی اسی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے کہ انتخاب کی اصل 1248ھ کے نسخے سے الگ کوئی نسخہ تھا۔

یہ انتخاب کئی وجوہ سے اہم ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ دیوان غالب کا اتنا قدیم انتخاب کوئی دوسرا موجود نہیں ہے۔ دوسرے اس انتخاب کا متن جگہ جگہ متداول نسخوں سے الگ ہے، ان میں سے بعض کاتب کی غلطی نہیں معلوم ہوتے، بلکہ ایسا نظر آتا ہے کہ نسخۂ اصل میں یہی الفاظ تھے، مثلاً 1248ھ کے نسخے اور بعض اور میں بھی شعر تحت اس طرح ہے:

حضرت ناصح جو آویں، دیدہ و دل فرشِ راہ\
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھاویں گے کیا

انتخاب میں ''جو آویں'' کی جگہ ''گر آویں'' ہے۔ غالب کے بعد کے نسخوں میں یہی قرأت برقرار رکھی گئی ہے۔ یا مصرع ذیل کے اندر ''ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہے، کھاویں گے کیا۔'' نسخۂ 1248ھ اور بعض دوسرے نسخوں میں ''رہیں'' ہے۔ بعد میں غالب نے انتخاب والی قرأت کو متن میں رکھا ہے اور نسخۂ عرشی میں بھی یہی لفظ متن کے اندر درج ہوئے ہیں۔

امید ہے کہ غالب دوست اس انتخاب کو غالبیات میں ایک اہم اضافہ قرار دیں گے۔

حاشیوں میں جن نسخوں کے حوالے دیئے گئے ہیں، ان کی مفصل کیفیت دیوان غالب (نسخۂ عرشی) کے دیباچے میں دیکھی جائے۔ یہاں صرف ان کے سالہائے سال ترتیب کا ذکر کیا جاتا ہے:

(الف) مخطوطات:	ق (نسخۂ بھوپال یا حمیدیہ)	1237ھ = 1821
	قا (نسخۂ شیرانی، لاہور)	1242ھ = 1826
	گل (گل رعنا، انتخاب کلام اردو (فارسی)	1245ھ = 1829
	قب (نسخہ رام پور قدیم)	1248ھ = 1833
	قبا (نسخہ لیاقت میوزیم کراچی)	1254ھ = 1838
	قد (نسخۂ رام پور جدید)	1271ھ = 1855
(ب) مطبوعات	م (طبع اوّل، دہلی)	1257ھ = 1841
	مب (طبع سوم، دہلی)	1278ھ = 1861
	مج (طبع چہارم کانپور)	1278ھ = 1862
	مد (طبع پنجم آگرہ)	1280ھ = 1863
	لطیف (طبع حیدر آباد تصحیح و ترتیب ڈاکٹر سید عبداللطیف)	1347ھ = 1928

یہ آخری ایڈیشن ناتمام رہ گیا، اور مطبوعہ فرمے پریس میں آگ لگ جانے کے باعث تباہ ہو گئے۔ مجھے وہ فرمے مرحوم تمکین کاظمی صاحب سے ملے تھے۔

26 اپریل 1969 امتیاز علی عرشی

رام پور

از کلام جناب مرزا نوشہ صاحب متخلص بہ اسد و غالب

رب یسر، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، وتمم بالخیر، و بہ نستعین

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا؟ — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ — صبح کرنا شام کا لانا ہے جوے شیر کا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے — سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
بس کہ ہوں، غالب، اسیری میں بھی آتش زیرِ پا — موے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ — مبارکباد! اسدؔ، غم خوارِ جانِ درد مند آیا

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ — جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا، نہ سود تھا
ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی — میں ورنہ، ہر لباس میں ننگِ وجود تھا[1]
لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز — لیکن یہی کہ ''رفت'' گیا، اور ''بود'' تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن، اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا[2]
کہتے ہو نہ دیں گے دل[3] ہم، اگر پڑا پایا — دل کہاں کہ گم کیجیے ہم نے مدعا پایا[4]
حالِ دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر، یعنی — ہم نے بارہا ڈھونڈھا، تم نے بارہا پایا[5]
سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری — حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا
شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا — آپ سے کوئی پوچھے: تم نے کیا مزا پایا؟

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں — آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا

---

1. قب میں یہ شعر اگلی بیت کے بعد ہے۔
2. تمام نسخوں میں یہ مطلع ثانی ہے۔
3. تمام نسخے: ''نہ دیں گے ہم دل''
4. یہ اور اگلا شعر دونوں اصل کے ورق 17 الف کے حاشیے میں مندرج ہیں۔
5. یہ اور آئندہ دو شعر قب میں نہیں ہیں۔

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

یہ لاشِ بے کفن اسدِؔ خستہ جاں کی ہے حق مغفرت کرے! عجب آزاد مرد تھا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں، سو وہ بھی نہ ہوا

مرگیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں، ورنہ سبب کیا، خواب میں آکر، تبسمہاے پنہاں کا؟

تو اور سوے غیر نگہ ہاے[1] تیز تیز میں اور دُکھ تری مِژہ ہاے دراز کا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا[2]
کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ ہاے! اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف! اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت، غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

دوست غم خواری میں میری سعی فرماویں[3] گے کیا
زخم کے بھرتے تلک ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا؟
حضرتِ ناصح گر آویں،[4] دیدہ و دل فرشِ راہ!
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھاویں گے کیا

1۔ ’گلِ رعنا‘ اور ’گلشنِ بے خار‘ میں بھی یونہی ہے اور تمام نسخوں میں ’نظر ہاے‘ ملتا ہے۔
2۔ یہ شعر اصل میں ورق 21 الف کے حاشیے میں ردیف کافِ فارسی کے بعد لکھا گیا ہے۔
3۔ گلشنِ بے خار، مد اور حمیدیہ میں ”ئیں گے“ ہر جگہ۔
4۔ قب، قبا، م اور گلدستہ، نازنیناں میں: ”جو آویں۔“

بے نیازی حد سے گزری، بندہ پرور، کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل، اور آپ فرماویں گے "کیا"؟
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لاویں گے کیا
خانہ زادِ زُلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟
ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبراویں گے کیا؟
ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت، اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہے،[1] کھاویں گے کیا؟

نہ دے نامے کو اتنا طول، غالب، مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستمہاے جدائی کا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا دل، جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
عذرِ واماندگی، اے حسرتِ دل نالہ کرتا تھا، جگر یاد آیا
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا
آہ! وہ جرأتِ فریاد کہاں دل سے تنگ آکے جگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے! دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

ہمہ ناامیدی، ہمہ بدگمانی میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

تو دوست کسو کا بھی، ستم گر، نہ ہوا تھا اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

1. قب، قبا،م،مب،مج 'گلدستۂ نازنیناں': "رہیں۔"

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم | میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
میں سادہ دل آزردگی یار سے خوش ہوں | یعنی سبقِ شوق مکرر نہ ہوا تھا

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف! | عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

اُس[1] سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد | تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہوجانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم، اللہ اللہ! | اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہوجانا
ضعف سے گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہوا | باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہوجانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال | ہوگیا گوشت سے ناخن کا جدا ہوجانا

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں، غالبؔ | یار لائے مری بالیں پہ اُسے، پر کس وقت

عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے | کشتۂ دشمن ہوں آخر، گرچہ تھا بیمارِ دوست
غیر یوں کرتا ہے پُرسش[2] میری اُس کے ہجر میں | بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غم خوارِ دوست
تا کہ میں جانوں کہ ہے اُس کی رسائی واں تلک | مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست
جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ | وہ کرے ہے پھر حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست
چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر | مجھ سے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست
یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آئی ہے آپ | ہے ردیفِ شعر میں، غالبؔ، زبس تکرارِ دوست

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد | بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
شمع بجھتی ہے، تو اُس میں سے دھواں اٹھتا ہے | شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی | کہ کرے تعزیتِ اہلِ وفا میرے بعد

---

1 تمام نسخے: ''تجھ''۔

2 قب وغیرہ: ''مری پرسش''۔ حمیدیہ اور لطیف میں: ''پرسش مجھ سے اُس کے۔'' مگر یہ سہو کاتب معلوم ہوتا ہے۔

ہجوم گریہ کا سامان کب کیا میں نے — کہ گر پڑے نہ مرے پانو پر در و دیوار

زنار ڈال[1]، سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال — رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر[2]
سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا — یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر[3]

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی — سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر
مجھے اب دیکھ کر ابر شفق آلودہ یاد آیا — کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں[4] پر

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے — متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر
اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا، قاتل سے کہتا تھا — کہ مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر

ے خانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں — خمیازہ کھینچے ہے بُتِ بیداد فن ہنوز

مژدہ، اے ذوقِ اسیری، کہ نظر آتا ہے — دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس[5]

جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع — چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہوتے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک[6]
دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ — دیکھیں، کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہوتے تک

---

1. تمام نسخے: ''باندھ'' یہ سہو کاتب معلوم ہوتا ہے۔
2. یہ شعر ورق 21 ب کے حاشیے میں ردیف الیاء کے شعروں کے ساتھ مندرج ہے۔
3. یہ شعر ورق 21 الف کے حاشیے میں ردیف الیاء کے اشعار کے ساتھ مندرج ہے۔
4. یہ شعر ورق 21 الف کے حاشیے میں ردیف الیاء کے اشعار میں مندرج ہے۔
5. یہ شعر ورق 19 الف کے متن میں ردیف النون کے اشعار کے اندر درج ہوا ہے۔
6. یہ تین شعر ورق 21 الف کے حاشیے میں مندرج ہیں۔

عاشقی صبر طلب، اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہوتے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن
خاک ہوجاویں[1] گے ہم تم کو خبر ہوتے تک

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
میرے گنہ کا مجھ سے حساب، اے خدا، نہ مانگ[2]

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں
ظالم، مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے! خدا نکردہ، تجھے بے وفا کہوں

نالہ جُز حسنِ طلب، اے ستم ایجاد، نہیں
ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں
عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو، کیا خوب!
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں
کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم!
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی ایک اپنی ہوا باندھتے ہیں
اہلِ تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

دیوانگی میں[3] دوش پہ زنار بھی نہیں
یعنی ہمارے جیب میں اِک تار بھی نہیں
دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کرچکے
دیکھا، تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں
ملنا ترا اگر نہیں آساں، تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے، اور یاں
طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں
شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں، اے خدا، کوئی دیوار بھی نہیں
گنجائشِ عداوت اغیار یک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں
اس سادگی پہ کون نہ مرجائے، اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ودیعت خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرا ہر قطرہ خوں تن میں

---

1. تمام نسخے: ''ہوجائیں گے۔''
2. یہ شعر بھی ورق 21 الف کے حاشیے میں درج ہوا ہے۔
3. تمام نسخے: ''سے''۔ بظاہر ''میں'' سہو کاتب معلوم ہوتا ہے۔

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں، پر صحبت مخالف ہے
جو گُل ہوں، تو ہوں گلخن میں، جو خس ہوں، تو ہوں گلشن میں
ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے بہ رنگ پنبہ روزن میں [1]
اسدؔ، زندانیِ تاثیر الفت ہائے خوباں ہوں
خمِ دستِ نوازش ہوگیا ہے طوق گردن میں

اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں بھلا اُسے نہ سہی، کچھ مجھی کو رحم آتا

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دِکھا کہ یوں بوسے کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ یوں
رات کے وقت مے پیے، ساتھ رقیب کو لیے آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں

پیدا ہوئی ہے، کہتے ہیں، ہر درد کی دوا یوں ہو، تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو [2]
ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو
چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا ہے دل پہ بار، نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ جس کی بہار یہ ہو، پھر اُس کی خزاں نہ پوچھ

بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں وہ بھی سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی
رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے تکلف برطرف، تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
مرے دل میں ہے، غالبؔ، شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

---

1. قب میں یہ شعر حسن مطلع ہے۔
2. قب میں ترتیب اشعار یوں ہے: چھوڑا نہ، ہے مجھ کو، پیدا ہوئی ہے

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر — اب تک یہ[1] جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے
ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا — ہر چند اُس کے پاس دلِ حق شناس ہے

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی — میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق مجھ سے — کچھ نہیں ہے، تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی — اے وہ مجلس نہیں، خلوت ہی سہی[2]
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں — نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے — غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جاے، اسدؔ
گر نہیں وصل، تو حسرت ہی سہی

میں نامرادِ دل کی تسلی کو کیا کروں — مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے
گزرا، اسدؔ، مسرتِ پیغام یار سے — قاصد پہ مجھ کو رشک سوال و جواب ہے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے — میں اسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
غیر کو یارب وہ کیونکر منع گستاخی کرے — گر حیا بھی آئے[3] ہے اس کو، تو شرما جائے ہے
ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا — رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے
نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہے — کھینچتا ہے جس قدر، اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب — ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

---

1. تمام نسخے: ''وہ''
2. قب میں ترتیب اشعار یہ ہے میرے ہونے، ہم بھی دشمن، ہم بھی تسلیم، ہم کوئی ترک وفا۔
3. تمام نسخے: ''گر حیا بھی اس کو آتی ہے۔''

گرچہ ہے کس کس برائی سے، ولے باایں ہمہ — ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے
دیکھنا تقریر کی خوبی کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں — اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خواب سحر گئی

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں — پھر وہی زندگی ہماری ہے
بیخودی بے سبب نہیں غالب — کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے — جو واں نہ کھنچ سکے، سو وہ یاں آ کے دم ہوے

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستم گر — کچھ تجھ کو مزہ بھی مرے آزار میں آوے
مر جاؤں نہ کیوں رشک سے، جب وہ تنِ نازک — آغوشِ خمِ حلقۂ زنّار میں آوے

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی — امتحاں اور بھی باقی ہو، تو یہ بھی نہ سہی
ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق — نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

کب وہ سنتا ہے کہانی میری — اور پھر وہ بھی زبانی میری

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے — یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل — بارے، اب اس سے بھی سمجھا چاہیے
چاک مت کر جیب بے ایامِ گُل — کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے
منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید — نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے
چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد — آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے
غافل، ان مہ طلعتوں کے واسطے — چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں دود کی طرح رہا سایہ گریزاں مجھ سے
اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے
دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو نہ دے جو بوسہ، تو منہ سے کہیں جواب تو دے
پلا دے اوک سے، ساقی، جو ہم سے نفرت ہے پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے، شراب تو دے

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے مرا سر رنجِ بالیں ہے، مرا تن بارِ بستر ہے
سرشکِ سر بصحرا دادہ نورالعینِ دامن ہے دلِ بے دست و پا اُفتادہ، برخوردارِ بستر ہے
خوشا! اقبالِ رنجوری، عیادت کو تم آئے ہو فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

کیوں بوتے ہیں باغبان تو بنے گر باغ گدائے مے نہیں ہے
کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد مے ہے، یہ مگس کی قے نہیں ہے
ہستی ہے، نہ کچھ عدم ہے، غالب آخر تو کیا ہے، اے نہیں ہے

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی وائے! ناکامی کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہے

وائے! واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے
وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

خدایا، جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے کہ جتنا کھینچتا ہوں، اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے
قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر، غالب وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

روتے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے دھوئے گئے ہم ایسے[1] کہ بس پاک ہو گئے

---

1. تمام نسخوں میں ''اتنے'' ہے۔ صرف گلشن بے خار متن کے موافق ہے۔

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر؟ پردے میں لاکھ[1] گُل کے جگر چاک ہوگئے
کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا بس[2] گلہ کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہوگئے

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھاتے تھے مجھے[3] دیکھوں، اب مرگئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی قیامت، کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

بیچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے وہ آوے، یا نہ آوے، یہاں انتظار ہے

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تمنا مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی برآوے

غالبؔ، برا نہ مان جو واعظ برا کہے ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے
پھر پُرسشِ جراحت دل کو چلا ہے عشق سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کیے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی[4] کو لبِ بام پر ہوس زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

1۔ تمام نسخے: ''پردے میں گل کے لاکھ''
2۔ تمام نسخے: ''ہم'' یہ سہو کاتب معلوم ہوتا ہے۔
3۔ قب اور م میں مصرع یوں ہے: زندگی میں تو اٹھاتے تھے وہ محفل سے مجھے۔ باقی نسخوں میں ''زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے۔ یہ عرض کردوں کہ یہ شعر سب سے پہلے قب ہی میں ملتا ہے۔

پھر دل[1] میں ہے کہ در پہ کسی[2] کے پڑے رہیں سر زیرِ بارِ فتنہ درباں کیے ہوئے
دل[3] ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے
غالبؔ، ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیہ طوفاں کیے ہوئے

تمام شد
کلام مرزا نوشہ متخلص باسد و غالب

قطعہ

ہے جو[4] صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی[5] زیب دیتا ہے، اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اِسے کیا لکھیے ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے
مہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے حرزِ بازوے شگر فانِ خود آرا کہیے
مسی آلودہ سر انگشتِ حسیناں لکھیے داغِ طرفِ جگر عاشقِ شیدا کہیے
خاتمِ دستِ سلیمانؑ کے مشابہ لکھیے سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیے
اخترِ سوختہ قیس سے نسبت دیجے خالِ مشکینِ رُخِ دل کشِ لیلیٰ کہیے
حجر الاسودِ دیوارِ حرم کیجے فرض نافہ آہوے بیابانِ ختن کا کہیے
وضع میں اُس[6] کو اگر سمجھیے قافِ تریاق رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے
صومعے میں اسے ٹھہرایئے گر مہرِ نماز میکدے میں اسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے
کیوں اِسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے؟ کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیے؟

---

1. تمام نسخے ''کسو''۔ صرف ''گلشن بیخار'' موافق متن ہے۔
2. ق، قا، اور گل کے علاوہ: ''جی''
3. تمام نسخے قد، مج کے علاوہ ''کسو'' یہ شعر قب میں اگلے شعر کے بعد ہے۔
4. تمام نسخے: ''جی''
5. قب: ہے کفِ دست پہ صاحب کے جو یہ چکنی ڈلی۔
6. تمام نسخے: ''یہ چکنی ڈلی۔''
7. تمام نسخے: ''اس'' یہ سہو کاتب ہے۔

کیوں اِسے گوہر نایاب تصور کیجے؟ کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے
کیوں اِسے تکمۂ پیراہنِ لیلیٰ کہیے[1]؟ کیوں اِسے نقشِ پےَ ناقۂ سلمٰی کہیے؟

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

تمام شد

مشکل ہے زبس کلام میرا، اے دل
سُن سُن کے اُسے سخنوران کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل، و گر نہ گویم مشکل



1. تمام نسخے: ''لکھیے۔'' یہ سہو کاتب ہے۔

دیوانِ غالب (نسخۂ حمیدیہ) کی اشاعت کا سال

نسخۂ حمیدیہ کے جو نسخے عام طور پر دستیاب ہوتے ہیں ان میں سے کسی ایک میں بھی سنہ طباعت موجود نہیں۔ اس کی وجہ سے غالب پر کام کرنے والوں کو بعض اوقات زحمت بھی پیش آتی ہے۔ آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اس ایڈیشن کی ایک کاپی کے سرورق پر حسب ذیل عبارت چھپی ہے۔

''مفید عام اسٹیم پریس آگرہ میں محمد قادر علی خاں صوفی کے اہتمام سے چھپا۔''

اس عبارت میں تقریباً اسٹیم پریس کے اوپر خفی خط میں '1921' لکھا ہوا ہے، نیز اس سطر کے نیچے لکھا ہے۔

قیمت مجلد 4 ہے۔ منتظر امروہوی کتابت نمود قیمت غیر مجلد 8 آنہ۔

اس صراحت کے بعد شبہ نہیں رہتا کہ نسخۂ حمیدہ 1921 میں طبع ہوا تھا، نیز معلوم ہوتا ہے کہ پھر کسی وجہ سے (جو قیمت کا معاملہ ہوسکتا ہے) دوسرا سرورق آگرے میں چھپوایا گیا اس میں مطبع اور قیمت کا اظہار ان لفظوں میں ہوا۔

''مفید عام اسٹیم پریس آگرہ میں باہتمام محمد قادر علی خاں صوفی طبع ہوا۔ قیمت مجلد صہ [پانچ]، منتظر امروہوی تحریر نمود قیمت غیر مجلد للعہ [چار]۔

اس سرورق کے بعد پھر ضرورت ہوئی کہ کچھ اور کاپیاں سرورق کی نکلوائی جائیں۔ اب یہ کام بھوپال میں ہوا اور عبارت یوں لکھی گئی۔

''صرف ٹائٹیل گورنمنٹ پریس بھوپال میں طبع ہوا۔''

قیمت مجلد صہ [پانچ]، (کتبہ نصیر الدین) غیر مجلد للعہ [چار]۔

ہماری زبان، 8 اگست 1961

ان دونوں سرورقوں کے ساتھ سنہ طباعت نہیں ہے جس کی وجہ یہ ہوگی کہ یہ دونوں 1921 کے بعد تیار کرائے گئے تھے اگر ان کے ساتھ 21 لکھتے تو غلط ہوتا، اور دوسرا سنہ لکھتے تو شبہ ہوسکتا تھا کہ یہ سنہ اصل نسخے کی طباعت کا ہے اور یہ لکھنا کسی وجہ سے مناسب نہ ہوتا کہ صرف سرورق فلاں سنہ میں چھاپا گیا۔

یہ تصریح نامناسب نہ ہوگی کہ آخری دونوں سرورق کے نسخے رضا لائبریری میں بھی موجود ہیں۔



نسخۂ حمیدیہ اور بجنوری

نومبر 49ء میں پروفیسر سید احتشام حسین صاحب کو نسخۂ حمیدیہ کی ایک کاپی ملی تھی، جو محمد احتشام الدین دہلوی کی ملک رہ چکی تھی، اس کاپی کے اندر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے مقدمے کے آخر میں مالک نسخہ کا ایک نوٹ مورخہ 11/مئی 1937 درج ہے اس کے ضروری حصے یہ ہیں:[1]

"یہ غلط ہے کہ بجنوری مرحوم نے یہ دیباچہ غالب کے نسخۂ دیوانِ معدوم کی دستیابی سے پہلے لکھا تھا۔نہیں، بلکہ دستیاب ہونے پر اُن کو مکمل کلام غالب کے شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا، اور یہ مقدمہ اس ارادہ کی پیروی میں لکھا گیا۔اس کے لکھنے کے بعد وہ ایک بار علی گڑھ آئے اور راقم کے پاس دو ایک روز مہمان رہے۔ یہ مقدمہ پنسل سے لکھا ہوا، کٹا پھٹا ان کے پاس موجود تھا، اور انھوں نے خود اپنی زبان سے اس کو پڑھ کر سنایا اور طباعت کے متعلق مشورے کیے۔"

اس نوٹ پر پروفیسر احتشام حسین صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا ضروری حصہ یہ ہے:

"غالب شناسوں کے لیے اس عبارت میں بہت سا دلچسپ مواد ہے... اس سے خود مفتی انوارالحق کے اس بیان کی تکذیب ہوتی ہے کہ ڈاکٹر بجنوری نے مقدمہ متداول نسخوں کو سامنے رکھ کر لکھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ممکن ہے مرحوم اس تبصرہ پر نظر ثانی کرتے، کیونکہ ابھی تک انھوں اس مضمون کو ختم نہیں کیا تھا اور قرین قیاس ہے کہ اس میں اور کچھ رد و بدل ہوتا، کیونکہ جو کچھ لکھا گیا تھا وہ

---

1. اس تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہماری زبان علی گڑھ بابت یکم مارچ 1961، باب مراسلات مئی 1961

العلم کراچی، اپریل تا جون 1969

> مروجہ اور مطبوعہ دیوان کے متعلق تھا، اور اب ایک سو برس کے قلمی دیوان میں
> غالب کا غیر مطبوعہ اور قلمزدہ کلام مل جانے سے میدان سخن فراغ ہو گیا تھا...
> لیکن افسوس کہ ان کی مرگِ بے ہنگام نے بہت عجلت کی...

مفتی انوارالحق نے یہ بھی لکھا ہے کہ بجنوری نے انجمن ترقی اردو ہند کے لیے دیوان غالب اردو کا نیا ایڈیشن تیار کرنا منظور کیا تھا۔ یہ مقدمہ اسی کے لیے لکھا گیا تھا۔

مولوی احتشام الدین دہلوی قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ مقدمہ نسخۂ دیوان معدوم کے دستیاب ہونے کے بعد لکھا گیا۔ اور خود بجنوری نے انھیں مقدمہ کا مسودہ دکھایا۔

یہ معمولی سا مسئلہ کہ بجنوری نے یہ مقدمہ کس دیوان کو سامنے رکھ کر لکھا اس لیے یہ معمہ بن جاتا ہے کہ ان کے مقدمہ میں نسخۂ حمیدیہ کے مخصوص اشعار کے حوالے نہیں ملے۔ مگر مولوی احتشام الدین کو اصرار ہے کہ بجنوری نے اسے سامنے رکھا تھا...

ان دونوں بزرگوں کی تحریریں پڑھ کر حسب ذیل سوال پیدا ہوتے ہیں:

(1) کیا انجمن ترقی اردو نے بجنوری سے دیوان غالب مرتب کر دینے کی فرمائش کی تھی؟

(2) کیا بجنوری نے اس نسخے کے لیے کوئی مقدمہ بھی لکھا تھا؟

(3) محاسنِ کلام غالب کے نام سے دیوان غالب پر بجنوری کا جو تبصرہ انجمن ترقی اردو نے پہلے اپنے رسالہ اردو بابت ماہ جنوری 21 میں اور پھر اسی سال علی گڑھ سے کتابی شکل میں شائع کیا تھا، کیا وہ یہی مقدمہ ہے جو انجمن کے مجوزہ ایڈیشن کے لیے لکھا گیا تھا؟

(4) کیا بجنوری نے یہ مقدمہ لکھتے وقت صرف متداول دیوان ہی کو سامنے رکھا تھا؟

(5) کیا نسخۂ بھوپال جو نسخۂ حمیدیہ مطبوعہ کی اصل ہے، بجنوری کی زندگی میں دستیاب ہو گیا تھا؟

(6) کیا بجنوری نے اس نسخے پر کچھ کام کرنا شروع کر دیا تھا جو ان کی موت کے باعث نامکمل رہ گیا؟

(7) اس کام کی نوعیت کیا تھی؟

پہلا سوال: اس سوال کا حل مولوی عبدالحق صاحب کے اس نوٹ میں موجود ہے جو انھوں نے محاسنِ کلام غالب مطبوعہ 1921 پر بطور پیش لفظ لکھا تھا۔ وہ فرماتے ہیں:

> انجمن ترقی اردو کا ایک مدت سے ارادہ تھا کہ مرزا غالب کے اردو دیوان کا
> ایک نفیس صحیح جدید ایڈیشن طبع کرے۔ چنانچہ بڑی کوشش اور تحقیق سے یہ

دیوان مرتب کیا گیا۔

میری درخواست پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے اس کے لیے بطور مقدمہ کے غالب کے کلام پر تبصرہ لکھنا شروع کیا۔

اس اثنا میں اتفاق سے بھوپال کے سرکاری کتب خانہ میں مرزا صاحب کے قدیم دیوان کا مکمل نسخہ نکل آیا، جس میں وہ تمام نظمیں درج تھیں جو بعد میں خارج کردی گئی تھیں علمی لحاظ سے یہ ایک بڑی نعمت اور بیش بہا خزانہ تھا۔

مرحوم نے انجمن کے لیے اسے ترتیب دینا شروع کیا۔

لیکن افسوس اجل نے اتنی مہلت نہ دی کہ اس کی تکمیل ہوجاتی اور یہ ہونہار نوجوان جو علم و اخلاق کا پتلا تھا بے وقت اس دنیا سے کوچ کرگیا۔

یہ مضمون جو زورِ بیان، جدتِ فکر اور بلندیِ خیالات کے لحاظ سے اردو زبان میں بالکل ایک نئی چیز ہے مرحوم کی یادگار میں سب سے اوّل رسالہ اردو میں شائع ہوا تھا، اور اب مستقل کتاب کی شکل میں چھاپا جاتا ہے۔

اس پیش لفظ سے یہ امر تو بصراحت معلوم ہوجاتا ہے کہ انجمن نے ایک نیا نسخہ تیار کرایا تھا مگر اسے کس نے مرتب کیا تھا۔ اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ہاں اس پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش بجنوری مرحوم سے ضرور کی گئی تھی جو انھوں نے پوری بھی کردی تھی۔

اس سلسلے میں مفتی انوار الحق صاحب نے نسخۂ حمیدیہ کے دیباچے میں لکھا ہے:

"جب انجمن ترقی اردو نے دیوان غالب اردو کی ایک نئی اشاعت کا ارادہ کیا تو نظرِ انتخاب مرحوم ہی پر پڑی اور انھوں نے بھی اس ملکی اور ادبی خدمت کو بطیبِ خاطر قبول کیا اور اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ اس کام کے لیے ان سے زیادہ موزوں کوئی شخص نہ تھا۔

مرحوم نے بڑے اہتمام سے اس کے سرانجام کا قصد کیا۔ سب سے پہلے دیوان غالب کے مختلف اور متداول نسخے بہم پہنچا کر نہایت احتیاط سے اس کی تصحیح کی اور اس کے ساتھ ہی غالب کی شاعری پر ایک ضخیم اور بسیط تبصرہ لکھنا شروع کیا۔"

اس بیان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ترتیب و تصحیح دیوان کی خدمت بجنوری ہی کے

ذمے عائد کی گئی تھی اور انھوں نے اسے نہایت ضابطے سے انجام دیا تھا یعنی پہلے دیوان کے متداول نسخے اکٹھے کیے گئے تھے اور ان کی مدد سے ایک صحیح نسخہ تیار کیا تھا۔

یہ بات مفتی صاحب کو کیسے معلوم ہوئی خود بجنوری مرحوم کی زبانی یا کسی اور سے، اس کا انھوں نے ذکر نہیں کیا۔ ہوسکتا ہے کہ ان کا بیان صحیح ہو اور مولوی عبدالحق صاحب نے کسی وجہ سے اس کی صراحت مناسب نہ خیال کی ہو۔ اب تنہا وہی بتا سکتے ہیں کہ انجمن کے لیے انھوں نے بجنوری مرحوم سے دیوان مرتب کرایا تھا یا نہیں، اور وہ نسخہ جو بقول انوارالحق مرتب ہو چکا تھا کہاں گیا۔[1]

دوسرا اور تیسرا سوال: مولوی صاحب کے پیش لفظ اور مفتی صاحب کے بیان محولہ بالا سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ بجنوری نے دیوان غالب پر تبصرہ لکھا تھا اور وہ تبصرہ وہی ہے جو محاسن کلام غالب کے نام سے انجمن نے چھاپا اور اس کے بعد نسخۂ حمیدیہ میں بھی شامل کرلیا گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ بجنوری جس زمانے میں یہ مقدمہ لکھ رہے تھے اپنے دوستوں سے بھی اس کا ذکر کرتے تھے۔ مولوی احتشام الدین نے بصراحت کہا کہ مرحوم نے علی گڑھ میں انھیں اس کا کٹا پھٹا مسودہ پڑھ کر سنایا تھا ان کے ماسوا ڈاکٹر سید محمود صاحب نے بھی اپنے مقدمہ دیوان غالب (نظامی ایڈیشن طبع سوم 1920) میں بجنوری کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> اس نئے دور میں مغربی تعلیم نے ہندوستان میں ایک ایسا نوجوان پیدا کیا تھا جس نے مرزا غالب کی عظمت حقیقی معنوں میں پہچانی تھی اور جو غالب کے کلام کو ایسے حسن معانی کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کرنے والا تھا جس سے فلسفی اور صوفی، شاعر اور سائنس داں سب متحیر رہ جاتے۔
>
> ''آہ، عبدالرحمٰن! عمر نے تیرے ساتھ وفا نہ کی اور تو ملک اور قوم کی یہ عظیم الشان خدمت انجام نہ دے سکا۔
>
> غالب نے ایسے ہی موقعہ کے لیے اور شاید تیرے ہی واسطے یہ کہا ہو:

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی رحمٰن　　　کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

1۔ حال ہی میں ایک ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ یہ دیوان مولوی عبدالحق مرحوم نے سید ہاشمی فریدآبادی مرحوم سے مرتب کرایا تھا۔ ممکن ہے انجمن ترقی اردو پاکستان کے کتب خانے میں یہ اب بھی موجود ہو۔

2۔ یہ مضمون مولوی عبدالحق مرحوم کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔

> یہ نوجوان، فلسفی، جو شاعرانہ تخیل سے بھی بہرہ ور تھا، ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس وید اور دیوان غالب۔"

ان لفظوں سے مترشح ہے کہ ڈاکٹر صاحب یہ عبارت لکھتے وقت بجنوری کے تبصرہ لکھنے سے واقف تھے۔ موصوف نے یہ مقدمہ 8/اکتوبر 1919 کو ختم کیا تھا اور اس تاریخ تک محاسن کلام غالب رسالہ اردو میں بھی شائع نہ ہوا تھا جو موصوف اسے مطبوعہ شکل میں پڑھ کر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے، اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ انھوں نے بھی اس تبصرے کا ذکر یا تو خود ہی بجنوری مرحوم سے سنا ہوگا، یا ان کے اور اپنے مشترک دوست کی زبانی جانا ہوگا چونکہ آخری پیراگراف میں ''الہامی دو کتابیں ہیں'' والی بات ''کو کہا کرتا تھا'' سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس مقدمے کے اہم حالات سے براہِ راست واقفیت رکھتے تھے۔

چوتھا سوال: اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ''جی ہاں، بجنوری نے اپنا تبصرہ صرف متداول دیوان غالب ہی کو سامنے رکھ کر لکھا تھا۔

1. پہلی دلیل تو وہ ہے جس... کی طرف پروفیسر احتشام صاحب نے ان لفظوں سے اشارہ کیا ہے کہ ''ان کے مقدمے میں نسخۂ حمیدیہ کے مخصوص اشعار کے حوالے نہیں ملے۔'' واقعہ یہ ہے کہ بجنوری جیسا شخص تبصرہ لکھتے وقت نسخۂ حمیدیہ کو پا گیا ہوتا تو ناممکن تھا کہ وہ مرزا صاحب کے منسوخ الہام کی فلک پیمائی پر زمین آسمان کے قلابے نہ ملا دیتا۔ لہٰذا قلمزد اشعار پر مقدمے میں ایک ادنیٰ سا اشارہ بھی نہ کرنا بتاتا ہے کہ وہ اس نسخے کی دستیابی سے پہلے اپنا تبصرہ مکمل کر چکے تھے اور مفتی صاحب نے بجا لکھا ہے کہ۔

> ممکن ہے کہ مرحوم اس تبصرے پر نظر ثانی کرتے، کیونکہ ابھی تک انھوں نے اسے ختم نہیں کیا تھا اور قرین قیاس ہے کہ اس میں کچھ رد بدل ہوتا کیونکہ جو کچھ لکھا گیا تھا وہ مروجہ اور مطبوعہ دیوان کے متعلق تھا اور اب ایک سو برس کے قلمی دیوان میں غالب کا غیر مطبوعہ اور قلمزد کلام مل جانے سے میدانِ سخن فراخ ہو گیا تھا۔ مقابلے کے لیے نئے نئے مضمون ہاتھ آگئے تھے اور مرحوم کی نکتہ رس اور دقیقہ سنجی کے لیے نہایت وسیع جولانگاہ مہیا ہو گیا تھا۔ (ص 29)

2. دوسری دلیل جو اس بحث کو بالکل ختم کر دیتی ہے یہ ہے کہ بجنوری نے اپنے تبصرے میں

دیوان غالب کی غزلوں اوران کے اشعار کی تعداد بتائی ہے۔فرماتے ہیں:

''غالبؔ کا دیوان علاوہ قصائد و رباعیات 185 غزلوں سے جن میں ایک ہزار چار سو چھپن اشعار ہیں، زیادہ نہیں، (صفحہ 38)

یہ تصریح صرف نسخۂ حمیدیہ کے ساتھ شائع شدہ مقدمۂ بجنوری میں ہوتی تو شبہ کیا جاسکتا تھا کہ مفتی صاحب نے اپنی طرف سے اس کا اضافہ کردیا ہے۔لیکن حسن اتفاق سے یہ پوری عبارت محاسن کلامِ غالب مطبوعہ انجمن ترقی اردو 1921 کے صفحۂ 5 پر بھی موجود ہے چونکہ یہ تعداد نہ نسخۂ بھوپال کی غزلوں اور ان کے اشعار کی ہے، نہ نسخۂ حمیدیہ کی غزلوں اور ان کے اشعار کی، بلکہ مرزا صاحب کے دیوان متداول کی غزلوں اوران کے شعروں کی ہے، اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ بجنوری نے اپنے تبصرے میں صرف دیوان متداول ہی کو استعمال کیا تھا نیز ان کے دلائل کے پیش نظر:

(1) مولوی احتشام الدین دہلوی کا یہ بیان محل نظر قرار پائے گا کہ ''یہ غلط ہے کہ بجنوری مرحوم نے یہ دیباچہ غالب کے نسخۂ دیوان معدوم کی دستیابی سے پہلے لکھا تھا۔نہیں، بلکہ دستیاب ہونے پر ان کو مکمل کلام غالبؔ کے شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا اور یہ مقدمہ اس ارادے کی پیروی میں لکھا گیا۔'' اور

(2) اس کے برخلاف مفتی صاحب کا بجنوری کے مذکورہ بالا بیان پر حاشیہ صحیح مانا جائے گا۔ چونکہ یہ مقدمہ جدید قلمی نسخے کے ملنے سے پہلے لکھا جاچکا تھا، اس سبب سے اس تعداد میں صرف قدیم مطبوعہ دیوان کے شعر شمار کیے گئے ہیں (صفحہ 38 کا حاشیہ نمبر 1)

پانچواں سوال: جہاں تک مفتی کا تعلق ہے۔انھوں نے کہیں اس کا اظہار نہیں کیا کہ نسخۂ بھوپال بجنوری کی زندگی میں دستیاب ہوا بلکہ ان کی عبارتوں سے اس کے خلاف مترشح ہوتا ہے۔اس سلسلے میں ان کی یہ عبارتیں قابل غور ہیں:

(1) غالب کے انتقال کے پورے پچاس برس بعد اس صحیفے کو دنیا میں رونما کیا جو پوری ایک صدی سے گوشۂ خفا میں پڑا ہوا تھا اور جس کے وجود کا کسی کو سان و گمان بھی نہ تھا۔'' (تمہید ص 3)

(2) اب ایک سو برس کے قلمی دیوان میں غالب کا غیر مطبوعہ اور قلمزدہ کلام مل جانے سے میدانِ سخن فراخ ہوگیا تھا۔(تمہید، ص 29)

غالبؔ کا انتقال 15 فروری 1869 کو ہوا تھا ان کے انتقال کے پورے پچاس برس بعد نسخۂ بھوپال کے نکلنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ 15 فروری 1919 کے لگ بھگ یہ نسخہ دستیاب ہوا تھا اور ایک صدی تک گوشۂ خفا میں پڑے رہنے کے بعد دیوان کے منظر عام پر آنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ اپنی تاریخ کتابت یکم نومبر 1821 کے سو برس بعد یعنی نومبر 1921 میں دستیاب ہوا تھا۔

ان دونوں تاریخوں کے تضاد کے باوجود یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ کم از کم فروری 1919 سے پہلے دیوان نہیں ملا تھا۔ چونکہ بجنوری مرحوم نے معارف ماہ نومبر 1918 کے شذرات کے مطابق[1]، 7 نومبر 1918 کو بھوپال میں انتقال کیا تھا۔ اس لیے اس سے یہ بھی ترشح ہوگیا کہ ان کے انتقال کے بعد یہ نسخہ ملا تھا لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے اوّلاً اس لیے کہ مولوی عبدالحق صاحب نے صراحت کی ہے کہ نہ صرف بجنوری کی حیات میں یہ نسخہ مل چکا تھا بلکہ انھوں نے انجمن کے لیے اس پر کام بھی شروع کر دیا تھا۔ دوسرے اس بنا پر کہ معارف ستمبر 18 کے شذرات میں اس نسخے کے ذکر کے ساتھ یہ اطلاع بھی[2] دی گئی ہے کہ آج کل یہ بجنوری کے زیر مطالعہ ہے۔ عنقریب نتائج فکر منظر عام پر آنے والے ہیں۔

ان شہادتوں کے بعد کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ اس دعویٰ کی صحت میں کہ نسخۂ بھوپال بجنوری کی زندگی میں نکل آیا تھا اور انھوں نے اس پر کام بھی شروع کر دیا تھا۔

چھٹا سوال: مذکورہ بالا بیان سے اس سوال کا جواب بھی بآسانی دیا جاسکتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ بجنوری نے اس نسخے پر کام شروع کر دیا تھا مگر ان کی موت نے اسے ناتمام رکھا۔

ساتواں سوال: چونکہ مولوی عبدالحق صاحب اور سید سلیمان ندوی صاحب دونوں نے ان کے کام کی نوعیت پر مطلق روشنی نہیں ڈالی۔ اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے متن کی ترتیب کا کیا ڈول رکھا تھا۔ ممکن ہے مفتی صاحب نے جس طرح مرتب کیا ہے، یہی ان کا نقشہ ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اور طرح پر کام کرنا چاہتے ہوں، اور ان کا کیا ہوا کام ضائع ہوگیا ہو۔

یہاں سوئے ظن سے کام لینے والا کہہ سکتا ہے کہ مفتی صاحب نے جو کام اپنے نام سے شائع کیا ہے یہ سب یا اس کا بڑا حصہ بجنوری کا انجام دیا ہوا تھا۔ لیکن پہلے تو انھوں نے بجنوری

---

1. یہ دونوں اطلاعات مختار الدین احمد صاحب آرزو نے مہیا فرمائی ہیں۔

2. یہ دونوں اطلاعات مختار الدین احمد صاحب آرزو نے مہیا فرمائی ہیں۔

کا تذکرہ جس محبت اور افسوس کے ساتھ کیا ہے، اس کا تقاضہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ ان کے کام کو چھپا جاتے۔ دوسرے نواب حمیداللہ خاں کے تعلقات بجنوری سے بہت گہرے تھے اور خود انھیں اس دیوان سے بھی دلچسپی تھی، چنانچہ ان کا پیش لفظ بھی دیوان کے شروع میں موجود ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ بجنوری کے کام سے جو بھوپال ہی میں کیا جارہا تھا، وہ ناواقف رہتے اور یہ بھی ناممکن تھا کہ ان کے علم میں سب کچھ ہوتے ہوئے مفتی صاحب جرأت کر کے نواب صاحب کے دوست کے کام کو اپنا کہہ کر پیش کر دیتے اس طرح یہ بھی ناقابل یقین ہے کہ اپنے پیش لفظ میں نواب صاحب ڈاکٹر بجنوری کے کام کی داد نہ دیتے۔

ان باتوں کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ مولوی عبدالحق صاحب کی فرمائش پر یہ کام ہورہا تھا اس لیے ان کا اس کام کی تفصیل سے بھی واقف ہونا ضروری تھا اگر یہ سب کام جو مفتی صاحب نے شائع کیا ہے بجنوری کا ہوتا تو ناممکن تھا کہ مولوی صاحب خاموش رہ جاتے اور مفتی صاحب کا پردہ چاک نہ کر دیتے۔



نسخۂ حمیدیہ کی فروگزاشتیں

نسخۂ بھوپال کی روشنی میں

میرزا غالب نے اپنا منتخب دیوان ریختہ مرتب کر کے خارج اشعار کے متعلق دیباچہ میں حسب ذیل الفاظ لکھے تھے:

> ''امید کہ سخن سرایان سخن درستائی، پراگندہ ابیاتی را کہ خارج ازیں اوراق یابند، از آثار تراوش رگِ کلکِ این نامہ سیاہ نشناسند، وچہ گرد آور را در ستایش و نکوہشِ آن اشعار ممنون و ماخوذ نسگالند۔''

لیکن ان کی اس ہدایت کے باوجود جب ملک میں نسخۂ حمیدیہ شائع ہوا، اور میرزا صاحب کے دیوان قدیم کے نظری اشعار اہل ذوق کے سامنے لائے گئے تو ان کی عمومی بے لطفی کے باوجود اس انکشاف کو بہت بڑا ادبی کارنامہ تسلیم کیا گیا۔

فی الحقیقت ریاست بھوپال کے ''کتاب خانۂ حمیدیہ'' کا یہ شرف لایق صد تحسین و آفریں ہے کہ اس نے اس مجموعے کو عرصہ دراز تک محفوظ رکھا، ورنہ آج اس عدیم المثال شاعر کی تدریجی ترقی کا مطالعہ ناممکن تھا اور ریاست بھوپال مستحق تبریک ہے کہ اس نے مفتی انوار الحق صاحب ایم اے مرحوم خلف مولانا عبداللہ صاحب ٹونکی مرحوم کو اس کی ترتیب کا ذمہ دار قرار دیا۔ مفتی صاحب جدید اصول ترتیب سے بڑی حد تک واقف تھے، انھوں نے اس کام کو محنت سے انجام دیتے ہوئے ترتیب کا اچھوتا مگر قدرے مشکل انداز اختیار کیا لیکن وہ ریاست کے اعلیٰ عہدے دار تھے اور بہر حال اس عہدے کے فرائض، اہم اور زیادہ توجہ کے مستحق تھے، اس بنا پر ہمہ تن محقق و مفتش کا سا کام نہ کر سکے اور چھوٹی بڑی کوتاہیاں راہ پا گئیں اور یوں بھی انسان سہو و خطا کا پتلا ہے۔

مجھے عرصے سے دیوان غالب اردو کے نسخوں میں اس سب سے پرانے اور اہم نسخے کی

نیا دور لکھنؤ، مئی 1969

زیارت کا شوق تھا۔ خوش قسمتی سے کل ہند انجمن ترقی اردو کے اجلاس ناگپور منعقدہ 19, 20, 21 جنوری 1944 سے واپسی میں دو روز بھوپال میں قیام کا موقع مل گیا۔ اس بہانے سے میں نے نسخۂ بھوپال یعنی نسخۂ حمیدیہ کے اصل کی زیارت اور اصل ونقل کا مقابلہ کرنے کا کچھ وقت نکال لیا۔ اس مختصر سے وقت میں جو کچھ نوٹ میں نے لے لیے تھے انھیں نسخۂ عرشی کے دیباچے اور حواشی میں پیش کر چکا ہوں۔ لیکن نسخۂ بھوپال کے ضائع ہو جانے کی وجہ سے ان نوٹس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے، اس لیے علیحدہ مضمون کی شکل میں یکجا پیش کرنا مناسب جانتا ہوں تاکہ وہ حضرات جن کے پاس نسخۂ حمیدیہ ہے اپنے اپنے نسخوں میں تصحیح واضافہ کر سکیں۔ پہلے اس گم شدہ متاعِ بے بہا کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے:

اس مخطوطے کا ناپ 22x29ء 8 اور کاغذ عمدہ کشمیری ہے۔ جدولیں رنگین اور طلائی اور باریک لاجوردی ہے۔ روشنائی سیاہ اور عنوانات شنجرفی ہیں۔

شروع میں فوج دار محمد خاں[1] بہادر کی مہر ہے، جس میں 1261ھ (1845) منقوش ہے۔ ابتدائی سادہ اوراق میں سے پہلے دو ورقوں پر جو کھردرے کاغذ کے ہیں وہ فارسی غیر منقوط خط نقل کیا گیا ہے جو میرزا صاحب نے مولانا فضل حق خیرآبادی مرحوم کو لکھا تھا۔[2] ان دونوں ورقوں کے بعد دو اور انگریزی کاغذ کے ورق ہیں، جن میں سے پہلے کے رخ ب میں شمسے کے اندر لکھا ہے:

> ''دیوان ہذا من تصنیف میرزا نوشاہ دہلوی المتخلص بہ اسد۔ از کتب خانۂ سرکار فیض آثار عالی جاہ عالم پناہ میاں فوج دار محمد خاں بہادر، دام اقبالہ قلمی خوش خط۔''

دوسرے ورق کے رُخ الف میں شمسے کے اندر فوج دار محمد خاں کی بڑی مہر ہے جس میں بخط طغرئ عربی ''فوج دار محمد خاں بہادر'' منقوش ہے۔ اس مہر کا سنہ 1261ھ ہے۔ اصل دیوان کے ورق 1 الف پر انھیں صاحب کی دو چھوٹی مہریں ثبت ہیں، جن میں سنہ 1248ھ (1832) منقوش ہے۔ یہ مہر کتاب کے اندر بھی کئی جگہ نظر آتی ہے۔

دیوان کا آغاز رنگین اور طلائی لوح کے تحت ہوا ہے، اور شروع میں قصائد درج ہیں۔

---

1. موصوف الذکر، نواب غوث محمد خاں بہادر کے بیٹے اور نواب سکندر جہاں بیگم والیہ بھوپال کے چھوٹے ماموں تھے۔ انھوں نے ذی الحجہ 1281 (مئی 1865) میں انتقال کیا۔
2. کلیات نثر، پنج آہنگ 63

سب سے پہلا قصیدہ فارسی کا ہے جس کا آغاز ہے: ''بہر ترویج جنابِ والیِ یوم الحساب[1]'' یہ قصیدہ ورق 1 ب سے شروع ہو کر 4 الف پر ختم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد 4 الف کی آخری سطر سے ''قصیدہ حیدری بہ تمہید بہار مغفرت'' شروع ہوا ہے، جس کا آغاز ہے: ساز یکذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار۔ اس کا انجام ورق 9 ب کی سطر 2 پر ہوا ہے۔ اس کے بعد ایضاً فی المسبت کے عنوان سے دوسرا اردو قصیدہ ملتا ہے جس کا آغاز ہے: توڑے ہے عجز تنک حوصلہ بر روئی زمیں، یہ قصیدہ ورق 9 ب کی سطر 3 سے شروع ہو کر ورق 12 ب پر ختم ہوا ہے۔ اس کے بعد اسی عنوان سے تیسرا قصیدہ شروع ہوتا ہے: جو نہ نقد داغ دل کی کرے شعلہ پاسبانی۔ یہ ورق 12 ب کی سطر 6 سے شروع ہو کر ورق 14 الف پر تمام ہوتا ہے۔

ورق 15 ب۔ دوسری رنگین اور طلائی لوح کے تحت غزلیں شروع ہوئی ہیں۔ اس پورے حصے میں دو غزلوں کے درمیان ایک سطر سادہ چھوڑی گئی ہے۔ ان سادہ جگہوں میں معمولی بدخط میں جگہ جگہ ''ولہ'' لکھا گیا ہے۔ میری رائے میں یہ بدمذاقی مرزا صاحب سے ممکن نہ تھی۔

آخر میں کاتب نسخہ نے شنجرفی روشنائی سے لکھا ہے: ''دیوانِ من تصنیف مرزا صاحب و قبلہ المتخلص بہ اسد و غالب، سلمہم ربہم علی ید العبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ پنجم شہر صفر المظفر 1237 من الہجرۃ النبویہ صورت اتمام یافت۔''

اس عبارت کے نیچے پھر فوج دار محمد خاں کی چھوٹی مہر ہے۔

دیوان کے متن اور حواشی دونوں میں جگہ جگہ اصلاحیں اور اضافے نظر آتے ہیں۔ ان کا قلم، روشنائی اور روش خط تینوں مختلف ہیں، جن سے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کام مختلف اوقات میں انجام دیا گیا ہے۔ دیوان کے آخری سادہ اوراق میں بھی بعد کی کہی ہوئی غزلیں لکھی ہیں، مگر یہ سب ردیف یا کی ہیں۔ حک و اضافے کا خط جگہ جگہ میرزا صاحب کے اس خط سے ملتا ہوا ہے جس سے ہم آشنا ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر وہ بالیقین میرزا صاحب کا نہیں معلوم ہوتا جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انھوں نے سرخوشی یا کسی دوسری وجہ سے کسی اور سے بھی یہ کام لیا ہے۔

کچھ غزلوں کے آغاز کی سادہ جگہوں میں لفظ 'غلط' لکھا گیا ہے اور بعض غزلوں پر صرف 'غ' اس طرح لکھا گیا ہے کہ اس کا سر مطلع کے دونوں مصرعوں کے بیچ میں آیا ہے اور دائرے نے ساری غزل کو گھیر لیا ہے۔ یہ سب غزلیں وہ ہیں جو نسخۂ شیرانی میں شامل نہیں کی گئی ہیں۔

1۔ ملاحظہ ہو کلیات نظم فارسی 47 جہاں یہ بہ عنوان قطعہ 60 فاتحہ مندرج ہے۔

چند غزلوں کے مقابل حاشیے پر مکرر نوشتہ شدہ لکھا ہوا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان عبدالعلی نام کے کسی صاحبِ ذوق کے مطالعے میں رہ چکا ہے۔[1] انھوں نے کئی جگہ اپنی پسندیدگی کے اشعار کا اظہار حاشیوں پر صاد بنا کر کیا ہے اور اکثر جگہ اس صاد کے ساتھ اپنا نام بھی لکھا ہے۔ پہلی غزل کے شعر آتشیں پا ہوں گداز وحشت زنداں نہ پوچھ الخ کے مقابل حاشیے پر لکھا ہے ''عبدالعلی'' اسی طرح ''نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا'' کے مقابل بھی یہی لکھا گیا ہے نیز اسی غزل کے تیسرے شعر کے مقابل لکھا ہے ''منہ۔'' ردیف غ کی پہلی غزل: عشاق اشک چشم سے دھوئیں ہزار داغ'' کے متعدد شعروں کے مقابل ''پسند عبدالعلی منہ'' لکھا ہے۔ اس ردیف کی دوسری غزل کے مقابل لکھا ہے ''پسند خاطر عبدالعلی۔''

ورق 28 ب کے اوپر کے حاشیے میں لکھا ہے ''مقابلہ کردہ شد۔'' یہ جس قلم میں ہے وہ اندرونی تغیرات کے قلم سے مشابہ ہے۔

ورق 29 الف کے حاشیے میں باریکے کے اندر لکھا ہے ''محمد عبدالصمد مظہر'' میرے لیے یہ صاحب بھی انجان ہیں۔ آخری سادہ اوراق میں جو غزلیں بہ خط بد اضافہ کی گئی ہیں ان میں کی آخری غزل ''مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے'' کے آخر میں اسی قلم سے لکھا ہے ''دیکھ تو عکس قد یار لبِ جو پر سے'' تمام شد۔ کار من نظام شد۔ رب یسر وتمم بالخیر۔''

بدنما خط میں جو اضافے یا اصلاحیں ہیں، ان میں املے کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں، مثلاً ''فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضہ ہے'' میں تقاضا کو ''تقھا'' لکھا ہے یا ''وارستگی، بہانہ بیگانگی نہیں'' میں ''بہانیے'' یا ''بوسے میں وہ مضائقہ نہ کرے'' میں ''مضاعقۃ'' یا ''ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست'' میں ''زرہ'' یا ''رنگ ہے سنگِ محک، دعویٰ بینائی عبث'' میں 'سنگ مہک' یا ''خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں'' میں ''بھاگے نگے'' یا ''آ گہی گر نہیں غفلت ہی سہی'' میں ''غلفت'' لکھ دیا ہے۔ اس قسم کی غلطیاں غالب جیسے شخص سے 25 سال کی عمر میں سخت حیرت انگیز ہیں اس لیے اس کے باوجود کہ عام طور پر اس انداز کا حک واضافہ

---

[1] خاندان ریاست رام پور کے ایک صاحب عبدالعلی خاں بہادر ابن نواب غلام محمد خاں بہادر تھے۔ یہ نواب عبداللہ خاں بہادر صدر الصدور میرٹھ کے بھائی تھے، اور صدر الصدور سے میرزا صاحب کے تعلقات ہمیں معلوم ہیں۔

بخط مصنف ہوتا ہے اور اندرون کلام میں قلم زدگی و اصلاح خود غالب کے قلم سے ہونا چاہیے، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بدنما خط کے اندراجات بخط غالب نہیں ہیں۔

مفتی صاحب کی رائے میں یہ نسخہ لکھا تو گیا تھا فوج دار محمد خاں بہادر بھوپالی کے لیے، لیکن کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کہ چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا اور ان کی نظر سے گزرا۔[1] لیکن یہ خیال درست نہیں۔ فی الحقیقت یہ میرزا صاحب ہی کے لیے لکھا گیا تھا اور نسخۂ شیرانی کی تیاری تک انھیں کے پاس تھا۔ اس کے بعد عبدالعلی صاحب اور عبدالصمد مظہر کے پاس ہوتا ہوا فوج دار محمد خاں بہادر کے کتاب خانے میں پہنچا۔ بھوپال پہنچنے کا زمانہ کیا تھا اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا، لیکن 1248ھ والی مہر بتاتی ہے کہ بہر حال اس سال کے بعد ہی اسے وہاں باریابی حاصل ہوئی ہوگی، جو دیوان غالب کے متداول انتخاب کی تاریخ ترتیب و تالیف ہے۔

اب وہ تمام اغلاط جو اس مختصر سے وقت میں نوٹ کی جاسکی تھیں نسخۂ حمیدیہ کے صفحات کے مطابق پیش کرتا ہوں۔ چونکہ یہ سب مفتی صاحب مرحوم کے اختیار کردہ اصول پر مبنی ہیں اس لیے ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں بجز اس کے کہ انھیں اپنے اپنے نسخوں میں درج کرلیں۔ ملاحظہ ہو:

ص1: جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے — سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے — مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

یہ دونوں شعر اصل میں حاشیے پر خوشخط قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔ مگر مرتب نے اسے ظاہر نہیں کیا۔ یہ خط متن کے خط سے جدا ہے:

ص2: جنوں گرم انتظار و نالہ بیتابی کمند آیا — سویدا تا بلب زنجیر سے دود سپند آیا

اصل میں کاتب نے ''زنجیر دود سپند'' لکھ دیا تھا، میرزا صاحب نے اپنے قلم سے ''ی'' بڑھا کر ''زنجیری'' بنادیا ہے، اس کو مرتب نے ''زنجیر سے'' نقل کیا ہے:

ص2: ہوئی جس کو بہار فرصت ہستی سے آگاہی — برنگ لالہ جام بادہ برمحمل پسند آیا

اصل نسخے میں ہے: ''برنگ لالہ جامِ بادہ پرمحمل پسند آیا'':

ص2: جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، خون جگر ہدیہ — مبارک باد اسد، غمخوارِ جان دردمند آیا

---

[1] تمہید نسخۂ حمیدیہ:6

اصل کے اندر پہلے مصرع میں ''داغ جگر'' ہے:

ص 3: عالم جہاں بعرضِ بساط وجود تھا چوں صبح چاک جیب مجھے تار و پود تھا

اصل کے اندر دوسرے مصرع میں ''جوں صبح'' ہے۔

ص 3: اس غزل کا حسب ذیل شعر مرتب نے چھوڑ دیا ہے:

عالم طلسم شہر خموشاں ہے سربسر یا میں غریب کشور گفت و شنود تھا

تو یک جہاں قماشِ ہوس جمع کر، کہ میں حیرت مطاع عالم نقصان و سود تھا

اصل نسخے میں ''حیرت متاع'' ہے اور یہی درست ہے:

ص 5: شب نظارہ پرور تھا خواب میں خیال اس کا صبح موجۂ گل کو نقش بوریا پایا

اس شعر کے لفظ ''نقش'' پر مرتب نے یہ حاشیہ لکھا ہے: ''متن میں 'وقف' لکھا ہوا ہے، مگر اسے کاٹ کر حاشیے پر ''نقش'' بنایا ہے۔'' پہلے یہ عرض کر دوں کہ اصل نسخے میں یہ ترمیم حاشیے پر نہیں ہے، بلکہ بین السطور میں لفظ ''وقف'' کے اوپر کی گئی ہے بعد ازاں یہ گزارش کرنا ہے کہ مرتب نے مصرع اوّل میں لفظ ''خرام'' کی جگہ ''خیال'' چھاپ دیا ہے، جس سے شعر کا مطلب کہیں کا کہیں جا پڑا، مخطوطے میں یہ اس طرح ہے:

شب نظارہ پرور تھا خواب میں خرام اس کا

ص 5: ہے مکیں کی پاداری نام صاحب خانہ ہم نے تیرے کوچے نے نقش مدعا پایا

اصل میں مکیں کی جگہ ''نگیں'' اور ''ہم نے'' کے عوض ''ہم سے'' ہے۔

ص 5: نے اسد جفا سائل، نے سم جنوں مائل تجھ کو جس قدر ڈھونڈا، الفت آزما پایا

مخطوطے میں ''سم جنوں'' کی جگہ ''ستم جنوں مائل'' ہے۔

ص 5: عشرت ایجاد، چہ بوی و گل و کو دود چراغ جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا

اصل میں ''چہ بوی گل'' ہے اور یہی درست بھی ہے۔ نیز مصرع پر لا نہیں لکھا گیا بلکہ نسخے کی علامت ن بنا کر نیا مصرع لکھ دیا ہے مرتب نے یہ بھی نہیں بتایا کہ یہ اضافہ اصل کے حاشیے پر ہے:

ص 6: شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا قیس تصویر کے پردے سے بھی عریاں نکلا

اصل میں ہے: ''قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا۔'' اور یہی تمام قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں پایا جاتا ہے:

ص6: شور رسوائی دل دیکھ کے یک نالۂ شوق لاکھ پردے میں چھپا، پھر وہی عریاں نکلا
اصل میں دوسرے مصرع کے اندر ''پر وہی عریاں نکلا'' ہے اور یہی صحیح ہے:

ص7: دل گزرگاہ خیال مے و ساغر ہی سہی گر نفس جادہ سر منزل تقویٰ نہ ہوا
یہ شعر اصل نسخے کے حاشیے پر خوش خط قلم سے بڑھایا گیا ہے مگر مرتب نے اس کا اظہار نہیں کیا:

ص7: ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی گوش منت کش گلبانگِ تسلی نہ ہوا
اصل نسخے میں مصرع اوّل اس طرح ہے ''ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں راضی کہ کبھی۔'' دوسرے تمام قلمی اور مطبوعہ نسخے ''کرنے میں بھی پر'' متفق ہیں جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کاتب سے لفظ بھی چھوٹ گیا ہے۔ مطبوعہ میں ''کرنے میں بھی'' کی جگہ ''کرنے پہ بھی'' مرتب کا سہو ہے:

ص7: حیف اے ننگ تمنا کہ پی عرض حیا یک عرق آئینہ برجبۂ سائل باندھا
مرتب نے اس شعر کے پہلے مصرع پر یہ حاشیہ لکھا ہے: ''پہلے یہ مصرع یوں تھا: داغ اے حاجتِ بیدرد کہ در عرض حیا۔'' پھر اسے کاٹ کر اس صورت میں تبدیل کر دیا ہے۔ حالانکہ میرزا صاحب نے متن کے مصرع اوّل کو قلم زد نہیں کیا ہے، بلکہ اسی پر ''نسخہ'' کا ''ن'' بنا کر حاشیے پر دوسرا مصرع لکھ دیا ہے:

ص8: حسن آشفتگیِ، جلوہ سے عرض اعجاز دستِ موسیٰ سر دعوی باطل باندھا
اصل میں ہے: ''حسن آشفتگیِ جلوہ ہے عرضِ اعجاز۔'':

ص8: نہ بندھے تشنگی ذوق کے مضموں غالب گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا
مرتب نے یہ شعر نقل کیا ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ اصل مخطوطے میں نہیں پایا جاتا۔

ص9: واں خودآرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال یاں ہجوم اشک سے تارِ نگہ نایاب تھا
اصل میں ''ہجوم اشک میں'' ہے۔ دیگر قلمی مطبوعہ نسخوں میں بھی اسی طرح ہے، لہٰذا اسے مرتب کا سہو مانا جائے گا:

ص10: شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرہ ابر آب تھا شعلۂ جوالا ہر یک حلقۂ گرداب تھا
اس غزل کے تمام اشعار مطلع کے علاوہ ''شب کہ ذوق گفتگو سے تیری دل بیتاب تھا'' والی غزل (ص9) کے حاشیے پر خوش خط مگر قدرے شکستہ آمیز قلم سے مندرج ہیں۔ چنانچہ ان

میں صفحہ 9 کی اسی زمین کی غزل کے ان دونوں شعروں کو بھی شامل کرلیا تھا:

(1) دیکھتے تھے ہم بچشم خود وہ طوفان بلا ئخ

(2) موج سے پیدا ہوئے پیراہنِ دریا میں خار ئخ

مگر بعد میں شعروں پر ترتیبی نمبر شمار ڈالتے وقت نظر انداز کر دیا ہے۔ ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ زیر بحث غزل کے حسب ذیل شعر دو بار لکھے گئے ہیں، ایک بار شکستہ آمیز اچھے خط میں اور دوبارہ برے خط میں:

(1) جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو

(2) یاں سر پر شور بیخوابی سے تھا دیوار جو

(3) یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزم بیخودی

(4) فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا

ص10: نہ بھولا اضطراب دم شماری انتظار اپنا کہ آخر شیشۂ ساعت کے کام آیا غبار اپنا

یہ غزل حاشیے پر مذکورۂ بالا خوش خط قلم سے لکھی گئی ہے۔ مرتب نے اس حقیقت کو ظاہر نہیں کیا ہے نیز اس کے دوسرے شعر:

زبس آتش نے فصل رنگ میں رنگ دگر پایا

چراغ گل سے ڈھونڈے سے چمن میں شمع خار اپنا

کے دوسرے مصرع میں ''ڈھونڈ ہے'' کی جگہ ''ڈھونڈے سے'' غلط چھپ گیا ہے:

ص11:

محبت تھی چمن سے، لیکن اب یہ بد دماغی ہے

کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے، دم میرا

اصل میں ''بے دماغی'' ہے:

ص11: نہ ہو وحشت کشِ درسِ شراب سطر آگاہی میں گردِ راہ ہوں، بے مدعا ہے پیچ وخم میرا

اس شعر کے دوسرے مصرع پر مرتب نے یہ حاشیہ لکھا ہے: ''حاشیے پر ''میں گرد راہ ہوں، کی بجائے ''غبار راہ ہوں'' بنایا ہے۔'' حالانکہ میرزا صاحب نے بین السطور میں ''میں گرد'' کے اوپر ''غبار'' بنایا ہے:

ص11: اسد وحشت برستِ گوشہ تنہائی دل ہے برنگِ موج مے خمیازۂ ساغر ہے رم میرا

اصل میں پہلے مصرع کا آخری لفظ ''ہوں'' ہے اور یہی صحیح بھی ہے:

ص12: بعجز آباد وہم مدعا تسلیم شوخی ہے تغافل کو نہ کر مصروف تمکیں آزمائی کا

مرتب نے ''مصروف'' پر یہ حاشیہ لکھا ہے: ''حاشیے پر مصروف کی جگہ ''معزول'' لکھا ہے۔

اولاً تو یہ مناسب تھا کہ مرتب حسب دستور خود اصلاحی لفظ متن میں اور قلم زد لفظ حاشیے پر لکھتے، ثانیاً یہ کہ اصل نسخے میں حاشے پر ''معزول'' نہیں ''مغرور'' بنایا گیا ہے۔

نیز اصل کے کاتب سے مصرع اوّل کا آخری لفظ ''ہے'' چھوٹ گیا تھا جو لفظ ''شوخی'' کے اوپر بعد کو بڑھایا گیا ہے:

ص13:

وہی اک بات ہے جو یاں قفس واں نکہت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

یہ شعر بخط خوش مذکورۂ بالا اس غزل کے حاشیے پر مندرج ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے ''نہ ہو حسن تماشا دوست رسوا بے وفائی کا'' مندرج ہے، مگر مرتب نے اس حقیقت کو ظاہر نہیں کیا ہے:

ص14: عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا نبضِ خس سے تپش شعلہ سوزاں سمجھا

اصل میں ہے: ''عجز سے اپنے میں جانا'' الخ۔ اس فرق کو مرتب نے ظاہر نہیں کیا ہے:

ص14: سفر عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا

اصل میں ہے: ''ہر قدم سایہ کو اپنے میں شبستاں سمجھا۔'' اس فرق کو مرتب نے ظاہر نہیں کیا ہے۔

ص14: یہ جانتا ہوں کہ تو اور جواب نامۂ شوق مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا

اصل میں مصرع ثانی کے اندر ''ستم زدہ'' کی جگہ ''جنوں زدہ'' ہے، مگر اس کو مرتب نے ظاہر نہیں کیا ہے:

ص15: مراشمول ہر اک دل کے پیچ وتاب میں ہے میں مدعا ہوں تپش نامۂ تمنا کا

اصل میں ''پیچتاب'' ملا کر لکھا ہے:

ص15: فلک کو دیکھ کے کرتا ہے تجھ کو یاد اسد اگرچہ گم شدہ ہے کاروبار دنیا کا

اصل میں اس مقطعے کے نیچے بڑے خط میں یہ دوسرا مقطع لکھا ہے:

فلک کو دیکھ کے کرتا ہے اوس کو یاد اسد　　جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا

مرتب نے اس مقطع میں ''کرتا ہوں'' چھاپ دیا ہے۔

ص 15: اس مقطع کے قبل دو اور شعر بعنوان مطبوعہ درج کیے ہیں جس کا مطلب ہے کہ اس غزل کے یہ شعر مخطوطے میں نہیں ہیں۔ حالانکہ اصل کے حاشیے پر چار شعر قدرے اچھے خط میں مندرج ہیں۔ جن میں سے یہ شعر بالکل ترک کر دیا ہے:

دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے　　ہمیں دماغ کہاں حُسن کے تقاضا کا

اور اس شعر کو:

ملی نہ وسعتِ جولانِ یک جنوں ہم کو　　عدم کو لے گئے دل میں غبار صحرا کا

صرف جدید مصرع اوّل کے ساتھ متن کے اندر لکھا ہے اور قدیم مصرع حاشیے میں نقل کیا ہے حالانکہ اُن کے دستور کے مطابق دونوں مصرعے متن میں درج ہونا چاہیے تھے:

ص16:　ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب　　خونِ جگر ودیعت مژگانِ یار تھا

اصل میں یہ شعر دو اگلے اشعار کے ساتھ حاشیے پر بخط قدرے خوش تحریر ہے، مگر مرتب نے اس کو ظاہر نہیں کیا ہے:

ص16:　بقدر ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی　　جو تو دریای مے ہے، تو میں خمیازہ ساحل کا

اصل میں ''خمار تشنہ کامی ہا'' تھا۔ اس میں میرزا صاحب نے اپنے قلم سے ''ہا'' کو ''بھی'' بنایا ہے:

ص16:　مجھے راہ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب　　عصائی خضر صحرای سخن ہے خامہ بیدل کا

مرتب نے ''گمراہی'' پر حاشیہ لکھا ہے: ''متن میں پہلے یہ مصرع یوں تھا۔ ''مجھے اس قطع رہ میں'' الخ اسے کاٹ کر یہ اصلاح کی گئی ہے۔'' اس حاشیے میں لفظ ''کاٹ کر'' قابل نظر ہے، اس لیے کہ اصل نسخے میں کسی لفظ کو قلم زد نہیں کیا ہے، نئے الفاظ بین السطور میں پرانے لفظوں کے نیچے لکھ دیے گئے ہیں اور پرانے لفظ بھی جوں کے توں موجود ہیں:

ص17:　غریب بدر جستۂ باز گشتن　　سخن ہوں سخن بر لب آوردگاں کا

اصل میں ''بدرجستہ'' کی جگہ حاشیے پر ''ستم دیدہ'' تجویز کیا ہے یہ بخط معمولی ہے۔ مرتب نے اس کو ظاہر نہیں کیا:

ص19:　رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے　　شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے پُرگل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

یہ دونوں شعر اصل نسخے کے حاشیے پر مذکورہ قدرے خوشخط قلم سے مندرج ہیں۔ اس کو ظاہر کرنا چاہیے تھا جیسا کہ ص 20 کے حاشیۂ نمبر 1 میں کہا گیا ہے:

ص 19: رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

یہ شعر آیندہ دو شعروں کے ساتھ اصل حاشیے پر بخط مذکورۂ بالا تحریر ہے، اس کو بھی مرتب نے ظاہر نہیں کیا:

ص 21: گروہ مستِ نازِ تمکیں دے صلای عرضِ حال خارِ گل، بہر دہانِ گل زباں ہو جائے گا

میرزا صاحب نے پہلے مصرع کے لفظ ''تمکین'' پر ''لا'' علامتِ نفی بنا کر داہنے حاشیے پر ''وے گا'' لکھا ہے، گویا اس مصرع کو یوں بنایا ہے: گروہ مست ناز دیوے گا صلای عرض حال۔ اس کو مرتب نے ظاہر نہیں کیا نیز دوسرا مصرع پہلے یوں تھا:

خارِ گلبن در دہانِ گل زباں ہو جائے گا

اس میں گلبن کو متن کے اندر ہی ''گل'' بنا دیا ہے، اور ''در'' کو قلم زد کر کے اوپر ''بہر'' لکھا ہے۔ مرتب نے اس ترمیم کا بھی ذکر نہیں کیا:

ص 22: گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط
شعلۂ خس میں جیسے خوں در رگ نہاں ہو جائے گا

اصل میں دوسرے مصرع کے اندر ''مثل خوں در رگ'' ہے۔ مرتب نے اس کو غلط نقل کیا ہے:

ص 22: فائدہ کیا سوچ، آخر، تو بھی ہے دانا اسد
دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

اصل میں ہے ''تو بھی دانا ہے اسد'' اور اسی طرح دیگر قلمی و مطبوعہ نسخوں میں پایا جاتا ہے۔ مرتب نے اس کو غلط نقل کر دیا ہے۔ نیز اصل میں سونچ ہے۔ ہاں یہ عام شعر حاشیے پر بخط مذکورۂ بالا مندرج ہیں۔ مرتب نے اس کو ظاہر نہیں کیا ہے:

ص 22: گرمی دولت ہوئی آتش زنِ نامِ نِکو خانۂ خاتم میں یاقوتِ نگیں اختر ہوا

اصل میں ''اخگر ہوا'' درج ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔

ص 23: اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

یہ شعر مرتب نے مطبوعہ عنوان کے ماتحت لکھا ہے حالانکہ یہ شعر اس برے خط میں جس میں اکثر اصلاحیں نظر آتی ہیں حاشیہ پر مندرج ہے:

ص23: تا کجا افسوسِ گرمیہای صحبت اے خیال دل ز آتشخیزیِ داغِ تمنا جل گیا

مرتب نے حاشیے میں لکھا ہے کہ ''حاشیے پر آتش خیزی'' کی بجائے ''سوزِ آتش'' بنایا ہے۔ حالانکہ اصل نسخے میں ''آتش خیزی کے نیچے بغیر اسے قلم زد کیے ''بہ سوز آتش'' تحریر ہے۔ مرتب نے سہواً بہ کوز سے بدل دیا ہے:

ص23: ہے اسد بیگانۂ افسردگی اے بے کسی دل زانداز تپاک اہل دنیا جل گیا

اصل میں ''بیگانہ ای افسردگی ای بیکسی'' لکھا ہے، میرے خیال میں دونوں جگہ ''ای'' علامت اضافت کے لیے کاتب نے استعمال کیا ہے۔ مرتب نے دوسرے کو حرف ندا قرار دیا ہے۔ نیز اس مقطع پر اصل کے اندر ''لالا'' تحریر ہے۔ گویا اس کو کالعدم ٹھہرایا ہے۔ مگر مرتب نے اس کو بھی ظاہر نہیں کیا:

ص23: دل میں ذوق وصل و یادِ یار تک باقی نہیں آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

یہ شعر مع آئندہ 45 اشعار کے قدرے خوش خط قلم سے حاشیے پر ہیں اور اس شعر:

ص24: دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

کے مصرع اوّل میں ''تجھ کو دکھاتا'' کی جگہ ''تجھ کو دکھاؤں'' ہے۔ اس فرق کو بھی ظاہر کرنا چاہیے تھا:

ص24: کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اصل میں دوسرا مصرع اس طرح ہے: ''تھا میں صحرا میں کہ گھر یاد آیا۔'' مرتب نے اسے نظر انداز کر دیا ہے:

ص25: تو دوست کسو کا بھی ستم گر نہ ہوا تھا اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

اصل میں ہے: ''وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا'' اور یوں ہی تمام قلمی و مطبوعہ نسخوں میں بھی پایا جاتا ہے:

ص26: انداز نالہ یاد ہیں سب مجھ کو پر اسد جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

اصل میں مصرع اوّل پر ''ن'' بنا کر بائیں حاشیے میں لکھا ہے: بیداد عشق سے نہیں ڈرتا ہوں پر اسد'' مرتب نے اس کو ظاہر نہیں کیا۔ اور:

ص26: جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لیے ہوئے ہوں شمع کشتہ درخور محفل نہیں رہا
یہ شعر مع باقی اشعار کے اصل کے حاشیے پر مندرج ہیں لیکن اس کے مصرع ثانی میں ''ہوں شمع کشتہ'' کی جگہ ''جوں شمع کشتہ'' ہے:

ص26: مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا
اصل میں دوسرا مصرع یوں ہے ''اب لایق توجہ قاتل نہیں رہا'':

ص27: رخصت نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا
یہ شعر اصل کے حاشیے پر مندرج ہے۔ مگر مرتب نے ظاہر نہیں کیا ہے:

ص28: مشہد عاشق سے کوسوں تک جو آگی ہے حنا کس قدر یارب ہلاک حسرت پابوس تھا
یہ بھی اصل کے حاشیے پر مندرج ہے، مگر وہاں ''مشہد عاشق کے کوسوں تک'' لکھا ہے:

ص29: غم مجنوں عزاداران لیلیٰ کا پرسش گر خم رنگ سیاہ از حلقہ ہائے چشمِ آہو تھا
اس کے دوسرے مصرع کے الفاظ ''از حلقہ ہائے'' کو قلم زد کر کے اوپر ''لا۔ لا'' لکھا ہے، اور نیچے بین السطور میں بنایا ہے: ''پیمانۂ ہر'' گویا مصرع میں اصلاح کر کے یوں قرار دیا ہے:

خم رنگ سیہ پیمانۂ ہر چشمِ آہو تھا

ص29: نیز اس غزل کا صحیح مقطع پہلے یہ تھا:

اسد، خاکِ درِ مے خانہ بر فرق پاشیدن خوشا روزی کہ آب از ساغرِ مے تا بزانو تھا

اس کو بھی مرتب نے ظاہر نہیں کیا ہے۔ اصل میں بین السطور کے اندر مصرع کو ابتدا اس طرح بنایا ہے ''اسد خاک در میخانہ اب سر پر اڑاتا ہوں'' اور بین السطور ہی میں مصرع کو اصلاح دے کر یوں کر دیا ہے ''گئے وہ دن کہ پانی جام مے سے زانو زانو تھا۔'' مگر چونکہ کاتب نے زانو زانو کو سہواً رنو رنو لکھ دیا ہے، مرتب اس غلطی کو سمجھ نہیں سکے اور انھوں نے مصرع یوں درج کیا ہے ''گئے وہ دن کہ پانی جام مے سے تا بزانو تھا'':

ص29: نفس حیرت پرست طرز نا گیرائیِ مژگاں مگر یک دست دامان نگاہ واپسیں پایا
دوسرے مصرع کے ابتدائی الفاظ یہ تھے ''مگر دستے بدامان نگاہ الخ'' مرتب نے اس حقیقت کو بھی ظاہر نہیں کیا:

ص30: نزاکت سے فسونِ دعوی طاقت شکستن ہا شرار سنگ انداز چراغ از جسم جستن ہا
اصل میں ہے: نزاکت ہے فسون دعوی طاقت شکستن ہا:

ص 31: یہ رہن شرم ہے باوصف شہرت اہتمام اس کا
نگیں میں جوں شرار سنگ ناپیدا ہے نام اس کا
اصل میں پہلے دوسرا مصرع اس طرح تھا ''نگیں میں جوں شرر در سنگ'' الخ۔
مرتب نے اس اصلاح کو ظاہر نہیں کیا:

ص 31: مسی آلودہ ہے مہر نوازش نامہ پیدا ہے کہ داغ آرزوئے بوسہ لایا ہے پیام اس کا
اس شعر کے دوسرے مصرع میں ''لایا ہے'' پر نشان دے کر حاشیے پر لکھا ہے:
''دیویگا'' گویا اس مصرع میں تغیر کیا ہے مگر اس کو بھی مرتب نے ظاہر نہیں کیا:

ص 33: ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہوگیا تو کہے، صحرا غبارِ دامنِ دیوانہ تھا
اس دوسرے مصرع میں پہلے ''تو کہے'' کی جگہ ''گوئیا'' تھا۔ مرتب نے اس اصلاح کو بھی چھوڑ دیا ہے:

ص 34: جوش بی کیفیتی ہے اضطراب آرا اسدؔ ورنہ بسمل کا تڑپنا لغزش مستانہ تھا
پہلے مصرع میں ''اضطراب آرا'' کی جگہ ''اضطراب اندیش'' اور ''تڑپنا'' کی جگہ ''طپیدن'' تھا، مرتب نے دوسری اصلاح کو حاشیے میں ظاہر کردیا ہے، مگر پہلی کو چھوڑ دیا:

ص 41: دھمکی میں مرگیا جو نہ باب نبرد تھا عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا
یہ غزل اصل کے حاشیے پر (ورق 19 الف) قدرے خوش خط قلم سے درج ہے مگر مرتب نے اس کو ظاہر نہیں کیا ہے:

ص 41: تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
اصل میں ''موت'' کی جگہ ''مرگ'' ہے:

ص 41: دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا
اصل میں کاتب نے پہلے مصرع کے اندر ''دل تھا جگر'' سہواً لکھ دیا ہے۔ مرتب نے اس کی طرف اشارہ نہیں کیا:

ص 42: محرم نہیں ہے تو ہی نواہای راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
یہ غزل بھی حاشیے میں درج ہے مگر مرتب نے اسے ان غزلوں کے زمرے میں رکھا ہے جن کا کوئی شعر اصل میں نہیں:

ص 44: دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

یہ غزل بھی ورق 18 الف کے حاشیے پر موجود ہے مگر اس کا خط برا ہے، نیز اصل میں فرمادیں جاویں وغیرہ ہے۔ نیز دوسرے مصرع میں ''بھرتے تلک'' ہے اس کو مرتب نے موجودہ مطبوعہ نسخوں کے مطابق چھاپ دیا ہے:

ص 44: بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا

اصل میں اس کے دوسرے مصرع میں لفظ ''گے'' کاتب سے چھوٹ گیا ہے۔ مرتب نے اس غلطی کو نہیں بتایا:

ص 44: خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟
ہیں گرفتارِ بلا زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟

اس کے دوسرے مصرع میں ''بلا'' کی جگہ ''وفا'' ہے۔ جو دیگر تمام نسخوں کے مطابق ہے، مگر مرتب نے غلطی سے لفظ بدل دیا ہے۔ نیز اصل میں کاتب نے پہلے مصرع میں بھاگیں گے کو اس طرح لکھا ہے ''بھاگے نگے'':

ص 44: ہے اب اس معمورے میں قحط غم الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

اصل میں ہے ''دلی میں رہے۔'' اسی طرح دیگر نسخوں میں ہے صرف نظامی ایڈیشن میں ''رہیں'' چھپ گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی سے مرتب نے نقل کر دیا ہے:

ص 51: عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

یہ غزل ورق 35 الف و ب کے حاشیے پر موجود ہے، اور برے خط میں لکھی ہوئی ہے، اس کا عکس بھی نسخۂ حمیدیہ میں شائع ہو چکا ہے مگر مرتب نے اسے ان غزلوں میں درج کیا ہے جن کا کوئی شعر مخطوطے میں نہیں ہے:

ص 51: دل ہوا کشمکش چارۂ زحمت میں تمام مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہو جانا

اصل کے کاتب نے مصرع اوّل میں سہواً کشمکش اور رحمت لکھا ہے۔ نیز اصل میں ''عقدے'' کا املا ''عقدہ'' نہیں جو مرتب نے اختیار کیا ہے:

ص51: ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہوجانا
اصل کے اندر دوسرے مصرع میں ''پانی کا جدا ہوجانا'' لکھا ہے:

ص53: پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب
دے بطِ مے کو دل دستِ شنا موج شراب
یہ غزل اصل کے حاشیے پر درج ہے مگر مرتب نے ظاہر نہیں کیا:
چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو
موج گل، موج شفق موجِ صبا موجِ شراب
اصل میں پہلا مصرعہ ''موج گل'' سے شروع ہوتا ہے، بہ ظاہر یہ کاتبِ اصل کی غلطی ہے، لیکن مرتب کا فرض تھا کہ حاشیے میں اس فرق کو ظاہر کرتے:

ص53: جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے
سر سے گزرے پہ بھی ہے بال ہما موجِ شراب
اصل میں دوسرا مصرع یوں ہے ''سر سے گزری تھی یہی بال ہما موج شراب'' یہ اصل کے کاتب کا سہو ہے مگر مرتب نے ظاہر نہیں کیا:

ص53: موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال ہے تصور میں زبس جلوہ نما موج شراب
اصل میں دوسرے مصرع کی ردیف کو کاتب نے بدل کر ''ہوجانا'' لکھ دیا ہے یعنی ''ہے تصور میں زبس جلوہ نما ہوجانا'' جو میرزا غالب کو بھی نظر نہ پڑا اور جوں کا توں باقی رہا۔ مرتب نے اس کو بھی ظاہر نہیں کیا ہے:

ص53: ایک عالم پہ ہے طوفانیِ کیفیتِ فصل موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب
اصل میں ہے: ''ایک عالم میں ہے'' مرتب نے اسے بھی ظاہر نہیں کیا ہے:

ص54: شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب
اصل میں پہلے مصرع کے اندر ''ہنگامہ'' کی جگہ ''کیفیت'' ہے اور دوسرا مصرع اس طرح ہے:
رہبر قطرہ بدریا ہے، خوشا موجِ شراب
یہاں مرتب نے مصرع ثانی نقل کرتے وقت غلطی کی ہے، کیوں کہ اسی غزل میں یہ مصرع آچکا ہے:

ص55: گرمی ہے زباں کی سبب سوختنِ جاں ہے شمع شہادت کے لیے سر بسر انگشت

اصل میں پہلے یونہی تھا لیکن بعد کو دوسرے مصرع میں ''ہے'' کو ''ہر'' بنا دیا ہے۔ مرتب نے اس اصلاح کا تذکرہ نہیں کیا:

ص55: خوں دل میں جو میرے نہیں باقی، تو عجب کیا
جوں ماہی بے آب تڑپتی ہے ہر انگشت

اصل میں ''تو عجب کیا'' کی جگہ ''تو پھر اوس کی'' ہے:

ص55: کس رتبہ میں باریکی و نرمی ہے کہ جوں گل
آتی نہیں پنجے میں بس اس کے نظر انگشت

لیکن اصل میں ''اس کے نظر'' کے بجائے ''اوس کے نظر'' ہے:

ص55: افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے جن لوگوں کے تھے درخور عقدِ گہر انگشت

یہاں مرتب نے ''کی تھی'' کی جگہ ''کے تھے'' چھاپ دیا ہے۔ حالاں کہ انگشت بالاتفاق مونث ہے نیز اصل کاتب نے گوہر لکھ دیا ہے بجائے گہر۔ مرتب نے اس کا بھی اظہار نہیں کیا:

ص55: کافی ہے نشانی تری چھلّے کا نہ دینا خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

اصل میں پہلے مصرع کے اندر ''ترا چھلے کا نہ دینا'' ہے، یونہی دیگر نسخوں میں بھی ہے صرف نظامی میں ''تری'' چھپ گیا ہے۔ مرتب نے بلاتحقیق اسی سے نقل کر دیا ہے۔ نیز اصل کے کاتب نے سہواً ''بموقت'' لکھ دیا ہے جو مرزا صاحب کی نظر سے بھی چوک گیا اور جوں کا توں باقی رہا۔ مرتب نے اس غلطی کا بھی ذکر نہیں کیا ہے:

ص57: جگر کو مرے عشق خوں نابہ مشرب لکھے ہے خداوند نعمت سلامت

اصل کے کاتب نے پہلے مصرع میں ''خونتابہ مشرب'' سہواً لکھا ہے۔ اس غلطی کو مرتب نے ظاہر نہیں کیا اور خود بھی خوں نابہ غلط لکھا ہے، صحیح لفظ ''خونابہ'' ہے:

ص57: دوعالم کی ہستی پہ خطِ وفا کھینچ دل و دستِ اربابِ ہمت سلامت

دوسرے مصرع میں اصل کاتب نے سہواً ''دل و دوست'' لکھ دیا تھا۔ مرتب نے اس غلطی کو نہیں بتایا:

ص57: نہیں گریہ کام دلِ خستہ گردوں جگر خواہی جوشِ حسرت سلامت

اصل کے کاتب نے ''کریکام'' لکھ دیا تھا مرتب نے اس سہو کو گریہ کام پڑھا ہے صحیح

گر بکام ہے:

ص57: نہ اوروں کی سنتا، نہ کہتا ہوں اپنی سرِ ختہ دشوار وحشت سلامت

اصل میں دوسرے مصرع کے اندر ''سرِ ختہ دشوارِ وحشت'' کی جگہ ''سر خستۂ وشورِ وحشت'' ہے اور یہی صحیح بھی ہے:

ص59: ناز لطفِ عشق باوصف توانائی عبث رنگ ہے سنگِ مہک دعوائے مینائی عبث

اس شعر کے دوسرے مصرع میں ''سنگِ مہک'' چھاپ دیا ہے۔ حالانکہ اصل میں ''محک'' ہے:

ص59: ناخنِ داخل عزیزاں یک قلم ہے نقب زن پاسبانِ طلسم، کنج تنہائی عبث

اس شعر کے دوسرے مصرع میں ''گنج تنہائی'' کو ''کنج تنہائی'' لکھ دیا ہے:

ص60: یک نگاہ گرم ہے جوں شمع سرتاپا گداز بہر از خود رفتگاں رنج خود آرائی عبث

پہلے ''ناز خود آرائی'' تھا، بعد میں ''رنج خود آرائی'' بنایا ہے، مرتب نے اسے ظاہر نہیں کیا:

ص61: حیرت فروشِ صد نگرانی ہے اضطرار سررشتہ چاک جیب کا تار نظر ہے آج

اصل میں ''ہر رشتہ'' ہے:

ص61: اے عافیت کنارہ کر، اے انتظار چل سیلاب گریہ در پئے دیوار و در ہے آج

اصل میں ہے ''اے انتظام چل'' اور یونہی دیگر تمام نسخوں میں بھی ہے۔ مرتب نے سہواً انتظار چھاپ دیا ہے:

ص62: اے اسد ہے مستعد شانہ گشتن بہر زلف پنجۂ مژگاں بخود بالیدنی رکھتا ہے آج

اصل میں پہلے یونہی تھا مگر پھر ''شانہ گشتن بہر زلف'' کے نیچے 'گیسو شدن' اصلاح کی ہے یعنی بعد اصلاح مصرع یوں ہوا ''اے اسد ہے مستعد شانۂ گیسو شدن۔'' مرتب نے اس کا حوالہ نہیں دیا:

ص65: آئینہ خانہ ہے صحن چمنستاں یکسر بس کہ ہیں بیخود و وارفتہ و حیراں گل و صبح

اصل میں پہلے ''یکسر'' کی جگہ ''تجھ سے'' تھا بعد میں یہ تغیر کیا گیا ہے۔ مرتب نے اسے بھی ظاہر نہیں کیا ہے:

ص66: کون ہوتا ہے حریفِ مئی مردافگنِ عشق ہے مکرر لب ساقی پہ سلا میرے بعد

اصل میں ''لب ساقی میں'' ہے۔ دیگر نسخوں میں بھی سوائے نظامی ایڈیشن کے اسی طرح ہے۔

مرتب نے اسی سے نقل کر دیا ہے اور اصل کی قرأت کو ظاہر نہیں کیا:

ص72: فسونِ یکدلی ہے لذتِ بیداد دشمن پر
کہ وجد برق جوں پروانہ بال افشاں ہے خرمن پر

اصل میں ''چوں پروانہ'' ہے:

ص73: برنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگ بیتابی ہزار آئینہ دل باندھا ہے بال یک تپیدن پر

اصل میں ''باندھے ہے'':

ص73: اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے کہ مشق ناز کر خون تمنا میری گردن پر

اصل میں پہلے مصرع کے اندر ''کہتا تھا کو مرزا صاحب نے ''کہتا ہے'' بنایا ہے۔ مرتب نے دوسرے مصرع کو تو لکھا، مگر اس فرق کو ظاہر نہیں کیا۔

ایک بات اور ذکر کے قابل تھی، مگر مرتب نے چھوڑ دی۔ وہ یہ ہے کہ اس غزل کے وہ تین شعر جو بعنوان مطبوعہ نقل کیے گئے ہیں، اصل کے حاشیے پر تحریر ہیں۔ ان میں سے:

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاع بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں فرض رہزن پر

اصل میں مصرع اوّل میں تقضا سہو کاتب ہے مرتب نے اسے ظاہر نہیں کیا۔ نیز قرض کی جگہ فرض چھاپ دیا ہے:

ص79: ای شعلہ! فرصتی کہ سویدای دل سے ہوں کشت سپندِ صد جگر اندوختن ہنوز

اصل نسخے میں شعلہ ساقط ہے، اس لیے ''شعلہ'' بڑھا کر حاشیے میں اس کا اظہار لازم تھا:

ص80: ہر ایک ذرّہ عاشق ہے آفتاب پرست گئی نہ خاک ہوے پر ہوائے جلوۂ ناز

لیکن اصل کے کاتب نے ''زرّہ'' سہواً لکھ دیا ہے۔ مرتب نے اس غلطی کا اظہار نہیں کیا:

ص83: اضطرابِ نارسائی مایۂ شرمندگی ہے عرق ریزی عجلت جوشش طوفان عجز

اصل میں پہلے ''موجد شرمندگی'' تھا۔ اسے قلم زد کر کے غالب نے ''مایہ شرمندگی'' بنایا ہے۔ مرتب نے اس اصلاح کو ظاہر نہیں کیا:

ص85: میں بھی رک رک کے نہ مرتا، جو زباں کے بدلے
دشنہ ایک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

حسب تصریح مرتب اصل کے حاشیے پر یہ شعر بھی موجود ہے مگر اصل کے کاتب نے

''ترے غمخوار'' لکھا ہے۔ اس کا اظہار ضروری تھا۔

ص85: دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

اصل کے کاتب نے نمو کے واو پر تشدید لگا دی ہے مرتب نے اس سہو کو ظاہر نہیں کیا:

ص91: وقتِ خیالِ جلوۂ حسنِ بتاں اسد دکھلائے ہے مجھے دو جہاں لالہ زار داغ

اصل میں پہلا مصرع ابتداءً یوں تھا: در عالم تصور روی بتاں اسد۔ بعد میں غالب نے اس کو بدل دیا مرتب نے اس کا ذکر نہیں کیا:

ص96: مجھ کو ارزانی رہے، تجھ کو مبارک ہو جیو نالۂ بلبل کا درد، اور خندۂ گل کا نمک

اصل میں ہے: ''سینۂ بلبل کا زخم۔'' مرتب نے اس فرق کو ظاہر نہیں کیا ہے:

ص96: غیر کی منت نہ چھوڑوں گا پی[پے] توقیرِ درد زخمِ دل جوں خندۂ خوباں ہیں سرتاپا نمک

اصل میں دوسرے مصرع میں ''خوباں ہے'' لکھا ہے، اور یہی صحیح بھی ہے۔ اس کو مرتب نے غلط چھاپ دیا ہے:

ص96: اس عمل میں عیش کی لذت نہیں ملتی اسد زور نسبت مے سے رکھتا ہے اصنارا کا نمک

اصل میں ''نصارا کا نمک'' ہے اور یہی درست ہے۔

ص97: آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک۔

اصل میں اس غزل کی ردیف ہر جگہ ''ہوتے تک'' ہے، خود میرزا صاحب نے اس کو ''ہوتے تک'' ہی لکھوایا ہے اور چھپوایا ہے۔ مگر مرتب نے قابلِ اعتبار جدید مطبوعہ نسخوں سے ''ہونے تک'' نقل کر دیا ہے جو کسی طرح مستحقِ قبول نہیں:

ص98: ہنگام انتظار قدوم بتاں اسد ہے بر سرِ مژہ نگراں دید بانِ اشک

پہلے مصرع اوّل اس طرح تھا: درحال انتظار قدوم بتاں اسد۔

اس کے ابتدائی الفاظ قلم زد کر کے اوپر بین السطور میں اصلاح کی گئی ہے، مرتب نے اسے ظاہر نہیں کیا:

ص101: نور سے تیرے ہے اس کی روشنی ورنہ ہے خورشید یک دستِ سوال

پہلے مصرع اوّل اس طرح تھا۔ ''نور حیدر سے ہے اس کی روشنی۔'' اس میں سے حیدر کو قلم زد کر کے نیچے موجودہ الفاظ بڑھائے ہیں:

ص103: خاک ہے عرضِ بہارِ صد نگارستاں اسد حسرتیں کرتی ہیں میری خاطرِ آزاد گل

اصل میں دوسرا مصرع پہلے یوں تھا۔ آرزوئیں کرتی ہیں الخ۔ مرتب نے اس کا ذکر نہیں کیا:

ص105: دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسد
جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم

اس کے حاشیے میں مرتب نے لکھا ہے کہ دوسرا مقطع کہہ کر حاشیے میں درج کر دیا ہے۔ حالاں کہ پہلے مصرع ''شام غم میں سوزِ عشق شمع رویاں سے اسد'' کے بجائے دوسرا مصرع دونوں غزلوں کے درمیان کی سادہ جگہ میں لکھ گیا ہے:

ص109: تھی وہ اک شخص کے تصور سے اب وہ رعنائی خیال کہاں

اصل میں پہلا مصرع اس طرح ہے: ''تھی وہ خوباں ہی کے تصور سے۔'' مرتب نے مطبوعہ سے مصرعہ نقل کر دیا اور اس فرق کو ظاہر نہیں کیا:

ص109: بوسہ میں وہ مضائقہ نہ کرے پر مجھے طاقتِ سوال کہاں

اصل میں کاتب نے ''مضاعقہ'' لکھا ہے:

ص111: عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا گر اک ادا ہو، تو اسے اپنی قضا کہوں

یہ شعر مع آئندہ دوشعروں کے بعنوان مطبوعہ لکھے ہیں حالاں کہ یہ حاشیۂ اصل پر بخط بد موجود ہیں۔ مگر مرتب نے اسے ظاہر نہیں کیا:

ص113: آئینہ دام کو پردے میں چھپاتا ہے عبث کہ پریزاد نظر قابلِ تسخیر نہیں

اصل میں آئنہ اور پریذاد ہے، نیز پہلے کاتب نے سہواً ''قابلِ تقریر'' لکھ دیا تھا پھر لفظ تقریر کاٹ کر اس کے نیچے تسخیر لکھا ہے:

ص113: میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

اصل میں ''اوس کا دیوان'' ہے:

ص115: دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا بارے اپنے دردِ دل کی ہم نے پائی دادیاں

اصل میں ''اپنے دردِ دل'' کی جگہ ''اپنی بے کسی'' ہے اور یہی تمام مطبوعہ نسخوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ خدا جانے کہاں سے مرتب نے ''دردِ دل'' چھاپ دیا ہے۔ نیز اس غزل کے تمام شعروں کی ردیف اصل میں بہ ہائے مخلوط التلفظ ''یہاں'' لکھی ہے:

ص116: ہے مری وحشت عدوئے اعتبارات جہاں مہر گردوں ہے چراغِ رہگزارِ بادیاں

یہ شعر اصل کے حاشیے پر بخط بد درج ہے مگر مرتب نے ظاہر نہیں کیا:

ص116: قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

یہ شعر بھی اصل کے حاشیے پر درج ہے مگر مرتب نے اسے ظاہر نہیں کیا:

ص119: برشکال دیدۂ عاشق ہے دیکھا چاہیے کھل گئی مانند گل سوجا سے دیوار چمن

اس شعر کا پہلا مصرع اصل میں یوں ہے ''برشکال گریۂ عشاق دیکھا چاہیے۔'' مرتب نے مصرع مطبوعہ نسخے سے نقل کرلیا ہے، اور اس فرق کو ظاہر نہیں کیا، نیز ''کِھل گئی'' کو ''کھُل گئی'' چھاپا ہے، جو صراحتاً غلط ہے:

ص122: سر پر مرے وبالِ ہزار آرزو رہا یارب میں کس غریب کا بختِ رمیدہ ہوں

مرتب نے اسے اس طرح لکھا ہے گویا یہ اصل دیوان کے متن کا شعر ہے حالانکہ ص 122 کی غزل ''خوں در جگر نہفتہ بزردی رسیدہ ہوں'' کے حاشیے پر اسی مطلع کے ساتھ لکھا ہے۔

ص122: اس شعر کے ساتھ وہ شعر بھی اسی غزل کے حاشیے پر تحریر ہے جس کو مرتب نے حاشیے میں سابق غزل کے حاشیے پر لکھا ہونا ظاہر کیا ہے یعنی ''ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج۔'':

میں عندلیب گلشنِ ناآفریدہ ہوں

نیز اصل میں ''ہوگرمی نشاط'' لکھا ہے ''ن'' سہواً چھوٹ گیا ہے:

ص147: چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

اصل میں پہلا مصرع سہواً یوں لکھا گیا ہے ''چھوڑا نہ مجھ ضعیف نے اختلاط کا۔'' مگر مرتب نے اظہار نہیں کیا۔ نیز اس غزل کو اس کلام کے زمرے میں درج کیا ہے جس کا ہم طرح کوئی شعر قلمی نسخے میں نہیں اور حال یہ ہے کہ اصل کے حاشیے میں یہ غزل موجود ہے جس کا اقرار خود مرتب نے اپنے حاشیے میں کیا ہے:

ص147: پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا یوں ہو تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو

اصل کے دوسرے مصرع میں ''جارہ'' ہے جو سہو ہے مگر مرتب نے ظاہر نہیں کیا:

ص147: ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

اصل کے دوسرے مصرع میں سہواً لفظ ''سے'' ترک ہوگیا ہے۔ مرتب نے اسے ظاہر نہیں کیا:

ص148: وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں اپنے سے کرنہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

اصل میں پہلا مصرع یوں ہے ''وارستگی بہانۂ سنگی دلی نہیں'' اور بہانہ کو بہانئے لکھا ہے۔ مرتب نے نہ اصلاح کا ذکر کیا نہ کاتب کی غلطی کا:

ص148: مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اصل میں دوسرا مصرع اس طرح ہے: ''ہر چند عمر صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو۔'' اس کو ظاہر نہیں کیا:

ص168: کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اصل میں ہے: ''کھلتے کسو پہ کیوں مرے دل کے معاملے۔'':

ص170: جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو، گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دل ہے، لذت زندگانی کی

اصل میں ''گر'' کی جگہ ''گو'' ہے اس فرق کو مرتب نے ظاہر نہیں کیا ہے:

ص189: مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

اصل میں کاتب نے ''فزائے حیرت آباد'' سہواً لکھ دیا تھا مرتب نے اس سہو کو ظاہر نہیں کیا۔

ص189: اسی طرح اس غزل کے دوسرے شعر:

خزاں کیا، فصل گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

اصل میں ''وہ ہم ہیں'' سے شروع کیا گیا ہے جو سہو ہے، مرتب نے اس سہو کو ظاہر نہیں کیا:

ص198: افسردگی نہیں طرب انشای التفات ہاں دردبن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

اصل میں ''ہاں'' کی جگہ ''جوں'' ہے:

ص242: مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

یہ غزل اصل کے حاشیے پر بخط بد موجود ہے، اور اس میں یہ شعر زائد ہے:

وہ بات چاہتے ہو کہ جو بات چاہیے
صاحب کے ہم نشیں کو کرامات چاہیے

ص 242 : اصل میں یہ شعر بھی دوسرے مطبوعہ نسخوں کی طرح موجود ہے مگر مرتب سے چھوٹ گیا ہے:

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے

ص242: سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے
اصل میں کاتب سے لفظ ''مہ'' سہواً چھوٹ گیا ہے مگر مرتب نے ظاہر نہیں کیا:

ص242: ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
اصل میں دوسرے مصرع کا لفظ ''کا'' سہواً ترک ہو گیا ہے مگر مرتب نے اس کا ذکر نہیں کیا:

ص242: سرپای خم پہ چاہیے ہنگام بیخودی رو سوے قبلہ وقت مناجات چاہیے
اصل میں مصرع اوّل کے اندر ''چاہیے'' کی جگہ ''کھینچیے'' ہے۔ نیز لفظ ''پہ'' کاتب سے ترک ہو گیا ہے۔ مرتب نے ان دونوں کا ذکر نہیں کیا:

ص242: عشق مجکو نہیں، وحشت ہی سہی میری وحشت تری شہرت ہی سہی
یہ غزل بھی حاشیے پر بخط بد درج ہے۔ مرتب نے اسے ان غزلوں کے تحت درج کیا ہے جن کا کوئی شعر مخطوطے میں نہیں ہے:

ص243: اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
ناقل نے دوسرے مصرع میں غفلت سہواً لکھ دیا تھا۔ مرتب نے اس سہو کا ذکر نہیں کیا:

ص243: یار سے چھیڑ چلی جائے اسد گر نہیں وصل، تو حسرت ہی سہی
اصل میں ہے ''چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد'':

ص244: دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

یہ غزل اصل دیوان کے آخر میں بخط بد مندرج ہے۔ مرتب نے اسے ان غزلوں کے زمرے میں شمار کیا ہے جن کا کوئی شعر مخطوطے میں نہیں:

ص245: ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے، جتنا کہ اڑتا جائے ہے

اصل میں ''پری وش'' متن میں اور اس کے اوپر بغیر ''وش'' کو قلم زد کیے ''رخ'' لکھا ہے:

ص246: گرمِ فریاد دکھا شکل نہالی نے مجھے تب اماں ہجر میں دی بردلیالی نے مجھے
یہ غزل بھی مخطوطے کے آخر میں مذکورۂ بالا غزل کے بعد درج ہے، مرتب نے اسے بھی

انھیں غزلوں میں قرار دیا ہے جو اصل میں نہیں ہیں اور اصل میں درج ذیل شعر تمام قلمی و مطبوعہ نسخوں سے زیادہ ہیں، مرتب نے انھیں بھی نقل نہیں کیا:

زندگی میں بھی رہا ذوق فنا کا مارا نشہ بخشا غضب اس ساغر خالی نے مجھے

بس کہ ہے فصلِ خزانِ چمنستانِ سخن رنگ شہرت ندیا تازہ خیالی نے مجھے

جلوۂ خور سے فنا ہوتی ہے شبنم غالب کھودیا سطوتِ اسمای جلالی نے مجھے

یہ بات بھی نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ دوسرے شعر میں اصل نسخے کے اندر ''ندیا'' کی جگہ ''نادیا'' ناقل کا سہوِ قلم ہے:

ص252: پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے سینہ جویاے زخم کاری ہے

یہ غزل بھی اصل کے آخر میں درج ہے اور اس کے شعر:

وہی صد رنگِ نالہ فرسائی وہی صد گونہ اشک باری ہے

کے دونوں مصرعوں میں ''وہی'' کی جگہ ''وہ ہی'' لکھا ہے:

ص253: پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب اشک باری کا حکم جاری ہے

اصل کے اندر دوسرے مصرع میں ''بے قراری کا حکم'' ہے اور پہلے مصرع میں ''ہوئے ہے۔'':

ص266: چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے

یہ غزل آخر میں چوتھے نمبر پر درج ہے، اور مصرع اوّل میں ''اچھوں'' کی جگہ ''خوباں'' لکھا ہے۔

ص 266: یہ شعر اصل میں زیادہ ہے:

دل تو ہو، اچھا نہیں ہے گر دماغ کچھ تو اربابِ تمنا چاہیے

ص 266: نیز غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے والا شعر مقطع کے بعد لکھا ہے اور اسی طرح دیوان مطبوعہ منشی شیونراین میں بھی ہے:

ص268: وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے ولے مجھے تپشِ دل مجال خواب تو دے

یہ غزل اصل کے آخر کی غزلوں میں پانچویں نمبر پر درج ہے اور حسب ذیل نئے شعر پر مشتمل ہے:

یہ کون کہوے ہے آباد کر ہمیں لیکن
کبھی زمانہ مرادِ دلِ خراب تو دے

ص 273: کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

یہ غزل چھٹے نمبر پر درج ہے۔ اس میں ایک تو ''تکلف بر طرف نظارگی میں بھی سہی'' والا شعر متروک ہے، اور دوسرے ''نہ پوچھا جائے ہے، اُس سے، نہ بولا جائے ہے مجھ سے'' میں دونوں جگہ ''مجھ سے'' لکھ دیا ہے:

ص284: مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

یہ غزل ساتویں نمبر پر درج ہے مگر ''پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس'' والا شعر متروک ہے:

ص284: پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بہ خون دل سازِ چمن طرازی داماں کیے ہوئے

اصل میں اور دیگر تمام نسخوں میں ''بھر رہا ہوں'' ہے:

ص285: دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

اصل میں پہلے مصرع میں الفاظ ''پھر ہر'' ترک ہو گئے ہیں:

ص285: مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

اصل میں ہے: ''ڈھونڈھے ہے پھر کسو کو لب بام پر ہوس۔'' اور ڈھونڈے کو ناقل نے ''دہوندہے'' لکھا ہے:

ص285: چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو سرمے سے تیزہ دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اصل میں ہے ''مانگے ہے پھر کسو کو۔'':

ص285: اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

اصل میں ہے: ''چاہے ہے پھر نگاہ۔'':

ص286: پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں سر زیر بار منت درباں کیے ہوئے

اصل میں ہے: ''پھر دل میں ہے، کہ در پہ کسو کے پڑے رہیں۔'':

ص286: جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

اصل میں ہے ''بیٹھے رہے'' الخ

ان مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر نسخۂ بھوپال کا تفصیلی مطالعہ ممکن ہوتا تو نسخۂ حمیدیہ کی تصحیح اور ترتیب نو میں کس قدر مدد ملتی اور نسخۂ بھوپال کے ضائع ہو جانے سے کیسا نا قابلِ تلافی نقصان ہوا ہے۔

○

غالب کی اپنے کلام پر اصلاحیں

نسخۂ حمیدیہ نے پہلی بار ہمیں بتایا کہ مرزا غالب نے اپنے قدیم اشعار میں سے نسبتاً آسان اور اچھے اشعار کا انتخاب کرنے سے پہلے ان میں اصلاح بھی کی تھی اور موجودہ دیوان کے وہ شعر جو نسخۂ حمیدیہ میں بھی موجود ہیں خاص قطع و برید کے بعد منظرِ عام پر آئے ہیں۔

نسخۂ حمیدیہ کا انتخاب کر لینے کے بعد بھی مرزا صاحب نے اپنے کلام پر نظر ثانی کی یا نہیں، اس کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ وہ ایسا ضرور کرتے رہے، اور خصوصاً جب کبھی انھوں نے کوئی نسخہ کسی کو تحفتاً دینے یا مطبع بھیجنے کے لیے تیار کرایا، تو نہ صرف ان کی صحت ہی کی، بلکہ اس میں مناسب ترمیم بھی کہیں نہ کہیں ضرور فرمائی۔ رضا لائبریری رام پور میں ان کے عہد کے لکھے اور چھپے ہوئے متعدد دیوان محفوظ ہیں۔ اُن کو دیکھنے سے مذکورہ خیال کی تائید ہوتی ہے۔ میں آج کی صحبت میں انھیں ترمیموں اور اصلاحوں میں سے چند آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

چوں کہ میں دیوانِ غالب کے متعدد نسخوں کے حوالے دوں گا اس لیے میں ان کا آپ سے تعارف کرا دوں۔

(1) قا سے مراد وہ قلمی نسخہ ہے جسے نواب خلد آشیاں (والیٔ رامپور) نے کسی معمولی کاتب سے نقل کرایا تھا۔ اس کے اشعار کی تعداد 1067 ہے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر نے 1838 میں جو تقریظِ دیوان لکھی تھی۔ اس میں کل تعدادِ اشعار 1090 بتائی ہے۔ تقریباً اتنے ہی شعر 1841 کے مطبوعہ نسخے میں بھی ہیں۔ قا اس تقریظ سے خالی اور تعدادِ اشعار میں تقریظ والے نسخے سے کم ہے۔ اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ یہ دیوانِ غالب قدیم کا پہلا انتخاب ہے۔

(2) قب سے مراد وہ قلمی نسخہ ہے، جو یونیورسٹی لائبریری دہلی کے نسخے سے میں نے رضا لائبریری کے لیے نقل کرایا تھا۔ یونیورسٹی کا یہ نسخہ مئی 1847 میں دہلی کے مطبع دارالسلام

آجکل، دہلی (غالب نمبر)، فروری 1952

سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔ اس ایڈیشن کا ایک نسخہ بھی جو ابتدائی ورقوں کے بعد خاصا ناقص ہے، سال گزشتہ لائبریری کے لیے خرید لیا گیا ہے۔

(3) ؔنخ سے مراد وہ قلمی خوشخط نسخہ ہے جسے میرزا صاحب نے مئی 1857 میں نواب فردوس مکان ناظم تخلص (والی رام پور) کی خدمت میں ڈاک کے ذریعے سے بھیجا تھا۔ یہ نسخہ ترتیبِ اصنافِ سخن میں غالب کے تمام قلمی اور مطبوعہ نسخوں سے مختلف ہے یعنی اس میں فارسی دواوین کی مروجہ ترتیب کے مطابق پہلے دیباچہ، پھر قطعات، پھر مثنوی، پھر قصائد، پھر غزلیات، پھر رباعیات اور پھر خاتمہ ہے۔

چونکہ میرزا صاحب نے اس کی بڑی احتیاط سے تصحیح کی ہے۔ اس لیے تمام دوسرے نسخوں کے مقابلے میں زیادہ معتبر اور مستند ہے۔

(4) ؔما سے وہ مطبوعہ نسخہ مراد ہے جو شعبان 1257ھ (اکتوبر 1841) میں سرسید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خاں بہادر کے چھاپے خانۂ دہلی میں طبع ہو کر شائع ہوا تھا۔ اس ایڈیشن کا ایک مکمل نسخہ صولت پبلک لائبریری رام پور میں اور اس ایڈیشن کی پرانی نقل رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ نیر کی تقریظ کے مطابق اس کے اشعار کی تعداد 1098 ہے۔

(5) ؔمب سے وہ مطبوعہ نسخہ مراد ہے جو 20 محرم 1278ھ (1861) کو مطبع احمدی دہلی میں اَمّو جان کے اہتمام سے چھپا تھا۔ اس کے آخر میں میرزا صاحب نے 'عبارتِ خاتمۂ دیوان' کے عنوان سے لکھا ہے۔

> ''داد کا طالب غالب گزارش کرتا ہے کہ یہ دیوانِ اردو تیسری بار چھاپا گیا ہے۔ مخلص و داد آئین، میر قمرالدین کی کارفرمائی اور خان صاحب الطاف نشان محمد حسین خان کی دانائی مقتضی اس کی ہوئی کہ اس جزو کا رسالہ ساڑھے پانچ جزو ہیں منطبع ہوا۔ اگرچہ یہ انطباع میری خواہش سے نہیں لیکن ہر کاپی میری نظر سے گزرتی رہی ہے اور اغلاط کی تصحیح ہوتی رہی ہے۔ یقین ہے کہ کسی جگہ حرف غلط نہ رہا ہو مگر ہاں ایک لفظ میری منطق کے خلاف نہ ایک جگہ بلکہ سو جگہ چھاپا گیا ہے۔ کہاں تک بدلتا۔ ناچار جابجا یوں ہی چھوڑ دیا یعنی 'کسو' بکافِ مکسور وسینِ مضموم و واو معروف۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ لفظ صحیح نہیں۔ البتہ فصیح نہیں۔ قافیے کی رعایت سے اگر لکھا جائے تو عیب نہیں۔

ورنہ فصیح بلکہ افصح 'کسی' ہے، واو کی جگہ یائے تحتانی۔ میرے دیوان میں ایک
جگہ 'کسو' بواو ہے۔ اور سب جگہ 'کسی' بیائی تحتانی ہے اس کا اظہار ضرور تھا۔
کوئی یہ نہ کہے کہ یہ کیا آشفتہ بیانی ہے۔ اللہ بس ماسوئی ہوس۔"

(6) نج سے مراد وہ مطبوعہ نسخہ ہے جو ذی حجہ 1278 میں کان پور کے مطبعِ نظامی سے شائع ہوا۔ یہ نسخہ مب سے چھاپا گیا تھا۔ اس لیے اس کے مطابق ہے۔

(7) مد سے وہ نسخۂ مطبوعہ مراد ہے جو منشی شیونرائن نے اپنے مطبع مفیدِ خلائق (آگرہ) میں 1863 میں چھاپا تھا۔ یہ نسخہ نقل ہے نج کی۔ اس لیے ترتیب کلام وغیرہ میں اس کے مطابق ہے۔

چونکہ عام بازاری نسخے نج سے چھاپے گئے ہیں، اس لیے وہ نج اور مد دونوں سے مختلف ہیں۔

اس تشریح وتعارف کے بعد میں آپ کے سامنے میرزا صاحب کے چند اشعار پیش کرتا ہوں، جن میں مختلف نسخوں کے اندر اختلافِ الفاظ پایا جاتا ہے۔ میری دانست میں یہ کاتبوں کی دستبرد نہیں بلکہ خود میرزا صاحب کی ترمیمیں ہیں، اس لیے قابلِ غور وفکر ہیں۔

(1) میری تنخواہ میں تہائی کا ہوگیا ہے شریک ساہوکار

نج اور مد میں 'تہائی' کی جگہ 'چہارم' ہے۔ حقیقت کیا تھی، اسے میرزا صاحب اور ان کا ساہوکار جانے، لیکن بظاہر 'چہارم' بعد کی ترمیم ہے، اور اس سے مقصود مبالغے کو حقیقتِ حال کے قریب کرنا معلوم ہوتا ہے:

(2) میکدے میں ہو اگر آرزوی گلچینی بھول جا یک قدحِ بادہ بطاقِ گلزار

نسخۂ حمیدیہ اور عام نسخوں میں اسی طرح ہے۔ لیکن قا اور ما میں 'بصحنِ گلزار' ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کی اصل میں بھی 'بطاق' یہی ہے، تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ میرزا صاحب نے انتخاب کے وقت 'بصحن' بنایا، جو پہلی اشاعت تک داخلِ دیوان رہا۔ بعد ازاں پھر 'بطاق' ہی بنا دیا لیکن مجھے نسخۂ حمیدیہ کے مطبوعہ متن پر اعتبار نہیں ہے۔ اس لیے میری رائے میں پرانے دیوان کا لفظ بھی 'بصحن' ہی ہے، جو اس لیے درست معلوم ہوتا ہے کہ گلزار میں طاق کہاں۔ وہاں تو صحن ہی صحن نظر آتا ہے کہ 'طاق نسیاں' کی شہرت نے میرزا صاحب کو مجبور کیا کہ وہ 'بھول جا' کی رعایت سے 'صحنِ گلزار' کو طاقِ گلزار سے بدل دیں، اور 'طاق گلزار' سے نفسِ گلزار مراد لیں۔ چنانچہ 1841 کے بعد اُنھوں نے یہ تغیر کیا، مگر اس سے مضمون شعر میں

کوئی معنوی اضافہ یا صوتی لطف میری دانست میں پیدا نہیں ہوا۔

(3) مردمک سے ہو عزاخانۂ اقبال نگاہ   خاکِ در کی ترے جو چشم نہ ہو آئینہ دار

متداول نسخوں کے برخلاف قآ اور مآ میں 'عزاخانۂ یک شہر نگاہ' ہے۔ نسخۂ حمیدیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل میں بھی اسی طرح تھا۔ لیکن بعد ازاں میرزا صاحب نے ترمیم کر کے 'عزاخانۂ اقبال' بنا دیا، جس سے مبالغے کی بے مزگی دور اور مضمون کی لطافت بڑھ گئی۔

یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ عام طور پر شارحینِ غالب نے اس شعر کے پہلے مصرع میں 'ہو' کا فاعل 'نگاہ' کو قرار دیا ہے۔ لیکن میری حقیر رائے میں مصححِ نسخۂ حمیدیہ نے جو 'عزاخانہ اقبال نگاہ' میں اقبال کو نگاہ کی طرف مضاف قرار دیا ہے، ان کی یہ رائے صحیح ہے۔ اس صورت میں شعر کی نثر یہ ہوگی کہ:

''جو چشم تیرے خاکِ در کی آئینہ دار نہ ہو، (وہ) مردمک سے عزاخانہ اقبالِ نگاہ ہو جائے'' اور مطلب یہ ہوگا کہ جس آنکھ میں تیرے در کی خاک کا سرمہ نہ لگایا جائے، خدا کرے، اس کی کالی پتلی بجائے رونق اور خوبصورتی پیدا کرنے آنکھ کو نگاہ کی تاثیر اور رونق کے عزاخانے میں تبدیل کر دے۔ یعنی اُسے بے رونق اور بے اثر بنا دے۔

اور یہی صورتِ حال اس وقت بھی ماننا پڑے گی، جب کہ 'یک شہر نگاہ' ہو اور 'یک شہر نگاہ' کا وہی مطلب ہوگا جو 'یک جہاں جمال' یا 'یک شہر آرزو' کا ہوتا ہے۔

(4) دیدہ تا دل اسد، آئینۂ یک پرتوِ شوق   فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

نسخہ حمیدیہ میں یہ شعر پہلے اس طرح تھا:

دیدہ تا دل اسد آئینۂ یک سجدۂ شوق   فیضِ الفت سے رقم تا دل معنی سرشار

میرزا صاحب نے اس میں ترمیم کر کے قآ اور مآ میں یوں شائع کیا۔

دیدہ تا دل 'اسد' آئینۂ یک پرتوِ شوق   فیضِ معنی سے رقم تا کف راقم سرشار

بعد ازاں 'تا کفِ راقم' کو 'خطِ ساغر' میں تبدیل کر یا، جو آج زبان زد ہے۔ میری حقیر رائے میں یہ اصلاح بھی بہتر نہیں۔ رقم (تحریر مراد قصیدہ) کا فیضِ معنی (اوصاف مرتضوی) سے، راقم (شاعر) کے کفِ دست تک، جس میں وہ قلم اور کاغذ پکڑتا ہے۔ سرشار ہو جانا دلچسپ اور حقیقت کے قریب مبالغہ ہے۔ لیکن فیضِ معنی سے شاعر کے خطِ ساغر کا سرشار ہونا بہت دور کی بات ہے اور کچھ بامزہ بھی نہیں۔

(5) عشق بے ربطیِ اجزائے حواس وصل زنگارِ رخِ آئینہ حسنِ یقیں

نسخۂ حمیدیہ میں دوسرا مصرعہ تھا: ''وصل، افسانۂ اطفالِ پریشاں بالیں'' مرزا صاحب نے پہلے انتخاب کے وقت اس میں تغیر کر کے بنایا ''وصل، زنگارِ رخِ روشنِ مراۃ یقیں۔'' چنانچہ قاَ اور ماَ میں اسی طرح نظر آتا ہے۔ اگرچہ اس اصلاح نے مضمونِ شعر کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا تھا، لیکن ابھی مصرعہ میں لفظی و معنوی دونوں طرح کی سستی اور جھول تھا۔ 1841 کے بعد پھر مرزا صاحب نے اس پر نظر ثانی کی اور 'روشن مراۃ' کی جگہ 'آئینۂ حسن' رکھ کر مضمون میں لطف کا اضافہ بھی کر دیا اور بے کار لفظ کو حذف کر کے اور ثقیل کی جگہ ہلکا پھلکا لفظ رکھ کر لفظی ثقالت بھی دور کر دی۔

(6) دل میں پھر گریے نے اک شور اٹھایا غالب آہ، جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

قاَ میں ''شور مچایا'' ملتا ہے، لیکن ماَ میں 'اٹھایا' ہی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مرزا صاحب نے اس شعر میں 1841 سے قبل ہی اصلاح کر لی تھی۔ وجہ ترمیم یہ معلوم ہوتی ہے کہ 'شور مچانا' زیادہ تر بچوں کی چیخ پکار کے لیے بولا جاتا ہے۔ مرزا صاحب جس تلاطم جذبات کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں وہ اس محاورہ کے بس کا نظر نہیں آتا۔ 'اُٹھانا' میں لفظ اور معنی دونوں کے لحاظ سے 'طوفان' کے ساتھ ہم آہنگی ہے۔ ادھر ایرانی مصدر 'انگیختن' (بمعنی اٹھانا) بھی شور و شر کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اس لیے مرزا صاحب نے عام محاورہ ترک کر کے یہ نیا محاورہ انتخاب کیا:

(7) نہ بندھے تشنگیِ ذوق کے مضموں غالب گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

مبَ، رجَ اور بعد کے تمام نسخوں میں اس طرح ہے۔ لیکن قاَ۔ قبَ۔ نجَ اور ماَ۔ مدَ میں 'تشنگیِ شوق' ملتا ہے۔ میری حقیر رائے میں یہاں شوق کا لفظ ذوقَ سے بہتر نظر آتا ہے۔ اس لیے 'ذوق' اگر بعد کی ترمیم ہے، تو کچھ بہتر ترمیم نہیں۔

(8) پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن دست مرہونِ حنا، رخسار رہنِ غازہ تھا

قاَ اور ماَ میں پہلے مصرع کے اندر 'انداز' کی جگہ 'پرواز' ہے۔ میری دانست میں 'پرواز' کی جگہ 'انداز' نے نہ لفظی خوبی پیدا کی اور نہ معنوی بلکہ بنظرِ غائر دیکھا جائے، تو انداز کے معنی بھی یہاں 'پرواز' ہی ہیں۔ اس لیے اگر اس لفظ کے حق میں کچھ کہا جا سکتا ہے تو یہ کہ اس کا استعمال مقابلتاً عام ہے۔

(9) شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

قاَ اور ماَ میں 'اربابِ عشق' ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے 1841 کے بعد یہ اصلاح کی ہے۔

(10) مرنے کی، اے دل، اور ہی تدبیر کر کہ میں شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا
قا، ما، مب اور بعد کے تمام مطبوعہ نسخوں میں اسی طرح ہے لیکن قب، تج اور مد میں 'بازو' کی جگہ 'خنجر' ہے۔ اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ مرزا صاحب نے 1847 سے قبل یہ اصلاح کی تھی۔ چونکہ مب ہی نے رواج پایا، اور یہ اس اصلاح سے خالی تھا۔ اس لیے اہل ادب اس اصلاح سے واقف نہ ہو سکے۔ رہا اس کا مقابلتاً بہتر ہونا تو ہے، اس سے ظاہر ہے کہ لفظ 'خنجر' سے مفہوم میں معقول اضافہ ہو جاتا ہے۔

(11) مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی، ہے ہے! بیٹھنا اُس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس
قا میں 'پھوڑ' کی جگہ 'مار' ہے۔ چونکہ سر پھوڑنے میں وحشت کا اظہار 'مارنے' کے مقابلہ میں زیادہ ہے نیز 'سر مارنا' کئی معنی کا احتمال رکھتا ہے جن میں سے بعض وحشت کی ضد بھی ہیں۔ اس لیے 1841 سے قبل ہی مرزا صاحب نے یہ اصلاح فرمائی۔

(12) مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
قا میں اس غزل کی ردیف میں 'بھی' کی جگہ 'ہی' ہے۔ ما میں 'بھی' کا وجود اس کی دلیل ہے کہ مرزا صاحب نے 1841 سے قبل یہ ترمیم کر دی تھی۔ میری حقیر رائے یہ ہے کہ 'ہی' میں جو معنوی قوت اور وسعت ہے وہ 'بھی' میں کسی طرح نہیں۔ ہاں صوتی زور اس سے ضرور پیدا ہو جاتا ہے، جو معنی کے مقابلہ میں خود مرزا صاحب کے نزدیک بھی چنداں قابل لحاظ نہیں۔

(13) وہ تبِ عشق تمنا ہے کہ پھر صورت شمع شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے
قا اور ما میں 'چوں رشتۂ شمع' اور 'مغزِ جگر' ہے اور قب میں متن کی طرح ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے 1847 سے قبل ہی یہ اصلاح فرمائی تھی۔ لیکن اس اصلاح نے مضمونِ شعر پر کوئی معتد بہ اثر نہیں ڈالا۔ چونکہ مرزا صاحب پختگی کو پہنچ کر 'چوں' اور 'جوں' سے پرہیز کرنے لگے تھے اس لیے مصرع اول میں لفظ 'صورت' لانا پڑا تا کہ تشبیہی معنی پیدا ہو جائیں۔ 'مغز کی جگہ 'نبض' لانا اس لیے مناسب تھا کہ ایک تو 'رشتۂ شمع' میں سے 'رشتہ' گرایا جا چکا تھا جو شمع کے جلنے کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے 'نبض' نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ دوسرے 'ریشہ دوانی' کی مناسبت 'مغز کی جگہ' 'نبض' ہی کو چاہتی تھی۔

(14) میکدہ گر چشمِ مست ناز سے پاوے شکست موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے
قا، قب اور ما میں 'ناز' کی جگہ 'یار' ہے۔ نیز قا اور ما میں 'موئے شیشہ' کی جگہ 'موئے مینا'

ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی اصلاح 1847 کے بعد اور دوسری اس سے پہلے کر لی تھی۔

(15) ابھی آتی ہے بو باش سے اس کی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

قا اور ما میں ہماری دید کی جگہ 'ہمارے ذوق' ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مرزا صاحب نے 1841 کے بعد یہ اصلاح کی تھی۔ یہاں 'دید' سے مراد 'دیدار' نہیں، بلکہ رائے یا نظر ہے۔اس لیے 'ذوق' کی کوئی معنوی کمی اس سے پوری نہیں ہوتی، البتہ 'خواب' کے ساتھ 'دید' لانے میں لطفِ تضاد ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔میری حقیر رائے میں یہ تغیر بھی مرزا صاحب کی روش کے خلاف اور معنی میں غیر دلچسپ پیچیدگی پیدا کرنے کا موجب ہے۔اس لیے مقابلتاً بہتر نہیں۔

(16) عارضِ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسد جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

نسخۂ حمیدیہ، قا اور ما میں 'جلوہ گل' ہے، جو اس کا ثبوت ہے کہ یہ تغیر 1841 کے بعد کیا گیا ہے۔ یہاں بھی 'روئے یار' کی مناسبت سے 'جلوہ' کو 'عارض' بنایا ہے۔ ورنہ ازروئے معنی کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(17) سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر، ورنہ یاں دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

قا۔ قب۔ قج اور ما اور مد میں 'شورشِ باطن' ہے۔ غالباً کسی سہو سے مب میں پہلی بار اور پھر اس کے تتبع میں بعد کے نسخوں کے اندر 'شورش' نے 'سوزش' کی شکل اختیار کر لی ہے جو مقابلتاً مضمون کے ساتھ ہم آہنگ بھی نہیں۔اس لیے کہ دل کا 'محیطِ گریہ' ہونا اندرونی سوزش کا نہیں، شورش و تلاطم کا متقاضی ہے۔

(18) وہ بدخو اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

قا۔ قب۔ قج اور ما اور مب میں 'داستانِ شوق' ہے جو 'داستانِ عشق' کے مقابلے میں بہتر ہے۔ میری دانست میں یہاں بھی مب ہی کی وجہ سے یہ لفظ مشہور ہوا۔ ورنہ غالب کی پسندیدہ ترکیب مقدم الذکر ہی ہے۔

(19) گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

قج کے کاتب نے نادانی سے 'جو شامت آئے' کو 'خوشامد سے' بنایا تھا۔اس کی تصحیح ہونے

سے رہ گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مطبعِ چشمۂ فیض دہلی سے 1886 میں اور شاید اسی زمانے کے لگ بھگ منشی نولکشور کے مطبع سے اور 1908 میں مطبعِ نامی لکھنؤ سے جو نسخے چھپ کر نکلے، ان میں بھی اس غلطی نے جگہ پالی۔

اسی طرح بعض نسخوں کے کاتبوں نے 'شامت آئے' کو اپنی نظر میں غلط یا نامانوس سمجھا اور 'آئے' کو 'آئی' میں تبدیل کر کے شعر کو درست کر دیا۔ چنانچہ سر عبدالقادر مرحوم کے مقدمے کے ساتھ جو نسخہ لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اس میں بھی یہ غلطی موجود ہے۔ اربابِ ذوق ان دونوں فعلوں کے محل استعمال اور اُن کے معانی کے نازک فرق کو اچھی طرح جانتے بوجھتے ہیں۔ اس لیے اس تغیر کو بزمِ ادبا میں قبولِ عام حاصل نہ ہوسکا۔

(20) ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

مد میں پہلا مصرع یوں ہے: ''ہے زلزلہ و صرصر و سیلاب کا عالم'' میری دانست میں مروج مصرع زیادہ اچھا ہے۔ اس لیے کہ معشوق کے آنے کو بجلی کی کڑک، شعلے کی لپک اور پارے کی چلت پھرت کہنے میں شعریت ہے۔ اس کے لیے بھونچال کا آجانا۔ آندھی کا چلنا اور سیلاب اُمڈ آنا بولنا زیب نہیں دیتا۔ اندریں صورت اگر یہ ترمیم مرزا صاحب ہی کی ہے تو بادل ناخواستہ قبول کرنے کی ہے:

(21) یعنی ہر بار کاغذ باد کی طرح ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لیے

نسخہ حمیدیہ میں پہلا مصرع اس طرح تھا ''مغرور وفا نہ ہو کہ جوں کاغذِ باد' اس میں ترمیم کر کے مرزا صاحب نے ''یعنی ہر بار کاغذ باد کی طرح'' بنایا۔ چنانچہ قا اور ما میں اس طرح ہے لیکن نج اور رج میں 'صورتِ کاغذ باد' ہے۔ چونکہ مرزا صاحب خود اپنے بعض شاگردوں کی اصلاح میں یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ 'طرح' بسکون کا استعمال مثل دیانند کے معنی میں انھیں پسند نہیں۔ اس لیے میں اس ترمیم کو اصلاح مانتا ہوں اور چونکہ یہی صورت قب میں بھی ہے اس لیے یہ اصلاح 1847 کے بعد کی ہے مگر مجھے تعجب ہے اسی پر کہ مد میں جو نج کی نقل سے چھاپا گیا ہے یہ اصلاح کیوں نہیں نظر آتی اور رج میں جو مب سے طبع ہوا ہے ''صورتِ کاغذِ باد'' کیوں ہے۔

○

میرزا غالب کی اصلاحیں

(نواب محمد یوسف علی خاں ناظم اور صاحبزادہ عباس علی خاں بیتاؔب کے کلام پر)

یہ اصطلاحیں ہمیں مولانا امتیاز علی عرشؔی کی وساطت سے حاصل ہوئی ہیں، جو ریاست رام پور کے سرکاری کتاب خانہ میں ناظم کی حیثیت سے مامور ہیں۔
مولانا عرشؔی، کو یہ اصلاحیں کتب خانہ کے پرانے مسودات میں دستیاب ہوئی تھیں اور اس میں شک نہیں کہ بڑی ادبی و تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔
مولانا عرشؔی عرصہ سے غالب کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ اس کا نام مٹائے بغیر نہ رہیں گے۔ کسی شخص کے متعلق اتنا کچھ لکھنا کہ پھر کچھ لکھنے کو باقی ہی نہ رہے، اس کا نام ہی مٹانا ہے! (نیاؔز)

اصلاحات کلام ناظم

لو صاحب، آفتاب کہاں اور ہم کہاں!   ~~عاقل نہیں~~ (احمق بنیں) ہم اس کو نہ سمجھیں، اگر غلط

اس رخ کا جلوہ تجھ کو مضر ہے، دل فگار   سب چاندنی سے کرتے ہیں، ~~گھائل~~ (بسمل) کی احتیاط

~~بے دیئے~~ (بن دیئے) لے اوڑا کبوتر خط   یوں پہونچتا ہے اوپر اوپر خط

اگر ''بن دیے'' رکھنا منظور نہیں، تو ''بے دیے'' رہنے دیجے۔ لیکن میرے نزدیک 'بن دیے' فصیح ہے۔ چنانچہ میرا شعر ہے:

میں بلاتا تو ہوں، اُس کو مگر اے جذبۂ دل   اوس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

اس سے قطع نظر، یہ جو مثل مشہور زباں زد جمہور ہے کہ ''بن آئے کوئی نہیں مرتا'' اس کو

نگار، اکتوبر 1943

کوئی کیا کرے گا۔ غرض کہ میں اپنی طرف سے اس لفظ کی سفارش کرتا ہوں۔ مگر آپ کی اطاعت منظور ہے۔ ایک عرض کر کے پھر نہ کہوں گا۔ غالب

اوس
پڑھ تو لیں گے وہ نامہ میرا بھی   آتے رہتے ہیں اون کے اکثر خط

''اس کا مخاطب یہاں رقیب ہے۔ پس پھر جمع کا صیغہ کیوں لکھا جائے۔ غالب

ہریک
تو ہو جاتا ہے ہرایک عیش و عشرت کا شریک   دوست کہتے ہیں، اوسے جو ہو مصیبت کا شریک

جہاں ''ہرایک'' اچھی طرح نہ آئے وہاں ''ہریک'' لکھئے۔ ''ہرایک'' کیوں لکھئے؟ غالب

جس فیاض سے دونوں ہیں ناظم بہرہ یاب   میں بھی ہوں اُستاد کے حسن طبیعت کا شریک

پیری میں بھی بے ولولۂ شوق نہیں ہم   رکھتے ہیں ابھی اک دلِ ہنگامہ گزیں ہم

یہاں ''ایک'' کی جگہ ''اک'' بے یائے تحتانی درست ہے مگر ''ہر'' کے ساتھ ''ہریک'' ہو نہ ''ہراک۔'' غالب

سیاح جہاں گرد ہیں، آنکلے یہاں بھی   کچھ تیرے پجاری تو نہیں، اے بت چیں ہم

''آنکلے ہیں یہاں بھی''، ''یہاں'' بروزن وہاں فصیح نہیں۔ بے ضرورت نہ چاہیے۔ ''یہاں'' بہ یائے مختلط التلفظ افصح ہے۔ غالب

وہ جب آپ سے   تو
~~جو اپنے سے بھی~~ اپنا پردہ کریں   ~~وہ~~ بندِ قبا کس طرح وا کریں!

وفا شعاریٔ ناظم یقیں نہیں، نہ سہی   یہ کون شخص ہے، اس کا بھی کچھ خیال نہیں؟

سبحان اللہ! کیا امیرانہ مضمون ہے۔ غالب

قاصدوں کے کہیں انعام میں بٹ جائے نہ ملک؟
جلد جلد اب مرے ناموں کے جواب آتے ہیں

یہ مضمون سوائے آپ کے کون باندھ سکتا ہے۔ غالب

غلطی غیر کی گفتار کی دیکھی، ناظم   وہاں میں جاتا ہوں، تو کہتا ہے ''نواب آتے ہیں''

ہائے کیا نیا مضمون ہے! غالب

چپک
ہے یہی گریۂ خونیں، تو کسی دن، ناظم   یوں ہی رہ جائیں گی آپس میں ~~جھپک~~ کر پلکیں

''جھپکنا'' اور ہے اور ''چپکنا'' اور ہے۔ یہاں ''چپکنا'' منظور ہے۔ غالب

قطعہ

ہوئے ہو ایک بتِ دلفریب پر عاشق — زبس کہ آپ کو ناکردہ کار سمجھے ہو

صلاح و مشورہ رکھتے ہو مجھ سے اور مجھے — فنونِ عشق کا آموز گار سمجھے ہو

شریکِ دولتِ ناز و نیاز رکھتے ہو — انیسِ خلوتِ شبہائے تار سمجھے ہو

اگرچہ خوش ہوں، پر آتا ہے رحم بھی تم پر — کہ مجھ سے غمزدہ کو غمگسار سمجھے ہو

ہائے، کیا قطعہ ہے! غالب

نالے کے مجھے طور بہت یاد ہیں لیکن — طاقت کا گماں بھی ~~ہے~~ ہو دل غمزدہ پر کچھ

تم آ تو جاؤ صومعہ میں ایک دن کہ ~~ہیں~~ وہاں — ~~اپنے کو دور~~ دور آپ کو ہیں مردمِ دیندار کھینچتے

لگاوٹ غیر سے اُس کی جلا کر خاک کردیتی
~~لگاوٹ غیر سے دیکھ اُس کی جلکر خاک ہوجائے~~ — سمجھتے گر نہ ہم دل میں کہ وہ بیمہر کس کا ہے

ہو رات ~~جو~~ تو جیتے رہیں، امیدِ سحر پر — یہ روزِ سیہ ہے، شبِ دیجور نہیں ہے

خستۂ پیکانِ غم ~~ہرایک~~ ہر یک جوان و پیر ہے — اور پھر دیکھو تو ترکش ہی میں پنہاں تیر ہے

ملا کر منہ سے منہ بوسہ دہن کا دے کے کہتے ہیں — پیاسے پاس کیا آنا کنویں کا امر مشکل ہے؟

اگر ''پیاسے'' کے لفظ میں یاے تحتانی کا اعلان نہ منظور ہو، تو آغازِ مصرع میں کاف لکھ دیجیے[1] غالب

دے کے دل مل گئی دلبر کی طبیعت مجھ سے — سیکھنے آتا ہے آئینِ محبت مجھ سے

سبحان اللہ! اس غزل میں معشوق کے عاشق ہونے کا بیان کیا خوب ہے! اگرچہ معشوق کے معشوق کو مخاطب نہیں کیا، مگر معشوق کو کس لطف سے سمجھایا ہے! غالب

تنگ ہوں جینے سے، اب مرنا کہاں! — ~~بچ ہے زچ ہونے میں بچتا~~ ضیق ہوجانے میں بچتی مات ہے

مانا ہے مجھ کو قیسِ بیاباں نوردنے — گر ~~پوچھتی~~ پوجتی ہے لیلیِ محمل نشیں تجھے

''پوجتی''۔ یہاں ''پوجنا'' بمعنی پرستش ہے، ''پوچھنا'' بمعنی پرستش نہیں۔ غالب

لکھ کے دو بحروں میں، ناظم یہ غزل — نازشِ حسنِ طبیعت ہے مجھے

---

[1] یعنی مصرع اس طرح بنالیا جائے: ''کہ پیاسے پاس کیا آنا کنویں کا امر مشکل ہے۔'' عرشی

دو بحریں ایک تو یہ "فَعِلاتن فَعِلاتن فعلن۔" دوسری یہ "فاعلاتن فاعلاتن فاعلن" کیا اچھی صنعت ذو بحرین کی اور پھر باوجودِ رعایتِ صنعت، اشعار کیا خوب! غالب

اصلاحات کلام بیتاب

قصاید

ناگاہ کیوں
~~یوں یک بیک~~ کا نقشہ بدل گیا — یہ رنگ تو ہوا نہ تھا دنیا میں آشکار
یہ مصرعہ مجھ سے نہیں پڑھا گیا (غالب)

روبرو جس کے ہے
~~زینت کچھ آج کل ہے وہ اس خاکدان کی~~ — خلد بریں بھی ~~روبرو ہے جس کے~~ شرمسار

ہر جزو سے ظہور
گل نے کیا ہے شاخ کے ہر ~~جزو سے سربدر~~ — اب کون سی جگہ ہے کہ نکلے جہاں سے خار

نسیم
بیٹھے ہیں مطمئن سبھی بزمِ نشاط میں، — ہاں ایک ~~صبا تو~~ پھرتی ہے گلشن میں بیقرار

ہوتے ہیں
کثرت سے بسکہ جمع ہوئے شاہدان گل — کس کس مزے سے ~~ہوئے~~ ہیں آپس میں ہمکنار

اور شب برات
دن عید ہے زمانہ میں ~~اور رات شب برات~~ — ہر سمت راگ و رنگ ہے قانون اور ستار

فدا
وہ دن ہے آج جس پہ کروں جان تک ~~نثار~~ — ہے جشنِ غسلِ صحت نواب، نامدار
اگر یہ مطلع ہے تو چاہیے اس سے پہلے ایک شعر میں اطلاع دی جائے۔

ثنا
ممکن نہیں جو کر سکے ممدوح کی ~~صفت~~ — بیتابؔ اب دعا ہی پہ بہتر ہے اختصار

نطق
بات یہ ہے وقت پر خوب سجا ہی مجھے — فکرِ رسا کا بڑا ~~مجھ~~ پہ احسان ہوا

ہے — ہے آج
دھوم ~~سے~~ سرکار میں جشن کا سامان ~~ہوا~~ — عرش سے لے فرش تک، عیش کا طغیان ہوا

والہ
رنگ محل کا سماں، ہو نہیں سکتا بیاں — جس کی نظر پڑ گئی ~~ششدر~~ و حیراں ہوا

طرز
کثرتِ مقیش سے مثلِ جبینِ عروس — روئے زمین پر عجب طرح کا افشاں ہوا

جب سے کہ / وہ

بزم منور ہوئی مقدم نواب سے — ~~جبکہ وہ~~ رونق فزا ~~چوں~~ مہ کنعاں ہوا

چوں بمعنی مثل و مانند اب متروک ہے اور چوں لفظ فارسی الاصل تو آگے بھی متروک رہا ہے۔

اور بجز رسد کے

دور میں اُس کے بجز ابر نہ رویا کوئی — ~~اور جوشش کے سوا~~ کوئی نہ نالاں ہوا

مسندِ اقبال پر یوں وہ نمایاں ہوا — صفحۂ گردوں پہ جوں مہرِ درخشاں ہوا

(میرزا صاحب نے اسے قلمزد کر کے یہ مطلع لکھا تھا)

دودۂ چنگیز میں جیسا کہ قا آنی ہوا — ویسا ہی اس قوم میں کلبِ علی خاں ہوا

(اس پر بیتاب نے لکھ دیا ہے: قصیدۂ ہذا در شان یوسف علی خاں بہادر مرحوم بود۔ ازیں سبب شعر ہذا نوشتی نیست)

دنیا کی

ہو رہی ہے عجب آراستگی ~~کہنہ سرا~~ — سب فرشتے اسی خدمت پہ ہوئے ہیں مامور

سے

تہ کھڑے کرتے ہیں سجادۂ طاعت جبریل — ایک طرف ہاتھ ~~میں~~ رکھتے ہیں اسرافیل بھی صور

کی فکر

قبض ارواح سے معذور ہوئے عزرائیل — موت ~~کا غم ہی~~ کسی کو نہیں، سب ہیں مسرور

کی / تو

زیب و زینت کا اب اس دہر ~~میں~~ کیا کہنا ہے — صانعِ گل کی ~~جو~~ تعلیم، ملائک کا شعور

کیا / ہے! اللہ اللہ!

چاندنی رات کا ~~تو~~ ذکر ~~ہی کیا صل علیٰ~~ — لیلۃ القدر پہ فایق ہے شب تار کا نور

وہ ایسے ہوئے ہیں

کو بکو ڈھونڈھتے پھرتے ہیں، کہ دیں کس کو زکات — ~~تھے جو محتاج جہاں میں وہی ہیں~~ ذی مقدور

بادشاہان جہاں کا بھی

کوئی دعوت سے مسافر بھی نہ محروم رہا — ~~بادشاہوں کے یہاں بھی تو~~ نہ تھا یہ دستور

ہے قند سے

اس قدر کھانے کی افراط ہے اور پانی کا قحط — دیکھو جس چاہ کو، ~~شربت سے ہے~~ منہ تک معمور

کس سلیقے سے ہے آراستگی ہر ہر شے کی — مہتمم بزم کے آج اپنا دکھاتے ہیں شعور

لہرے

تھاپ طبلوں کی بجتی ہے فلک پر پیہم — ~~لہر~~ سارنگیوں کی سن کے ملک ہیں مسرور

پریوں کے آئے جمگھٹ

تھاپ طبلوں پہ پڑی ~~آئے پریوں کے جھمگٹ~~ — شادیانے کی صدا پہونچی فلک سے بھی دور

گھونگرو کے وہ چھماکے، وہ صدا نغمہ کی، اہل محفل کو کیا عشوہ گروں نے مسحور
چلی اس طرح سواری کہ نہ دیکھی نہ سنی رشک کھانے لگے مرقد میں امیر طیمور

یہ لفظ ''طوئے'' سے نہیں ''تے'' سے ہے اور پھر تیمور بوزن طنبور نہیں، دراصل تمُر بوزن سہ دُر ہے۔ لکھتے ہیں تیمور اور پڑھتے ہیں تمُر۔ اور تمر ترکی میں فولاد کو کہتے ہیں:

لٹکیں تاش تمامی کی ہیں باندھے سقے ہیں بزاری چڑھی اور عطر سے مشکیں معمور

للہ الحمد کہ اب چرخ ہوا نیک خصال ترک اس نے کیے وہ اپنے قدیمی افعال
راہ میں ٹھوکریں کھاتے ہیں پڑے لعل و گہر خذف و سنگ سے بے قدر ہیں دینار و ریال

خزف بمعنی ٹھیکری کے لغتِ فارسی اور املا اس کی زے سے ہے:

ہے کسی جا پہ بھگت، رلیس کہیں سانگ کہیں کہیں کنچن، کہیں کنہک ہیں، کہیں ہیں قوال
کوئی باعث بھی تو ایسا ہی قوی ہے ورنہ اس کی عادت سے تو یہ بات تھی از بس ہی محال
اپنے اسرار سے واقف ہے تو ئی اے پرفن بھید تیرے کوئی پہچانے یہ ہے کس کی مجال
بن پڑے صانع قدرت سے بھی دو ایک نقشہ کھینچتا اور بھی کچھ سکتیں گر ایسی اشکال
اور شجاعت یہ عالم ہے کہ زہرہ ہو آب دیکھ لیں حضرت رستم اگر اوسکی مثال
ہو یہ حیرت کہ میں یہاں تھا کہ زمیں پر، یارب!
~~ہو یہ حیرت کہ میں کہیں تھا زمیں پر اللہ~~ عرش کی سیر کا راکب کو گر آجائے خیال
~~وعدہ کے ساتھ وفا اک جز لاینفک ہے~~ ~~عہد کا نقض ہوا عہد میں اس کے مثال~~

جزِ لاینفک غلط۔ جزوِ لاینفک صحیح

بھوکے پیاسوں کے خورد نوش کے کیوں آتے نہ دن یہ مسلم ہے کہ بعد از رمضاں ہے شوال
فلک پر کوئی اوڑ جائے، پہ وہ بھی نصیبوں میں سوا دو گز زمیں ہے
یہ سچ ہے، تحسین کے قابل ہے معشوق مگر عشاق پہ بھی آفریں ہے

جنابِ غالبِ ~~دوراں~~ کا بیتاب — خلوص طبع سے اب خوشہ چیں ہے

کلام حضرتِ غالب — غالبِ دوراں لفظ نامانوس ہے۔

اے دل، تو اوس کو دیکھ کے ایسا ~~مچل~~ [پھسل] گیا — حیراں ہوں میں کہ ~~پہلو~~ [سینہ] سے کیونکر نکل گیا

دل پر بنی ہوئی تھی اجل کے نہ آنے سے — اب جاں پہ آبنی ~~تو~~ [جو] ذرا دل سنبھل گیا

کیسا مزا دکھاتے ہیں ہم بھی، ~~تو ٹھیر جا~~ [ٹھہر تو جا] — تقریریں کر کے روز یہ ناصح تو ہل گیا

پھاہا ہے وہ تیزاب کا، کیوں ہوتے ہو برہم؟ — ہم نے دل پر داغ پہ ~~رکھا ہے جو مرہم~~ [رکھا نہیں مرہم]

~~کہوں کیا؟ یوں بتانے~~ [وہ بات ایسی چھپانے] کی نہیں ہے — ~~رقیبوں~~ [غیروں] کے سنانے کی نہیں ہے

~~تمھیں سچ باور آنے کی نہیں ہے~~ [نہ کہہ تجھ سے کہ لے میری بلائیں] — ~~یہ~~ [مری] الفت بھی دکھانے کی نہیں ہے

وہاں رقیبوں سے گرم صحبت، یہاں امیدِ وفائی وعدہ — ~~ہے ایک طرفہ ہی یہ تماشا تم اپنے گھر خوش، ہم اپنے گھر خوش~~ [ہے ایک طرفہ تر تماشا]

محبت تری، نفرت اوس کی بڑھی — یہ کیسا پڑا ~~اب~~ [اے] دلِ زار پیچ

مسرور ہوں اغیار، خدا کی قدرت — اون سے ہو ترا پیار، خدا کی قدرت

اور بیٹھے رہیں بزم میں تیری ~~خاتم~~ [چپکے] — ہم ~~شکلِ~~ [مثل] گنہ گار، خدا کی قدرت

غافل نہ کر اپنی ~~زندگی~~ [زندگانی] کو تو خراب — دنیا کا یہ کارخانہ ہے مثلِ سراب

آنکھیں کھل جائیں گی جب آنکھیں ہوئی بند — بیداری کا عالم یہ نظر آئے گا خواب

غزلیات

میرے دل کی ذراسی پھانس کیا ہے روبرو او سکے — اُکھاڑا ایک ہی حملہ میں ~~ہو~~ [تھا] در جس نے خیبر کا

~~ہوا یوں دین اصحاب رسول اللہ سے شایع~~ [ہوا دین نبی اصحاب سے دنیا میں یوں شایع] — کہ نکلے چوک میں سے جس طرح بازار چوسر کا

دل
اُف ری گرمی تب عشق کہ جل کر نکلا، ~~رگ~~ سے جب سوختہ جاں کے تیرے خنجر نکلا

تو
پھر مجھ کو کچھ خبر نہیں، آگاہ ہے خدا پی لی تھی ایک بار جو ہاں جان کر شراب

طور
نہیں آتا ہے شرارت کا گماں بھی اون پر دیکھنے میں تو ہے اس ~~طرح~~ کی اچھی صورت

خلق کے قتل سے کیا فائدہ بس شکر کرو
~~شکر کی جا ہے نہ ایک خلق کو مارے ڈالو~~ کیا قیامت ہوئی گر ہوگئی اچھی صورت

باقی رہی نہ بوند صبوحی کے واسطے
~~اللہ صبح تک خمِ گردوں الٹ گیا~~ ساقی نے کس قدر مئے گلگوں پلائی رات

میں بیخود
~~بیخود میں~~ اور وہ محو خیال رقیب تھے تھی وصل میں بھی وہ ہی جدائی تمام رات

قاتل لگا رکھا ہے تیری تیغ کے لیے بیتاب کو اگرچہ نہیں سر کی احتیاج
~~قاتل بنا ہے تیری ہی تلوار کے لیے~~ ~~تھی ورنہ عاشقوں کو نہ کچھ سر کی احتیاج~~

برہم ہے جو
کیا رحم کھا کے میری سفارش کچھ اوسنے کی ~~برہم جو ہے~~ رقیب سے بھی یار کا مزاج

کہ
درماں نے تیرے گور میں پہونچا دیا مجھے اب چارہ گر، بتا ~~میں~~ کروں کیا تیرا علاج

لیکن بنائے چرخ
عادل ہے تو تو، شک نہیں کچھ اس میں اے خدا ڈالی ہے کس مراد پہ ~~تونے بنائے چرخ؟~~

کیا قلم؟ کیسی دوات اور کہاں کا کاغذ آپ چل کر کہو احوال دل اوس سے بیتاب
~~آپ چل کر کہو احوال دل اوسے بیتاب~~ ~~کس کی دوات، قلم کیسی، کہاں کا کاغذ؟~~

ممنون
دشمنوں کا اور فلک کا بھی میں ~~مشکور~~ ہوں خوش اگر ہوتا ہے وہ ظالم میرے آزار پر

لکھ دیا لکھنے کو، لیکن پھر جو کچھ رحم آگیا رو دیا اللہ نے میرا مقدر دیکھ کر

آپ پہلے میری سرنوشت پر بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ غالب

میری
طبع رسا نے ~~اپنی~~ دوبالا کیا اُسے پہونچا تھا مرتبہ کو نہ اپنے سخن ہنوز

چھوڑ
سخت جانی، تجھے اللہ کی مار! او ظالم پھر گیا، زندہ مجھے ~~دیکھ~~ کے دلبر، مایوس

ظالم
خدا کرے! تیرے پیکان تیر کو ~~تو صنم~~ پسند آئے دل بیقرار کی آغوش

~~ہے میرے دوست کا بھی دشمنِ جاں وہ ظالم~~ / ~~میں نے اس واسطے دشمن سے نکالا اخلاص~~

درست یعنی معشوق۔ دشمن یعنی رقیب۔ رقیب معشوق کا عاشق ہوتا ہے، دشمنِ جاں نہیں ہوتا۔ مانا کہ وہ رقیب معشوق کا در پردہ دشمن ہے۔ پھر اس عاشق نے اپنے معشوق کے عدو سے اخلاص کیوں نکالا۔ خدا جانے اس شعر کی فکر کے وقت حضرت کا خیال کدھر تھا۔ غالب

دوستی اپنی، خدا کے لیے ~~کہہ~~ (تہہ) کر رکھئے / نہیں بھاتا ہے مجھے، ناصحو، اتنا اخلاص

~~قاصد کی تاب کیا ہے؟ کبوتر کی کیا مجال؟~~ / ~~پہونچا دے یار تک تو ہی، پروردگار خط~~

یہ گستاخی بے مزہ ہے:

دے دادِ دل۔ وگرنہ یہ دونوں ہیں بدبلا، / کرتے ہیں آہ و نالہ تیرا، اے خدا لحاظ

ہاں، اس میں نمک ہے۔

دیوانہ ہے وہ کون، جو دن کو جلائے شمع / ~~خورشید رو~~ (اوس مہروش) کے سامنے کیا کوئی لائے شمع

~~پروانہ ساں نہ کہیے، مجھے شرم آتی ہے~~ (پروا نہ مجھ کو کہتے ہو تم کو حیا نہیں) / میں مبتلا ہوں آپ کا، وہ مبتلائے شمع

دیکھو یہ چھیڑ ہم سے، ~~وہ~~ (کہ) غیروں کے سامنے / انجان بن کے پوچھتے ہیں ماجرائے داغ

درماں کرے گا دیکھ تو کس کس کا، چارہ گر / ~~ہیں زخم و آبلے بھی تو~~ (ہے زخم اور آبلہ) دل پر سوائے داغ

~~وہ بھی تو~~ (اُلٹے وہ) بھاگ نکلے، یقیں ہے مجھے، اگر / دوڑے میرا گلا تیری شمشیر کی طرف

اب پوچھتے ہیں آپ کہ ہے تجھ ~~پہ~~ (کو) کیا قلق / جب قابلِ بیان نہ اپنا رہا قلق

اتنا کسی ~~سے~~ (کو) وصل میں ہوگا نہ عیش بھی / جتنا کہ تیرے ہجر میں ہم نے سہا قلق

دل کو، جگر کو، پھونکے ہی دیتا ہے، ہائے عشق / اک آگ، کاش! سینہ میں ~~جلتی~~ (ہوتی) بجائے عشق

~~کیا سختیوں سے جان دی بیتاب نے مگر~~ (دی جان کس عذاب سے بیتاب نے مگر) / نکلا نہ شکوہ منہ سے کبھی جز ثنائے عشق

ناچیز اوس، کو جان کے یہ نالۂ سحر / ~~اولٹا پھرا کہ جا نہ سکا آسماں تلک~~ (اولٹا پھرا ادھر نہ گیا آسماں تلک)

ہے کدھر
~~کیا ہے کے~~ تو ہی بتا دے محتسب
ڈھونڈتے پھرتے ہیں میخانہ کو ہم

وہ
قیس و فرہاد کا گو عشق میں کچھ نام ہوا
لیک بیتاب کے مانند ~~تو~~ مشہور نہیں

نہیں کیا
جھنجھلا کے بولے جان ~~بھی نہیں~~ اب تمھیں عزیز
کہہ بیٹھے اون کو جان جو ایک روز پیار میں

ہم اوس کو
بیتاب کا بھی، رندو، معلوم ہے پتا کچھ
~~اوس کو بھی~~ دیکھتے تھے اکثر اس انجمن میں

بھی گھر میں
شکوہ ہے کیا، قبول گر اپنی دعا نہیں
اس درد کی خدا کے ~~یہاں بھی~~ دوا نہیں

کی
کیا بزم رفتگاں میں خموشی ~~کا~~ رسم ہے
ہیں جمع کس قدر، پہ کسی کی صدا نہیں،

لکھے نہ نامہ میں کیوں شوقِ سجدہ در دوست
~~لکھے نہ نامہ میں اب کیوں یہ شوقِ حسرتِ وصل~~
ہم اپنے سر کو تو ہر دم قلم سمجھتے ہیں

ہے ایک دم
اونھیں تو وصل کا ~~ایک دم بھی ہے~~ ہزار برس
ہزار سال کو ہم ایک دم سمجھتے ہیں،

نکالی
پھر بیٹھے بیٹھے چھیڑ ~~لگائی~~ خدا سے ڈر
ظالم، ابھی تو آنکھ کا آنسو تھما نہیں

ہرگز نمک
~~الماس تک~~ نہیں تیرے مرہم میں، چارہ گر
پھر کیوں میں زخمِ دل کو عبث بے مزہ کروں

ہوا شق وہ بھی انگشت نبی سے
~~ہوا شق جلوۂ جاناں سے وہ بھی~~
کیا گرماہ نے ٹکڑے کتاں کو

گر اوس کی
مسیحائی نہ دیکھی ہو ~~تو میرے~~
مری تربت پہ لاؤ
~~جنازہ پر لے آؤ~~ دلربا کو

بھا گیا اپنے زبس قتل کا ایما ہم کو
ہے
بعد مردن بھی ~~تھی~~ مرنے کی تمنا ہم کو

عشق نے دم ہی پہ، بیتاب، بنا دی آخر
ستمگر
کسی صورت سے ~~بھی کافر~~ نے نہ چھوڑا ہم کو؟

وحشت
ننگ عریانی ہو کیوں قطع نظر ~~سودے~~ سے
جب کہ اللہ نے پیدا کیا عریاں مجھ کو

مقتضیات بشر میں سے نہ تھا صبر مگر؟
~~مقتضائے بشری صبر بھی تھا اے اللہ~~
یہ بھی دینا تھا، بنایا تھا جو انساں مجھ کو

دیکھا جس بت کو لگے پڑھنے اوسی کا کلمہ،
میرے خالق نے دیا ہے عجب ایماں مجھ کو
~~واہ! اللہ دیا خوب ہی ایماں مجھ کو~~

ہزار صبر کرو، لاکھ بے قرار نہ ہو
نہیں وہ چیز محبت کہ آشکار نہ ہو
~~مگر وہ چیز ہے الفت کہ آشکار نہ ہو~~

بڑے ادب سے جسے قیس نے کیا سجدہ
کہیں یہ حضرت بیتاب کا
~~کسی سے پوچھو تو، اپنا ہی~~ وہ مزار نہ ہو

بہاتے ہیں تو دو دریا بہائیں چشم تر دونو
فغاں و نالہ ہیں تو ہوں مگر ہیں بے اثر دونو

''دونوں'' میں نون ضرور چاہیے۔ اس غزل کو نون کی ردیف میں لکھ دو۔

کیونکہ منھ رکھے وہ میرے سینۂ پُر داغ پر
بوئے گل ~~سے~~ بھی خاطر نازک پہ جس کی بار ہو

حق تو یہ ہے خوب ہی دی غیر کو رونق مگر
باوفا کیونکر بناتے اُس کو تم ~~لاچار~~ ناچار ہو''

لاچار غلط محض ہے۔ ناچار بہ نون صحیح ہے۔

آواز اُوس کی
~~آواز اُوس کا~~ سن کے شبِ وصل مرگئے
گویا ہماری موت تھی مرغِ سحر کے ہاتھ

خانۂ آئینہ میں ہوتی ہے کیسی چاندنی!
دیکھ کر رکھتا ہے
~~دیکھ رکھتا ہے~~ جب وہ مہ شمایل آئینہ

اوسکے گلے کا ہار
مجموعہ کا سا عطر ہے ~~اوس کا سینہ~~
بوئے بدن ملی ہے جو بوئے بدن کے ساتھ

جالگی ہی ہو پر
~~جان نکلی ہی ہووے~~ اب تک آس تو ٹوٹی نہیں
حشر میں ہووے گی اوس سے ایک صحبت اور بھی

~~گریہ وزاری کو جو روکا تو سودا ہوگیا~~
~~ہوگئے ہم ضبط کرنے سے فضیحت اور بھی~~

میں نے اس شعر کو ناحق کاٹا۔ ''جوروکا'' یہ لفظ مکروہ تھا۔ جو کی جگہ جب لکھ دیجیے۔ شعر صاف اور بے عیب ہوجائے گا۔ غالب

گریہ وزاری کو جب روکا تو سودا ہوگیا
ہوگئے ہم ضبط کرنے سے فضیحت اور بھی

کس لیے
قتل میں اپنے، خدا، اب ~~کون سی~~ تاخیر ہے؟
خمِ یہاں گردن، علم وہاں ہاتھ میں شمشیر ہے

ہے غزلخواں مثلِ بلبل، کہتے ہیں، وہ برگِ گل
پر ہمارے سامنے تو غنچۂ تصویر ہے

ایک ذرا سی اور بھی تاخیر کرنا، اے اجل،
ہمارے
سنتے ہیں کچھ وہاں ~~بھی اپنے~~ قتل کی تدبیر ہے

ہمنشیں
قتل کرتے ہیں گمانِ داد خواہی پر ہمیں، ~~دیکھ تو~~ تقصیر سے پہلے یہاں تعزیر ہے

اب تک اپنی
گزری ~~اپنی~~ عمر ~~تو کس~~ چین سے! شکر خدا دیکھئے، بیتابؔ، اب کیا خواہشِ تقدیر ہے

کی آ کر
فرماتے ہیں بالیں پہ وہ بیمار ~~کے اپنے~~ کیا درد ہے؟ کیوں اس کا مداوا نہیں کرتے

آپ باتیں بنائیں
ہمیں کرنا تھا، جو وہ کر بیٹھے ~~اور تم سر اوٹھاؤ~~ گھر بیٹھے

تمھیں
وفادار، ناصح، مبارک ~~ہوں تم~~ کو ہمیں تو وہی بے وفا چاہیے

اگر
مقابل میں تیرے تو اے پند ~~فرما~~ تجھی سا کوئی بے وفا چاہیے

ہمیں
خدا نے دیا ہے عجب دل ~~ہم کو~~ اب ایسا ہی ایک دلربا چاہیے

پر
بجا ہیں تمہارے سب ارشاد، ~~لیکن~~ ذرا اور کی بھی سنا چاہیے

سے
زباں ~~پہ~~ نام اوس کا دمبدم ناصح لواتا ہے خدا کے واسطے چپ رہ کلیجا منھ کو آتا ہے

درود اوس پر پڑھوں میں، اور
نیازو ناز میں ہے ربط گر ضد ہے تو ظاہر میں ~~میں پڑھتا ہوں درود اوس پہ،~~ وہ صلواتیں سناتا ہے
(مطلع) غنیمت ہے کہ نام اوس کا زباں پر تیری آتا ہے

مشفق
خموشی سے میری، اللہ! کیا مسرور ہے دل میں! کہے جا، ناصحِ ~~ناداں~~ مجھے یہ ذکر بھاتا ہے

بکھرنا
~~کشادہ~~ زلف کا دستِ عدو سے وہم آفت ہے غش آیا جب ہوا سے نکہتِ مشک تتار آئی

تسلی کیا ہو
~~تسلی~~ بخش ~~ہوگی~~ سادگی حوروں کی، اے واعظ ہمیں جب یاد یہ آرائشِ روئے نگار آئی

ہم ملے
~~مل گئے~~ خاک میں، لڑتے ہی تیرے بن گئی جی پہ، بگڑتے ہی تیرے

یہ میں ہوں کہ بت
خدا کو تو پاتے ہیں عشقِ بتاں سے ~~میں وصل صنم~~ مانگتا ہوں خدا سے

کیا
اگر چشم بد ہے، تو ~~کچھ~~ زلف کم ہے یہ سچ ہے، بچائے خدا ہر بلا سے

کریں وہ وعدہ — ناچار

پاس رکھنے کا جو بیتاب ~~وہ وعدہ کرلے~~ — صحبتِ غیر بھی ~~واللہ!~~ گوارا ہوجائے

آپ

کیا کہے جاتے ہو کچھ وصل کی تدبیر بتاؤ — ~~کچھ تم~~ عقبیٰ میں تو، ناصح، رہے کام آنے سے

کریں کیا مرگ کی آخر دعا کی

~~کروں کیا جان سے تنگ آکر دعا کی~~ — بتو منت ہی کروائی خدا کی

نہ

ڈرانا تھا ~~کہ~~ اس کا دل دکھانا — خدنگ آہ نے، ہے ہے باخطا کی

نوحہ

اپنے ہاتھوں سے کرکے کام تمام — ~~نوحے~~ کرنے کو چارہ گر بیٹھے

بتاکر

گئے وہ تو ہوا ہم کو ~~بتا کے~~ — خوشامد ہے یہاں کیا کیا صبا کی

عیادت سے مرض کا ہوگیا ذوق

~~عیادت سے بڑھی خواہش مرض کی~~ — ہمارے درد کی اچھی دوا کی

نہ دو لیلیٰ کو تم مجنوں کا طعنہ — جو دیکھو صورت اپنے مبتلا کی

~~نہ ہنسئے قیس کی دیوانگی پر~~ — ~~خبر تو لیجے اپنے مبتلا کا~~

~~زلف بکھری جو رخِ یار پہ یہاں دل بکھرا~~ — ~~خود پریشاں ہوئے ہم اس کو پریشاں کرکے~~

زلف خود بخود بکھرتی ہے۔ ہم نے کب پریشاں کیا جواب کہیں:

جس طرح آہ

~~آہ جس طرح~~ موے سب عاشق — وہی اپنی بھی حقیقت ہوگی

طَرَح اور ہے، اور طرْح اور ہے۔ فقیر ''طَرَح'' بہ حرکت کے معنے میں طرح بہ سکون نہیں لکھتا۔ غالبؔ

حور

دیکھ ایمان سے کہہ دے، واعظ — ایسی ہی ~~حوروں~~ کی صورت ہوگی

(اس غزل میں مقطع سے پہلے یہ شعر اضافہ کیا ہے)۔

بوسہ لیتے ہی، پھر آجائے گی — جان کیا بوسہ کی قیمت ہوگی

حضرت ایوب گر جیتے ہوں، تو اے ہمدمو — لاؤ — میرے

~~بے قراری سے موا ہے ہے کوئی اللہ سے~~ — مانگ ~~لائے~~ ایک ذرا سا صبر ~~اپنے~~ نام سے

حشر میں اللہ کے آگے یونہی لیجاؤں گا — کام لینا ہے مجھے اپنے دلِ ناکام سے

مجھ سے یہ مصرع پڑھا نہیں گیا:

آجائیں گے جب

تو دیجے جا گالیاں، دے لیں گے ہم بھی کچھ جواب — ہوش میں ~~آئے کبھی گر~~ لذتِ دشنام سے

بہت

تھا ~~نہ بس~~ شوقِ طپیدن، پر ادب مانع ہوا — بچ گئے ہم ذبح کے بھی وقت اس الزام سے

ہم

دیر دیکھا، میکدہ دیکھا، حرم بھی دیکھ لیں، — آج آ نکلے ہیں یہاں ~~بھی~~ گردشِ ایام سے

ہو

ذکر اوس کا ~~ہے~~، کچھ بھی فرمائے — کاش! ناصح ہی دل کو بہلائے

خواب خوش سے جگا دیا

~~پھر بلا میں پھنسا دیا~~ کس نے — دی صدا نعش پر کہ وہ آئے

اور — پچھتائے

~~جواب~~ اون کا ہوا گلہ اولٹا — کر کے شکوہ بھی اون سے ~~پچھتائے~~

مارے خدا کہ چھوڑے یہ ایمان کی تو یہ ہے — الفت بتوں سے اپنے تئیں لاکلام ہے

(اس بیت کو قلمزد کر کے لکھا ہے) ''کو'' کی جگہ ''تئیں'' نہ لکھا کرو۔ غالب

لاہوت ہے نہ، یہ جبروت اے خدا پرست

~~جبروت یہ نہیں ہے، نہ لاہوت زاہدا~~ — یہ عشق ہے کچھ اور ہی اس کا مقام ہے

جبروت بہ حرکتِ موحدہ اور ملکوت بہ حرکت لام صحیح ہے۔ غالب

سوتے ہیں بے خبر

پا کر نجات نزع سے، ~~آرام کرتے ہیں~~ — ہم رہروِ فنا ہیں، یہ غربت کی شام ہے

معمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ — ساقی اگر نہیں تو نہ ہووے سے کام ہے

بیتاب پی خدا نے دیے ہیں تجھے بھی ہاتھ — یہ خم ہے، یہ سبو ہے، یہ شیشہ، یہ جام ہے

(ان دونوں شعروں کے ہر مصرع پر صاد بنا کے دائیں گوشے میں لکھا ہے) واللہ! کیا ذوق انگیز قطعہ ہے۔ غالب 12

(پھر بائیں گوشے میں لکھتے ہیں) خم سے بھر سبو میں، سبو سے شیشے میں، شیشے سے جام میں، اس تقدیم و تاخیر کا مزا میں ہی جانتا ہوں۔ غالب

ہر روز کئی بار مجھے یاد کریں گے

ہر روز اگر وہ ستم ایجاد کریں گے — ~~آزار تو دینے کو کبھی یاد کریں گے~~

ہم خاطر

پرواز کی طاقت ابھی موجود ہے لیکن

~~پرواز کی ہے گرچہ ہوس دل میں اگر ہم~~ — آزردہ نہ ~~خاطر تیری~~، صیاد کریں گے

اس دکھ سے
~~اس طرح~~ مریں گے کہ ہو ہر ایک کو عبرت   معدوم ہم اُلفت ہی کی بنیاد کریں گے

~~خدا کے آگے ہمیں پوچھے جائیں گے پہلے   میری وفورِ ضلالت ہی رہنما ہوگی~~

''پونچھنا'' اور ہے۔ پرسیدن کا ترجمہ پوچھنا بے نون کے ہے۔ یہ آگہی کے واسطے لکھا ہے۔ شعر غلطی املا کے واسطے نہیں کٹا۔ بلکہ ناقص تھا5

~~فلک بہائے گا آنکھوں کی راہ اُس کو بھی   جو خونِ دل تیرے غم میں میری غذا ہوگی~~

خون مذکر، غذا البتہ مونث ہے۔ مگر ذرا غور کیجیے، خون غذا ہوگا، یا خون غذا ہوگی۔ 5

دعا کی ہے
نہیں ٹھہرا ہے اب تک عرشِ اعظم   ~~دعا کی تھی~~ یہ کس نے بلبلا کے

کہ تیرے جام میں
بن اوس کے خونِ جگر ہم پییں، یہ مے ساقی   خدا کرے! ~~تیرے ساغر میں بھی~~ لہو ہو جائے

(اس شعر پر صاد بنا کے حاشیہ پر لکھا ہے)۔ شعر اچھا، مگر بھی کا لفظ بے موقع اور بے محل ہے۔

ئے
ہوئے ہیں گرچہ تایب، پر ہوا و ابرِ باراں میں   رہے مے، ساقیا، میخانہ میں طیار تھوڑی سی

ناصحو
میں سب سمجھے ہوئے ہوں، بات کا جو ڈھب تمھارا ہے   نہ چاہوں ~~ناصحا~~ میں اُس کو یہ مطلب تمھارا ہے

دور
کہاں ہیں قیس اور فرہاد، اب یہ ~~عہد~~ ہے اپنا   کہاں ہیں لیلی و شیریں، زمانہ اب تمھارا ہے

ہو دل
مژگاں کا تیری صید ~~یہ~~ کس طرح سے ~~ہو دل~~   اس تیر کے لیے بھی تو نخچیر چاہیے

نیکوں کے بھی جھکی رہیں سر کچھ تو، دیر کی   مسجد کی چوب و خشت سے تعمیر چاہیے

یہ مصرع مجھ سے پڑھا نہیں گیا:

اب تو
بلا میں آپ پڑتا ہے ~~تو~~ ناصح،   ترے اوپر تو کچھ آفت نہیں ہے

معاذ اللہ مگر
خدا کیونکر ملائے دلربا سے   ~~کہتے وہ کہ یہ~~ قدرت نہیں ہے

بہلاتا ہوں دل کو
یہی کہہ کہکے ~~ٹالو ہی شاہو!~~   کرے جو چاہے، پر عادت نہیں ہے

عزت
ذرا بیتاب کو باہر تو دیکھو،   تمھارے آگے گو ~~غیرت~~ نہیں ہے

آج، پیغام بر، نہ کچھ کہنا، ہیں بہت ہم پہ وہ خفا بیٹھے

ہیں وہ ہم پر بہت۔ جہاں پورا لفظ آ سکے، یعنی پر، وہاں ادھورا لفظ کیوں لکھئے۔ البتہ جہاں گنجایش نہ ہو، وہاں قاعدہ کے موافق جایز ہے اور اس قاعدہ کا نام تخفیف ہے:

یہ بھی قدرت خدا کی اے بیتاب تم بھی اب بن کے پارسا بیٹھے

تیغ کھینچے ہوئے جس وقت وہ قاتل آئے کوئی (کون) ہے میرے سوا، جو کہ مقابل آئے



اردو شاعری پر غالبؔ کا اثر

بڑا شاعر اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ زمانہ پہلے پہل اس کا ساتھ نہیں دیتا اور لوگ اس کے کلام کو ٹکسال باہر مہمل قرار دیتے ہیں۔ یہ بے چارا سوچتا ہے کہیں سچ مچ میرے شعر بکواس تو نہیں۔ ذوق سلیم ڈھارس بندھاتا ہے کہ نہیں ہرگز نہیں، یہ خود زمانے کی نادانی اور بدمذاقی ہے۔ اس سوچ بچار سے حریف فائدہ اٹھاتے ہیں اور طنز کو زیادہ تیز اور زہریلا بنالیتے ہیں۔ اب شاعر بھی نہیں چوکتا اور ترکی بہ ترکی جواب دیتا ہے آخر ایک ایسا وقت آجاتا ہے کہ زبان سے اقرار کیے بغیر دونوں فریق کچھ باتیں مان اور کچھ منوالیتے ہیں۔ بڑے شاعر کی اثر اندازی اور اثر پذیری کا یہ پہلا قدم ہے اسی پر اس کی آئندہ شہرت وقبولیت اور بقا کی عمارت کا انحصار بھی ہوتا ہے۔

میرزا غالب بھی بڑے شاعر تھے۔ ان کے سامنے بھی وہی آیا جو ہر بڑے شاعر کی قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔ ان کے حریفوں کو بھی نہ ان کی خیال آرائیاں پسند تھیں نہ ان کی لفظی تراش خراش بھاتی تھی اور ان سے دریافت کیا جاتا تھا کہ حضرت! آپ کے اس شعر کا کیا مطلب ہے؟

پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال　　　پھر دوا جتنی ہے اس بھینس کے انڈے میں ڈال

تو وہ جھنجھلا کر جواب دیتے تھے۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　　سن سن کے اسے سخنوران کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

کبھی حسرت سے محفل پر نظر ڈال کر فرماتے۔

بیاد دید گراں جا بود زباں دانے　　　غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

اس پر بھی حریف ترس نہ کھاتے تو پکار اٹھتے۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا　　　گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

سچی بات تو یہ ہے کہ اس کش مکش میں میرزا صاحب کے حریف بھی غلطی پر نہ تھے۔ میرزا

نیا دور، مارچ 1959

صاحب زندہ ہوتے اور اس قسم کے اشعار فرماتے۔

اب عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا　　میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

تو آج بھی ہم سب مل کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور بہ ادب عرض کرتے۔ حضرت!

آیت نہیں، حدیث نہیں جس کو مانیئے　　ہے نظم و نثرِ اہلِ سخن سر بسر غلط

ہم کیا مرزا صاحب ہی نے اپنی مشکل پسند طبیعت سے یہ استدعا کی تھی چنانچہ ایک صاحب کو لکھا ہے:

"قبلہ ابتدائے فکرِ سخن میں بیدلؔ و اسیرؔ و شوکت کی طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ پندرہ برس کی عمر تک مضامینِ خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا، اوراق یک قلم چاک کیے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیے۔"

یہ اس بات کا کھلا ہوا اقرار ہے کہ حریفوں کے بار بار ٹوکنے پر انھیں بھی خیال آیا کہ اپنے کلام کو پرکھیں اس کے لیے پہلے کسوٹی کی ضرورت تھی جو ظہوریؔ، نظیریؔ، عرفی وغیرہ کے کلام میں ہاتھ آ گئی۔ میرزا صاحب نے اس پر اپنے طلسمی اشعار کس کر دیکھے تو ان کی حقیقت کھلی جس کے نتیجے میں انھیں اردو اشعار کے بڑے حصے سے دست بردار ہونا پڑا۔

آپ کہیں گے یہ تو میرزا صاحب کی ہار ہے میں عرض کروں گا ہرگز نہیں میرزا صاحب نے صرف میدان چھوڑا تھا ہتھیار نہیں ڈالے تھے انھوں نے اردو شاعری سے بالکل ہاتھ کبھی نہیں اٹھایا۔ وہاں ایرانی مسالے سے ایٹم بنانے میں زیادہ وقت صرف کیا اور کچھ عرصے کے بعد اس میدان میں واپس آئے تو ان کے پاس اس قسم کے بے بدل ہتھیار تھے۔

نکتہ چیں ہے، غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

اس عرصے میں میرزا صاحب کے حریف بھی اپنے کمزور پہلو ٹٹول ٹٹول کر بڑی حد تک اصلاح کر چکے تھے۔ اب جو میرزا صاحب نے میدان اردو میں قدم رکھا تو ان کے ڈر سے قفسؔ کی تیلیاں اور تارنفس کی تیلیاں سامنے نہ لائی گئیں اور نہ زنجیر در کھڑکائی گئی بلکہ مومن و آزردہؔ جیسے پختہ کاروں کے پرے ان نئے قسم کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر سامنے آئے:

مومن:

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی
اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو
دُشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہمنشیں نزاکت آواز دیکھنا

آزردہؔ:

میں اور ذوق بادہ کشی! لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں
اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں
کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے بھی تو یہ زندان قدح خوار ہوئے

یہ تھا وہ اثر جو غالبؔ نے اپنے زمانے کی شاعری پر ڈالا اور قبول کیا۔ اگر ان کے اور دلّی کے حلقہ ادب کے درمیان اتنی کش مکش نہ ہوتی تو یقین ہے کہ شعر میں وہ گہرائی اور گیرائی بھی نظر نہ آتی جو دہلی اسکول کی جان ہے۔

پہلی جنگ آزادی کے بعد دلّی اور لکھنؤ کی بساط الٹی تو ان کے ادبی پروانے رام پور کی روشن شمع کے ارد گرد جمع ہو گئے نواب یوسف علی خاں ناظمؔ میرزا صاحب کے شاگرد تھے اور دربار میں انھیں کا طوطی بول رہا تھا۔ ناممکن ہے کہ یہ سب پروانے سرکار کے مذاق کی رعایت نہ کرتے ہوں۔

نواب خلد آشیاں جن کا عہد رام پور کے ادبی عروج کا آخری نقطہ تھا امیر مینائی کے شاگرد تھے لیکن اس عرصہ میں دہلی اور لکھنؤ کے ٹکراؤ سے ایک نیا رنگ پیدا ہو چلا تھا جس کی تکمیل خود ان کے زمانے میں ہوئی۔ درباری شاعروں کے لیے ضروری تھا کہ آقا کی پسندیدگی کی خاطر کسی نہ کسی حد تک وہی رنگ اختیار کیا اور اس طرح میرزا صاحب کی سادہ پرکاری ذرا شوخ ہو کر سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔

ادھر یہ صورت در پیش تھی ادھر انگریزی علاقوں میں زندگی کے مسائل نت نیا رنگ بدل رہے تھے۔ وہاں کے باشندے محسوس کرنے لگے تھے کہ ان کے لیے مقامات آہ وفغاں اور بھی ہیں۔ کوئی غیبی آواز ان سے یہ کہتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

فضا تری مہہ و پرویں سے ہے ذرا آگے
قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں

حسن اتفاق کہ اس آواز پر حالیؔ اور آزادؔ آگے بڑھے جن میں ایک خود غالبؔ کے شاگرد تھے اور دوسرے گو ان کے حریف ذوقؔ کے نام لیوا تھے مگر تھے بڑے دانا اور دیدہ درمان دونوں نے جدید شاعری کی بنیاد ڈالی اور اپنے خون جگر سے اس پودے کو سینچ کر نئی پود کے حوالے کر دیا۔ حالیؔ اور آزادؔ کا زمانہ دب کر سمجھوتہ کرنے کا تھا اس بنا پر ان کے مسائل گفتگو بھی محدود تھے۔ انھیں مشاہدۂ حق کے ذکر میں بادہ و ساغر کی ضرورت نہ تھی اور دشنہ و خنجر کے بغیر بھی ان کا کام چل جاتا تھا۔ یہ نئی پود کچھ ایسی باتیں بھی کہنا چاہتی تھی جو ان بزرگوں کے نزدیک ناگفتہ تھیں اور اس لیے ان سے زیادہ گہری فکر پر زور الفاظ اور محتاط مگر وسیع طرز بیان کی محتاج تھی۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر جس عمدگی کے ساتھ غالبؔ نے نظر ڈالی تھی اس نے ان نئے شاعروں کو غالبؔ کے کلام کے گہرے مطالعے کی طرف متوجہ کیا۔ یہاں اظہار خیال کے لیے انھیں نئی تشبیہیں انوکھے استعارے اور شگفتہ ترکیبیں ہاتھ آئیں انھوں نے دیکھا کہ ایک ہی بات کو غالبؔ نے مختلف طریقوں سے ادا کیا ہے اور ہر جگہ طرز ادا میں بڑی پر لطف جدت ہے مثلاً کبھی کہتا ہے

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

کبھی اس مضمون کو یوں باندھتا ہے۔

بقدرِ حسرتِ دل چاہیے ذوق معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن جو آبِ ہفت دریا ہو

اور کبھی اس انداز سے ادا کرتے ہے۔

آتا ہے غم حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اور کبھی اس صورت سے نظم کرتا ہے۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ آتش خاموش، گلبانگ تسلی، موج نگاہ، خود داری ساحل، شہپر رنگ، صحرا دستگاہ، طعنۂ نایافت، جنت نگاہ اور فردوس گوش جیسی ہلکی پھلکی ترکیبوں میں کتنا لطف اور کس درجہ وسعت ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نئے اہلِ ادب نے اپنے نظم و نثر دونوں میں غالب کی پیروی کی اور آزاد، نیاز، اقبال جیسے باکمال نظم و نثر لکھنے والے پیدا ہو گئے۔

آج کل سیاسی دنیا کے ساتھ ادبی دنیا نے بھی نئی کروٹ بدلی ہے اور نئے آدمیوں کے سامنے کچھ اور نئی باتیں آ کھڑی ہوئی ہیں اس گروہ کے مسائل کیا ہیں۔ اس بحث سے ہمیں اس وقت سروکار نہیں۔ جو بات یہاں ظاہر کرنے کی ہے وہ یہ کہ جہاں تک پرواز کا تعلق ہے ان سب کے یہاں معمولی طبعی مذاق کے ساتھ غالب کے انداز بیان کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ بہتر ہوگا کہ اپنے مقصد کو واضح کرنے کے لیے غالب کے چند شاگردوں اور دو چار ہم رنگ شاعروں کے کچھ شعر آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

عارف

سخت شرمائے میں اتنا نہ سمجھتا تھا انھیں
چھیڑتا تھا تو کوئی شکوۂ بے جا کرتا

نسبتی:

کام دو پاؤں اک سر سے نکلتا ہے کبھی
ہوسکی طے نہ رہ کوچۂ جاناں ہم سے

سالک:

افزوں ہے ترک عشق سے اندوہ ترک عشق
پرہیز کرکے ہم ہوئے بیمار دیکھنا

تھی شکیبائی علاج اضطراب
چارۂ رنج شکیبائی نہیں
ہے خضر خوش کہ نام رہے اور نشاں نہ ہو
ہم کو نصیب زندگی جاوداں نہ ہو

ناظم:

اے نواسنج انا الحق ترا دعویٰ حق ہے
لیکن دستور نہیں قطرے کو دریا کہنا
شرمندہ ہوئے پر کہیں ضد اور نہ بڑھ جائے
عہد اس کا اسے یاد دلانا نہیں اچھا

شہرت نہیں مجنوں کے برابر یہ مسلم
پر کوئی نہ جانے ہمیں ایسے بھی نہیں ہم
میں نے پھونکا بھی تو کیا تم نے تماشا دیکھا
گھر کو اچھا ہے تمہیں آگ لگاتے جاؤ
کھلے کیا دل در و دیوار کے آثار باقی ہیں
ہوا ہر چند گھر ویراں یہ صحرا پھر بھی صحرا ہے

شیفتہ:

کہا کل میں اے سرمایۂ ناز
تلون سے بھی تم کو مدعا کیا؟
کبھی مجھ پر عتاب بے سبب کیوں؟
کبھی بے وجہ غیروں سے وفا کیا؟
کبھی تمکین صولت آفریں کیوں؟
کبھی الطاف جرأت آزما کیا؟
کبھی بے جرم یہ آزردہ ہونا
کہ کیا طاقت جو پوچھوں میں خطا کیا؟

کبھی اس دشمنی پر بہر تسکیں
پیے ہم جلوہ ہائے دل رُبا کیا؟
یہ سب طول اس نے سن کر بے تکلف
جواب اِک مختصر مجھ کو دیا کیا؟
ابھی تک مہرباں واقف نہیں تم
کہ باتیں عشق میں ہوتی ہیں کیا کیا؟

حالؔی:

تم کو ہزار شرم سہی ہم کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

ہم خوش کبھی ہوئے ہوں تو غم ناگوار ہو
ملتا نہیں محل ستمِ روزگار کا
ہنستے ہیں اس کے گریۂ بے اختیار پر
بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں سے ہم
کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت
ہم کو طاقت نہیں جدائی کی

اقبالؔ:

منصور کو ہوا لب گویا پیام موت
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی
سکون دل سے سامان کشود کار پیدا کر
کہ عقدہ خاطر گرداب کا آب رواں تک ہے
راز ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو
کھل گیا جس دم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں
بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی

ہوئی نہ عام جہاں میں کہیں حکومت عشق
سبب یہ ہے کہ محبت زمانہ ساز نہیں
نگہ بلند سخن دلنواز جاں پر سوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے

فانی:

اللہ رے بے نیازیٔ آداب التفات
دیکھا مجھے تو پائے نظر درمیاں نہ تھا
ممکن نہیں ہے راحت دنیا کی آرزو
غم پر گمان راحت دنیا کیے بغیر

شاید میں در خور نگہ گرم بھی نہیں
بجلی تڑپ رہی ہے مرے آشیاں سے دور
ظرف ویرانہ بقدر ہمت وحشت نہیں
لاؤ ہر ذرے میں پیدا وسعت صحرا کریں
زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

وحشت:

بجز خون تمنا کیا نتیجہ ہے تمنا کا
بغیر از برق خرمن اور کیا حاصل ہے خرمن سے

چکبست:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

میں نہیں کہہ سکتا کہ ان شعروں کو پڑھ کر آپ نے کیا رائے قائم کی مگر میں تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ان کے پردے میں غالب کی یہ آواز سنائی دے رہی ہے۔

کیوں صاحبو! میں نہ کہتا تھا؟

قدر شعر من بگیتی بعد من خواہد شدن

○

غالب کی نئی فارسی تحریریں

مرزا غالب نے 'قاطع برہان' کی تالیف کے سلسلے میں 'برہان قاطع' کے جس مطبوعہ نسخے کو پیش نظر رکھا تھا، وہ افضل المطابع کلکتہ میں 1251ھ (1839ء) میں محمد اعظم لکھنوی کے اہتمام سے بانس کے کاغذ پر نسخ ٹائپ میں بڑی تقطیع کے دو کالمی 924 صفحوں پر طبع ہوا تھا۔

سرورق کے مطابق مہتمم نے کپتان دوبکہ صاحب کے چھاپے ہوئے نسخے کو سامنے رکھا تھا اور اس میں اتنی ترمیم کردی تھی کہ گفتار 29 جو لغات متفرقہ پر مشتمل اور اصل کتاب اور ملحقات کے درمیان میں رکھی تھی اس کے الفاظ کو بہ ترتیب حروف تہجی ملحقات میں داخل کردیا تھا نیز سابق طباعت میں جو غلطیاں رہ گئی تھیں انھیں درست کردیا تھا۔

سرورق ہی کے مطابق مندرجہ ذیل علماء و فضلا نے تصحیح کے کام میں مدد دی تھی۔

(1) مولوی حافظ حاجی احمد کبیر امین مدرسہ عالیہ عربی۔ یہ بزرگ رام پور کے باشندے اور حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد میں تھے۔ مولوی مسیح الدین خاں کاکوروی کے ایک خط مورخہ 17 جمادی الآخر 1269ھ (28/مارچ 1853ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخ سے کچھ پہلے ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ (2) مولوی عبدالرحیم مدرس قانون فارسی۔ (3) مولوی قدرت اللہ ممتحن کمیٹی (4) مولوی منصور احمد معاون مدرسہ (5) مولوی افضل علی لکھنوی (6) منشی سعید بخت یکی از نجبائے وروسائے سلہٹ (7) منشی امداد حسین بریلوی منشی صدر مجسٹریٹ (8) منشی عبداللہ خاں (9) مولوی اصغر علی خاں۔ (10) مرزا حامد علی خاں (11) شیخ نصیرالدین۔

ان دس [گیارہ] حضرات کے بارے میں اس وقت کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کون تھے اور کب مرے۔

سرورق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمانہ لارڈ آکلینڈ کی گورنر جنرل کا تھا اور اس سے پہلے

ماہِ نو، کراچی، جنوری فروری 1969

دو تین بار اور یہ کتاب چھپ چکی تھی۔ چنانچہ سرورق پر منشی امداد حسین بریلوی کا یہ قطعۂ تاریخ چھپا ہے:

اگرچہ نسخۂ برہان قاطع	دو سہ کرت بطبع آمد ز افراد
بہ تصحیحش چو پروائی نکردند	فوائد خلق را چنداں نمی داد
چو مولانا محمد اعظم این حال	شنید و دید و تنگ آمد ز فریاد
میاں بستہ پیئے تصحیح محکم	کہ ماندر جہاں از وے ہمیں یاد
بعون اللہ چناں تصحیح کردہ	کہ شد از عالماں تحسین ارشاد
ہم از بہر رفاہ خلق طبعش	باحسن طرز کرد آں نیک بنیاد
چو شد اتمام طبعش با خوش اسلوب	نمودم فکر در تاریخش امداد
بگفتا از سر احسان سروشم	جہانی بہرہ یاب از فیض آں باد

1251 ہجری

صفحہ (1) کی ایک تحریر کے مطابق محمد اسفندیار بیگ نے 1251ھ میں کلکتہ کے اندر اسے 20 روپے میں خریدا تھا۔ پہلے کی ایک انگریزی تحریر کے مطابق جو بظن قوی نواب علاء الدین احمد خاں علائی کے قلم کی ہے 10/اگست 1858 کو مرزا اسد اللہ خاں غالب نے یہ نسخہ علائی کو تحفۃً دیا۔ آغاز کتاب کے اوپر ایک کاغذ کی چیپی لگی ہوئی ہے۔ اس پر تحریر ہے:

''بخشایندہ و بخشندہ راستایم کہ ایں نادرہ بہ ارمغان پدر نامور میرود۔ یارب چوں آرزوی ہوا خواہ خیر سگال پزرفتہ باد۔ نامہ نگار از گنہ پیش خداوند شرمسار علاء الدین آمرزش خواستار۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علائی نے یہ نسخہ اپنے والد محترم نواب امین الدین احمد خاں بہادر کی خدمت میں بطور ارمغاں پیش کر دیا تھا۔ اس صفحہ کی ایک اور تحریر یہ ہے:

''وصول دولت فرہنگ معنوی ارتنگ مانی روز اوّل از محرم ونخست از اگست 1279ھ (1859ء) بہ جنگ آمد۔''

اس کا کاتب سوائے نواب امین الدین احمد خاں بہادر کے اور کوئی نہیں معلوم ہوتا اور اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ علائی سے اس تاریخ کو یہ نسخہ ان کے والد نے وصول پایا تھا۔

مرزا صاحب اس کتاب کو پڑھتے وقت اپنے اختلافی نوٹ جگہ جگہ حاشیوں پر لکھتے

رہے تھے۔ کبھی کبھی اردو میں اور زیادہ تر فارسی میں یہ تحریریں سب کی سب قلم برداشتہ اور اس لیے آورد سے پاک ہیں۔ لیکن ان میں سنجیدگی بھی ہے ظرافت بھی اور غیر ثقاہت بھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس وقت جس موڈ میں ہوتے تھے ویسی ہی تحریر قلم سے نکلتی تھی۔ جب انھیں یہ خیال آیا کہ ان تحریریں کو ایک کتاب کی شکل دے دیں تو انھوں نے انھیں از سر نو لکھا اور ستم یہ کیا کہ مولف کو جا بجا سب وشتم کرنے سے بھی نہ چوکے جس کے نتیجے میں ایک مستقل ہنگامہ برپا ہوگیا اور مرزا صاحب اور ان کے حامیوں کی طرف سے برہان کے خلاف اور دوسرے حضرات کی طرف سے حمایت میں رسالے اور مضامین نظم ونثر لکھے اور چھاپے گئے۔

اس بحث میں دوسری طرف سے بھی ہٹ دھرمی برتی گئی اور ادب وتہذیب کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا گیا لیکن اب نہ وہ لوگ ہیں اور نہ موجودہ عہد میں اس وقت کی بحث کا اچھا برا اثر لینے والے دل ودماغ ہی موجود ہیں اس لیے میں خرافات کو نظر انداز کرتے ہوئے اور اصل مطلب کو ذہن میں رکھ کر ذیل میں ڈاکٹر محمد معین تہرانی مصحح 'برہان قاطع' کا فیصلہ نقل کرتا ہوں۔ انھوں نے اپنے دیباچے ص 113 میں قاطع برہان کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

''چنانکہ دیدہ می شود در برخی موارد حق با غالب است۔ ودر برخی دیگر ایراد نابجاست ودر مواضع بسیار نزاع لفظی است وکرای گفتن نکند۔'' اور اس کے بعد صرف الف سے متعلق وہ تحریریں نقل کرتا ہوں جو مرزا صاحب نے فارسی زبان میں لکھی تھیں۔ اس باب کی اردو میں لکھی گئی تحریریں ہندوستان کے بعض رسائل میں شائع کر چکا ہوں نیز ملحقات سے متعلق کل تحریریں بھی چھپ چکی ہیں۔

جس تحریر کے شروع میں 'ب' ہوئی ہے وہ برہان قاطع کی ہے اور جس کے آغاز 'غ' ہے وہ مرزا غالب کی تقلید ہے اور ان دونوں کے بعد اپنی رائے بھی جگہ جگہ ظاہر کرتا گیا ہوں امید ہے کہ غالب دوستوں کو ان کی یہ نئی تحریریں پسند خاطر ہوں گی۔

1۔ ب: آبتین۔ بروزن عابدین۔ نام پدر فریدون است۔ وبتقدیم رابع بر ثالث نیز بنظر آمدہ است۔

غ: آتبین بتقدیم تای قرشت صحیح است 12

مرزا صاحب کی تحریر کے نیچے کسی نے لکھا ہے ''یہ غلط''۔ غالباً یہ علائی کی تحریری ہے قاطع برہان اور درفش میں یہ لفظ موجود نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مرزا صاحب نے اس

رائے کو بدل دیا تھا۔

برہان قاطع (نسخۂ تہران) کے مصحح ڈاکٹر محمد معین نے اپنے حاشیے میں مرزا صاحب کی طرح لکھا ہے کہ صحیح آتبین است۔ اک آتبین۔'' اور اس آخری لفظ پر جو حاشیہ لکھا ہے اس میں فرماتے ہیں کہ 'اوستا میں افریدون کے باپ کا نام Arwvoya ملتا ہے جو تائے قرشت کے مقدم ہونے کا ثبوت ہے لیکن سنسکرت میں APTIYA ہے اس لیے بای موحدہ کی تقدیم کی وجہ بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مورخ طبری (ج1 ص 59) اور البیرونی (آثار باقیہ 229) نے 'اثفیان' لکھا ہے۔ مجمل التواریخ (ص 29) میں اتفیان اور اتفیال دو طرح سے ملتا ہے۔ ان شکلوں کی 'ث' بھی تائے قرشت کے مقدم ہونے کی دلیل ہے۔

خود مجمل التواریخ کے حاشیے میں ملک الشعرا بہار نے جو اس کے مصحح ہیں لکھا ہے: اتفیان اصل: ''اتفیال۔ وفی جمیع النسخ سوی شاہ نامہ اثفیان در کتب پہلوی اتپیان، اثپیان، اثوپیان (منتہای پہلوی ص 23) بہر اد املا و آتبین: غلط ولا بلد آتپین بتقدیم تا بر پا فارس ویای مجہول محالہ از الف باید خواند۔ واملای مشہور تصحیف اصل است۔''

2۔ ب: آبچین۔ بروزن آستین پارچۂ جامہ را گویند کہ بدن مردہ را بعد از غسل دادن بدان خشک سازند۔

غ: آب چین مطلق بمعنی جامہ ایست کہ دست درو بدان خشک کنند و در عرف رومال گویند۔ قید مردہ لغو است 12

قاطع برہان میں اس اعتراض کو چھ سطروں میں پھیلایا ہے اور یہ اضافہ کیا ہے کہ ''این مغلطہ تنہا نہ این بیچارہ را افتادہ دیگران را تیز روی دادہ است۔'' درفش کاویانی میں جو قاطع برہان کا نقش ثانی ہے 'دیگراں' کی جگہ 'فرہنگ نگاران دگر' بنا دیا ہے۔

3۔ ب: آبدار۔ کنایہ از مردم صاحب سامان و مالدار ہم ہست۔

غ: آبدار۔ می گوید کہ کنایہ از مردم مالدار و صاحب سامان است غلط می گوید آن را آب مند گویند نہ آبدار۔ آبدار باصفت تیغ و گوہر است یا در ہند اسم داروغہ آبدار خانہ است 12

قاطع برہان میں یہ بھی کہا ہے کہ اس لفظ کو لغات میں جگہ دینا ہی نادرست ہے اور اس کا اسم گیاہ ہونا محل تامل ہے۔ اس کے جواب میں سنائی کا شعر بمعنی مالدار کی سند میں پیش کیا گیا تھا۔ درفش کاویانی میں اس بارے میں فرمایا ہے: ''عزیزی در شعر حکیم سنائی نشان داد۔ گفتم:

شعر سنائی سند کامل و من حیث المعنی جائز۔ اما ہمنفسان وہمسران سنائی ترک کردہ اند۔ و وجہ ترک این است کہ از دیر باز در کارخانہ ھای سلطنت آبدار خانہ و نام تحویلدار آن کارخانہ آبدار می نویسند۔ ہر آئینہ از روی ابہام تو ہم برہانت دارد۔

4۔ ب: آب در جگر ندارد یعنی مفلس است و چیزی ندارد۔

غ: ہرگاہ آب در جگر داشتن بمعنی تونگری نبشت، صیغۂ مضارع را با اضافہ نون مافیہ لغتی جداگانہ چرا آورد۔ 12

قاطع اور درفش میں اسی بات کو ذرا پھیلا کر بیان کر دیا ہے۔

5۔ ب: آب دہ دست اشارہ بحضرت رسول صلوات اللہ علیہ است خصوصاً و شخصی را نیز گویند کہ بزرگ مجلس بود و آرایش صدر و زینت مجلس از و باشد عموماً۔

غ: آب دہ دست سندمی خواہد 12

قاطع برہان درفش میں اسے تفصیل سے لکھا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس مرکب لفظ کے آخر میں 'رسالت، امارت' وغیرہ قسم کے لفظ بطور مضاف الیہ ضرور آنا چاہیے ورنہ اس کا مطلب ہوگا۔ ہاتھ دھلانے والا۔ جو توہین آمیز لفظ ہے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ مولف نے غالباً آب دہ دست رسالت" نہیں پڑھا تھا جس کا مطلب تھا مسند رسالت کا رونق دہندہ۔ غلط فہمی سے نصف لغت کو لغت سمجھ بیٹھا۔

6۔ ب: آب زیر کاہ کسی را گویند کہ خود را بظاہر خوب وانماید و در باطن مفتن و فتنہ انگیز باشد و کنایہ از خوبی و نیکی مخفی و رواج و رونق خس پوش ہم است۔ الخ

غ: گوئی آب زیر کاہ را از اضداد شمردہ است۔ و این اندیشہ غلط است۔ ہمان مردم کار دورنگ را گویند۔ 12

قاطع برہان و درفش میں اس عبارت کی سستی کی ہنسی اڑائی ہے اور اوپر کے جملے کی جگہ لکھا ہے "سخن کوتاہ آب زیر کاہ عبارت از نفاق و ریاست و بس۔"

7۔ ب: آب سیہ بکسر ثالث مخفف آب سیاہ است کہ شراب انگوری و علت کوری وغیرہ باشد۔ آب شنگرفی بکسر ثالث کنایہ از شراب لعلی باشد۔

غ: ہندیان شراب را کالا پانی گویند۔ 12

آب سیاہ و آب سیہ اسم چیزی کہ آں را خود آب شنگرفی نبشتہ است محل تامل 12 قاطع

برہان و درفش میں اس اعتراض کو بھی خوب پھیلا کر لکھا اور مولف کو بے طرح بنایا ہے۔

8۔ب: آب طرب۔ کنایہ از شراب انگوری باشد

غ: آب طرب بمعنی شراب نیز جای تردد است۔ آب طربناک می توان گفت۔ 12۔

آب عشرت ایضاً 12

قاطع برہان اور درفش میں اس اعتراض کو چھوڑ دیا ہے۔

9۔ب: آبشت۔ نہفتہ و پنہاں را گویند الخ

غ: آبشت را شش لغت ساختہ واز حقیقت جوہر لفظ غافل ماندہ۔ آبشتن مصدر نیست کہ آبشت ماضی آن باشد۔ وآبشتن وآبستن لغتی است بمعنی مکتوم و پوشیدہ عموماً و بمعنی زن حاملہ خصوصاً ہر آئینہ آبشتنگاہ مستراح را گویند وآبشتگاہ مخفف آن است۔ 12

اس اعتراض کو بھی قاطع برہان و درفش میں پھیلا کر لکھا ہے۔

10۔ب: آب گاہ۔ تہی گاہ و پہلو را گویند و بمعنی تالاب واستخر ہم ہست۔

غ: آب گاہ بمعنی تالاب می تواند بود لیکن بمعنی تہیگاہ مسموع نیست 12

قاطع برہان و درفش میں یہ بھی تسلیم نہیں کیا ہے کہ بمعنی تالاب ہوسکتا ہے اور دونوں کے لیے سند کا مطالبہ کیا ہے۔

11۔ب: آب وزر بفتح واو وسکون ثالث و رای بے نقطہ و زای نقطہ دار شنا ور و شنا کنندہ را گویند۔

غ: آب وزر بہ تقدیم معجمہ بر مہملہ غلط است۔ آری آب ورز بہ تقدیم رای مہملہ بر معجمہ درست۔ 12

قاطع برہان و درفش میں اس اعتراض کو ترک کر دیا ہے، کیونکہ یہ طباعت کی غلطی تھی۔ خود مصنف نے الفاظ میں جو تصریح کی ہے اس میں صاف طور پر رای مہملہ کو زای معجمہ پر مقدم بتایا ہے۔

12۔ب: آتش برگ۔ بمعنی آتش زنہ است کہ چقماق باشد۔

غ: آتش برگ سنگی را گویند کہ چو آتش زنہ بمعنی چقماق برآن زنند آتش برون دہد۔ و آتش برگ را در ہندی پتھری گویند نہ چقماق۔ 12

قاطع برہان اور درفش میں اس پر بھی اعتراض کیا ہے کہ کاف کے ساتھ فارسی کیوں نہ لکھا۔

13۔ ب: آتش زم زم کنایہ از آفتاب عالمتاب است۔

غ: آتشیں زم زم بطریق استعارہ آفتاب را گویند نہ آتش زمزم۔12

قاطع برہان و درفش میں اس اعتراض کو بھی پھیلا کر لکھا ہے اور سب سے پہلے اس پر حرف زنی کی ہے کہ 'زم زم' کو الگ الگ کیوں لکھا ہے ملا کر کیوں نہ لکھا۔

14۔ ب: آخور۔ و بے داد نیز درست است چنانکہ گذشت۔

غ: آخور غلط۔ بی داد صحیح با آنکہ خور بے داد نوشتہ دوبارہ چرا نوشتہ۔12

قاطع برہان و درفش میں اس اعتراض کو حذف کر دیا ہے۔

15۔ ب: آدیش بکسر ثالث۔ آتش را گویند۔ وایں کہ بفتح تای قرشت اشتہار دارد غلط است الخ

غ: آدیش۔ ہرگز اسم آتش آدش و تای مکسور نیست۔ تش و تف و تب بمعنی گرمی است و بہ افزائش دو الف نام نار قرار دادہ اند۔12

قاطع برہان اور درفش میں اس اعتراض کو بھی تفصیل سے لکھا ہے۔ نیز درفش میں آتش کی ت کے فتح کی سند میں میر حسین سادات، داعی اندجانی۔ نظامی گنجوی۔ سعدی اور خاقانی کے شعر بھی لکھتے ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس محل پر برہان قاطع کا یہ دعویٰ کہ آتش بفتح تای قرشت غلط ہے اور مرزا صاحب کا یہ ادعا کہ 'آتش' کی ت مکسور نہیں ہے دونوں غلط ہیں۔ فارسی میں اس لفظ کی دونوں شکلیں مستعمل ہیں اور نہ صرف اسلامی فارسی میں بلکہ قدیم لہجوں میں اسے ایک لہجے 'شہمیر زادی' میں بھی 'آتش'(Atish) بکسر تائی قرشت بولا جاتا تھا۔ ملاحظہ ہو ڈاکٹر محمد معین کا حاشیہ لفظ آتش پر۔

16۔ ب: آذر۔ بنا بر مشہور بفتح ذال نقطہ دار است الخ

غ: آذر استغفر اللہ۔ آذر بذال منقوطہ ہرگز نیست بدال مفتوحہ چنانکہ جامع لغات بر صفحہ 22 نوشتہ است۔ صحیح است۔ و باقی ہمہ خرافات 12

قاطع برہان میں یہ بھی لکھا تھا کہ آذر جو دن اور مہینے کا نام ہے، اس میں بھی دال ابجد درکار ہے۔ لیکن درفش میں اس کی جگہ تحریر کیا کہ رای ہوز درکار ہے۔ مجھے یہاں دو باتیں عرض کرنا ہیں۔ پہلی یہ کہ مرزا صاحب نے اپنے ایرانی نومسلم استاد عبدالصمد کا ذکر سب سے پہلے قاطع کی اس بحث میں اس وقت کیا، جب وہ اسے کتابی شکل میں مرتب کر رہے تھے۔ برہان قاطع میں پائے جانے والے حاشیوں میں سے کسی ایک میں بھی عبدالصمد کا نام نہیں ملتا۔

دوسری بات یہ کہ اسدی طوسی نے لغت فرس ص 208 میں 'درفش' بمعنی برق کے سلسلے میں لکھا ہے کہ ''گویند کہ در زبان پارسی ہیچ کلمہ نیست کہ اول اوزار بود جز این کلمہ'' چونکہ یہ کامہ آزرفش کا مخفف اور اس کا ہم معنی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسدی طوسی کے زمانے میں اس لفظ کے املا میں ذال تھا۔ دال یا زے نہ تھے۔

17۔ب: آرازش۔ بمعنی خیر و خیرات کردن و در راہ خدا چیزی بکسی دادن باشد۔

غ: آرزانش بمعنی خیرات است نہ آرازش۔ 12

18۔ب: آرشی۔ بمعنی معنوی باشد کہ در مقابل لفظی است چہ آرشی یعنی معنی است۔

غ: ہرگاہ آرشی بمعنی معنی نوشت آرشی را لغتی آخر چرا قرار داد۔ 12

قاطع برہان و درفش میں یہ اعتراض شامل نہیں ہے۔

19۔ب: آژدن۔ بروزن و معنی آزدن باشد الخ

غ: آزدن بہ زای عربی غلط۔ آژدن بہ زای فارسی ہیچ۔ و در ہر صورت بمعنی رنگ کردن غلط آژدن سہ معنی دارد۔ بخیہ کرنا، بچنے لگانے، چکی ربانی۔ 12

قاطع برہان و درفش میں تقریباً 12 سطروں میں اس اعتراض کو پھیلایا ہے اور آزدن کے معنی بجائے تین کے چار بتائے ہیں جن میں سے ایک کپڑوں پر اٹو کرنا بھی ہے۔ نیز درفش میں یہ اضافہ کیا ہے کہ آزدن کے ایک معنی گودھنا بھی ہیں جو ہندوستان کی دیہاتنیوں میں مروج ہے۔

20۔ب: آستان برخاستن کنایہ از خراب شدن باشد و بمعنی بلند و رفعت و جاہ و دولت ہم آمدہ است۔

غ: آستان برخاستن بمعنی ویران شدن خانہ درست۔ 'بلند و جاہ و رفعت' دروغ و ایں کہ جاہ مند را بلند آستان نویسند امری دیگر است رفعت تصرف بلندی آستان دیگر و برخاستن آستان امری دیگر 12

21۔ب: آستینہ بروزن ماستینہ تخم مرغ را گویند۔

غ: نظری۔ سندمی خواہد 12

قاطع برہان و درفش میں اس لفظ کو خوب مایۂ تمسخر بنایا ہے۔

22۔ب۔ آل طمغا بسکون ثالث مہر و نگین بادشاہان را گویند۔

غ: تمغا بہ طای حطی باخوبی تحقیق جامع است یا سہو کاتب۔ 12
قاطع برہان و درفش میں اس سے صرف نظر کرلیا ہے۔
23۔ ب: آمادن بمعنی ساختن و ساختہ شدن و پر و مملو گردانیدن و مہیا کردن و مستعد نمودن باشد۔
غ: آمادہ بمعنی مہیا مسلم لیکن آمادہ مصدر ہرگز نیست بیچارہ از روی قیاس نوشتہ است 12
قاطع برہان و درفش میں یہ بھی لکھا ہے کہ: ''عجب از خان آرزو کہ او نیز بجائے آمودن آمادن نبشتہ است۔''
24۔ ب: آمودن۔ بمعنی آراستن و آراستہ شدن و آمیختن و آمیختہ شدن و ساختن و ساختہ گردانیدن و پر کردن و مملو ساختن باشد۔
غ: آمودن ترجمہ اندراج و آمودہ ترجمہ مندرج۔ و گہر در رشتہ کشیدن نیز اندراج است 12
25۔ ب: آموسنی بہ سکون سین۔ دو زن یا بیشتر کہ یک شوہر داشتہ باشند ہر یک مر دیگری را آموسنی باشد۔
غ: سندمی خواہد 12
قاطع برہان و درفش میں اس لفظ کو شامل نہیں کیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر محمد معین نے اس لفظ پر جو حاشیہ لکھا ہے اس میں وہ فرماتے ہیں کہ: ''در لغت فرس ص 523 ذیل وسنی۔''
آمدہ۔ زنی باشد کہ بر سر زن خواہند۔'' و در لہجۂ گنابادی (Vasni, Vosnt) بدیں معنی است ولی در گیلکی کنونی (Avesti) گویند۔ تصوری رود کہ کلمۂ مصحف' آوسنی' است۔'
26۔ ب: آوازگشتن بمعنی شہرہ شدہ و مشہور گردیدن باشد۔
ب: آوازہ گشتن بمعنی آوازگشتن است۔
غ: آوازگشتن و آوازہ گشتن بمعنی شہرت از کلام اساتذہ سندمی خواہد 12
قاطع برہان میں یہ لکھا ہے کہ: ''بلند آوازہ گشتن بمعنی شہرت مسلم، تنہا آواز یا آوازہ گشتن بمعنی شہرت ندارد۔ نہ من شنیدہ ام و نہ کس شنیدہ باشد۔'' لیکن برہان کے حامیوں نے فخر گرگانی کا یہ شعر سند میں پیش کیا ہے:

اگر نومید زین در بازگردم   بہ زشتی در جہاں آواز گردم

تو مرزا صاحب نے درفش میں اس کا یوں جواب دیا ''گویم، این نادراست و برنادر حکم نتواں کرد۔'' الخ

27۔ ب: آوند۔ ریسمانی را گویند کہ خوشہ ہای انگوراز اں بیاویزند 'لنگی' و جامہ وغیرہ بہ زیرآن اندازند۔ وصحبت و دلیل و برہان را نیز گویند وبمعنی سائرظروف واوانی باشد ہمچو کاسہ و کوزہ وامثال آن وبعربی دعا گویند وتخت وستدرا ہم گفتہ اند وبمعنی شطرنج باشد۔

ب: آونگ۔ بمعنی ایسمانے باشد کہ رخت برآن اندازند وخوشہای انگور نیز ازان آویزند وہر چیز آویختہ را نیز گویند۔

غ: آوند وآونگ را بہم آمیختہ از پیش خویش معنی ہائے عجیب انگیختہ سخن این است کہ آوند ظرف، آونگ، لنگنی اورنگ تخت، باقی خرافات۔ 12

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو تفصیل سے لکھا ہے اور جن معنی کو تسلیم نہیں کیا ہے، ان کے لیے سند طلب کی ہے۔

ڈاکٹر محمد معین نے آوند بمعنی محبت و دلیل کی سند میں فردوسی کا یہ شعر پیش کیا ہے:

چنین گفت با پہلوان زال زر　　جو آوند خواہی بہ تیغم نگر

(لغت فرس ص 103)

نیز بمعنی کوزہ و کاسہ کے سلسلے میں یہ لکھا ہے کہ یہ آب اور وند سے مرکب ہے۔ بمعنی دارای آب اور اوستا میں (Avnt) اور سنسکرت میں Apovant اور پہلوی میں Apaomad کی شکل میں ملتا ہے۔ نیز لغت فرس ص 103 سے ابوحنیفہ اسکاف کا یہ مصرع نقل کیا ہے: ''چون آب بگونہ ہر آوند شوی'' اور یہ جو بمعنی تخت لکھا ہے اس کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا خیال یہ ہے کہ یہ 'اورند' کا بگڑا ہوا ہے۔

28۔ ب: آویزہ بروزن پاکیزہ گوشوارہ را گویند۔

غ: آویزہ بمعنی گوشوارہ ریشخند است۔ آویزہ چیز دیگر و گوشوارہ چیز دیگر۔ 12

قاطع برہان میں یہ صراحت کردی ہے کہ گوشوارہ ایک مرصع اور زرنگار چیز ہوتی ہے جسے دستار پر لپیٹتے ہیں اور آویزہ کان کی گدیا میں سوراخ کر کے پہنا جاتا ہے۔ درفش میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ: ''آویزہ خصوصیت بگوش ندارد درکلاہ وتاج وتخت و چتر نیز استعمال یابد۔ وگوشوارو گوشوارہ باوجود آن معنی کہ نوشتہ آمد ہرگونہ پیرایۂ گوش را نیز گویند نہ تنہا آویزہ را۔ آری آں

آویزہ را کہ در ترصیع تاج وتخت بکار رود گوشوار و گوشورہ چون توان گفت۔

29۔ب: آینہ دار وآیینہ دار سرتراش وحجام را گویند۔

غ: آئینہ دار ہرگز حجام رانگویند ولطف این کہ سرتراش اسم حجام قرار دادہ است حال آن کہ سرتراش جلاد رامی توان گفت نہ حجام را۔ حجام موی سرمی سترد۔ نہ سرمی تراشد۔ آدمی دکھنی بیچارہ فارسی راچہ داند۔ 12

قاطع برہان اور درفش میں اس اعتراض کو بھی تفصیل سے لکھا ہے اور یہ بتایا ہے کہ آئینہ دار ایک عہدہ یا منصب ہے اور حجام یا سرتراش پیشہ ہے۔

30۔ب: ابرش۔ بروزن مہوش رنگ سرخ وسفید درہم آمیختہ را گویند واسپے کہ نقطہائے مخالف رنگ او برد باشد۔

غ: این لغت عربی است 12

اس کے آگے نواب علاء الدین احمد خاں بہادر نے لکھا ہے "لاریب فیہ کذا رائنا فی الصراح علاء الدین۔" قاطع برہان و درفش میں اس لغت کا ذکر نہیں آیا۔

31۔ب: ابروفراخی کنایہ از خوش دلی الخ۔

غ: ابروفراخی۔ این مردک لغت تراش است۔ ہرگز درکلام اساتذہ این لغت نیامدہ۔ 12

قاطع برہان و درفش سے یہ لفظ بھی غائب ہے۔

32۔ب: ارژنگ۔ بروزن ومعنی ارتنگ است کہ نگارخانہ مانی نقاشی باشد۔ گویند اصل لغت باین معنی ارثنگ با ثائے مثلثہ بودہ۔ وبعض گویند نام مانی ارژنگ بودہ است الخ

غ۔ ارژنگ اسم نقاشی صحیح و نام مرقع مانی غلط۔ مرقع را ارتنگ گویند۔ بہ ثائے مثلثہ غلط درغلط۔ 12

قاطع برہان میں اس کے بعد لفظ ارسنگ اور ارتنگ کے سامنے 'غلط' لکھا ہے۔

لفظ ارتنگ کو محل اعتراض بنایا ہے اور اسی کے ذیل میں ارثنگ، ارجنگ، ارژنگ، ارسنگ اور ارغنگ کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ آخری چار وجود خارجی نہیں رکھتے۔

ڈاکٹر محمد معین نے لفظ 'ارژنگ' کے حاشیے میں لکھا ہے کہ فارسی ارژنگ، ارجنگ، ارتنگ، ارثنگ اور پہلوی میں (Arthang) مستعمل ہے اور یہ قدیم فارسی کے مادہ (Arjanam) سے تعلق رکھتا ہے جو (Arjana) بمعنی آرائش، تزئین زینت سے متعلق ہے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ اسدی طوسی نے لغت فرس (ص 261) میں ارشنگ کے معنی 'کتاب اشکال مانی' لکھ کر تصریح کی ہے کہ 'اندر لغت دری ہمیں ایک ثا دیدہ ام کہ آمدہ است' اس کتاب کے دوسرے نسخے میں ارتنگ کو اصل لغت قرار دیا ہے اور اس کے معنی کے بعد لکھا ہے کہ: ''اندر لغت دری بجای تا، ثا دیدم یعنی ارشنگ۔'' اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسدی کے عہد میں یہ لفظ ثا کے ساتھ بھی لکھا اور بولا جاتا تھا۔

33۔ ب: ازدن بفتح اوّل وثانی وثالث وسکون نون بمعنی خلانیدن سوزن ہم ہست۔

غ: ازدن الف مقصور مفتوح محض غلط ومعنی سوزن خلانیدن و رنگ کردن غلط در غلط۔

ہماں لفظ آژدن است کہ در الف ممدودہ نوشتہ شد۔ 12

قاطع برہان و درفش میں اس اعتراض کو بھی آزدن اور آژدن کے تحت لکھا ہے۔

34۔ ب: اسطخر باطای حطی۔ وبعض گویند معرب استخر است۔

اس لفظ پر مصحح کتاب نے یہ حاشیہ لکھا تھا: ''پوشیدہ نماند کہ استخر بسین وتا مشہور و در کتب لغت فارسی مذکور است و اصطخر بصاد مہملہ وطای حطی معرب آن چنانکہ از کتب معتبرہ معلوم می شود۔ اما استخر بسین و طا در کتب متعارفۂ فارسی وعربی بنظر نرسیدہ ظاہرا از مخترعات صاحب برہان باشد چنانکہ از عادت اوست۔ واللہ اعلم بالصواب۔''

اس حاشیے کے آخر میں مرزا صاحب نے لکھا ہے: ''برکاتب این سطور آفرین غالب۔'' 12

قاطع برہان میں حاشیہ مذکور کا حوالہ دیے بغیر املا کو محل اعتراض قرار دیا ہے۔ بعد ازاں درفش میں قاطع کی عبارت کے بعد لکھا ہے کہ: ''در برہان قاطع بہ عہد لارڈ ہنٹنگ در کلکتہ بہ تصحیح حکیم عبدالمجید و مولوی بدیع الدین و مولوی عبداللہ و چار فاضل دیگر مطبوع شدہ است آخر صفحہ 57 این ہفت دانشمند از طرفگی جامع برہان ستو آمدہ حاشیہ نوشتہ اند ومن آن را لفظا پس از لفظ ہو می نویسم ...... اما اسطخر بسین وطا در کتب متعارفہ فارسی وعربی بنظر نرسیدہ۔ ظاہراً از مخترعات صاحب برہان باشد چنانکہ از عادات اوست واللہ اعلم بالصواب۔''

اور اس کے بعد فرماتے ہیں: ''غالب گوید لفظ تراشی و ناآگہی دکنی باتفاق رای ہفت افاضل ثابت است۔ من از راہ خشم بہ درشتی می نویسم۔ دانایان از رای حلم بہ درستی نوشتہ اند۔ آہ از مرزا رحیم بیگ کہ در ساطع برہان این ہفت فاضل جلیل القدر را کار پردہ زان مطبع نام نہادہ اند۔ من ہیچ نمی گویم اما سعدی را چہ کنم کہ می گوید:

سنگ بدگوہر اگر کاسۂ زریں شکند قیمت سنگ نیفزاید وزرکم نشود

میں عرض کرتا ہوں کہ مرزا صاحب نے درفش میں برہان قاطع کے جس ایڈیشن کا حوالہ دیا ہے وہ یہ زیر بحث نسخہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں محولہ بالا حاشیہ بجائے ص 57 کے ص 93 کے آخر میں ہے۔ چونکہ مرزا صاحب زیر بحث نسخہ 1858 میں علائی کو دے چکے تھے اور وہ ان کے والد کے کتب خانۂ لوہارو میں تھا اس لیے موجودہ حوالے کے وقت ان کو کسی دوست سے دوسرا ایڈیشن مانگنا پڑا ہوگا۔"

35۔ ب: اسفند خور الخ

غ: اسفہبد خرہ بی واؤ درست و بہ واو غلط۔12

قاطع برہان و درفش میں کہا ہے کہ: "بواو معدولہ غلط بلکہ قبیح۔"

36۔ ب: اش بفتح اول وسکون ثانی بمعنی او واورا باشد الخ

غ: اش نہ بمعنی او ونہ بمعنی اورا۔ مجردشین ضمیر غائب است وبس آری، اگر بعد آن لفظ آید کہ آخروی مبنی بر ہائی انہای حرکت است چون خانہ و جامہ الف زیادہ کنند و بعد ہای اصلی مانند کلاہ وسیاہ وگرہ وزرہ بہ الف حاجت نیست۔12

قاطع برہان و درفش میں اس لفظ کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اس کا جواب 'ات' میں گزر چکا ہے۔ زیر نظر کتاب میں ات پر جو لکھا ہے وہ اردو میں ہے اس لیے نقل نہیں کیا گیا۔

37۔ ب۔ افندستا کلمہ ایست مرکب از 'افند' کہ عجب و 'ستا' کہ ستائش و بندگی باشد۔ بمعنی ستایش عجب ونیکوترین ستایش و بندگی، وبمعنی حمد خدائے تعالیٰ ہست۔

غ: افندستا، جامع ایں لغت از پیش خود تراشیدہ است 12

38۔ ب: افدستا۔ بروزن مجلسہا بمعنی افندستا است الخ

غ: افدستا صحیح 12

قاطع برہان و درفش میں ان دونوں لفظوں کا ذکر نہیں ہے۔ نیز لغت فرسی (مدہ) میں اس لفظ کے حرکات مصحح نے بفتح اول وسکون ثانی وثالث وکسر رابع بتائے ہیں۔

39۔ ب: افشار۔ وبمعنی مدد ومعاون وشریک ورفیق نیز گفتہ اند ہمچو دزد افشار

غ: دزد افشار معاون و مددگار دزد را گویند۔ دزد افشار کسی را گویند کہ چوں دزد مال برد اورا بگیرد وازوی چیزی بستانند، داورا بگذارد بہ بین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا12

قاطع اور درفش میں افشار کے دوسرے معانی پر بھی اعتراض کیا ہے۔ نیز درفش ''دزد افشار'' کی بحث میں یہ جملہ بڑھایا ہے ''جواب توجیہات باردہ معاونان خواجہ برہان دکنی را کہ در تصحیح وتسلیم برہان قاطع، بکارمی برند، بمشاہدۂ لطائف غیبی کہ جامہ آن سیف الحق میان داد خان سیاح اورنگ آبادی رفیق نواب میر غلام باباخاں سورتی است حوالہ می کنیم۔''

40ب: اُل۔ بضم اول بمعنی او باشد۔

غ: اُل بمعنی او محل تامل 12

41۔ب: الاساندرا۔ نام اسکندر ذوالقرنین است۔ واسکندر مخفف آن یا معرب آں است۔

غ: الاساندرا۔ اسکندر مخفف این نتواند بود۔ مخفف الاساندرا اسندرا گر باشد بعید نیست کجا الاساندرا کجا اسکندر۔ 12

42۔ ب: انبازدن بادای بجد بروزن ومعنی اپناشتن است کہ برکردن وانبار کردن چیزی باشد از چیزی دیگر۔

غ: انبادن وانباردہ غلط محض ومحض غلط۔ انباشتن مصدر، وانباشت ماضی، وانباشتہ مفعول، وانبارد مضارع وانبار امر وموافق دستور اکثر یہ بمعنی حاصل مصدر مستعمل است چنانکہ سوز وآشوب وگداز۔ این بزرگوار انباردن مصدر از پیش خود تراشیدہ است۔ اگر گویند کہ مصدر مضراعی است آن ہم غلط۔ چہ در آن صورت انباریدن خواند آمد، نہ انباردن 12

ڈاکٹر محمد معین نے اس لفظ کو انبار۔ دن (لاحقۂ مصدری) سے مرکب بنایا ہے۔

43۔ب: انبلہ۔ تمر ہندی را گویند۔ وبہندی انبلی خوانند۔

غ: انبلہ بہندی انبلی خوانند۔ مگر انبلہ فارسی است ہندی آن انبلی خواہد بود خود این ثمر در فارس نیست کہ نام داشتہ باشد۔ انبلی وانبلہ یکی است۔ بیچارہ مرد دکنی انبلہ را لغت فارسی قرار داد۔ عیاذاً باللہ۔ 12

قاطع برہان ودرفش میں اس اعتراض کو شامل نہیں کیا ہے۔

44۔ب: انبوذن باذال نقطہ دار بروزن اندودن بمعنی، اصل کائنات وآفرینش باشد۔

غ: انبوذن باذال نقطہ دار واللہ غلط، باللہ غلط۔ نہ بدین معنی صحیح ونہ معنی دیگر مسلم۔ لفظی است تراشیدہ۔ 12

قاطع برہان ودرفش میں شرف نامہ کو بھی دکنی کا ہم زبان بتایا ہے۔

45۔ب: انجلک ۔ ہر چند فراش خیال جاروب سنبل بر جل خرسک ریش زند۔از پوست آں پاک نتوان کرد۔

غ: ہر چند فراش خیال الخ سراسر معنی ندارد۔12

قاطع برہان میں اس عبارت کا خوب مذاق اڑایا ہے اور درفش میں اتنا اضافہ کیا ہے: ''در برہان قاطع مطبوعہ کہ ذکر آن در تنبیہ متعلق مذکر اسطر گزشت، علمائے صدر پائین ص 77 رقم می فرمایند کہ از لفظ فراش خیال الی آخر ترجمہ لغت بی معنی ومخبط است۔ ختم۔''

میں عرض کرتا ہوں کہ برہان کے زیر بحث نسخے میں یہ حاشیہ ص 83 پر ہے اور اس کے آخر میں مرزا صاحب نے لکھا ہے: ''اس فقرہ کا چھاپنا کیا ضرور تھا۔ مگر ہاں، حماقت جامع کا اظہار منظور تھا۔ غالب 12''

46۔ب: انجم روز بکسر میم کنایہ از آفتاب عالمتاب است۔

غ: انجم روز چگونہ کنایہ زآفتاب تواند بود مگر نجم روز۔12

47۔ب: انگبہ برزی گری را گویند کہ صاحب ساماں بود و کارکنان و زراعت کاران بسیار داشتہ باشد۔

غ: انگبہ و دیگر پایان صفحہ انکشتہ ہر دو بمعنی بزرگ و صاحب ثروت و سامان نوشتہ است۔ واو ازین تصیحف خوانی 12 غالب۔ قاطع برہان و درفش میں اس لفظ سے بحث کرتے ہیں۔ آخر میں یہ بھی لکھا ہے: ''کاش از بوم دکنی دگری برخیزد و گوید کہ صحیح ایکبہ است۔ بالف مکسور و یائی مجہول و کاف عربی مضموم بروزن بی خصیہ۔''

میں عرض کرتا ہوں کہ لغت فرس (431) میں اسی لفظ کو 'انکشبہ' لکھا ہے۔

48۔ب: اودر بفتح اول وسکون ثالث ورای بی نقطہ ساکن برادر پدر باشد کی بعربی عم گویند۔

اس عبارت کے الفاظ 'سکون ثالث' پر پہلے لکھا ہے: ''سکون ثالث چہ معنی دارد۔'' بعد ازاں حاشیے میں فرماتے ہیں: ''اودر بہ المفتوح وواو ساکن و دال مفتوح درای ساکن برادر پدر را گویند۔ ایں کہ صاحب برہان بہ سکون ثالث و رائے بے نقطہ ساکن می نویسد اگر سہو کاتب نیست وای بر جامع۔12

49۔ب: اویژہ۔ بروزن ہمیشہ خالص و خاصہ و پاک و پاکیزہ را گویند۔

غ: اویژہ۔ بمعنی پاک نیست۔ ویژہ بمعنی پاک واویژہ بمعنی ناپاک است وایں الفی

است پارسیان را مفید معنی نفی — بیچارہ محمد حسین دکنی الف اصل دانستہ چوں
شتر واشتر۔12

قاطع برہان و درفش میں اس لفظ پر بھی دکنی کو خوب بنایا ہے اور درفش میں یہ بھی لکھا ہے
کہ: ''جو لوگ اس لفظ کی حمایت کرر ہے ہیں ان کا اور میرا معاملہ بالکل ایسا ہے جیسا کہ بنی
اسرائیل اور ہارون کا گوسالہ پرستی کے سلسلے میں تھا۔لیکن ڈاکٹر محمد معین نے اس کے حاشیے میں
لکھا ہے کہ'' پہلوی میں Avanak اَویژک بمعنی پاک ومقدس و ناآلودہ آتا ہے۔اس پہلوی
کا کاف اسلامی فارسی میں ہائی ہوز سے بدل گیا ہے۔اس لیے اویژہ بمعنی پاک درست ہے۔



غالب اور برہان

میرزا صاحب کی ادبی زندگی کا سب سے زیادہ دل چسپ ہنگامہ برہانِ قاطع پر تنقید ہے، جو پہلے قاطعِ برہان اور بعدازاں درفشِ کاویانی کے نام سے شائع ہوئی تھی۔

اس سلسلے میں خواجہ حالی لکھتے ہیں:

> ’’غدر کے زمانے میں مرزا دلّی سے بلکہ گھر سے بھی باہر نہیں نکلے۔ جوں ہی بغاوت کا فتنہ اٹھا، اُنھوں نے گھر کا دروازہ بند کرلیا اور گوشۂ تنہائی میں غدر کے حالات لکھنے شروع کیے... ‘‘ (یادگارِ غالب، نامی پریس، کانپور، ص 37)

جب مرزا دستنبو ختم کر چکے اور اب بھی تنہائی اور سناٹے کا وہی عالم رہا، اُس وقت سوا اس کے اور کیا چارہ تھا کہ دوات اور قلم کو مونس اور رفیق سمجھیں، اور کچھ لکھ پڑھ کر اپنا غم غلط کریں اور دل بہلائیں۔ مرزا کے پاس اُس وقت سوائے برہانِ قاطع اور دساتیر کے کوئی کتاب موجود نہ تھی۔ برہان کو اٹھا کر سرسری نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ پہلی ہی نگاہ میں کچھ بے ربطیاں سی معلوم ہوئیں۔ پھر زیادہ غور سے دیکھا تو اکثر لغات کی تعریف غلط پائی۔ ایک ایک لفظ متعدد فصلوں میں مختلف صورتوں سے لکھا دیکھا۔ شعرا نے جو الفاظ بطور مجاز و کنایہ کے استعمال کیے ہیں، اُن کا ذکر بطور مستقل لغات کے دیکھا۔ طریقۂ بیان اکثر بھونڈا اور اصولِ لغت نگاری کے خلاف پایا۔ بہت سے لغات کی ایسی تفسیر بھی دیکھی، جس کے معنی بالکل سمجھ میں نہ آئے۔ مرزا نے یادداشت کے طور پر جو مقام قابلِ اعتراض نظر آئے اُن کو ضبط کرنا شروع کیا۔ شدہ شدہ وہ ایک کتاب بن گئی، جس کا نام ’قاطع برہان‘ رکھا گیا اور سنہ 1276ھ میں چھپ کر شائع ہوگئی۔ پھر مرزا نے 1277ھ میں باضافۂ دیگر مضامین وفوائد اُس کو دوسری بار چھپوایا اور اُس کا نام درفشِ کاویانی رکھا۔‘‘ (یادگارِ غالب، نامی پریس، کانپور، ص 42)

آج کل، مارچ 1958

آگے بڑھ کر فرماتے ہیں:

"جس وقت مرزا نے قاطع برہان لکھی ہے نہ اُس وقت اُن کے پاس ایک قلمی برہان کے سوا کوئی فرہنگ لغات تھی اور نہ کوئی اور ایسا سامان موجود تھا جس پر تحقیقِ لغت کی بنیاد رکھی جاتی۔ پس جو کچھ انھوں نے لکھا، یا محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر، یا ذوق و وجدان کی شہادت سے لکھا۔"

(یادگارِ غالب، نامی پریس، کانپور، ص 44)

مولانا مہر نے اور مالک رام صاحب نے خواجہ صاحب کے بیان کو دہراتے ہوئے سب سے پہلے یہ بتایا کہ برہانِ قاطع کا جو نسخہ میرزا صاحب کے سامنے تھا، وہ چھاپے کا تھا، جیسا کہ خود میرزا ہی نے صاحب عالم مارہروی کو لکھا تھا۔ نیز یہ بھی اطلاع دی کہ وہ نسخہ نواب صاحب لوہارو کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔[1] اور اس کے حاشیوں پر میرزا صاحب کے لکھے ہوئے اشارات موجود ہیں۔

پچھلے سال نواب صاحب لوہارو بالقابہ نے اپنا سارا ذخیرہ رضا لائبریری رام پور میں منتقل فرما دیا، تو اس میں مذکورۂ بالا برہانِ قاطع بھی میرے مطالعے میں آئی۔

یہ نسخہ، سرورق کے مطابق، افضل المطابع کلکتہ میں سنہ 1251ھ مطابق سنہ 1836ء میں بڑے سائز کے 924 صفحات پر چھپا تھا۔ ہر صفحے میں دو کالم رکھے گئے تھے اور کلکتیا ٹائپ میں طباعت ہوئی تھی۔ سرورق کا دوسرا اور اصل کتاب کا پہلا صفحہ یہ دونوں سادہ ہیں۔ کتاب کے شروع میں بسم اللہ کے نیچے تحریر ہے:

"محمد اسفندیار بیگ خرید نمود در سنہ 1251 ہجری مقام کلکتہ بقیمت بیست دو روپیہ۔"

کتاب کے پہلے سادہ صفحے پر بخط انگریزی لکھا ہے:

Presented to Alaooddin Khan by Mirza Asadoollah Khan Bahadur 1st August 1858 Loharoo.

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے یکم اگست سنہ 1858 کو یا اس سے کچھ پہلے یہ نسخہ نواب علائی کو تحفے میں دے دیا تھا۔

---

1. میرزا صاحب نے علائی کے نام 2 جولائی سنہ 1860 کو ایک خط لکھا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں کہ "برہانِ قاطع تم کو دے چکا ہوں۔" خطوط غالب ج 1، ص 321۔ اس سے واقعے کی مزید تصدیق ہو جاتی ہے۔

دوسرے صفحے پر اسفندیار بیگ کی تحریر کے دائیں طرف کے حاشیے پر لکھا ہے:

''وصول دولت فرہنگ معنوی ارتنگ مانی روز اول از محرم دنخست از اگست
بہ جنگ آمد سنہ 1276 ھجری، 1859ع۔''

میرا خیال ہے کہ یہ تحریر نواب امین الدین احمد خان بہادر والی لوہارو کی ہے۔ وجہ یہ کہ اسفندیار بیگ کی تحریر پر چپی لگا کر علائی نے لکھا تھا:

''بخشایندہ و بخشندہ راستایم کہ ایں نادرہ بہ ارمغانِ پدر نامور میرود۔ یارب،
چون آرزوی ہواخواہِ خیر سگال پذرفتہ باد۔ نامہ نگار از گنہ پیشِ خداوند شرمسار
علاء الدین آمرزش خواستار۔''

میری دانست میں اس تحریر کی توثیق کے لیے اُن کے والد ماجد نے مذکورۂ بالا عبارت اپنے قلم سے حاشیے پر لکھی تھی۔

اس نسخے کے حاشیوں پر، اور کبھی کبھی متن کے اندر، سطر کے خاتمے پر بھی میرزا صاحب نے اپنے اعتراضات یا توضیحات یا شکوک وغیرہ اپنے قلم سے لکھے ہیں۔ ان کی تخمینی تعداد 461 ہے۔ ان میں سے تقریباً 312 الفاظ پر لکھی ہوئی یادداشتوں کو پہلے برہان قاطع اور پھر درفش کاویانی کے ناموں سے مرتب کر کے چھاپا تھا۔ صاحب عالم مارہروی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اس درماندگی کے دنوں میں چھاپے کی بُرہانِ قاطع میرے پاس تھی اس کو
میں دیکھا کرتا تھا۔ ہزارہا لغت غلط۔ ہزارہا بیان لغو عبارت پوچ، اشارت
پادر ہوا۔
میں نے سودوسو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ہے اور قاطعِ برہان اس کا
نام رکھا ہے۔''

تقریباً یہی اُن کا بیان ہے قاطع برہان کے دیباچے میں۔ مگر شاعرانہ مبالغے کو حذف کرنے کے بعد حقیقت لگ بھگ وہی ہے جو اوپر ذکر کی گئی۔ بہرحال میرزا صاحب کے ان ابتدائی اشارات کا پڑھنا قاطع برہان کی عبارتوں کے مقابلے میں زیادہ دل چسپ نظر آیا، کیونکہ یہ قلم برداشتہ لکھے ہونے کے باعث اُن کے جذبات کے اچھے مظہر ہیں۔ اس لیے آج کی صحبت میں برہان کے آخری باب پر لکھے ہوئے اعتراضات کو پیش کیا جارہا ہے۔ آخری باب کو ترجیح

دینے کا باعث یہ ہے کہ جیسا کہ خود مرزا صاحب نے قاطعِ برہان (ص 78) میں لکھا ہے، برہان کے آخری باب کے بیشتر اعتراضات انھوں نے تضیعِ اوقات کے خیال سے چھوڑ دیے تھے۔

اب آپ برہانِ قاطع اور قاطع برہان کی عبارتوں کو ملاحظہ فرمایئے میں نے سہولتِ کتابت کی غرض سے برہان کے لیے (ب) اور غالب کے بجائے (غ) کی علامت اختیار کی ہے۔

(م) ب۔ (آبای علوی) کنایہ از ہفت کوکب الخ۔

غ۔ آبای علوی افلاک کو کہتے ہیں، نہ کواکب کو۔ آبا، افلاک اور اُمہات، عناصر[1] 12

(م) ب۔ (آبای گلوگیر) کنایہ از سرور و عیشِ جہان۔ و کنایہ از غمِ دنیا و شادی کہ بجہتِ دشمن کنند۔

غ۔ تمام جملہ مہمل[2] 12

(م) ب۔ (آبِ خورشید) بمعنی آبِ زندگیست بایں اعتبار کہ آفتاب موثر است بجہتِ حیاتِ حیوانات، و او تجلی روحست برای ظہور نفس۔

غ۔ تمام بیان لغو۔[3] 12

(م) ب۔ (آب در دل شدن) کنایہ از سرور و انتعاش در دل پیدا شدن باشد۔

غ۔ لغو 12

(م) ب۔ (آبدید جام) کنایہ از شراب و جرعۂ شراب باشد۔

---

1 شرفنامہ (52ب) موید الفضلا (105/1) اور تحفۃ السعادہ (ص 74) میں آبای علوی سے کواکب سبعہ (سات سیارے) ہی مراد لیے ہیں اور کشف اللغات (6/1) میں لکھا ہے کہ 'در اصطلاح حکما آبا، افلاک و انجم را گویند۔''

2 موید الفضلا (33/1) میں ہے: ''آبای گلومیر، کنایت از سرور جہانست تنعم بیان است۔ کنال القنیہ۔ و فیہ ایضاً، آبای گلوگیر، نعیم دنیاوی و شادی کنندہ کہ در فوت حیات دشمن کنند۔ و در اداۃ الفضلا آوردہ است۔ آبای گلوگیر، نعیم دنیاوی و آن شادی کہ برفوت شدن رفعت دشمن و حیات او کنند۔'' مگر تحفۃ السعادہ (ص 62) میں لکھا ہے: ''آب گلوگیر، ہردو کاف فارسی، نعمتہای دنیاوی و شادی کہ از مرگ خصم حاصل شود۔'' میری دانست میں 'آبا' کہ جگہ 'آب' ہی درست ہے، اور یہ غلطی کسی کاتب کی نادانی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

3 ملاحظہ ہو موید الفضلا (24/1)

غ۔ لغو[1] 12

(م) ب۔ (آبذان) باذالِ نقطہ دار بمعنیٰ مستحق وسزاوار و درخور باشد۔ وخاندان رانیز گویند۔

غ۔ غلط[2] 12

(م) ب۔ (آب رو) بکسرِ ثالث، کنایہ از تری وتازگی و روشنائی باشد و بسکونِ ثالث شخصی کہ پیشِ بزرگان قدری واعتباری داشتہ باشد۔

غ۔ شخص کو آبرو نہ کہیں گے[3] قدر و اعتبار کو آبرو کہیں گے۔ 12

(م) ب۔ (آب ریخت) یعنی خجل شد و شرمندہ گردید۔

غ۔ ومنزل شد 12

(م) ب۔ (آبِ عرق) کنایہ از گلاب است۔

غ۔ دروغ[4] 12

* ب۔ (آب گردش) کنایہ از چارپای تیز رو و خوش رفتار باشد۔[5] (ج)

غ۔ آبگردش عبارت از تبدیلِ مکان بہرِ آب و ہوا 12

(م) ب۔ (آب ماہ) کنایہ از روشنی ماہ باشد

غ۔ دروغ[6] 12

(م) ب۔ (آب ورنگ) بمعنی شرابِ انگوری واشکِ خونی۔ وکنایہ طراوت وتازگی باشد۔

غ۔ صرف طراوت وتازگی کو کہیں گے، شرابِ انگوری واشکِ خونی کو نہ کہیں گے 12

(م) ب۔ (آتشِ نیستان) کنایہ از رونقِ بہار باشد

غ۔ دروغ[7] 12

1۔ موید الفضلا (63/1) میں آب دیدۂ جام ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہاں بھی کاتبوں نے 'دیدہ' کو 'دید' لکھ کر اصطلاح کے گلے پر چھری چلائی تھی۔

2۔ موید الفضلا (68/1 اور 75) میں اس لفظ کو دیکھا جا سکتا ہے۔

3۔ موید الفضلا (88/1) میں فرہنگ علمی کے حوالے سے یہ لغت لکھا گیا ہے۔

4۔ ملاحظہ ہو موید الفضلا (49/1)

5۔ یہ فرہنگ جہانگیری کا لغت ہے۔ رشیدی (ص 31) نے بھی اسے دہرایا ہے۔

6۔ ملاحظہ ہو موید الفضلا (95/1) اور تحفۃ السعادہ (ص 71) جہاں اس کے معنی روشنی ماہ ہی لکھے ہیں۔

7۔ کشف اللغات (100/1) موید الفضلا (69/1) اور تحفۃ السعادہ (ص 69) میں یہی معنی درج ہیں۔

(م) ب۔(آتشین داغ) بمعنی داغِ آتشین۔

غ۔سبحان اللہ۔کیا لغت ہے[1] 12

(م) ب۔(آتشین یافتن) کنایہ از رونق ورواج بہم رسانیدن باشد

غ۔دروغ ولغو 12

(م) ب۔(آراک) بروزن چالاک، جزیرہ، یعنی خشکیِ میان دریا را گویند

غ۔آداک بدال است، نہ بہ را 12

(م) ب۔(آرامیدن) بمعنی آرام گرفتن و ساکن شدن و قرار گرفتن و بخسپیدن و گردانیدن ودادن باشد۔

غ۔سبحان اللہ، کیا لغت ہے[2] 12

(م) ب۔(آرویز) غربال را گویند۔

غ۔لغتِ مصنوعی[3] 12

(م) ب۔(آرزو) کششِ خاطر باشد۔وبعربی شہوت گویند۔

غ۔سبحان اللہ، کیا لغت ہے[4] 12

(م) ب(آریدن) بروزنِ باریدن بمعنی آرایش کردن وآراستن باشد۔

غ۔محض غلط

* ب۔(آزا) بمعنی برابرست۔چنانکہ گویند در آزای فلاں کار یعنی در برابر فلاں کار۔وبکسرِ اوّل درعربی ہمیں معنی دارد۔

غ۔اِزا لفظِ عربی ہے۔فارسی میں آزا ان معنوں میں ہرگز نہیں[5] 12

* ب۔(آزادگان) جمعِ آزادہ است بمعنیِ احرار وجوانمرداں واولیاء وحلال زادگان۔

غ۔سبحان اللہ، کیا لغت ہے[6] 12

---

1. ملاحظہ ہو موید الفضلا (47/1) 2. ملاحظہ ہو موید الفضلا (71/1) 3. ملاحظہ ہو موید الفضلا (39/1)

4. ملاحظہ ہو شرف نامہ (48 الف)، موید الفضلا (88/1) اور تحفۃ السعادہ (ص 40) موید سے معلوم ہوتا ہے کہ اداۃ الفضلا میں بھی اس کا مذکور ہے۔

5. یہ لغت تحفۃ السعادہ (ص 54) میں مذکور ہے۔

6. ملاحظہ ہو شرف نامہ (41ب)، کشف اللغات (104/1) اور موید الفضلا (71/1)

(م) ب۔ (آزردن) بفتحِ ثالث بروزن واکردن، مخففِ آزاریدن است یعنی دیگری را آزار دادن وتورآزردہ شدن

غ۔ سبحان اللہ[1] 12

(م) ب۔ (آزردہ) بمعنی تنگ آمدہ وتند شدہ باشد وبمعنی رنجیدہ ہم آمدہ است۔

غ۔ یہ لغت سوائے جامع کے کسی کو کاہے کو معلوم ہوگا[2] 12

(م) ب۔ (آزمایش) بمعنی تجربہ باشد۔

غ۔ سبحان اللہ، کیا لغت غیر مشہور ہے[3] 12

(م) ب۔ (آستانہ) پیشِ در و چوب پیشِ درِ خانہ، و مدفن اولیاء اللہ باشد

غ۔ کیا عمدہ لغت ہے[4] 12

(م) ب۔ (آسودن) بروزنِ آمودن بمعنی راحت رسانیدن و راحت گرفتن باشد۔ وکنایہ از مردن ہم ہست۔

غ۔ صاحب، یہ تو میں جانتا ہوں کہ کوئی نہ جانتا ہوگا[5] 12

(م) ب۔ (آشتی) ترجمۂ صلح است۔

غ۔ واہ، واہ! کیا نیا لغت ہے[6] 12

(م) ب۔ (آشفتن) بمعنی شوریدن وشورانیدن وشوریدہ شدن وجنبانیدہ شدن باشد۔

غ۔ یہ لغت کس کو معلوم ہوگا[7] 12

(م) (آغشتن) بمعنی تر کردن وتر شدن وآلودہ کردن وآلودہ شدن باشد۔

غ۔ نہ، صاحب، یہ لغت تو کسی نے سنا بھی نہ ہوگا۔[8]

---

1. ملاحظہ ہو شرف نامہ (42 الف) کشف اللغات (104/1) اور موید الفضلا (71/1)
2. یہ لغت، موید الفضلا (92/1) میں القنیہ سے نقل کیا گیا ہے۔
3. یہ لغت موید الفضلا (43/1) میں شرف نامہ سے نقل کیا گیا ہے۔
4. موید الفضلا (43/1 و 96) بحوالہ اداۃ الفضلا و شرف نامہ
5. موید الفضلا (72/1) میں اس کا ذکر ہے۔
6. موید الفضلا (106/1) تحفۃ السعادہ (ص 52) اور فرہنگِ رشیدی (ص 60) ملاحظہ ہوں۔
7. کشف اللغات (105/1) موید الفضلا (72/1) اور رشیدی (ص 60) دیکھیے۔
8. یہ لغت شرف نامہ (42 الف) موید الفضلا (97/1) کشف اللغات (106/1) اور رشیدی (ص 63) میں بھی مذکور ہے۔

(م) ب (آفتابِ زرد) بکسرِ بای ابجد، کنایہ از خربزہ وشراب زعفرانی باشد

غ۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ[1] 12

(م) ب۔ (آفتابِ سادہ) کنایہ از سلیمانست

غ۔ معاذ اللہ[2] 12

(م) ب۔ (آفریدگار) باکافِ فارسی، پیدا کنندہ، موجودات از عدم باشد۔

غ۔ اس لغت کو کون جانتا ہوگا۔[3]

(م) ب۔ آگاہ و باکافِ فارسی، بروزنِ ناگاہ، بمعنی خبردار و باخبر شد و بمعنی دانش ہم ہست۔ وآگاہی، خبرداری و باخبر بودن باشد۔

غ۔ اس سے کون آگاہ ہوگا۔[4]

ب۔ (آگرہ) بروزنِ باکرہ، نامِ شہریست کہ بعد از دہلی پائی تختِ ہندوستانست۔

غ۔ یہ لغت ہے کام کا 12

(م) ب۔ (آلودن) بروزنِ پالودن، بمعنی آلودہ وملوث شدن وکردن باشد۔

غ۔ نہ صاحب یہ مصدر کسی کو معلوم نہ ہوگا 12

(م) ب۔ (آلوسیہ) میوہ است ترش مزہ و سیاہ رنگ در ہند و بہ ہندی جامن گویند۔ ودرختِ آن رانیز گفتہ اند۔

غ۔ آلوسیہ، جامن ولایت میں کاہے کو ہے جو اس کا نام ہو۔ ہاں الوی سیاہ بطریقِ ظرافت کبھی کسی نے کہا ہو، تو کہا ہو[5] 12

(م) ب۔ (آمدہ گیر) یعنی آمدنِ اور التصور کن وآمدنِ اوقبول کن واز دل بپذیر، بر سبیلِ دعا۔

غ۔ واہ، واہ، واہ، واہ[6] 12

---

1. مویدالفضلا (25/1) بحوالۂ اداۃ الفضلاء (88/1) بردن حوالہ، وتحفۃ السعادہ (ص 71) یہ بھی عرض کردوں کہ میرزا صاحب نے عربی املا کے خلاف قوۃ کو قوت اور باللہ کو بااللہ لکھا ہے۔

2. مویدالفضلا (97/1) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لغت، آفتاب ساوہ (بواو) ہے اور ساوہ ایک مقام کا نام ہے۔ سادہ (بالدال) سہوِ کتابت ہے۔

3. شرف نامہ (24 الف)، ومویدالفضلا (32/1)

4. تحفۃ السعادہ (ص 49 و 54)

5. مویدالفضلا (97/1) 6. ایضاً، (33/1)

(م) ب۔ (آمیختن) مخلوط شدن ومخلوط کردنِ دو چیز یا زیادہ باشد بہم (آمیختہ) بروزنِ آویختہ، ترجمۂ مخلوط وملحق است۔ (آمیزش) بہ معنی الحاق باشد۔

غ۔ یہ تین لغت کہاں سے لایا۔ آفرین[1] 12

(م) ب۔ (آن کہ را) یعنی آن کہ اورا۔ ہم چنانکہ ہرکرا، یعنی ہر کہ اورا۔

غ۔ یہ تو، صاحب، بغیر شرح کے کبھی کوئی نہ سمجھتا 12

(م) ب۔ (آہنِ سنجر نخورد) یعنی زخم وشکنجۂ سنجر نخورد، وبسیاست او نہ پیوست، وزحمتِ اورا نکشید۔

غ۔ واہ، کیا کہنا ہے۔[2]

(م) ب۔ (آہوگان) ہا کاف فارسی بروزن خالوجان، بمعنی آہو بچگان باشد۔

غ۔ لاحول ولاقوت[3] 12

(م) ب۔ (آھوی نو) بفتحِ نون، کنایہ از ابری کہ بسپیدی وسیاہی مایل باشد۔

غ۔ خبط، جنون 12

(م) ب۔ (آی) بسکون تحتانی، امر بآمدن باشد۔ یعنی بیا۔ وترکانِ مادہ را گویند۔

غ۔ ترکان مادہ را آی نگویند۔ ماہ را ای گویند۔[4]

(م) ب۔ (آیندگان) موجود شوندگان، وکسانی کہ بایں عالم می آیند۔

غ۔ نیا لغت ہے 12

(م) ب۔ (آئینۂ مقصود) اشارہ بآیۂ اطیعو اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم۔

غ۔ ادعای محض[5] 12

ب۔ (آئینۂ یوسفان منش) کنایہ از آفتابست

غ۔ غلط در غلط[6]

---

1. موید الفضلا (74/1 و 98)
2. موید الفضلا (25/1) میں بحوالۂ اداۃ الفضلا نقل کیا گیا ہے۔
3. ملاحظہ ہو کشف اللغات (112/1) اور موید (75/1)۔ یہاں بھی مرزا صاحب نے قوۃ کو قوت لکھ دیا ہے۔
4. یہ کاتب کی غلطی ہے کہ اس نے ماہ کو مادہ کر دیا، ورنہ ہمارے نسخہ برہان کے حاشیہ پر 'ماہ' ہی لکھا ہے۔
5. موید الفضلا (25/1) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لغت آئینہ نہیں ہے، بلکہ آیت مقصود ہے۔
6. ملاحظہ ہو موید الفضلا (43/1) اور تحفۃ السعادہ (ص 64)۔ مگر 'منش' کے بجائے موید میں 'وش' اور تحفے میں 'بینش' ہے۔

(م) ب۔(ابلقِ چشم) کنایہ از چشمِ سیاہ و سفید باشد۔
غ۔کون سی آنکھ ہے جو سیاہ و سفید نہیں ہے[1] 12

(م) ب۔(ابنای دہر و ابنای روزگار) مردمِ عالم را گویند۔
غ۔صاحب، یہ تو کسی کو معلوم نہ تھا[2] 12

(م) ب۔(ازرق) بمعنی آسمانست۔ و آنرا چرخ ارزق ہم میگویند۔
غ۔ازرق، بمعنی آسمان غلط۔ البتہ صفتِ آسمانست۔ 12

ب۔(افراز) بمعنی افزار است کہ کفش و پاپوش و مانِد [مانند] آن باشد۔

غ۔ افزار، افزار را ہرگز افراز نگویند۔ و تنہا افزار اسمِ کفش نیست بلکہ پا افزار است۔ افزار بمعنی آلہ چنانکہ در عوام اوزار مشہور است۔ و این را منسوب بہ پا کردہ، پاافزار گویند۔ و افراز صیغہ امر است از افراشتن[3] 12

(م) ب (امامان) دو امام اند کہ ہر یک در ہر قطب اند یکی را نام عبدالرب است، و مسندِ وزارتِ او بردست راست قطب است۔ و او ناظر ملکوت است۔ و دیگری عبدالملک نام دارد، او مسندِ وزارتِ او بردست چپ است۔ و او ناظر است در ملک۔ و نامِ قطب عبداللہ است۔

غ۔ امامان، تثنیہ نیست کہ حکیم دکنی لنقد رشرحِ کشاف آوردہ۔ امامان، جمعِ امام است، و این را اطفال نیز میدانند[4] 12

(م) ب (امشاش) ترجمۂ قیاس است
غ۔سندمی خواہد۔

(م) ب۔(امید) بضمِ اول، ترجمۂ رجا باشد و چشم داشتن از کسی۔

---

1. مویدالفضلا (63/1) میں ہے: ''ابلقِ چشم، ای مرکب چشم، باضافت صفت سوی موصوف با بلق بدہن کہ چشمِ سیاہ و سفید است۔

2. ملاحظہ ہو مویدالفضلاء (29/1 و 33 بحوالۂ اداۃ الفضلا) اور تحفۃ السعادہ (ص 61)

3. یہ میرزا صاحب کے نسخے کے کمپوزیٹر کی غلطی ہے۔ ورنہ برہان کے ایک قلمی نسخے کے ملحقات میں اور کپتان رابک کے مطبوعہ نسخے کے تتمے میں بھی لغت (افزار پا) لکھ کر اس کے معنی (افزار پا) ہی لکھے ہیں۔

4. یہ لغت کشف اللغات (109/1) سے ماخوذ ہے۔ ہاں، کاتب کی غلطی سے (ہر یک وزیر قطب اند) کی جگہ (ہر یک در ہر قطب اند) چھپ گیا ہے۔

غ۔ یارو، واسطے خدا کے، یہ کیا لغت ہے [1]

(م) ب۔ (انجامیدن) تمام شدن و بانتہا و بآخر رسیدنِ کارہا باشد۔

غ۔ واہ، واہ، یہ لغت کون جانتا تھا [2] 12

(م) ب۔ (انگشتِ کہین) بمعنی انگشتِ کوچک است کہ بعربی خنصر گویند۔

غ۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ 12

(م) ب۔ (انگشتِ مہین) یعنی، انگشتِ بزرگ کہ انگشتِ میانین باشد و بعربی وُسطیٰ گویند۔

غ۔ استغفر اللہ 12

(م) ب۔ (ییلاق) بکسرِ اوّل وسکونِ ثانی مجہول و لام الف و قاف ساکن جای سرد کہ بجہتِ تابستان درزیر زمین کنند۔

غ۔ غلط در غلط۔ یہ لفظ ترکی ہے بمعنی چھانونی کے۔ مگر جو گرمی کے موسم میں چھاونی بناتے ہیں، اوس کو قشلاق کہتے ہیں، اور جاڑوں کی چھانونی کو ییلاق کہتے ہیں۔ دونوں تحتانی۔ بای موحدہ کہاں سے آئی۔ [3] 12

(م) ب۔ (بیلفخت) بکسرِ اول و فتحِ ثانی وسکونِ لام و فای مفتوح بخای نقطہ دار زدہ و تای قرشت، ماضی الفختن است۔ یعنی، بہم رسانید و جمع کرد واندوخت وآورد۔

غ۔ بیلفخت لفظِ اصلی نہیں ہے الفختن کا ماضی الفخت ہے۔ بای زایدہ کو جوہرِ لفظ میں کیا دخل ہے۔ لفظ اصلی رفت ہے، نہ کہ برفت [4] 12

(م) ب۔ (پاپوش) آنچہ برپا پوشند و برہ روند۔

غ۔ کہو، صاحب، اس لغت کو دنیا میں کون نہ جانتا ہوگا۔ [5] 12

(م) ب۔ (پاختہ) بروزن باغچہ۔ چھجۂ بلند وطناب استادانِ بنارا گویند۔

غ۔ سندمی خواہد [6] 12

---

1. موید الفضلا (27/1) بحوالۂ اداۃ الفضلا۔
2. ملاحظہ ہو شرف نامہ (46ب) کشف اللغات (110/1) موید الفضلا (83/1) اور رشیدی (ص 77)۔
3. ملاحظہ ہو موید الفضلا (149/1) مگر وہاں بای فارسی ہے۔
4. ملاحظہ ہو موید الفضلا (118/1) جہاں بحوالۂ زفانِ گویا اسے لکھا گیا ہے۔
5. موید الفضلا (206/1) بحوالۂ القنیہ وشرف نامہ (92 الف)
6. ملاحظہ ہو موید الفضلا (221/1)، مگر وہاں پاحسہ (باسین) ہے۔ برہان کے ملحقات کے کاتب نے غلط لکھ دیا ہے۔

(م) ب۔(پاراج) بروزن تاراج، آنچہ، بجہت مہمان بعنوانِ پیشکش آورند۔
غ۔سند می خواہد۔

* ب۔(پاستان) بمعنی باستان، بیای تازیست کہ متقدمین واولین باشد۔
غ۔پھر بای فارسی میں کیوں لکھا12

ب۔(پالانیدن) بمعنی فشردن باشد۔(پالاننده) بمعنی افزانیده وافزون کننده باشد
غ۔ یہ بھی پالودن ہے، نہ پالاندن۔ اور بمعنی صاف کرنے کے ہے، نہ بمعنی فشردن۔ مصدر کے معنی فشردن لکھتا ہے، اور فاعل کے معنی افزاینده اے تیرا کھوج مٹے۔

(م) ب۔(پائی افزاه) کنایہ از افزایندۂ مرتبہ باشد۔
غ۔ ہای ہوز غلط۔ یا افزا، یا افزای۔ اور پھر پای افزای تمسخر محض پایہ افزا اور پایہ افزای ہے12

(م) ب۔(*پختن) بمعنی پختہ شدن وساختن ومہیا کردن باشد
غ۔ ہر آمد نامہ پڑھنے والا جانتا ہے حکیم دکنی کا کیا احسان[1]12

(م) ب۔(پائیر) بروزن جاگیر مدت بودن آفتاب در برج سرطان (پایر) بروزنِ سایر مدت ماندنِ آفتاب باشد در برج سرطان۔
غ۔ پائیر بروزن جاگیر، و پائر بروزن سائر، لفظ غلط معنی غلط اصل یہ ہے کہ پائیز بروزن کاریز اور پائیز بروزن جائز۔ فصل خزان کو کہتے ہیں کہ جس کا برگریز بھی نام ہے اور وہ تین مہینے ہیں: میزان عقرب، قوس۔ سرطان، اسد، سنبلہ، یہ تین مہینے تابستان کے ہیں اور اس کو تموز بھی کہتے ہیں۔ زای نقطہ دار کی جگہ رای بے نقطہ لے آیا اور ''مدتِ بودنِ آفتاب بسرطان'' اوس کے معنی لکھے۔ سرطان کے آفتاب کے مہینے کو 'تیر ماہ' کہتے ہیں، اور اس کے آفتاب کے مہینے کو 'مرداد' اور سنبلہ کے آفتاب کے مہینے کو 'شہریور' کہتے ہیں۔ میزان کے مہینے کو 'ماہ' کہتے ہیں۔ عقرب کے مہینے کو آبان، اور قوس کے مہینے کو آزر اور آزار کہتے ہیں پائیز اور پائز فصل کا نام ہے اور فصل تین مہینے کی ہوتی ہے پائیز اور پائز کو پائیر اور پایر لکھتا ہے اور پھر ایک مہینے کا نام بتاتا ہے اور مہینا بھی وہ کہ جس مہینے میں

1 ملاحظہ ہو شرف نامہ (97 الف) اور موید الفضلا (215/1)

آفتاب سرطان کا ہو۔ فاعتبروا[1] 12

ب۔ (لشکر) سپاہ، وعسکر معربِ آن (م) (لشکر شکن) شکنندۂ لشکر۔ (لشکر گاہ) جای لشکر باشد۔ (لشکر کشیدن) بمقابلہ مستعد جنگ شدن۔ (لشکری) سپاہی۔

غ۔ واسطے خدا کے، یارو، یہ پانچ لغت لشکر و لشکر شکن و لشکر گاہ و لشکر کشیدن و لشکری کس کی تعلیم کے واسطے لکھے ہیں۔ مردوں میں کوئی عامی، کوئی بازاری نہ ہوگا جو اس کے معنی نہ جانتا ہوگا۔ لشکر کو لغت ٹھہرانا اور پھر عسکر کو اس کا معرب جاننا! عسکر و عساکر و معسکر لفظ معرب پر اتنے اشتقاقات عارض نہیں ہوتے۔[2]

یارب، یہ کون شخص تھا اور پھر کیا خوش قسمت تھا کہ اس کے عیوب کو کوئی نہیں دیکھتا 12

ب۔ (مودادن) وموفرستادن۔ چوں کسی برزنی عاشق شود، و وصالش دست ندہد۔ موی درکاغذ پیچیدہ توی صندوق گذاشتہ پیش معشوقہ می فرستد وغرض ازاں اعلامِ ضعف و نحافت بوددر محنتِ ہجر۔ اگر معشوقہ ہم مشتاقِ او باشد او ہم در جواب موی فرستد۔ بم۔

غ۔ واہیات[3]

ب۔ (نالش) بروزنِ مالش، بمعنیٰ فریاد کردنست۔ مع۔

غ۔ نالش۔ یہ لغت تو میں قسم کھاتا ہوں کہ کسی کو معلوم نہ ہوگا۔[4] 12

ب۔ (نالیدن) گریہ کردن باشد۔ مع۔

غ۔ محض غلط، محض جھوٹ۔ نالیدن، فریاد کرنا ہے۔ گریہ کردن کیسا 12

1۔ یہ لغت کسی نے شرف نامہ (88 الف) سے اخذ کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں "پاپروزن (اپر، مدتِ ماندنِ آفتاب در برج سرطان کہ فارسیان یک ماہ شمرند و تیر ماہ گویند۔"

یہاں یہ عرض کردوں کہ میرزا صاحب نے 'فاعتبرو' عربی املا کے لحاظ سے لکھا ہے اُنھیں واو کے آخر میں ایک الف بھی لکھنا چاہیے تھا۔

2۔ میرزا صاحب کا یہ خیال بھی درست نہیں ہے کہ معرب پر زیادہ اشتقاقات عارض نہیں ہوتے۔ رہا عسکر کا معرب لشکر ہونا، تو یہ لغت ملحقات میں بہارِ عجم سے اضافہ کیا گیا ہے، اور اس کے مخفف (بم) کو آخر میں لکھ بھی دیا گیا ہے۔ پھر بھی میرزا صاحب بیچارے دکنی ہی کو موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں۔ باقی واقعہ یہی ہے کہ عسکر معرب لشکر ہے۔ بعض کے نزدیک یہ یونانی لفظ کا معرب ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب الفاظ الفارسیۃ المعربہ ص 114

3۔ یہ لغت بھی بہارِ عجم کا ہے۔

4۔ یہ لغات برہان کے نہیں ہیں، اور نہ ملحقات کے ہیں، بلکہ جیسا کہ اشارۂ (مع) سے ظاہر کردیا گیا ہے، میرزا محمد شفیع شیرازی کے بتائے ہوئے ہیں۔

* ب۔ (وطن) بالتحریک جای بودن واقامت کردن مردم۔ بم۔ (وقت) ہنگام۔
غ۔ وطن اور وقت کیا عمدہ دولغت ہیں کہ کم کسی کو معلوم ہوں گے۔[1] 12
* ب۔ (وہم) بالفتح رفتنِ دل بسوی چیزی بی قصدِ آن۔ وگمان بغلط بُردن و صاحبِ این حالت را وھمناک گویند۔ بن۔
غ۔ وہم اور وہمناک، یارب، یہ دولغت اس شخص نے کہاں سے بہم پہنچائے[1] 12
* ب۔ (ہمہ) بمعنی تمام۔
غ۔ ہمہ بمعنی تمام یہ نہ سمجھاتا، تو کون جانتا 12
* ب۔ (ہیزم) چوب را گویند کہ برای سوختن بکار برند۔ وانرہیمہ ہم می گویند۔ می۔
غ۔ ہیزم وہیمہ، خدا جانے، یہ شخص کتنی مدت پارس میں رہا ہے کہ یہ لغت اس کو معلوم ہیں[2] 12
* ب۔ (یاستن) بمعنی طاقت وتوانائی۔ ری۔
غ۔ یاستن غلط۔ یارستن ہے۔ بہ فتح رای قرشت[3] 12
* ب۔ (یاقوت) در سکندری است بمعنی آہ ونالہ۔ وبخاطر می رسد کہ تصحیفِ یارب خواہد بود۔ مل۔
غ۔ یاقوت کی تصحیف یارب۔ سبحان اللہ[4] 12
* ب۔ (یحییٰ برمکی) نام جوانمردی است معروف۔ مل۔
غ۔ لاحول ولاقوت[5]

1۔ یہ الفاظ مرتبین نے بہارِ عجم سے اخذ کیے ہیں، جیسا کہ اشارۂ (بم) سے واضح ہے۔
2۔ یہ لغت مرتبین نے منشکی کی کتاب سے اخذ کیا ہے۔
3۔ یہ لغت اشارۂ (ری) کے مطابق فرہنگ رشیدی سے ماخوذ ہے، اور رشیدی میں 'یارستن' ہی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابت کی غلطی سے یاستن بن گیا ہے۔
4۔ یہاں بھی مرزا صاحب سے چوک ہوگئی ہے۔ انھیں ''یارب کی تصحیف یاقوت'' لکھنا چاہیے تھا۔ نیز یہ بالیقین 'یارب' ہی کا بگاڑ ہے، کیونکہ اشارۂ (مل) کے مطابق اس لغت کو مدارالافاضل سے لیا گیا ہے، اور مدار (399 ب) ہی میں نہیں، شرف نامہ (401 الف) موید الفضلا (277/2) اور تحفۃ السعادہ (ص 644) میں بھی 'یارب' کے معنی آہ ونالہ بھی لکھے ہیں۔
5۔ یہ لغت بھی مدارالافاضل سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ مدار (404 ب) کے علاوہ موید الفضلا (286/2) اور کشف اللغات (1264) میں بھی موجود ہے۔

ب۔(فن) فضل مولی خان۔

غ۔سبحان اللہ۔میر فضلِ مولی کہ خودرا در بنگالہ فضلِ مولی خاں گویاندہ بود تا آنکہ ریختہ نمی دانست گفت، در زباندانانِ فارسی شمردہ می شد۔ خرس در کوہِ بوعلی سینا12

یہ تھے میرزا صاحب کے اعتراضات برہان قاطع کے آخری باب پر۔مناسب ہے کہ میں بھی چند باتوں کا اظہار کردوں۔

(1) برہانِ قاطع کو مؤلف نے 29 گفتاروں پر مرتب کیا ہے اور ہر باب کے عنوان میں اُن لغات کی تعداد لکھ دی ہے، جو اس گفتار میں مذکور ہیں۔چنانچہ 29ویں گفتار کے عنوان میں بھی وہ کہتا ہے:

''گفتار بیست ونہم از کتابِ برہان قاطع در لغات متفرقہ،محتوی بر ہفتاد و یک لغت و کنایہ۔''

''تمہ محتوی بر گفتار بیستم از کتاب برہان قاطع در لغات متفرقہ ومشتمل بر لغات وکنایات کہ بملحقاتِ برہانِ قاطع شہرت دارد، مع بعضے لغات وکنایاتِ کتب دیگر کہ احوالش در مقدمۃ الطبع مرقوم گشت۔'' (برہان قاطع ص832)

مقدمۂ طبع تو اس کتاب میں ہے نہیں البتہ سرورق میں ارشاد فرمایا ہے:

''برہانِ قاطع تالیف ابنِ خلف التبریزی،محمد حسین المتخلص بہ برہان،مشتمل برلغاتِ فارسی... و دیگر فوائدِ کتبِ لغاتِ دیگر باتمۂ آن کہ بملحقاتِ برہان قاطع شہرت دارد، اضعف العباد... محمد اعلم لکھنؤ آنرا بطرزی کہ کپتان روبک صاحب بعد تصحیح وترمیم طبع نمودہ بودند،مگر گفتار بیست ونہم کہ متضمنِ لغاتِ متفرقہ بترتیبِ علیحدہ مابینِ اصل کتاب وملحقات بود، وبعدمِ اہتمام طابعینِ سابقین بحلِ خود واقع نبود، وازین سبب مردمان بلحاظِ ترتیب از مضمونش بہرہ مند نبودند،لہٰذا آنرا بترتیبِ حروف در ملحقات مندرج نمودہ...''

سرورق کی اس عبارت میں کپتان روبک صاحب کے اہتمام سے چھپے ہوئے جس نسخے کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔یہ نسخہ مولوی کرم حسین بلگرامی، میر منشی تفریق عربی و فارسی اور چند دیگر اہلِ علم کی مدد سے مرتب کرکے روبک نے سنہ 1233ھ

(1818) میں طبع خانۂ ہندوستانی کو کلکتہ سے کلکتیا ٹائپ میں چھاپ کر شائع کیا تھا۔

اس کے شروع میں چودہ صفحوں کا مقدمۃ الطبع مولوی کرم حسین کا لکھا ہوا ہے جس میں برہانِ قاطع کی اہمیت، اس کے عام نسخوں کا غلط ہونا، کپتان تامس روبک صاحب کا اس کے صحیح نسخے کی اشاعت کی طرف توجہ کرنا، اس کام کے کئی اہلِ علم کو آمادہ کرنا، 13 نسخوں سے مقابلہ کر کے ایک نسخہ تیار کرنا، ان نسخوں کی تفصیل اور اُن کتابوں کی فہرست جن سے ملحقات کے سوا اور بہت سے لغات انتخاب کر کے تتمے میں درج کیے گئے ہیں، اس کے بعد ان زبان دانوں کے مجمل حالات جن سے ترتیب میں مدد لی گئی تھی، اور سب کے آخر میں مخففات اسامی کتب کی فہرست مندرج ہے۔

اس نسخے میں برہان کی گفتارِ بیست و نہم اُتنے ہی لغات پر مشتمل ہے جتنے مؤلف نے درج کیے تھے۔ ملحقات کو، جو برہان کے چار قلمی نسخوں کے حاشیوں پر مندرج ملے تھے، دوسری متعدد کتابوں کے بہت سے کارآمد الفاظ کے ساتھ مولوی نظام الدین حیدر سے جمع اور مرتب کرا کے آخر میں شامل کر دیا اور اس کا نام تتمہ رکھا۔

مولوی محمد اعلم لکھنوی نے جب اسے شائع کیا تو گفتارِ بیست و نہم اور تتمے کو ایک جگہ کر دیا اور سرورق کی عبارت میں اسے ظاہر بھی کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس حصے کے لغات کی تعداد 71 سے بڑھ کر 3855 ہوگئی اور آیندہ کے لیے مؤلف برہان کے ذمے اُن ہزار ہا الفاظ کی صحت و عدم صحت کا بار بھی آپڑا جو اُس نے نہیں لکھے تھے۔ چناں چہ اس دھوکے میں آ کر میرزا صاحب نے بھی تتمے کے اعتراضوں کا رُخ محمد حسین دکنی ہی کی طرف پھیرا ہے اور ان مدارج سے بخوبی واقف نہ ہونے کی بنا پر اس کو ہدفِ ملامت بنایا ہے، حالانکہ ان میں سے ایک لفظ بھی اس کے 71 لغات میں نہیں ہے۔ میں نے سہولت کے پیشِ نظر ملحقات کے الفاظ سے پہلے (م) اور دوسری کتابوں سے ماخوذ الفاظ سے پہلے یہ نشان (*) لکھ دیا ہے۔

(2) گو یہ لغات برہان کے نہیں ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ سب جعلی اور نا قابلِ تسلیم ہیں۔ جیسا کہ میں نے حاشیوں میں تصریح کر دی ہے، ان میں سے اکثر دوسری مشہور کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ جن کے حوالے مجھے سرِدست نہیں مل سکے ہیں، وہ بھی یا تو کتابوں میں سے لیے گئے تھے اور یا سید علی شیرازی متخلص بہ نیاز اور حاجی میرزا محمد شفیع شیرازی جیسے اہلِ زبان کے بتانے پر درج ہوئے تھے۔ ان اعتراضوں کے لکھتے وقت میرزا صاحب گھر میں بند تھے اور

اُن کے پاس لغت کی کوئی کتاب بھی نہ تھی، اس لیے انھیں ایسے الفاظ کے شامل کرنے پر معذور سمجھیے، جو دوسری کتابوں کے اندر موجود ہیں اور اپنی جگہ صحیح بھی ہیں۔ لیکن اُن الفاظ پر دکنی کو برا بھلا کہنا، جو ایسی کتابوں سے لیے گئے تھے، جو اس کے بعد لکھی گئی ہیں جیسے بہارِ عجم وغیرہ، قابلِ درگزر نہیں ہے۔ نیز جب انھوں نے ان ابتدائی اشاروں کو کتابی شکل میں مرتب کر کے شائع کیا تھا، اس وقت تحقیق کے تمام ذرائع ان کی دسترس میں تھے یا آسکتے تھے۔ لہٰذا اُن کا ایسے لفظوں پر صاحبِ برہان کو مطعون کرنا بھی یقیناً قابلِ اعتراض ہے، جو اپنی جگہ صحیح اور دیگر کتبِ متقدمین میں بھی موجود ہیں۔

(3) میرزا صاحب کے ان اعتراضوں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اُن کی رائے میں لغت کے اندر مشہور الفاظ کو شامل نہیں کرنا چاہیے۔ شاید میں ہی نہیں، مجھ سے زیادہ علم اور تجربہ رکھنے والے اصحاب بھی اس امر میں اُن سے اختلاف کریں گے۔ چنانچہ اُن کی یہ رائے عملاً کسی مرتب لغت نے بھی قبول نہیں کی ہے آپ انگریزی، عربی، فارسی، اردو، ہندی، کسی ایک زبان کی جدید ترین ڈکشنری اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ اس میں مشہور ترین الفاظ بھی غیر مشہور کے پہلو بہ پہلو نظر آئیں گے۔ اس کی وجہ بالکل ظاہر اور بدیہی ہے۔ لغات، علما اور خواص کے لیے نہیں، طلبا اور عوام کے لیے لکھے جاتے ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ کس طالب علم کو کون سا لفظ دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ باقی رہا بعض مولفین کا صرف غیر مشہور الفاظ کو اختیار کر لینا، تو یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی کسی خاص فن کے مصطلحات یا صرف محاورات پر مشتمل کوئی کتاب لکھ دے۔ مگر اس کا مطلب یہ کبھی نہ ہوگا کہ عام الفاظ پر مشتمل کتابِ لغت، قابلِ اعتراض قرار دے دی جائے گی۔

(4) اس میں شک نہیں کہ میرزا صاحب کے کچھ اعتراض درست بھی ہیں جنھیں صدق دل سے قبول کر لینا چاہیے مگر اس میں بھی شبہ نہیں کہ اُن کا لہجۂ اعتراض معاندانہ اور توہین آمیز ہے، جس کا نتیجہ اُن کی زندگی میں بھی اچھا نہیں نکلا، اور آج بھی قاطع برہان کو پڑھ کر قاری کی ہمدردیاں اُن کے ساتھ نہیں، اُس دکنی کے ساتھ ہو جاتی ہیں، جس کو یہ ہیچ و پوچ ماننے کو بھی تیار نظر نہیں آتے اور ان کے اس ارشاد کے باوجود کہ:

''بیزدانِ دانش بخش داد پسند می پناہم، و دانش از خدا و داد از خلق می خواہم، تا گرفتہ نزنند، و خردہ نگیرند، کہ با مردۂ دو صد سالہ دشمنی چرا می ورزد۔ نہ مرا با محمدؐ

حسین دکنی بحث است، و نہ بر شہرتِ برہانِ قاطع رشک۔"

(از دیباچۂ قاطع برہان و درفش کاویانی)

اس عبارت سے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ انھیں دکنی سے دشمنی بھی ہے اور برہانِ قاطع کی شہرت پر رشک بھی۔ کاش وہ اپنا لہجہ بالکل محققانہ اور مصلحانہ رکھتے!



غالب اور برہان

میں نے مارچ 1958 کے رسالہ ''آج کل'' دہلی میں بعنوانِ بالا ایک مقالہ لکھا تھا۔ اس میں برہانِ قاطع کے اس نسخے کا تعارف کرایا تھا، جس کے حاشیوں پر میرزا غالب نے اپنی یادداشتیں لکھی تھیں نیز آخری باب کی تمام یادداشتوں کو اپنی توضیحات کے ساتھ درج کردیا تھا، تاکہ اربابِ ذوق کو قاطع برہان کے اعتراضات کی ابتدائی شکل کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

آج کی صحبت میں کچھ اور یادداشتیں پیش کرنا چاہتا ہوں مگر ان سے پہلے دو چار باتیں بیان کرنے کی اجازت مطلوب ہے۔

1. میرزا غالب نے برہان کے حاشیوں پر جو خیالات ظاہر کیے ہیں ان کی زبان زیادہ تر فارسی اور کمتر اردو ہے۔ صفحاتِ آئندہ میں اُن کی صرف وہ عبارتیں نقل کی جارہی ہیں، جو اُردو میں ہیں۔ فارسی کے لیے کوئی اور موقع تلاش کروں گا۔
2. انھوں نے برہان کے لفظ ''آ'' سے لفظِ ''اُقلی'' تک 108 فارسی لفظوں کے اردو مترادفات بھی متن یا حاشیوں میں لکھے ہیں۔ اس عملِ پیہم سے خیال ہوتا ہے کہ ان کا ارادہ پوری کتاب کے اہم الفاظ کے اردو معنی بتانے کا تھا بعد میں کسی وجہ سے اس ارادے کو ترک کردیا۔
3. انھوں نے لفظ ''دولہ'' پر حاشیہ لکھا ہے: ''یہ سب عبارت نقل کر کر اس کی حقیقت لکھی جائے گی۔'' اس سے مترشح ہے کہ وہ کم از کم یہاں تک پہنچ کر یہ طے کر چکے تھے کہ ان یادداشتوں کو جداگانہ مرتب کریں گے۔ ایسا نہیں ہوا کہ ساری کتاب پر تنقید کرنے کے بعد اُسے کتابی شکل میں لانے کا ارادہ کیا ہو۔

تحریک، اپریل اور مئی 1961

انھوں نے قاطع برہان کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں دستنبو کی تالیف کے بعد تنہائی کا غم غلط کرنے کے لیے قاطع برہان دیکھا کرتا تھا۔ چونکہ اس میں جا بجا غلطیاں نظر آئیں اور میرا پیشہ تعلیم و تدریس تھا، اپنے شاگردوں کی آگاہی کے خیال سے میں نے ''از بسیار اندر کے'' اور ''از صد یکے'' اس کتاب میں جمع کر دیں، یہی بات انھوں نے صاحبِ عالم مارہروی کو بھی لکھی ہے۔''[1]

لیکن مجھے اس میں شبہ ہے کہ انھوں نے دستنبو سے فارغ ہو کر برہان کا تنقیدی مطالعہ شروع کیا اور اس شبہے کی بنیاد یہ ہے کہ دستنبو کو خود ان کی اپنی تصریح کے مطابق 31 جولائی 1858 (19/ذی الحجہ 1274ھ) کو ختم کر دیا گیا تھا۔[2] اگر اس کے بعد برہان پر کام شروع کرتے تو اس وقت سے لے کر 1276ھ (یکم اگست 1859 تا 20 جولائی 1860) تک، جو قاطع کا سال اختتام ہے، برہان کا نسخہ میرزا صاحب کے پاس رہنا چاہیے تھا، لیکن برہان کے زیرِ نظر نسخے کی تحریروں کے مطابق یکم اگست 1858 کو یہ نسخہ میرزا صاحب کی طرف سے بطورِ ارمغاں نواب علاء الدین احمد خاں بہادر، ولی عہد لوہارو کے پاس پہنچ چکا تھا اور یکم اگست 1859 کو انھوں نے اپنے والد نواب امین الدین احمد خاں بہادر کی خدمت میں بطورِ نذر پیش کر دیا تھا۔ ان دونوں تاریخوں کے درمیان یا اس کے بعد نسخۂ مذکور، بطورِ مستعار میرزا غالب کے پاس آیا ہو، اس کا کوئی ثبوت ہنوز دستیاب نہیں ہوا۔

میری رائے میں میرزا صاحب دستنبو لکھنے سے بہت پہلے یہ رائے قائم کر چکے تھے کہ فارسی لغت نویسوں نے الفاظ کی حقیقت اور معنی سمجھنے میں غلطیاں کی ہیں اور وہ دورانِ مطالعہ میں توضیحی یا تنقیدی یادداشتیں لکھنے کے بھی عادی تھے۔ چنانچہ لوہارو سیکشن میں سیالکوٹی مل وارستہ کی مصطلحاتِ شعرا خان آرزو کی موہبتِ عظمیٰ اور لالہ ٹیک چند بہار کے رسالہ ابطال ضرورت کے جو نسخے محفوظ ہیں اُن کے حاشیوں پر بھی میرزا صاحب نے اپنے توضیحی یا تردیدی نوٹ لکھے ہیں۔[3] نیز انھوں نے قاطع برہان کے آخر میں جو فوائد لکھے ہیں ان کے بارے میں کہا

1۔ عود ہندی: 31 2۔ دستنبو 53، مگر خطوط غالب، 1/238 میں لکھا ہے کہ یکم اگست 1850 تک میں نے 15 مہینے کا حال لکھا اور آئندہ لکھنا موقوف کیا۔

3۔ یہ نوٹ میں نے رسالہ شاعر بمبئی کے خاص نمبر 59 اور رسالہ اردوئے معلی دہلی فروری 60 میں شائع کر دیے ہیں۔ ان میں سے چند کا ذکر میرزا صاحب نے بھی قاطع برہان کے فوائد میں کر دیا ہے۔

ہے کہ ''نگارش فوائد کہ از ملحقاتِ قاطع برہان است، در رسال ''رستخیز'' انجام یافت'' اور سال رستخیز اسی کتاب کے دیباچے کے مطابق 1273ھ تھا، جو 1857 کے مطابق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دستنبو ختم ہونے سے پہلے ہی وہ ان فوائد کو لکھ چکے تھے۔ اس صورت میں قریب بہ یقین ہے کہ انھوں نے مختلف اوقات میں برہان پر یادداشتیں لکھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کہیں اردو میں اور کہیں فارسی میں لکھتے ہیں اور یہ زمانہ زیادہ تر دستنبو سے پہلے کا اور کچھ دستنبو کی ترتیب کے دوران کا تھا لیکن کتاب علائی کو دینے سے پہلے ہی انھوں نے ان یادداشتوں کو الگ نقل کرلیا تھا۔ جب دستنبو کے کام سے فارغ ہوئے تو ان یادداشتوں پر نظر ثانی و ثالث کی۔ اس میں کچھ اعتراض حذف کردیئے، اردو عبارتوں کا فارسی میں ترجمہ کیا اور مختصر عبارتوں کو پھیلا کر لکھا تا آنکہ اس مسودے نے قاطع برہان کی شکل اختیار کرلی۔

اس قیاس کے پیش نظر میرزا صاحب کی حسب ذیل تحریر کو میں قاطع برہان کی نظر ثانی و ثالث پر محمول کرتا ہوں۔ انھوں نے تقریباً مارچ 1859 میں چودھری عبدالغفور سرور کے خط میں صاحبِ عالم مارہروی کو خطاب کرتے ہوئے لکھا تھا:

> ''ان دنوں برہان قاطع دیکھ رہا ہوں، اور اس کے فہم کی غلطیاں نکال رہا ہوں۔ اگر زیست باقی ہے، تو ان نکات کو جمع کر کے اس نسخے کا نام قاطع برہان رکھوں گا۔''

اگر یہ تحریر برہان قاطع کے ابتدائی مطالعے کے وقت کی ہوتی تو ان تاریخوں میں برہان کا نسخہ لوہارو میں نہ ہوتا، دہلی میں میرزا صاحب کے پاس ہوتا۔ چونکہ قاطع کا سال اتمام 1276ھ ہے جو یکم اگست 1859 سے شروع ہوکر 19 جولائی 1860 پر ختم ہوتا ہے۔ اس سے میری اس رائے کی تائید ہوتی ہے کہ صاحبِ عالم کے خط میں اس کی کتابی ترتیب کا ذکر ہے۔

5. میرزا غالب نے قاطع برہان کے دیباچے میں اور صاحبِ عالم کے خط میں بھی یہ صراحت کی ہے کہ دستنبو اور قاطع برہان کی ترتیب کے دوران میں ان کے پاس سوائے دساتیر اور برہان کے دوسری کوئی کتاب نہ تھی۔ لیکن خود انھیں کے ایک خط سے اس کی تردید ہوجاتی ہے۔ وہ 20 اپریل 1858 کو میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

> ''کتنے اوچھے ہو۔ مصطلحاتِ شعرا، مصطلحات شعرا، بھائی، وہ کتاب تمہاری ہے۔ میں نے غصب نہیں کی۔ میرے پاس مستعار ہے۔ دیکھ چکوں گا بھیج

دوں گا۔ تقاضا کیوں کروں"[1]

ظاہر ہے کہ یہ 31 جولائی 1858 سے پہلے اور فروری1858 کے بعد کا واقعہ ہے۔ اس لیے دستنبو کی تالیف کے وقت کم از کم مصطلحات شعرا کا ان کے پاس ہونا محقق ہو جاتا ہے اور اندریں صورت دیباچۂ قاطع برہان کا بیان درست قرار نہیں پاتا۔

6. درفش کاویانی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قاطع برہان پر نظر ثانی کرتے وقت میرزا صاحب کے سامنے برہان قاطع کا دوسرا اڈیشن تھا، اس لیے اس میں جہاں کہیں برہان کے صفحے کا حوالہ دیا گیا ہے وہ اس نسخے کے خلاف ہے جس پر ان کی یادداشتیں مندرج ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قاطع کی اشاعتِ ثانی سے پہلے انھیں تحقیق لغات کے ذرائع میسر آگئے تھے۔ لہٰذا ان کا بہت سے ایسے اغلاط کا ذمہ دار بھی صاحبِ برہان کو بنانا جو پہلے مرتبینِ لغات کر چکے تھے، امرِ مستحسن معلوم نہیں ہوتا۔

7. آئندہ صفحوں میں میرزا صاحب کی جو اردو کی یادداشتیں پیش کی جارہی ہیں، وہ دو قسم کی ہیں:

(الف) پہلی وہ جن میں برہان کی ہیئت یا ترتیب پر اعتراض ہے۔

(ب) دوسری وہ جن میں تلفظ یا معنی پر ردوقدح کی گئی ہے۔

زیرِ نظر مقالے میں ان دونوں کو الگ الگ لکھا گیا ہے جس کے باعث برہان یا قاطع برہان کی ترتیب باقی نہیں رہی ہے لیکن یہ سب ترتیب ابجدی کے مطابق ہیں اس لیے اصول کی طرف رجوع کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔ بعض اعتراض ہیئت اور مواد دونوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسے مواقع پر میں نے اس کا لحاظ رکھا ہے کہ اعتراض کا زور کس پہلو پر ہے۔ اگر اس کے خلاف کوئی اندراج پایا جائے، تو وہ میرا سہو ہے۔

(الف) ہیئت برہان پر اعتراض

1. "آدر لکھ کر پھر لکھتا ہے کہ بمعنی آذر است کہ آتش باشد۔ گویا آدر اور آذر دو لغت ہیں، حال آں کہ آدر اصل ہے اور آذر بذال نقطہ دار منجملۂ غلطہائے مشہور 12"

بعد ازاں لفظِ آذر پر لکھا ہے کہ "استغفر اللہ، بذالِ منقوطہ ہرگز نیست۔ بدال مفتوحہ چنانکہ بر صفحۂ 22 نوشتہ است، صحیح است و باقی ہمہ خرافات 12"

---

[1] خطوط غالب از مولانا مہر: 261

قاطعِ برہان میں غالبؔ نے اس امر سے بحث کی ہے کہ فارسی میں ذالِ منقوطہ ہے یا نہیں، اور ہے تو کب سے ہے اور کس طرح اس کا داخلہ ہوا ہے۔ جیسا کہ مخدومی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب (الہ آباد) نے اپنے مقالہ ''ذالِ معجمہ فارسی میں'' کے اندر ثابت کردیا ہے، یہ حرف فارسی کی پرانی ملکیت ہے۔[1] اور جیسا کہ خود غالب نے اعتراف کیا ہے، اس لفظ کے فارسی نہ ہونے کی رائے تنہا انھیں کی ہے۔ دوسرا کوئی فاضل اس باب میں ان کا ہمرائے نہیں ہے۔[2]

2. آذرم اور آذرنگ کو دال سے لکھ آیا اور یہاں پھر ذال سے لکھتا ہے۔ یارب، اس نے وہیں کیوں نہ لکھ دیا کہ ذال نقطہ دار سے بھی لکھتے ہیں 12''

قاطع برہان میں غالب نے آذرم کے معنی پر بھی اعتراض کیا ہے اور لفظِ آذرنگ کو آرنگ کی بحث میں لکھا ہے۔

3. ''آرن کو مخففِ آرنج لکھ کر پھر آرنج اور آرنگ دو لغت کیوں لکھے 12''

قاطع برہان میں اس لفظ کی صورت اور معانی دونوں پر اعتراض کیا ہے، اور خفگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''نگرستنِ ایں عبارت خون را در دل و مغز را در سر بجوش می آرد۔''

4. ''آزرنگ، برائے خدا غور کرو، آدرنگ دال سے لکھا، پھر آذرنگ ذال سے لکھا، پھر یہاں زے سے لکھتا ہے 12''

قاطع برہان میں اس اعتراض کو آرفنداگ میں شامل کردیا ہے۔

5. ''آزفنداگ، رائے مہملہ سے لکھ آیا۔ اے زائے معجمہ سے لکھا۔ پھر زائے فارسی سے لکھا 12''

قاطع برہان میں مولف کی اس غلطی پر یوں اظہار برہمی کیا ہے: ''خوف از خدا و شرم از خلق ندارد۔''

6. ''آسودہ مفعولِ آسودن ہے اور اس کو دس برس کا بچا بھی جانتا ہے۔ یہ ایک لغت ایسا کیوں قرار دیا جائے کہ جس کے معنی لکھے جائیں 12''

قاطع برہان میں اس لفظ پر لکھا ہے کہ ''مشتقاتِ مصادر را لغت شمردن کارِ آدمی نیست۔''

7. ''آرفنداک لکھ آیا۔ آزفنداک لکھ آیا۔ آژفنداک لکھ آیا۔ اب آفنداک لکھتا ہے 12''

برہان قاطع کے حاشیے میں یہ اعتراض ''آفنداک'' کے تحت اور قاطعِ برہان میں

---

1. ارمغانِ علمی 139، طبع لاہور 1955 2. قاطع برہان 52

آرفنداک کے تحت کیا گیا ہے۔

8. ''آکندن، یہ قاعدہ اس بزرگ کا ہے کہ ایک مصدر کے مشتقات میں سے ہر لفظ کو ایک لغت جداگانہ قرار دیتا ہے۔ خیر، اس سے بحث نہیں۔ لیکن اتنا سمجھا چاہیے کہ آگندن بہ کافِ فارسی ہے نہ کہ بہ کافِ تازی 12''

قاطع برہان میں یہ اعتراض ''آگندہ گوش'' کے تحت کیا گیا ہے۔ بہرحال ڈاکٹر معین نے بتایا ہے کہ پہلوی میں اس لفظ کا تلفظ بکافِ تازی کیا جاتا ہے۔''[1]

9. ''ابرھام آگے لکھ آیا۔ یہاں اپراھام لکھتا ہے۔ اصل یہ کہ ابرھام و ابراھام و اپرھام و اپراھام، یہ سب بہ تغیر لہجہ اسمِ ابراہیم علیہ السلام ہے 12''

قاطع برہان میں اس اعتراض کو نظرانداز کر دیا ہے۔

10. ''ارغاب بمعنی ارغا۔ یہیں کیوں نہ لکھ دیا کہ بحذف بائے موحدہ بھی ہے 12''

یہ اعتراض بھی قاطع برہان میں نظرانداز ہو گیا ہے۔

11. آستینہ، اوپر چھ جگہ یہ لغت لکھ آیا ہے 12''

قاطع برہان میں آستینہ بالمد کے تحت اس لفظ کی حقیقت سے بھی بحث کی ہے اور مولف نے جو اس کے معنی ''تخمِ مرغ'' لکھے تھے، اس پر طنز کیا ہے کہ 'واچہ دیدہ است کہ خایۂ مرغ فہمیدہ است''

حسنِ عمید نے اپنی فرہنگ میں لکھا ہے کہ ''آستینہ، تخمِ مرغ، آشتینہ و آسینہ و استینہ و آشینہ ہم گفتہ اند'' فرہنگِ نظام نے فرہنگِ سروری سے نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ شعری زبان میں مستعمل ہے۔ اسی فرہنگ میں آشتینہ اور آشینہ کو فرہنگ جہانگیری سے نقل کیا ہے اور انھیں شعری زبان کا بتایا ہے۔

12. ''بختو یاد رہے 12''

13. ''بختور یاد رہے 12''

14. ''بختوذ' ایک لغت کے تین لغت بنائے ہیں۔ نہیں معلوم صحیح کیا ہے 12''

15. پھر دیکھیے جہاں چار کا ہندسہ ہے: بختو بروزن پرتو، رعد برادر برق را گویند۔ تے کی جگہ نون اور ضمہ کی جگہ فتحہ۔ پھر پانچ کے ہندسے کو دیکھیے: بختوہ برق خواہر رعد 12''

قاطع برہان میں اس لفظ سے مفصل بحث کر کے لکھا ہے کہ ''چہ مایہ خون خوردہ باشم،

---

1. برہان قاطع 1/54 حاشیہ 6 طبع تہران 1330 شمسی

تابمشاہدۂ این بیربطی زباں را از دشنام نگاہ داشتہ باشم۔"

جہاں تک ان شکلوں کی صحت کا تعلق ہے، یہ سب درست ہیں اور ایرانی انھیں استعمال کرتے رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو فرہنگِ نظام 611/1

16. "برزیگر" یہ چھٹا نقشہ ہے ایک لغت کا 12"

قاطع برہان میں اس لفظ سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

17. "بغلتاق و بغلطاق، لغت بڑھانے کو دو طرح سے لکھا۔ 12"

18. بکسل، بائے زایدہ کو اصلی سمجھا ہے 12"

قاطع برہان میں اس اعتراض کو شامل نہیں کیا ہے۔ ممکن ہے اس کا سبب اعتراض کا معمولی ہونا ہو۔

19. پنچپا، اوپر کئی طرح سے لکھ آیا ہے۔ اب یہاں تصحیف خوانی کرتا ہے 12"

یہ اعتراض بھی قاطع برہان میں جگہ نہ پا سکا۔

20. "ترکند، فے سے لکھ آیا۔ پھر قاف سے لکھا۔ پھر کاف سے لکھا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ 12"

21. تروند، دیکھیے اسی ترفند کو واو سے بھی لایا 12"

قاطع برہان میں ان دونوں لفظوں پر کیے گئے اعتراض کو "ترفند" کے تحت لکھا ہے۔ اگر مولفِ برہان زندہ ہوتا، اور "باللہ" کے دو الفوں کو خود غالبؔ کے قلم سے لکھا دیکھ کر پوچھ بیٹھتا کہ "حضرت یہ کہاں کی فارسی دانی ہے کہ اس عام جملے کو بھی آپ صحیح نہیں لکھ سکتے، تو ان کے پاس کوئی معقول جواب نہ تھا۔

22. "توبک، چل بھئی۔ تے اور نون اور ی تینوں لفظ آئے ہیں، اور بائے عربی اور بائے فارسی یہ بھی دونوں لکھ چکا ہے اور بضم اوّل لکھ کر بہ فتحِ اوّل بھی لکھ چکا ہے۔

اس کا لغت فاحشہ کا ولد ہے۔ یعنی معلوم نہیں ہوتا کہ باپ اس کا کون ہے۔ واہ بھئی[1]، حکیم دکھنی 12"

قاطع برہان میں یہ لفظ نظر انداز کر دیا گیا ہے اور یہ جذباتی بات لفظِ "تنگ" کے تحت بڑھا دی ہے۔

---

1. غالب کے قلم سے یہ لفظ "بھی" کی شکل میں لکھا ہوا ہے، لیکن موقع بھئی کا تھا اس لیے متن میں مناسب لفظ درج کر دیا گیا ہے۔

23. ''جفا پیشہ، یہ لفظ اس کی قابلیت نہیں رکھتا کہ لغات میں لکھا جائے 12''

قاطع میں یہ لفظ بھی نظر نہیں آتا۔

24. ''چغر، اے اہلِ فہم، خدا کے واسطے غور کرو چغر و چغر یدن و چغر یدہ بہ رائے بے نقطہ، اور پھر چغز و چغز یدن و چغز یدہ بہ زائے نقطہ دار۔ لغات کے معلوم کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی اُن لغات کو محل پر صرف کرے، اور ماخذ لغات کا فرہنگ۔ برہان قاطع کا دیکھنے والا ان لغات کو رے سے لکھے زے سے لکھے، کیا کرے۔ 12''

قاطع برہان میں ان لفظوں کے معانی کی غلطی پر زیادہ زور دیا ہے اور آخر میں جذباتی ہو کر لکھا ہے کہ ''گمراہی وآں نیز بصد رنگ، زہے علم و خہے فرہنگ''

25. ''خس بدہن گرفتن و خس دردہاں گرفتن'' یارو، واسطے خدا کے، یہ دو لغت کہاں سے ہو گئے۔ یہ شخص کاغذ کیوں سیاہ کرتا ہے 12''

قاطع برہان میں یہ اعتراض بھی شامل نہیں۔

26. ''خسک کے لغت کے تحت میں خسکدانہ لکھ چکا۔ پھر اس کو مکرر لکھتا ہے۔ یہ خبط نہیں تو اور کیا ہے 12''

یہ لفظ بھی قاطع میں شامل نہیں کیا گیا۔ جذباتی مصرع خود غالب کا معلوم ہوتا ہے اور اس سے پہلے ''ء'' (مخففِ مصرع) لکھنے کی جگہ ''ب'' (مخففِ بیت) لکھنا اُن کا سہوِ قلم ہے۔

27. ''لاحول ولاقوت۔ خشکنانہ لغت کا ہے کو ہے۔ وہی نانِ خشک ہے کہ اس کو خشک نان کہا اور ہائے مختفی بڑھا دی 12''

قاطع برہان میں یہ لفظ بھی جگہ نہ پا سکا۔

28. ''دانش، و دانش پژوہ، و دانشگر، و دانشور، و دانشمند و دانش، چھ لغت، سبحان اللہ اور پھر دانشگر غلطِ محض، عقلمند کو دانشگر کسی نے آج تک نہیں لکھا 12''

قاطع برہان میں دانشگر پر لکھا ہے کہ ''لفظے غریب آورد کہ اطلاقِ ایں صفت جز بر خدا روا نباشد، چہ ایں لفظ من حیث المعنی مرادفِ دانش آفرین است۔''

ڈاکٹر محمد معین نے اسے صحیح تسلیم کرتے ہوئے مبالغے کا صیغہ قرار دیا ہے۔[1] رشیدی فرہنگ نظام اور فرہنگ حسن عمید میں بھی یہ لفظ بمعنی دانشمند موجود ہے اور فرہنگ اسدی طوسی

---

1. برہان قاطع 19/2، حاشیہ

کے بعض نسخوں میں طپان کا یہ شعر سند میں پیش کیا گیا ہے:

چو دانشگر ایں قولہا بشنود
پس آنگہ زمانی فر و آرند

موید برہان میں بھی مدارالافاضل سے یہ معنی اور شعر نقل کیا ہے۔

29. ''دانم، پھر بمعنی توانم لایا حال آنکہ اسی دانستن کے مضارع کا صیغۂ متکلم ہے 12''

قاطع برہان میں لکھا ہے کہ اس لفظ کو مع اس کے معنی کے لغت میں لکھنا ''من نمی گویم کہ چیست۔ دانایان دانند۔ مع ھذا اگر دانم و توانم در معنی مرادف ہم گر باشد، ایں جگر تشنۂ تحقیق را نیز بفہمانند۔''

رشیدی نے لکھا ہے کہ ''بمعنی توانستن و قدرت داشتن از نظم و نثر واقع است۔'' موید برہان میں اس کی متعدد مثالیں نقل کر کے لکھا ہے کہ بعض جگہوں پر بمعنی علم بھی ہوسکتا ہے لیکن سروری نے انوری کا یہ شعر جو نقل کیا ہے اس میں بمعنی توانستن ہی ہوسکتا ہے۔ شعر یہ ہے:

آخر از رابطۂ قہر کجا داند شد
سرعت سیر تفاوت نہ بپای ھرب است

فرہنگ انجمن آرائے ناصری میں لکھا ہے کہ بمعنی توانستن و قدرت داشتن در نظم و نثر بسیار است، و در جمیع صیغہ برایں قیاس است۔''

30. ''لفظ ''دائے'' پر حاشیہ لکھا ہے: ''واو میں لکھ آیا تھا پھر یہاں کیوں لکھا 12''

قاطع میں یہ اعتراض بھی چھوڑ دیا گیا ہے۔

31. ''دراز، یہ لغت قابل لکھنے کے کا ہے کو تھا 12''

قاطع میں یہ اعتراض بھی موجود نہیں ہے۔

32. ''دندان آپریز، دندان آپریش، دندان افریش، دندان پریز، دندان فریش، دندان کلو۔''

ان لغات پر ایک سے چھ تک کے ہندسے بطور علامت لکھ کر حاشیے میں غالب نے لکھا ہے:

''خلال کے ایک لغت کے چھ لغت بنائے ہیں۔ ایک لغت کے تحت میں لکھ دیتا کہ یوں بھی کہتے ہیں، یوں بھی کہتے ہیں 12''

33. ''دوسیدن بمعنی چسپیدن کسی استاد کے کلام میں آیا ہو، تو ٹھیک ورنہ واہیات ہے۔ خیر، مانا کہ ان معنوں میں ہے۔ پانچ لغت بنائے ہیں اور پھر کس حماقت سے کہ پہلے متعدی کا صیغۂ ماضی اور آخر کو لازمی کا مفعول۔ ناقلِ معقول پسند اس لغت کو یوں لکھتا: دوسیدن بمعنی

چسپیدن و دوسانیدن متعدی آن است 5''
مصدر کا لکھ دینا کافی ہے۔ مشتقات اس کے تحت میں رہے۔ ہر صیغہ کو ایک لغت ٹھہرانا دلیل اس کی ہے کہ یہ شخص زبانِ فارسی سے لگاؤ اور صرفِ فارسی سے آگہی نہیں رکھتا 12''

قاطع برہان میں مصدرِ دوسیدن کو مولف کی گڑھت قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ ''نادر کلامِ سخنوران یا فرہنگ دیگران از نظر نہ گزرد، باور نتواں کرد۔'' فرہنگ رشیدی میں یہ مصدر بمعنی چسپیدن موجود ہے اور حسن عمید نے اپنی فرہنگ میں عطار کا یہ شعر سنداً پیش کیا ہے:

چند پای ہر کسے بوسیدنت
از طمع بر ہر خسے دوسیدنت

موید برہان میں نظامی اور اوحدی کے شعر بھی نقل کیے ہیں۔ فرہنگ انجمن آرای ناصری میں بھی دوسیدن بمعنی چسپیدن موجود ہے اور شیخ اوحدی کا یہ شعر سند میں پیش کیا ہے:

آب گندیدہ خاکِ بوسیدہ
در تو چون نفس و روح دوسیدہ

34. ''ساتگنی، ساتگی، ساتگیں، ساتگینی، بسم اللہ، ایک لغت کے چار 12''

قاطع برہان میں یہ بھی لکھا ہے کہ ''ساتگنی، و ساتگی، و ساتگینی ہر سہ غلط۔ صحیح ساتگیں، ومخففِ آن ساتگن، چون آستن مخففِ آستین'' لیکن فرہنگ رشیدی میں ساتگینی کی سند میں سعدی کا یہ مصرع ''من اندر سرو ساتگینی بدست'' اور ساتگنی کی شہادت میں منوچہری دامغانی اور عمارہ کے یہ دو شعر لکھے ہیں: [1]

منوچہری: از پسرِ نرد باز دادگران تر ببر
و ز دو کف ساتگین ساتگنی کش بدم

عمارہ[2]: چوں مے خورم بساتگنی یاد او خورم
از یاد او نباشد خالی مرا ضمیر

1۔ نیز ملاحظہ ہو برہانِ قاطع مرتبہٗ ڈاکٹر محمد معین، دیوان منوچہری 59 طبع تہران 1338 خورشیدی میں ''دو کفِ ساتگین'' کی جگہ ''دو کفِ سادگان'' ہے۔ اسی دیوان کے صفحات 89 اور 152 میں ساتگنی ملتا ہے۔ فرہنگ نظام مین ساتگینی کی سند میں ارزقی کا ایک شعر پیش کیا گیا ہے۔

2۔ عمارہ کا شعر فرہنگ اسدی طوسی میں بھی ساتگنی کی سند میں مندرج ہے لیکن موید برہان میں اسے ساتگی کی سند میں پیش کیا ہے اور مجھے بھی درست معلوم ہوتا ہے۔

منوچہری نے ایک جگہ لکھا ہے:

چوں دام ایزدی بنہادہ باشم
مرا دہ ساتکینی بر تو وام است

دوسری جگہ کہتا ہے:

چہار شنبہ کہ روز بلاست بادہ بخور
بساتکینی مے تا بعافیت گذرو

ان سندوں کے بعد غالب کا اعتراض درست قرار نہیں پاتا۔

35. ''سپوخت، سپوختن، سپوختہ، سپوز، سپوزد، ایک لغت کے چار لغت، ماضی الگ، مضارع الگ، مفعول الگ، امر الگ 12''

قاطع برہان میں اس موقع پر لکھا ہے کہ مولف کی یہ حرکت نہیں کہا جاسکتا کہ ''چہ مایہ ریشخند دارد۔''

36. ''سگالیدن کو اسی طرح تین چار لغت بنا کر کافِ عربی میں لکھ آیا ہے، اور وہاں اشارہ بھی کیا ہے کہ کافِ پارسی بھی لکھتے ہیں۔ پھر یہاں لکھنا کیا ضرور تھا اور حال یہ ہے کہ یہ کافِ پارسی سے ہے کافِ عربی سے نہیں ہے 12''

ڈاکٹر محمد معین نے اس لفظ اور اس کے دوسرے مشتقات کے بکافِ عربی ہونے پر کوئی اعتراض نہیں کیا ہے۔

37. ''شباں فریب، شباں فریبک، شباں فریو، شباں فریوک ایک لغت چار طرح سے 12''

قاطع برہان میں یہ اعتراض بھی نظر انداز ہوگیا ہے۔

38. طشتِ زر، طشت گر، طشتِ نگوں، طشت وخایہ، یہ سب لغت تاے تحتانی مع الشین میں لکھ آیا اور اب جو طوے اور شین کا کوئی لغت ہاتھ نہ آیا تو ان سب لغتوں کو یہاں مکرر لایا۔ فاعتبروا یا اولوا الابصار 12''

اس اعتراض کے آخر میں غالبؔ نے جو آیتِ کریمہ نقل کی ہے اس میں لفظِ ''اولوا'' کی جگہ ''اولی'' ہونا چاہیے تھا۔ مولفِ برہان قاطع زندہ ہوتا تو اسے معاف نہ کرتا۔

39. ''طنبک، خردتا مع النون میں لکھ آیا ہے 12''

قاطع برہان میں یہ اعتراض بھی شامل نہیں ہے۔

40. ''یہاں فغیازی لکھ چکا۔ پھر یہاں مکسور لکھتا ہے۔ حالانکہ یہ لغت سند طلب ہے۔''

پہلے یہ کہہ دوں کہ غالب نے اس عبارت کا یہ پہلا ٹکرا لفظ ''فغیاز'' پر اور دوسرا ''فغیازی'' پر لکھا ہے۔ پھر یہ اطلاع دوں کہ قاطع برہان میں یہ اعتراض بھی شامل نہیں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ فرہنگ اسدی میں فغیاز اور بغیاز دونوں اور رشیدی میں بغیاز مذکور ہے۔

41. ''سبحان اللہ، جب یہ قاعدۂ کلیہ ہوا کہ فے اور پے باہم مبدل ہوں، تو پھر فولاد بروزن ومعنی پولاد کے لکھنے کی کیا حاجت ہے 12''

قاطع برہان میں اس اعتراض کے سلسلے میں لکھا ہے کہ ''جائے آنست کہ از خندہ آب در چشم بگردد۔''

42. ''فیصور، نامِ شہر بتاتا ہے اور کافور کو فیصوری لکھتا ہے 12''

''پھر قاف میں قیصور اور قیصوری لکھتا ہے 12''

قاطع برہان میں لکھا ہے کہ 'لاجرم، یا قیصوری کہ شہرتِ بسیار دارد، غلط العام خواہد بود، یا فیصوری کہ افکانۂ بکرِ فکرِ دکنی است، غلط الخاص خواہد بود۔''

43. ''قیصور، فیصور کو دیکھ آئے ہو۔ پھر قیصور کو دیکھو 12''

44. نایب تنگری یعنی قائم مقامِ خدا'' واہ کیا اچھا لغت ہے۔''ٹکسال باہر 12''

قاطع برہان میں یہ اعتراض بھی شامل نہیں ہے۔

(ب) مواد برہان پر اعتراض

45. ''آذیش ہرگز لغتِ فارسی نہیں۔ عربی ہو تو ہو 12''

قاطع برہان میں یہ اعتراض بھی نظر انداز ہو گیا ہے۔ فرہنگِ رشیدی میں اس کی صراحت ہے کہ اربابِ فرہنگ اس لغت کو بذال منقوط صحیح قرار دیتے ہیں اور فرہنگِ سامانی میں انوری کے اس شعر سے بمعنی چوبِ آستانہ ہونے پر استدلال کیا گیا ہے:

گر کند چوبِ آستانِ تو حکم
شحنۂ چوبہا شود آذیش

46. ''آسیم و آسیمہ ایک لغت فارسی ہے۔ سام بمعنی ورم۔ آسام مزید علیہ۔ آسیم اس کا امالہ۔ اس سے مرکب ہے۔ سرسام، یعنی ورمِ سر۔ سراسیمہ اور آسیمہ سر، یعنی مانند سرسامیوں

کے مدہوش۔ پس آسیم بمعنی استاد کے کیوں ہو؟ قطع نظر اس سے، آسیم کا ہموزن جاجیم۔ آدمی ڈھونڈتا پھرے کہ جاجیم کیا چیز ہے 12''

قاطع برہان میں صرف اتنا لکھا تھا کہ ''ماراسخن در صحت لغتِ آسیم است، اگر از روئے ژند و پاژند نباشد، از روئے فرہنگھائے دگر۔'' اس کے دوسرے ایڈیشن موسوم بہ درفشِ کاویانی میں محولۂ بالا تشریح کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔

مولوی احمد علی جہانگیر نگری نے موید برہان میں فرہنگ جہانگیری کے خاتمے سے زرتشت بہرام پژدوی کا یہ شعر لغتِ آسیم کی سند میں پیش کیا ہے:

پرسیدم من از ہمراہِ آسیم
کہ ایں مردم چہ قوم اند اندریں تیم[1]

میں عرض کرتا ہوں کہ میرزا صاحب نے آسیم کے بارے میں جو کچھ اوپر لکھا ہے، تقریباً یہ سب اور ایسے ہی لفظوں میں فرہنگ رشیدی میں بھی موجود ہے۔

47. ''آہنگ کو ماضی کشیدن، آمدنامہ پڑھنے والا لڑکا بھی نہ کہے گا۔ ہاں، آہنگیدن مصدر بنایئے تو آہنگ امر پڑے گا۔ ماضی آہنگید ہوگا 12''

قاطع برہان میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس لفظ کے جتنے معنی لکھے ہیں ان میں سے بیشتر سند کے محتاج ہیں۔ صاحبِ موید برہان نے فرہنگِ جہانگیری سے تمام معانی کی سند پیش کر کے بتایا ہے کہ اصل میں جہانگیری نے آہنگ کے ساتویں معنی ''کشندہ'' (اسم فاعل) لکھے تھے۔ برہان نے اسے کشید پڑھ کر ٹھوکر کھائی ہے۔

48. ''ابدام بادالِ ابجد بروزنِ بدنام بمعنی جسم است کہ در مقابلِ جوہر باشد۔''

برہان قاطع کی اس عبارت پر میرزا صاحب نے لکھا ہے۔ ''جسم کو مقابلِ جوہر لکھتا ہے حال آنکہ مقابل جوہر عرض ہے، نہ جسم 12''

قاطعِ برہان میں یہ بھی لکھا ہے کہ ابدام، اندام کی تصحیف معلوم ہوتی ہے۔

ڈاکٹر معین نے حاشیۂ برہان میں کہا ہے کہ یہ لفظ موید الفضلا میں موجود ہے مگر اس کی سند میری نظر سے نہیں گزری۔

موید برہان میں دساتیر کی عبارت نقل کر کے بتایا ہے کہ یہ لفظ دساتیر کا ہے، اور ملا فیروز

1. تیم بمعنی کاروانسرا۔

بن کاؤس نے فرہنگ دساتیر میں اس تلفظ اور معنی کے ساتھ درج کیا ہے نیز صاحب موید نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ غالب کا یہ اعتراض کہ جسم و جوہر کا تقابل نہیں، ان کی علم کلام سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ ورنہ وہ مانتے کہ جسم و جوہر میں ترکیب و عدم ترکیب کا تقابل ہے۔

49. برہان قاطع میں ''ات'' کو ضمیر مخاطب لکھا ہے۔ اس پر میرزا صاحب فرماتے ہیں: ''ات'' لاحول ولاقوت تنہا تاے قرشت ضمیر مخاطب ہے نہ الف کے ساتھ۔ بات اتنی ہے کہ جو لفظ کہ اس کے آخر ہائے انہاے حرکت ہوگی اس میں اور ضمیرِ مخاطب میں ہمزہ پیدا ہو جائے گا 12''

قاطع برہان میں لکھتے ہیں کہ ''تابِ ضبط نماند۔ بے ادبی می کنم و می گویم کہ این مرد دنی کہ جامعِ این دفتر است، نہ چشم دارد تا بیند و نہ دل دارد تا بداند۔''

لیکن واقعہ یہ ہے کہ برہان نے دیباچے میں صراحت کردی ہے کہ بعضے حضرات کے نزدیک ضمائرِ ستہ میں الف اصلی ہے۔ بسبب کثرتِ استعمال حذف ہوگیا ہے اور دوسرے محققین کہتے ہیں کہ اصلی نہیں۔ صرف ہائے مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ کے بعد لایا جاتا ہے اور یہی قول بہتر ہے۔ اس صورت میں مولف کا اس لفظ یا اس کے نظائر کو بالف لکھنا قابل اعتراض نہیں ہوسکتا اور نہ میرزا صاحب کا برہان کو دیدہ و دل دونوں کا اندھا کہنا صحیح ہے۔

50. اسی طرح برہان میں ''ام'' کو ضمیر متکلم بتایا گیا تھا۔ اس پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ام'' ضمیر متکلم کا ہے کو ہے صرف میم ضمیر متکلم ہے 12''

قاطع برہان میں یہ بھی لکھا ہے کہ ''این خطائے سوم است مثلِ ہندی مشہور این جا صادق۔''

لیکن جیسا کہ ابھی مذکور ہوا۔ یہ اعتراض بھی برہان کو محولہ ہندی کہاوت کا مستحق نہیں ٹھہراتا۔

51. ''انجلک'' کے تحت برہان میں یہ عبارت مندرج ہے: ''ہر چند فراشِ خیال جاروبِ سنبل برجلِ خرسکِ ریش زند، پوست آں پاک نتواں کرد۔''

اس عبارت پر مصحح نے لکھا تھا کہ گو یہ عبارت بے معنی اور مختبط ہے اور زائد از ضرورت بھی اس لیے بآسانی حذف کی جاسکتی تھی، مگر تقریباً دس نسخوں میں موجود ہونے کے سبب سے جوں کا توں نقل کرنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آیا۔ میرزا صاحب نے اس پر تحریر فرمایا:

''اس فقرہ کا لکھنا کیا ضرور تھا مگر ہاں، حماقت جامع کا اظہار منظور تھا۔ غالب 12''

اور قاطع برہان میں لکھا کہ ''فقرۂ اخیر مگر کلام دیو است، آموزگار ایں بزرگوار ہماں دیو پر

غریواست۔"

ڈاکٹر معین نے اپنے تصحیح کردہ نسخۂ برہان کے دیباچے میں جناب علی اصغر حکمت کا ایک مقالہ برہان سے متعلق چھاپا ہے اس کے صفحہ 97 کے حاشیے میں موصوف نے لکھا ہے کہ مذکورہ بالا عبارت مولانا بسحق اطعمہ نے اپنے دیوان کی فرہنگ میں لکھی ہے اور اس کی اصل صورت یہ ہے: "الانجکک، دانۂ سیاہ کہ مغزی سفید داشتہ باشد چوں دانۂ امرود۔ خاصیتش آنست کہ ہر چند فراشِ خیال جاروبِ سبال برزیلوچۂ ریش زند، آن پوست پاک نتواند کرد۔" صاحبِ برہان قاطع کی غلطی کہ ایک ہزلیہ تشریح کو حقیقت سمجھ کر کتاب میں نقل کردیا اور وہ بھی کسی غلط نسخے سے کہ کسی کی سمجھ میں اس کا مطلب نہ آسکا۔

53. لفظ "برخ" پر نظر کی تخفیف "نظ" لکھ کر حاشیے میں فرمایا ہے:

> "برخ، یہاں چور پکڑا گیا۔ وہ جو "بخش" کے معنی "برج" لکھ آیا ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ اس دل کے اندھے نے کہیں دیکھا ہے کہ بخش جو صیغۂ امر ہے بخشیدن میں سے، وہ بمعنی حصہ و بہرہ و برخ بھی آتا ہے۔ اس نے برخ کو برج سمجھ لیا12"

قاطع برہان میں یہ توجیہ برخ کی بجائے بخش کے تحت لکھی ہے فرماتے ہیں کہ "بمعنی برج زنہار نیست۔ ایں نابینا جاے دیدہ است کہ فلک را بہ دوازدہ بخش کردہ اند و ہر بخش را برج نامند، گمان کرد کہ بخش برج را گویند۔ باچنین دیدہ است کہ بخش بمعنی بہرہ و برخ است، و برج فہمیدہ است۔"

لیکن میرزا صاحب کا یہ اعتراض درست نہیں معلوم ہوتا۔ موید برہان میں سروری کی مجمع الفرس سے بخش کو بمعنی برج نقل کیا ہے اور رودکی و فردوسی کے یہ شعر سند میں درج کیے ہیں:

رودکی۔ آفتاب آید ز بخشش زی برہ
روئے گیتی سبز گردد یک سرہ

فردوسی۔ چو پیدا شد آں چادر عاج گوں
خور از بخشِ دو پیکر آمد بروں

نیز مدار الافاضل اور ہفت قلزم میں بھی بمعنی برج لکھا ہونا ظاہر کیا ہے۔

53. برہان میں لکھا تھا "برینہ بکسر اوّل بروزن نگینہ" اس پر میرزا صاحب نے لکھا ہے:

''واہ، واہ، واہ، واہ 12''

لیکن قاطع میں اس اعتراض کو حذف کر دیا ہے۔

54. برہان کے لفظ ''بزلہ'' پر لکھتے ہیں کہ ''میں ایسا جانتا ہوں کہ یہ لغت عربی ہے اور ذال سے ہے، نہ کہ فارسی ہو اور زے سے ہو 12''

میرزا صاحب کا یہ خیال درست ہے کہ لفظ بذلہ عربی ہے اور اسے ذال سے لکھا جانا چاہیے۔ مگر قاطع میں یہ ارشاد کہ ''من محققِ لغاتِ عربی نیستم۔ دریں باب سکوت می ورزم، تا داناتایاں چہ فرمایند'' محل تعجب ہے۔ یہ بات کوئی ایسی پیچیدہ نہ تھی کہ اس کے لیے محققِ لغات درکار ہوتا۔ شیخ عبدالرشید کی منتخب اللغات ہر جگہ دستیاب ہوتی ہے۔ صرف اسے دیکھ لیتے یا کسی بھی عربی داں سے دریافت فرما لیتے، تو مسئلہ حل ہو جاتا۔

55. لفظِ ''بسمل'' پر لکھا ہے، ''وجہ تسمیہ کیا خوب لکھی ہے، اگر یوں ہے، تو چاہیے سوائے جانور حلال مذبوح کے اور کسی کو بسمل نہ کہیں۔ یہ شخص اپنے قیاس سے کیا کیا اوپج کی لیتا ہے 12''

قاطع برہان میں تفصیلی بحث کر کے آخر میں کہا ہے کہ ''طوبیٰ لک، اے دکنی گردن زدنی، طرفہ طالعِ قوی با خویش آوردۂ کہ زیرکانِ ہند گفتار ترا مسلّم می دارند و سند می شمارند۔''

لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرزا صاحب کا یہ اعتراض بھی درست نہیں۔ بسمل فارسی الاصل لفظ نہیں ہے، بلکہ عہدِ اسلام میں پیدا ہوا اور بمعنی ذبح و مذبوح مستعمل ہے۔ موید برہان میں ان معانی کی سند میں اہلِ زبان کے متعدد شعر نقل کیے گئے ہیں۔ نیز وجہ تسمیہ کے سلسلے میں موید الفضلا کی عبارت نقل کی ہے جو برہان کے قول کی موید ہے۔ اس صورت میں اس غریب کو گردن زدنی قرار دینا سراسر زیادتی ہے۔

56. ''بسیج'' پر لکھا ہے ''یہ تو اس کی عادت ہے کہ مشتقاتِ مصدر کو لغاتِ جداگانہ قرار دیتا ہے۔ مگر غلطی یہ ہے کہ اس تمام بحث کو جیم عربی سے لایا ہے، حال آنکہ یہ جیم فارسی سے ہے 12''

میرزا صاحب کا یہ اعتراض بھی درست نہیں ہے۔ یہ لفظ تمام قدیم و جدید لغات میں دونوں طرح درج کیا گیا ہے، ہاں بقولِ مدار الافاضل مشہور بہ جیم فارسی ہے۔

57. صاحب برہان نے ''پالوایہ'' کا ہم وزن چارخایہ لکھا تھا اس پر لکھا یہ کہ ''اس کا ہم وزن اگر چارپایہ لکھتے تو بہتر تھا۔ 12''

قاطع برہان میں بہت سخت طنز کیا اور فرمایا کہ ''مسکین چہ کند۔ ہر چہ در نظر داشت

نوشت'' لیکن لطیفہ یہ ہے کہ ڈاکٹر معین نے اپنے یہاں ''چار خانہ'' چھاپا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کلکتے والے نسخوں میں کاتب نے تصحیف کی تھی۔ میرزا صاحب نے اسے جامع کے سر تھوپ کر گالیاں دینا شروع کر دیں۔

58. پریدار پر لکھا ہے کہ ''پریدار کے معنی ٹھیک لکھے ہیں لیکن مجنون و دیوانہ کو پریدار نہیں کہتے 12''

قاطع برہان میں اس اعتراض کو خوب پھیلا کر لکھا ہے مگر حسن عمید نے اپنی فرہنگ میں، جو تہران میں 1337 خورشیدی میں طبع ہوئی ہے، پریدار کے معنی دیوانہ بھی لکھے ہیں اور ڈاکٹر معین نے برہان کے اپنے نسخے میں اس کی تغلیط نہیں کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ زبان کے یہاں ان معنوں میں لفظ پریدار کا استعمال شائع ہے۔

59. لفظِ ''پری گرفتہ'' پر لکھا ہے کہ ''پری گرفتہ'' کے معنی سراسر غلط۔ محض غلط۔ یہ سب معنی پریدار کے ہیں۔ پری گرفتہ و پری زدہ مجنوں و دیوانہ و بیخود کو کہتے ہیں، جس کو عرفِ عام میں سایہ کہتے ہیں۔ اس شخص نے پری دار اور پری گرفتہ کے معنی میں کیا خلط مبحث کیا ہے لاحول ولا قوۃ الا بااللہ 12''

اگرچہ رشیدی میں پری گرفتہ اور پریدار کو ہم معنی لکھا ہے مگر میری رائے میں غالب کا اعتراض معقول ہے اور ان دونوں کی مراد میں فرق ہے۔ ہاں غالب سے لاحول کے لکھنے میں غلطی ہوئی ہے اور وہ یہ کہ انھوں نے ''بااللہ'' میں ایک الف زائد لکھا ہے جو ان کی عربی سے ناواقفیت کا تو کیا، بے توجہی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

60. برہان نے لکھا تھا ''پوش با ثانی مجہول بروزن موش۔'' اس پر میرزا صاحب فرماتے ہیں ''واسطے خدا کے! موش میں واوِ مجہول کہاں ہے۔ کمبخت نے بروزن ہوش کیوں نہ لکھا 12''

قاطع برہان میں اس اعتراض کو نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہوگی کہ خود برہان ہی میں انھوں نے دیکھ لیا ہوگا کہ لفظ ہوش بمعنی گریہ و نوحہ بواو مجہول ہی بولا جاتا ہے۔

61. لفظ ''تردامن'' کے معنوں پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''یا الٰہی! عاصی و مجرم و گنہ گار میں کیا فرق ہے 12''

قاطع برہان میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے معنی جو بدگمان لکھے ہیں یہ درست نہیں۔ تردامنی کجا و بدگمانی کجا'' لیکن موید برہان میں موید الفضلا، مدار الافاضل اور کشف اللغات کے حوالے سے لکھا ہے کہ تردامن کے معنی بدگمان ہیں۔ اِس امر خاص میں ان سب لغات کا ماخذ

''قنیۃ'' ہے۔ اگر اس میں تصحیف نہیں ہوئی ہے تو اعتراض بے جا قرار پائے گا۔

62. ''تردست'' پر حاشیہ لکھا ہے ''تردامن'' کے تو معنی لکھے بے فائدہ کہ وہ سب مرادف ہمدگر ہیں۔ ''تردست'' کے معنی جلد و چست و چالاک وہی مرادف لکھ کر چپ ہو رہا۔ نہ لکھا کہ ''تردست'' سخی کو بھی کہتے ہیں۔ لغات کے معنی لکھنے کا یہ قاعدہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ مرادفات بلکہ مہملات لکھنی اور ضروریات کو ترک کرنا 12''

قاطع برہان میں اس اعتراض کو بھی چھوڑ دیا ہے۔ شاید وجہ یہ ہو کہ کسی لغت نویس نے اس لفظ کے معنی سخی نہیں لکھے ہیں۔

63. برہان میں ''ترغ'' کا تلفظ بتاتے ہوئے لکھا تھا کہ غین ساکن ہے۔ اس پر لکھا ہے کہ ''غین حرفِ آخر ہے۔ اس کا سکون کے اظہار سے کیا مدعا 12''

بعدازاں قاطع میں اس اعتراض سے صرف نظر کر لیا ہے۔

64. ''ترفندہ... بجائے حرفِ ثالث قاف نیز آمدہ است''

اس پر اعتراض کیا ہے کہ ''لاحول ولاقوت، جب قاف آیا تو لغت فارسی کہاں رہا 12''

قاطع میں اس کی جگہ یہ کہا ہے کہ مولف نے اس لفظ کو ف، ق، ک اور و چاروں سے بتا کر یہ ظاہر کر دیا کہ اسے خود بھی کسی ایک شکل کا یقین نہیں۔ ''واصل ایں، است کہ ترفند بقاے سعفص بروزنِ فرزند بمعنی سخنہائے بے اصل است، وباقی ہمہ بے اصل ولغو۔''

موید برہان نے موید الفضلا، شرفنامہ، سروری، جہانگیری اور رشیدی کے حوالوں سے چاروں شکلوں کی صحت ثابت کی ہے لیکن ڈاکٹر معین نے بتایا ہے کہ ترقندہ تصحیف ہے۔ ترفندہ کی۔

65. لفظ تماشا کے معنی برہان میں لکھے تھے: ''نظر کردن بچیزے باشد از روے حظ یا از روے عبرت'' اس پر حاشیہ لکھا ہے:

''تماشا کے معنی میں تماشا کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ جیسا کہ فارسی نہیں جانتا۔ عربی بھی نہیں جانتا۔ تماشا لفظ عربی ہے مشتق مشئی سے بمعنی خرامیدن۔ اہل عجم بمعنی دیکھنے کے لاتے ہیں، بلکہ بمعنی اس چیز کے جو دیکھنے کے لائق ہو بھی لاتے ہیں 12''

قاطع برہان میں یہ اعتراض بھی چھوڑ دیا ہے، شاید وجہ یہ ہے کہ جب عربی لفظ بہ تغیر لفظ و معنی فارسی میں استعمال کیا گیا ہے کہ وہ عربی نہ رہا، فارسی ہو گیا اور اس کا بھی مستحق ہو گیا کہ اُسے فارسی لغات میں نئے تلفظ اور معنی کے ساتھ جگہ دی جائے۔

66. لفظ تن پر لکھا ہے: ''لاحول ولا قوۃ الا باللہ، تن بمعنی خاموش واللہ غلط، باللہ غلط، تن زدن' بمعنی خموشیدن ایک اصطلاح، ایک روزمرہ ہے، جیسے گل کردن بمعنی ظاہر شدن اور اگر ''تن' بمعنی خاموش ہوتا، تو تن گشتن وتن بودن اور اس کا تعدیہ تن کردن بھی آتا۔ فلانے ''تن نشستہ است وفلانے تن رفت یہ بھی لکھتے:

ہائے کمبخت حکیم دکنی! کیوں اپنے قیاس کو لغات کے معنی میں دخل دیتا ہے 12''

قاطع میں اس لفظ کے اعراب اور ''بمعنی جسم است کہ در مقابل جوہر باشد' پر بھی اعتراض کیا ہے اور اسے مولف کی بے خودی پر محمول کر کے اپنا غصہ ٹھنڈا کیا ہے۔

جہاں تک جسم و جوہر کے تقابل کا علاقہ ہے اس کی صحت ابدام کے تحت گزر چلی ہے۔ رہا ''تن'' کا بمعنی خاموش ہونا تو اسے کسی لغت نویس نے تسلیم نہیں کیا ہے۔

67. ''توبال'' پر لکھا ہے کہ ''اس لغت کا عربی ہونا کیوں نہ ظاہر کیا۔''

قاطع برہان میں اس اعتراض کو بھی نظرانداز کر دیا ہے۔ شاید اس لیے کہ یہ عربی نہیں، بلکہ توپال کا معرب ہے۔

68. لفظِ تورہ پر لکھا ہے: ''یا الٰہی، تورہ کون سے ہندوستان میں کم کو کہتے ہیں۔ تھوڑا بہ تائے مختلط التلفظ ورائے ثقیلہ ودر آخر الف بہ معنی اندک ہے، نہ تورہ۔ اگر ولایتی اس لفظ کو بولے گا تو وہ تورا بولے گا مع الالف نہ بہ ہائے ہوز اور وہ تغیرِ لہجہ ہے۔ نہ یہ کہ اہلِ ہند تورہ بمعنی اندک بولتے ہوں۔

یہ، آپ سمجھے، لوگوں کو فریب دیتا ہے کہ میں ولایتی ہوں اور ہندی لغتوں کو صرف موافق اپنے لہجہ کے قیاس کرتا ہوں اور یہ جھوٹ ہے۔ کوئی باپ، دادا، پردادا اس کا جیسا کہ یہ کہتا ہے تبریز سے آیا ہوگا اور یہ خود بے شبہ وشک دکن کی پیدائش ہے۔ وہ زباندان ہے، نہ بادشاہ رس ہے، نہ محقق ہے۔ صرف عامی اور ناقل ہے 12''

قاطع میں بھی اس اعتراض کو تفصیل سے لکھا ہے اور اپنا حسب ونسب بیان کر کے کہا ہے کہ جب میں ترکی النسل ہونے کے باوجود ترکی نہیں جانتا تو یہ تبریزی الاصل ہونے کے باعث فارسی کا مستند عالم کیسے ہوسکتا ہے۔

میرزا صاحب نے برہان پر یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ وہ بادشاہ رس نہیں ہے۔ گویا بادشاہ رس ہوتا تو فارسی اچھی جانتا ہوتا لیکن اہلِ ہند کے لیے بادشاہ رسی بھی مہارتِ زبان فارسی کیسے

پیدا کر سکتی تھی۔ یہ زبان اردوے معلیٰ تو تھی نہیں جو بادشاہ اور اس کی اقامت گاہ کی تو معتبر ہوتی اور بقیہ کی قصباتی بولی کہلاتی۔

69. ''تیغ دودستی'' کے معنی برہان میں دو ہاتھ لمبی تلوار لکھے تھے۔ اس پر حاشیہ لکھا ہے:

''اے خدا! میں کہاں جاؤں؟ تیغ دودستی، دو ہاتھ کی لمبی تلوار کو کہتا ہے۔ رستم تک نے تو اتنی لمبی تلوار نہیں باندھی۔ پھر کون دو ہاتھ کی لمبی تلوار باندھے گا۔

اودکنی گردن زدنی! تیغ دودستی اُسے کہتے ہیں کہ گھوڑے کی باگ دانتوں میں پکڑ لیں اور دونوں ہاتھوں سے تلوار مارنی شروع کریں۔ چنانچہ عرب میں طاہر نام ایک سردار تھا کہ وہ لڑائی میں تیغ دودستی مارتا تھا۔ اعراب نے اس کا ذوالیمینین نام رکھا تھا یعنی صاحب دودست یمین۔

توبہ، توبہ!۔ تیغ دودستی، دو ہاتھ کی لمبی تلوار! 12''

قاطع برہان میں مولف کو لکھا ہے کہ ''بے چارہ نہ خود دانا ست، و نہ آموزگاری دارد، و نہ طبعے سلیم و قیاسے صحیح باخویشتن آوردہ است۔'' لیکن صاحب موید الفضلا اور مدار الافاضل وغیرہ نے تیغ دودستی کو ''نوعے از تیغ ہائے دراز'' بتایا ہے۔

نیز میرزا صاحب کی طرح نکتہ چینی کی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ آپ طاہر کو شجاعانِ عرب میں شمار کر رہے ہیں حالانکہ وہ ایرانی نسل کا تھا۔ امین کے مقابلے میں اسے مامون نے کماندارِ لشکر بنا کر بھیجا۔ اس نے جنگ میں دادِ مردانگی دیتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے تلوار چلائی۔ بعدِ فتح مامون نے اسے اس غیر معمولی شمشیر زنی کی دادیوں دی کہ اسے ذوالیمینین کا خطاب عطا کیا اور کچھ عرصہ کے بعد خراسان کا گورنر بنایا جہاں مدتِ دراز تک اس کا خاندان حکمراں رہا۔ آل طاہر اور طاہریہ کے نام سے ایرانی تاریخ کے اسلامی دور میں یہی خاندان مراد ہوتا ہے۔ تفصیل کے لیے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ملاحظہ فرمایئے۔

70. ''ثُغ'' پر حاشیہ لکھتے ہیں:

''اے حکیم، کیوں لغات کو خراب کرتا ہے؟ ثاے مثلثہ بموجب قطعۂ شرف الدین علی یزدی کے فارسی میں نہیں ہے پھر تو ثغ لکھ کر کیوں کہتا ہے ''بفارس بُت را گویند؟''

قطع نظر اس سے، اعراب غلط۔ ضمہ کہاں سے تو لے آیا۔ فغ بفائے مفتوح بُت۔ کمال یہ ہے کہ پغ بہ بائے مثلثہ ہو جائے گا۔ یعنی فے اور پے کا بدل ہے۔ یہ تو ثے کہاں سے لایا؟ اور ضمہ تو نے کس خس و خاشاک میں سے پایا؟

اے تیرا ستیاناس جائے!12''

قاطعِ برہان میں غالبؔ نے یہ اعتراض بہت اختصار کے ساتھ لکھا ہے اور غم و غصے کا اظہار بھی نہیں کیا ہے۔ میری دانست میں انھیں اس بیان پر معترض ہی نہ ہونا چاہیے تھا۔ خود مولف نے لفظ ارثنگ کے تحت لکھا ہے کہ ''بعضے ایں لغت را بجائے حرفِ ثالث ثای مثلثہ آوردہ اند و گفتہ اند کہ در لغت فارسی بغیر ازیں لغت و لغتِ ثغ بثائے سہ نقطہ و غینِ نقطہ دار دیگر لغت بثائے سہ نقطہ نیامدہ است۔ و ثغ بت را گویند و عرباں صنم خوانند۔''

علاوہ ازیں ڈاکٹر معین نے لکھا ہے کہ حرفِ ثا اوستائی زبان میں موجود ہے اور فارسی قدیم کے لفظِ سپہر (Spither) میں بھی یہی حرف پایا جاتا ہے۔

71. لفظ ثنگ پر میرزا صاحب نے لکھا ہے:

''ثنگ ثے سے کیسا لایا۔ اول ثے اور آخر گاف۔ نہ فارسی، نہ عربی۔ آدھا تیتر، آدھا بٹیر۔ تنگ موقع کو کہتے ہیں۔ ارتنگ مزید علیہ اور مانی کے مرقع کا اسم خاص ہے12''

قاطعِ برہان میں اولادِ زنِ فاحشہ والی پھبتی یہاں کسی گئی ہے۔

72. برہان میں ''جانگزاں کو بمعنی روح حیوانی لکھا تھا۔ اس پر فرماتے ہیں کہ ''جانگزا روحِ حیوانی کو کون کہے گا12''

لیکن قاطع برہان میں اس اعتراض کو شامل نہیں کیا ہے، حالانکہ کسی لغت میں بھی مجھے جانگزا کے معنی روح حیوانی نہیں ملے۔

73. لفظ ''پخی'' پر حاشیہ لکھا ہے:

''عجب تماشا ہے۔ خود پخیدن مصدر اور پخید ماضی لکھتا ہے۔ اس راہ سے ضرور آپڑا کہ پخد مضارع ہو اور پخی صیغہ واحد حاضر ہو۔ یہاں دو خطائیں ہیں، پخد صیغہ مضارع نہ لکھنا، اور پخی بسکونِ ثانی، یہ تو خطا کا ہے کو، گویا اندھاپن ہے12''

قاطع برہان میں اس موقع پر صرف اتنا لکھا تھا کہ ''پخی بہ اول مفتوح صیغہ واحد حاضر است از بحثِ مضارع پخیدن ہر آئینہ باید کہ پخی بروزن اخی باشد۔ سکونِ ثانی یعنی چہ'' درفش کاویانی میں یہ اور لکھا کہ ''یزداں را سپاس کہ فرزانگانِ صدر در بارۂ سکونِ حرفِ ثانی پخی با غالب ہمزبانند۔ چنانکہ از حاشیہ صفحہ 253 واضح است۔''

فرزانگان صدر سے برہان کے کلکتوی نسخے کے مصحح مراد ہیں۔ ان حضرات نے لکھا ہے

کہ جیسا کہ سروری میں ہے، عبارت یوں ہونا چاہیے: پچی بفتح اوّل و کسر ثانی وسکونِ تحتانی، مگر چونکہ ہمارے پیش نظر سب نسخوں میں بکسر اوّل وسکون ثانی وتحتانی لکھا ہے، اس لیے مجبوراً یوں ہی چھاپ رہے ہیں مگر یہ بات میرزا صاحب کو پہلے سے معلوم تھی۔ خدا جانے قاطع برہان میں اس کا اظہار کیوں نہ کیا۔

صاحب موید برہان نے لکھا ہے کہ ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک مخطوطے میں عبارت اس طرح ہے: ''پچی بکسر اوّل وسکونِ تحتانی۔''

74. لفظ ''خشکا خور'' پر لکھا ہے:

''خشکا خور شاید ہندی کی فارسی بنائی ہے۔ یعنی خشکہ کھا۔ صاحب، یہ ایک لغت نہیں ہے، ترکیب توصیفی ہے۔ آخرِ خشک بے واو معدولہ، جاے بے نفع۔ آخر چرب، جائے کثیر النفع۔ خشک آخر اور چرب آخر تقلیب ہے، صفتِ مقدم موصوف پر۔''

قاطع برہان میں ہندی کی فارسی بنانے کا ذکر نہیں ہاں اس پر زور دیا گیا ہے کہ اس لفظ کو ''خشکا خور'' ملا کر نہ لکھا جائے۔ لیکن حق یہ ہے کہ اعتراض اہم نہیں۔ نیز صاحبِ موید برہان کے بقول میرزا صاحب کا قاطع میں یہ لکھنا بھی غلط ہے کہ یہ مضاف ومضاف الیہ مقلوب ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اسے کہتے ہیں بشریت کہ مذکورۂ بالا عبارت میں درست لکھا تھا بعد میں صحیح کو غلط کر دیا۔

75. برہان میں خشکہ کو بے گوشت کا نہ لکھا تھا۔ اس پر میرزا صاحب فرماتے ہیں: ''بے گوشت کی قید ضرور تھی 12''

پھر قاطع برہان میں اسے نظر انداز کر رہے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ایرانی بے روغن کے پلاؤ کو خشکہ کہتے ہیں۔

76. خوپلہ بروزن طبلہ بمعنی نادان و احمق می نویسد۔ اے حکیمِ دکنی، تصحیف اور پھر بایں حماقت۔ خویلہ لفظِ فارسی مشہور ہے۔ ہندی میں اس کو خیلا کہتے ہیں۔ نہ گالی ہے نہ دشنام ہے۔ نہ خوبلہ بیائے تحتانی ہے۔ خویلہ، احمق اور نادان اور پوچ ولغو کو کہتے ہیں۔ یہاں تو خوبلہ لکھا ہے اور پھر صفحہ 319 میں خویلہ لکھا ہے۔''

پہلے یہ عرض کردوں کہ میرزا صاحب نے اپنے قلم سے بجائے خوپلہ کے خوبلہ لکھا ہے، جو برہان کی صحیح نقل نہیں۔ پھر یہ بتادوں کہ ڈاکٹر معین نے میرزا صاحب کے بیان کی تائید

کرتے ہوئے خویلہ کو صحیح اور خوبلہ کو تصحیف مانا ہے لیکن موید برہان سے معلوم ہوتا ہے کہ سروری، رشیدی اور سراج اللغہ میں بھی خوبلہ کو لغت صحیح کی طرح پیش کیا گیا ہے۔ اس صورت میں دکنی کے ذمے عائد کردہ حماقت کو تقسیم کرنا چاہیے۔

77. برہان کے لفظ ''دپ'' پر لکھا ہے:

''یہ شخص بکتا کیا ہے؟ دف معرب کا ہے کو ہے۔ فارسی میں پے اور فے باہم بدلے جاتے ہیں۔ فرمان اور پرمان۔ فرتاب اور پرتاب۔ اسی طرح دف اور دپ 12''

قاطع برہان میں اس لفظ پر کئی اعتراض کیے ہیں اور آخر میں فرمایا ہے کہ ''بمشاہدۂ این عبارت جای کہ خاصیتِ خونِ خرس می نویسد، دلم بر بیکسیہای این ناقل ناعاقل می سوزد۔ آیا کس از غمخواران و بیمارداران نبود کہ ہرگاہ ایں بے چارہ آہنگِ نوشتنِ برہانِ قاطع کرد، وآن مقدمۂ جنون بود، خونِ خرس بگلومی ریخت، وبینی، می دمید، و بکفِ پامی مالید، تا از رنجِ سودا میرست، ولب از ہذیان می بست۔''

موید برہان میں لکھا ہے کہ اکثر علمائے لغت کا خیال ہے کہ یہ عربی ہے اور کچھ حضرات فارسی مانتے ہیں۔ خانِ آرزو اسے اور دپ کو ہندی ڈھپ سے بنا ہوا مانتے ہیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ڈاکٹر معین کی رائے میں دف معرب ہے۔ عبرانی ففٖ کا جس کے معنی کوٹنا اور پیٹنا ہیں۔

اس صورت میں میرزا صاحب کا برہان کو مجنون اور دیوانہ کہنا اس کی دلیل ہے کہ ان کا لغت کا مطالعہ بہت محدود تھا۔

78. برہان میں ''دژم'' کے تیرہ معنی لکھے تھے۔ اس پر میرزا صاحب نے لکھا ہے: ''دژم کے تیرہ معنی لکھے ہیں، اور پھر کس لطف سے کہ رنجور و بیمار مرادفِ ہمدگر، اور سرمست و مخمور ضدِ ہمدگر، اندوہناک و غمگین مرادف، تیرہ و تاریک مرادف 12''

قاطع میں اس کے معانی پر تفصیلی بحث کے بعد لکھا ہے کہ ''ہاں، در منطق عوام کالانام ہر کہ سیہ مست باشد اورا مست و مخمور گویند۔ وکلام صاحب برہان بیشتر ازین دست است۔ مگر صاحب موید نے سعدی و قاآنی کے یہ شعر پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ مخمور بمعنی مست مستعملِ اہلِ زبان ہے:

سعدی: سید مست و خود رای و شہوت پرست
بغفلت شب و روز مخمور و مست

قاآنی: فلک، از نشۂ جامِ تو سرمست
جہان، از بادۂ لطفِ تو مخمور

باقی رہا کسی لفظ کے معنی بیان کرنے میں الفاظِ مترادفہ کا ذکر، تو یہ بھی اہلِ لغت کا دستور ہے۔ صرف برہان کو اس غلطی پر مطعون نہیں کیا جاسکتا۔

79. صاحب برہان نے لفظ ''دستنبو'' کے معنی لکھتے ہوئے کہا تھا ''نباتے باشد گرد و چک و الوان شبیہ بہ خربزہ خصوصاً''

اس پر میرزا صاحب نے لکھا ہے کہ ''نبات کی شان میں سے یہ بات کہاں ہے کہ گرد و کوچک والوان ہو، اور پھر نبات کو مشابہت خربزہ سے کاہے کو ہوسکتی ہے۔ اس احمق نے ''ثمرے باشد، میوۂ باشد'' کیوں نہ لکھا 12''

میرزا صاحب کا یہ اعتراض درست ہے۔ چنانچہ رشیدی وغیرہ نے اس موقع پر لفظ میوہ استعمال کیا ہے۔ نفائس اور غیاث میں لکھا ہے کہ ہندی میں اسے کچری کہتے ہیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ رامپور میں یہ پھل ''سیندا'' کہلاتا ہے۔

80. برہان کے لفظ ''دولہ'' پر میرزا صاحب نے لکھا ہے:

''یہ سب عبارت نقل کر کر اس کی حقیقت لکھی جائے گی 12''

قاطع برہان میں یہ لفظ ترک کردیا گیا ہے۔ خدا جانے اس کی کیا حقیقت ان کے دماغ میں تھی۔ لیکن اس سے اتنا بالیقین ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم یہاں پہنچ کر ان کا ارادہ کتابی شکل میں تنقید لکھنے کا تھا۔

81. ''راہِ خفتہ و راہِ خوابیدہ اس راہ کو کہتے ہیں کہ جو بند ہو اور کوئی اس راہ سے آتا جاتا نہ ہو۔ راہ دور دراز ہموار کو کبھی راہِ خفتہ نہیں کہتے اور خود جوہر لفظ بھی دلالت اس معنی پر کرتا ہے اور دوسرے معنی سے مخالفت رکھتا ہے 12''

قاطع برہان میں اس عبارت کا ترجمہ کردیا ہے مگر اعتراض کی اہمیت جتانے کے لیے ''پناہ بخدا'' سے شروع کیا ہے۔

مویدِ برہان میں جہانگیری، رشیدی، سراج اللغہ اور بہارِ عجم کے حوالے سے ظہوری، صائب وغیرہ اساتذہ کے شعر نقل کیے ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ راہِ خفتہ و خوابیدہ بمعنی راہِ دور دراز مستعمل ہے۔ شعر یہ ہیں:

ظہوری: راہِ ملکِ عشق راہِ خفتہ ایست

صد درازی خفتہ در پہنائے او

صائب: در بدست آوردنِ زلفش مرا تقصیر نیست
این رہِ خوابیدہ کوتہ می کند شبگیر را

واضح: عشق آگاہی نبخشد جانِ غفلت دیدہ را
برق نتواند بریدن این رہِ خوابیدہ را

بیدل: غبارم برنمی خیزد ازین صحرائے خوابیدہ
اسیرم ہمچو طفلان، در طلسم پائے خوابیدہ

راقم: جادۂ خوابیدہ داند پای شوقم برق را
دستِ کوتاہِ مرا ہر دم عنان گردد بلند

قاسم: سعیِ بیہودہ است در بیداری بختِ زبوں
این رہِ خوابیدہ را آوازِ پا افسانہ ایست

لیکن میری رائے میں ان اشعار میں راہِ خفتہ وخوابیدہ سے راہِ دور دراز مراد نہیں، بلکہ وہی راستہ مطلوب ہے جو بند ہو اور اس پر آمد و رفت نہ ہو رہی ہو۔

82. لفظِ رخشا پر بسیط نوٹ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

''رخشا کو بفتح لکھ کر لکھتا ہے کہ بضم اول نیز گفتہ اند۔ درخشاں کو خصوصاً بالضم لکھتا ہے۔

اے حکیم دکنی، تو کیوں لوگوں کو گمراہ کرتا ہے؟ کیوں اپنی طبیعت سے لفظ تراشتا ہے؟ جیسا کہ قدردانوں اور سخن فہموں نے کمال اسمٰعیل کو خلاق المعانی خطاب دیا تھا، میں چاہتا ہوں کہ تجھ کو خلاق الالفاظ خطاب دوں۔ اب تو سُن۔

رُخشا اور رُخشاں بہ رائے مضموم صرف تمسخر ہے۔ رخشیدن و درخشیدن یہ دو مصدر ہیں بمعنی چمکنے کے۔ چاہے اس کو مزید علیہ اس کا سمجھ۔ چاہے اس کو مخفف اس کا قرار دے۔ درخشیدن کا مضارع درخشند اور امر درخش۔ امر کے آگے الف فاعل کا لائے۔ درخشا اور رخشا ہو گیا۔ امر کے آگے الف اور نون حالیہ لائے، درخشاں اور رخشاں بن گیا۔ تو نہیں دیکھتا کہ درخشندہ اور رخشندہ ان دونوں بحثوں کے اسم فاعل ہیں۔ رُخشا بہ رائے مضموم و رُخشاں بہ رائے مضموم یہ مضموم نہیں، بلکہ مذموم ہے بذال شخذ۔

بھائی، مصدر کے ہر مشتق کو تو ایک لغت جداگانہ قرار دیا کر۔ میری بلا سے، مگر واسطے خدا

کے، غلط نہ لکھا کر، اور لغات میں قیاس کو دخل نہ دیا کر 12 غالب 12 ''

قاطع برہان میں اس عبارت کو مختصر کر کے لکھا ہے۔ نیز خلاق الالفاظ کا خطاب بجائے یہاں کے دیباچے ہی میں عطا فرما دیا ہے۔

موید میں شرفنامہ، موید الفضلا، مجمع الفرس، جہانگیری اور رشیدی سے نقل کیا ہے کہ یہ دونوں لفظ بضم را بھی بولے جاتے ہیں۔ نیز غالب نے جو درخشاں اور رخشاں کے الف نون کو حالیہ بتایا تھا اس پر اعتراض کیا ہے کہ یہ الف نون فاعلیت کے ہیں اور ان کے معنی تابندہ ہیں۔

میں عرض کرتا ہوں کہ اس عبارت میں بھی میرزا صاحب نے ''باالضم'' غلط لکھا ہے۔ صحیح املا ''بالضم'' ہے۔

83. برہان میں زرنگ کے آٹھ معنی مندرج ہیں۔ اس پر میرزا صاحب نے لکھا ہے کہ ''الہٰی، آٹھ معنی سے کہ وہ باہم مناسبت ہرگز نہیں رکھتے، کون سے معنی کو صحیح جانوں! 12 ''

لیکن قاطع برہان میں اسے نظر انداز کر دیا ہے۔ باقی ڈاکٹر معین نے یہ لکھا ہے کہ زرنگ کو بمعنی زردآبِ گلِ کاویشہ کہنا صحیح نہیں۔ یہ معنی لفظ زرتنگ کے ہیں۔

84. زنبیر پر حاشیہ لکھا ہے کہ ''زنبیر و زنبیل کی ہندی جھولی ہے۔ نہ ظرف ہے، نہ حصیر سے بنا ہے اور طرفہ یہ کہ لفظِ پشنگ کے تحت میں زنبیر کے معنی جھولی لکھے ہیں 12 ''

قاطع میں یہ اعتراض بھی شامل نہیں کیا گیا۔

85. برہان نے لکھا تھا ''پسی دیو بمعنی دیو سفید است کہ رستم در مازندران کشت چہ پسی بمعنی سفید باشد۔'' اس پر میرزا صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''پُسی بمعنی سفید باشد، عیاذاً باللہ! یہاں پھر اپنے قیاس کو دخل دیا۔ سپید یو ادغام ہے سپید دیو کا اور اسی طرح سپیدار ادغام ہے سپید دار کا۔ پسی دیو، یہ املا غلط در غلط 12 ''

قاطع برہان میں اس اعتراض کا آغاز ان الفاظ سے ہوا ہے ''اے بو بہرۂ از خرد بے بہرہ'' نیز وہاں ادغام کی جگہ قاعدۂ ترخیم کو بنا قرار دیا ہے۔ چونکہ مقدمۂ برہان میں اور اس لفظ کی مختلف شکلوں کے تحت بھی یہ بات بہرۂ از خرد بے بہرہ بیان کر چکا ہے، اس لیے وہ موردِ طعن قرار نہیں پا سکتا۔ ہاں، وہ انھیں طعنہ دے سکتا ہے کہ جب آپ سے ''عیاذاً باللہ'' صحیح لکھنا نہیں آتا، تو اپنی عبارت میں استعمال کیوں فرماتے ہیں۔

86. ''ستادن واستادن وایستادن بمعنی قیام مسلم اور بمعنی لینے کے ستدن ہے بہ ہر دو ضمہ اور

وہ مصدر جداگانہ ہے۔اس کا مضارع ستاند اور امر ستاں۔

اور ستادن و استادن و ایستادن کا مضارع ستد بہ کسرۂ سین، و استد بہ الف مکسور و ایستد ہے۔امر ایست اور اِست بہ الفِ مکسور۔

وجہ حکیم دکھنی کے گمراہ ہونے کی یہ ہے کہ ستد بکسرۂ سین وفتحۂ تائے تحتانی ستادن کا مضارع ہے۔اور سُتُد بہ ضمتین سُتُدن کا ماضی کا صیغہ ہے۔اس کور سواد نے دھوکا کھایا12''

قاطع برہان میں مولف کو''غول صحرائے سخن'' اور''کور مادرزاد'' اور آئینِ صرفِ فارسی سے اتنا نا آگاہ قرار دیا ہے کہ''کودکانِ آمدنامہ خوانِ دبستانہائے دہلی ولکھنؤ'' بھی اتنے ناواقف نہیں ہوں گے۔

موید برہان میں جہانگیری و رشیدی کے حوالے سے شاہ داعی شیرازی کا یہ شعر''ستاد'' بمعنی''ستاند'' کی سند میں پیش کیا ہے:

ما سر بغیرِ حضرتِ تو درنیاوریم
سلطان ز بندۂ تو نیارد ستاد باج

اور مجمع الفرس کے حوالے سے لکھا ہے کہ نظامی گنجوی نے اس شعر میں''ستادن'' کو بمعنی گرفتن استعمال کیا ہے:

نہ بخشندہ خبر دارد ز دادن
نہ آن کس کو پذیرفت از ستادن

نیز نوادر المصادر کے حوالے سے لکھا ہے کہ ستاندن بروزن نشاندن بمعنی گرفتن مستعمل اور ستاند اس کا مضارع۔فردوسی کہتا ہے:

ستاند ز تو

یہ بھی لکھا ہے کہ ستد مخففِ استد بمعنی'قیام کرد'ابھی تک نظر سے نہیں گزرا۔اسی طرح سُتُد بمعنی گیرد بھی نہیں آتا۔ہاں سکندر نامے وغیرہ میں بمعنی گرفت آیا ہے لیکن نہ بضمۂ سین وتا بلکہ بسینِ مکسور وتائے مفتوح۔طاہر وحید کہتا ہے:

دریں بارگہ بے گواہ و سند
بود گرم بازار داد و ستد

میں عرض کرتا ہوں کہ اس عبارت میں بھی میرزا صاحب نے لفظ''وجہ'' کو''وجہہ'' لکھ کر

املائی غلطی کی ہے۔ نیز فرہنگِ نظام میں سُتُد کو بکسرِ سین وفتح تا لکھا ہے۔ اس صورت میں ماضی سِتَد ہوگا نہ کہ سُتُد۔ فرہنگ میں یہ بھی صراحت کی ہے کہ اس مصدر کا ماضی اور اسمِ مفعول تکلم میں نہیں آتے۔

87. برہانِ قاطع میں صدا کو لفظِ سدا کا معرب بتایا تھا۔ اس پر مصححین مطبع نے نوٹ دیا کہ "لفظِ سدا بسینِ مہملہ بمعنی آوازِ گنبد وغیرہ آوردہ و گفتہ کہ معربِ آن صدا بصادِ مہملہ است حالا سدا باسینِ مہملہ باین معنی در ہیچ کتبِ موجود یافتہ نشد۔"

میرزا صاحب نے اس اعتراض کی داد دیتے ہوئے لکھا ہے:

"معترض سچا ہے۔ صدا بصاد لغتِ اصلی عربی ہے بمعنی مطلق آواز۔ سدا بہ سین لغتِ فارسی بمعنی آوازِ خاص غلط محض۔

اس بزرگ یعنی صاحب برہانِ قاطع کو عقل سے بہرہ نہیں صرف نقل پر مدار ہے۔ خدا جانے اس کو کوئی بہکا دیا کرتا ہے۔ یا یہ آپ قیاس کرتا ہے اور لطف یہ کہ قیاس اس کا کہیں صحیح نہیں ہوتا۔ عجب معوج الذہن آدمی ہے 12"

قاطع برہان میں اعتراض کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے:

"یارب، پیشِ کہ نالم داد از کہ جویم" نیز لفظِ صدا کے تحت بھی اعتراض کو دہرایا ہے۔ چونکہ اس اعتراض کا سہرا محشی مطبع کے سر تھا، چاہیے تھا کہ میرزا صاحب قاطع میں اس کا ذکر کرتے مگر ایسا نہیں کیا۔ اصولِ تحقیق کے یہ بات خلاف ہے۔

88. برہان میں "سر خاریدن" کے متعدد معنی لکھے ہیں۔ اس پر فرماتے ہیں کہ "سر خاریدن کے نو معنی لکھے ہیں اور اکثر ضد یکدگر ہیں۔

قاطع میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ اس محاورے کا مطلب یہ ہے کہ "انسان دران حالت کہ فرو ماندہ باشد و ہیچ کار نتواند کرد، کارے پیش گیرد۔" اور مثال میں عرفی کا یہ شعر لکھا ہے:

مرا زمانۂ طناز دست بستہ و تیغ
زند بفرقم و گوید کہ ہان سری میخار

موید برہان میں دوسری فرہنگوں کے حوالے سے ان سب معنوں کی توثیق وتائید کی ہے۔

89. برہان کے لفظ "سرخ شبانِ یا ہودار" پر لکھا ہے:

"سرخ شبانِ یا ہودار، یہ لغت الہامی ہے 12"

قاطع برہان میں اس اعتراض کو بڑی تفصیل اور دلچسپ انداز سے لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ''برنگرندگان ایں مقام فرض است کہ اگر توجیہے در خاطر گزرد نامہ نگار سیاہ نامہ را آگہی بخشند۔ واگر من نمانده باشم، برحاشیۂ ایں ورق نویسند، تا ہر کہ بیند، گفتارِ دکنی را مسلم گزیند۔ دہر کہ ایں رسالہ رانقل بردارد، آن عبارت راہمچناں برحاشیہ نگارد۔''

موید برہان میں فرہنگِ رشیدی (تحتِ لفظ یا ہو) کے حوالے سے بتایا ہے کہ جاماسپ نامے میں حضرتِ موسیٰ کو ''سرخ شباں باہودار'' کہا گیا ہے اور باہو (بباے موحدہ) کے معنی عصا ہیں جیسا کہ خود برہان نے لکھا ہے کہ ''چوبدست بزرگ کہ شبانان وشتربانان دردست گیرند۔'' مگر اس پر بھی میرزا صاحب نے اسے معاف نہیں کیا اور اپنی کسی بعد کی تحریر میں بھی تسلیم نہیں کیا کہ باہو کو یاہو کاتبِ برہان نے لکھ دیا ہے۔

اس جگہ ڈاکٹر معین بھی صحیح رائے قائم نہ کر سکے۔ انھوں نے بجائے باہو پڑھنے کے یاہو کی توجیہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ ''یہوہ'' (بمعنی خود در عبرانی) یا ''یہودا'' کی تصحیف ہے۔

90. ''سفید بروزن ومعنی سپید است'' کیا خوب لغت اور کیا خوب بیان!''

قاطع برہان میں اس موقع پر زیادہ جذباتی ہو کر لکھا ہے: ''دیوانہ تیز ا۔نہا نکند، مگر مسخرہ تا اہلِ بزم بخندند، وسیلی وگردنی بزنند ودشنام دہند۔''

91. برہان نے لفظِ سکار کو بکسرِ اوّل وبفتحِ اوّل وبضمِ اول تینوں طرح لکھا تھا۔ اس پر میرزا صاحب فرماتے ہیں:

''تینوں اعراب صحیح، واہ!12''

مگر قاطع میں اس اعتراض سے رجوع کر لیا ہے۔

92. لفظِ ''شبرواں'' پر میرزا صاحب لکھتے ہیں:

''شبرواں، لغت شبرو ہے، شبرواں جمع۔ جمع کو لغتِ مستقل قرار دینا یہ کیا طریقہ ہے پھر معنی اس کے شب بیداراں وسالکان۔ یہ بھی شاید صحیح نہ ہو۔ اس سے گزر کر یہ کیا عبارت ہے۔ ''کنایہ از دزد وعسس وعیار ہم ہست۔'' صیغہ جمع کا اور کنایہ شخص واحد سے۔ اچھا یہ بھی سہی۔ عسس کو بھی شبرواں کہیں اور چور کو بھی؟

برہان کے معتقدین کہیں گے کہ کیا چاہیے۔ یہ لفظ اضداد میں سے ہوگا۔ ہم کہتے ہیں، اگر یوں ہے، تو یہ کیوں نہ لکھا کہ یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔ لاحول ولاقوت الا باللہ۔

شبگرد، عسس کو کہتے ہیں اور شبرو چور کو کہتے ہیں۔ جمع اس کی شبروان 12''

قاطع برہان میں اس اعتراض کو ''واویلا، وامصیبتا'' سے شروع کیا ہے مگر موید میں شرفنامہ، موید الفضلا، مدارالافاضل، جہانگیری، رشیدی، سراج اللغہ اور اصطلاح الشعرا سے نقل کیا ہے کہ برہان کے لکھے ہوئے سب معنی صحیح ہیں۔ البتہ یہ تسلیم کیا ہے کہ ''دزد وعیار'' کی جگہ ''دزدان وعیاران'' ہونا چاہیے تھا۔ غالباً کاتب نے ازراہ سہو جمع کی بجائے مفرد لکھ دیا ہے۔

موید میں یہ بھی لکھا ہے کہ ''عسس'' عربی لفظ عاس کی جمع ہے۔ ایرانی اسے مفرد استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے گویا اس کا شبرواں کے معنی میں لکھنا قابل اعتراض نہیں۔ لیکن میری دانست میں یہ توجیہ بودی ہے۔

لاحول میں لفظ ''باللہ'' کو یہاں بھی غلط لکھا ہے۔

93. ''صغینہ'' کو برہان میں لکھا ہے کہ ''بعربی عرعر گویند'' اس پر میرزا صاحب فرماتے ہیں:

''سبحان اللہ! صفینہ مگر فارسی ہے کہ عربی میں اس کو عرعر کہتے ہیں۔ یہ ذال نقطہ دار تو نہیں ہے جو میں ہی اس کے فارسی نہ ہونے میں منفرد ہوں۔ یہ تو صاد ہے۔ دکھنی حکیم کا باوا شرف الدین علی یزدی کہہ گیا ہے کہ صاد فارسی میں نہیں ہے۔ غالب 12''

قاطع برہان میں اس موقع پر یزدی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ باقی بات وہی بیان کی ہے جو یہاں لکھی گئی۔

میرزا صاحب کا یہ لکھنا کہ ذال کے فارسی نہ ہونے میں میری رائے منفرد ہے، ظاہر کرتا ہے کہ اس سے پہلے یہ بحث ان کے اور دوسرے اہلِ علم کے درمیان ہو چکی ہے۔ یا کم از کم خود اس کی چھان بین کے بعد انھیں اس کا یقین ہو گیا ہے کہ اس مسئلے میں کوئی لغت نویس میرا ہم خیال نہیں ہے۔

94. ''صلا'' پر برہان میں لکھا ہے کہ ''بکسرِ اوّل در عربی بریان را گویند'' اس پر میرزا صاحب نے لکھا ہے: ''صلا بفتح بھی عربی ہے 12''

قاطع برہان میں یہ اعتراض بھی شامل نہیں۔

95. ''ضال میوۂ سرخ رنگ کا اسم لکھتا ہے، اور پھر لکھتا ہے کہ فارسی میں کنار اور عربی میں ثمرۃ السدر اور ہندی میں بیر کہتے ہیں یہ بھی تو لکھا ہوتا کہ ضال کس زبان میں کہتے ہیں 12''

قاطع میں اسے دیوان قاف کی زبان قرار دے کر مولف کو داد دیتے ہوئے لکھا ہے

''زہے ضالِ مُضِل۔''

96. برہان میں ضرب کے بارے میں لکھا ہے ''ضرب۔ سیخول را گویند... و در عربی بمعنی زون باشد۔''

اس پر میرزا صاحب کا ارشاد ہے ''اس سے یہ معلوم ہوا کہ فارسی میں سیخول کو ضرب کہتے ہیں، اور یہ جھوٹ ہے 12''

موید برہان میں لکھا ہے کہ یہ معنی صرف ہفت قلزم میں لکھتے ہیں اور کسی لغت میں نظر نہ آئے۔ چونکہ ہفت قلزم بہت بعد کی تصنیف ہے اس لیے مجھے یقین ہے کہ برہان ہی اس کا ماخذ ہوگا۔''

97. طارطقہ اور طارف پر میرزا صاحب نے لکھا ہے:

''طارطقہ اور طارف کو نہ لکھا کہ کس زبان کا لغت ہے۔ ظاہراً فارسی گمان کیا 12''

قاطع برہان میں اس اعتراض کو پھیلا کر لکھا ہے۔ موید برہان میں بھی اسے مانا ہے کہ ''عبارتِ جامع دریں مقام البتہ چیزے تسامح دارد۔'' مگر ساتھ ہی میرزا صاحب پر یہ اعتراض کیا ہے کہ انھوں نے جو طارف کو بجائے ''مال نو بدست آمدہ'' کے ''نو دولت'' لکھا ہے، یہ غلط ہے۔

98. ''طارق بمعنی در یعنی باب اس کو بھی مُجملۂ لغاتِ فارس جانتا ہے 12''

قاطع میں اس اعتراض کو طارطقہ کے تحت لکھا ہے۔ صاحبِ موید نے تسلیم کیا ہے کہ یہ معنی بھی سوائے ہفت قلزم کے کسی لغت میں نظر نہیں آئے۔

99. لفظِ طری پر میرزا صاحب نے لکھا ہے: ''طری کو خود لکھتا ہے کہ ''بمعنی تازہ و تر باشد'' اور پھر معربِ تری بتاتا ہے، اور تری کی توضیح کرتا ہے ''رطوبت و تازگی'' کہاں تازہ و تر کہاں تازگی و تری۔ تازہ و تر موصوف، تری و تازگی صفت۔ نہ صفت جانتا ہے نہ موصوف۔ نہ فارسی جانتا ہے نہ عربی۔

اے دکھن کے اُلو، تری لفظِ فارسی ہے۔ تر گیلے کو کہتے ہیں اور یائے مصدری بڑھا کر ''تری'' رطوبت کو کہتے ہیں۔ طری، طوی سے لغتِ عربی الاصل ہے۔ طراوت اور مطرا اور طری۔ طری میں یائے مصدری نہیں ہے، جزوِ کلمہ ہے، جیسے جری بمعنی صاحب جرأت 12''

قاطع برہان میں بجائے ''دکھن کے اُلو'' کے لکھا ہے: ''این بیچارہ تمیزِ تفرقۂ مصدر و مضارع و ماضی و امر و صفت و موصوف از ازل نیاوردہ است۔''

موید برہان میں غالب کے اعتراض کو درست مانا ہے۔ مگر غالب نے جو یہ لکھا ہے کہ طراوت و تازگی و تری صفت اور تازہ و تروطری موصوف، اس پر اعتراض کیا ہے کہ تازہ و تروطری یہ موصوف نہیں صفت ہیں۔ مثلاً میوۂ تازہ جب کہیں گے تو میوہ موصوف اور تازہ اس کی صفت ہوگی۔

100. طلق پر لکھا ہے: ''طلق، مگر طلق بمعنی ابرکھ کے فارسی ہے جو آپ لکھتے ہیں کہ بکسرِ اوّل، درعربی بمعنی حلال باشد کہ در مقابل حرام است 12''

قاطع میں اس اعتراض کو چھوڑ دیا ہے۔

101. طلل کو برہان نے لکھا تھا ''... و گویند عربیست'' اس پر میرزا صاحب فرماتے ہیں: ''شبہ ہے اس کے عربی ہونے میں۔ واہ بے محقق! 12''

قاطع میں یہ اعتراض بھی متروک ہے۔

102. برہان میں لفظ عسالنج آیا تھا۔ مصحح مطبع نے اپنے حاشیے میں بتایا کہ عسالیج کا بگاڑ ہے۔ اس پر میرزا صاحب مصحح کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں:

> ''اے حضرت، اس ایک لفظ پر کیا ہے یہ تو شاید تمام کتاب میں دو چار ہزار جگہ ایسی غلطی ہوگی۔''

قاطع برہان میں یہ اعتراض بھی شامل نہیں۔

103. فرامشت پر برہان میں لکھا ہے ''آنچہ کسے دو دست بگیرد ہم فرامشت خوانند۔'' اس پر غالب نے لکھا ہے:

''اللہ اللہ! جو ہر لفظ کی شناسائی سے اس کو بہرہ مطلق نہیں۔ فرامشت، مزید علیہ فرامش کا ہے اور بس۔

اور یہ جو ہاتھ کی چیز کو کہتے ہیں، لفظ مرکب ہے۔ فرا الگ اور مشت الگ، جیسے بردست اور دردست۔ اب یہ شخص بردست اور دروست کو دو لغت جداگانہ لکھے گا 12''

قاطع میں مولف کے بارے میں لکھا ہے: ''چو شناسائی حقیقتِ جوہرِ لفظ ندارد، فرہنگ چرا می نگارد؟ بوریا می بافت۔ رسن می تافت۔ ہیزم می فروخت۔ گلخن می افروخت۔''

زیرِ نظر مسودے میں یہ باتیں لفظ ''مران'' کے تحت نظر سے گزریں گی۔

فرامشت کے معنی بتاتے ہوئے میرزا صاحب نے لکھا تھا ''فرامرادف برمعنی علی'' ہے۔

صاحب موید نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ یہاں فرا بمعنی بر نہیں، بلکہ بمعنی در ہے۔

104. فرجد کو برہان میں لکھا ہے... پدر جدرا گویند کہ پدرِ سوم است، خواہ پدری باشد خواہ مادری۔''

اس لفظ پر پہلے فارسی میں اور پھر اُردو میں لکھتے ہیں:

''لاحول ولاقوۃ الا باللہ 5..... شارحانِ قران السعدین نے یہ مصرع امیر خسرو کا دیکھ کر فرجد پر دادا کو کہا ہے۔ اہل عقل ہنستے ہیں اور کیوں نہ ہنسیں؟ قیاس کے زور سے لغت تراشی کرتے ہیں اور پھر وہ قیاس بھی کیسا غلط کہ حضرت امیر خسرو اس کی تکذیب کرتے ہیں یعنی ان کے ممدوح نے اپنے دادا سے سلطنت پائی تھی نہ پر دادا سے ''فرجد'' یعنی شوکت دادا کی۔ وہ کیا کہ سلطنت۔ ''از فرجُد خود یافتہ۔'' اپنی کرامت و قدرت ولیاقت سے پائی۔ دستور یہ تھا کہ دادا سے باپ کو ملتی اور باپ سے اس کو۔ مگر چونکہ یہ سعیدِ ازلی اور صاحبِ کرامت و اعجاز تھا، بے واسطۂ اب، یعنی باپ، دادا کی سلطنت اس کے ہاتھ آ گئی 12 غالب۔''

پہلے یہ عرض کردوں کہ امیر خسرو کا مصرع غالب نے ازراہ سہو شروع میں نہیں لکھا۔ اگلی عبارت سے اس کے سب لفظ معلوم ہو جاتے ہیں یعنی ''فرجد از فرجدِ خود یافتہ۔''

پھر یہ بتاؤں کہ مویدِ برہان میں موید الفضلا، کشف اللغات مدار الافاضل اور مجمع الفرس کے حوالے سے لکھا ہے کہ فرجد بروزن سرمد جدِ اعلیٰ کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ سنائی نے فرمایا ہے:[1]

داشتہ فرجدش دہی روزی
در سرِ این فضول دہقانی

جہانگیری، رشیدی اور سراج بھی یہی لکھتے ہیں۔ اس لیے اعتراض قابلِ قبول نہیں۔

نیز ''فرجود'' بمعنی معجزہ و کرامات دساتیر کا خاص لفظ ہے۔ امیر خسرو کے یہاں اس کا استعمال ممکن نہیں۔ اسی طرح فرجُد کا مخففِ فرجود ہونا بھی بغیر کسی سند کے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا امیر خسرو کے لفظ فرجد کو مرکب مانا جائے گا۔ ''فر بمعنی نیک اور جد بمعنی بخت سے۔

اور آخر میں یہ بھی لکھ دوں کہ لاحول کے لکھنے میں غالب نے یہاں بھی غلطی کی ہے۔

105. ''فسوس'' کے لفظ پر میرزا صاحب نے لکھا ہے:

''فسوس کے لفظ میں چاروں شانے چت گرے ہیں حکیم جی۔ عربی اور فارسی کو ملا کر معنی لکھے ہیں اور یہ بڑا پالغز ہے۔ باوجود اس خرابی کے لابہ ولاغ اور چیز ہے، اور فسوس اور چیز ہے۔

---

1. کلیاتِ سنائی مرتبہ مظاہر مصفا 1336 شمسی کے صفحہ 342 میں ''فرجدش'' کی جگہ ''مرجدش'' ہے۔

اصل یہ ہے کہ عربی میں افسوس بمعنی حیف و دریغ ہے۔ تاسف و متاسف یہ سب وہی بحث ہے۔ فارسی میں فسوس بہ فائے مضموم و واو معروف نہ بہ واو مجہول، استہزا و ظرافت کو کہتے ہیں نہ لا بہ ولاغ کو۔ لا بہ ولاغ اختلاط و انبساط کا نام ہے اور فسوس ظریفانہ چھیڑ چھاڑ کو کہتے ہیں 12 ''

قاطع برہان میں برہان کو ''غولِ دادی گفتار'' اور ''بیخود'' خطابوں سے نوازا ہے اور فرمایا ہے کہ ''من ایں رانمی گزارم و پردہ از روئے کاوش برمی دارم'' لیکن خدا کی قدرت کہ اس لفظ کی تحقیق میں خود غالب چاروں شانے چت گر پڑے اور خود ان کی عربی دانی کی پردہ دری ہوگئی۔ یعنی انھوں نے افسوس کو عربی لفظ بتایا۔ حالانکہ یہ فارسی ہے اور پھر تاسف و متاسف کو اس سے مشتق مانا حالانکہ ان دونوں کا مادہ اسف ہے۔

موید برہان میں اس پالغزکی نشاندہی کی گئی تو بجائے اس کے کہ عربی نہ جاننے کا کھلا اعتراف کرتے، درفش کاویانی میں لکھا ہے کہ ''افسوس را اگر من لغتِ عربی گفتم، غلط گفتم و آں سہو طبعی بود۔''

موید میں شرف نامہ ''موید الفضلا، مدار الافاضل، مجمع الفرس اور رشیدی وغیرہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ افسوس کا مخفف ہے فسوس اور ان دونوں کے معنی ایک ہیں اور مثال میں اساتذۂ فارسی کے شعر پیش کیے ہیں۔

106. اس کے بعد مصدر فسوسیدن پر لکھا ہے:

''یہ خرافات ہے۔ ہاں بطریق تفریس طلبیدن و فہمیدن کی طرح اگر افسوس کو کہ وہ لغتِ عربی ہے افسوسیدن کہیں تو شاید جائز ہو 12''

قاطع برہان میں اسے لفظ فسوس ہی کے تحت ذکر کیا ہے لیکن موید میں اس اعتراض کو بھی غلط بتایا ہے اور رشیدی وغیرہ سے فردوسی کا یہ شعر سند میں نقل کیا ہے:

رُخش بر مہ و خور فسوسد ہمی
بُرَن خاکِ پالیش ببوسد ہمی

فرہنگ انجمن آرائے ناصری میں بھی فردوسی کا یہ شعر فسوسیدن کی سند میں نقل کیا ہے۔

107. برہان میں لکھا تھا ''کالب بروزن و معنی قالب است۔'' اس پر فرماتے ہیں:

''یہ نیا ڈھکوسلا ہے۔ قالب لفظ عربی ہے۔ کالبد انھیں معنوں میں لفظِ فارسی ہے۔ کالب آج تک کوئی لفظ نہیں سنا قیاس چاہتا ہے کہ کالبد کا مخفف ہو۔ یہ بھی مسموع نہیں۔ مگر ہاں یہ بات کہ اراذل اور گنوار قاف کو کاف بولتے ہیں۔ قسم کو کسم اور قرآن کو کران۔ اس شخص نے جو

دکن کے عوام الناس کو کالب کالب بولتے سنا، کہا کہ آؤ اس کو بھی ایک لفظ ٹھہرا دو۔ 12 ''

قاطع برہان میں بھی یہی بات کہی گئی ہے اور اس کا آغاز اس جملے سے کیا ہے۔ ''اگر حیرت روی ندادی، از خندہ بیخود شدی۔'' مگر موید برہان نے جہانگیری اور سراج اللغتہ سے نقل کیا ہے کہ کالب کالبد کا مخفف ہے۔ قالب اس کا معرب ہے شیخ نظامی فرماتے ہیں:

این من و این من کہ درین کالب است

ہیچ مگو، جنبشِ این قالب است

اندریں حال یہ گنواروں اور رذیلوں کی بولی نہ ہوئی۔ شرفا اور علما کی گفتگو ہوگئی اور برہان کے حامیوں کو اس کا حق پہنچا کہ وہ بھی اس اعتراض پر ہنستے ہنستے لوٹ ہو جائیں۔

108. برہان کے لفظ کانون پر لکھا ہے:

''سبحان اللہ! یہاں بھی وہی کالب وقالب کا قصہ لایا۔ کانون، بھٹی کو مقرر کہتے ہیں مگر طرز وروش وقاعدہ کو کانون کوئی نہ کہے گا۔ ہاں، قانون عربی میں قاعدہ کو کہتے ہیں۔ گنوار لوگ اور اراذل سے جو اس نے کانون کانون سنا، یہ معنی بھی لکھ دیے 12 ''

قاطع برہان میں بہت زیادہ جذباتی ہو کر لکھا ہے ''سبحان اللہ! کانون وقانون را یکے می داند، وآنچہ در کالب وقالب خوردہ بود، مکرر می خورد۔'' نیز مدرسۂ دہلی کے ایک ممتحن کا قصہ لکھا ہے، جو کلکتے سے آئے تھے اور بڑے فاضل شمار کیے جاتے تھے کہ انھوں نے صدا کو فارسی لفظ بتایا تھا۔ جب انھیں عربی لغات دکھائے گئے اور شعرائے عرب کے شعر سنائے گئے تو مطمئن ہوئے۔ غالب کی رائے میں یہ بزرگ بھی اس دکنی کے گمراہ کیے ہوئے تھے اور اس لیے ان کی گمراہی کا وبال بھی اسی کی گردن پر ہے۔

مویدِ برہان میں سراج اللغہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''بعض گفتہ اند کہ دراصل کانون است وعربی الاصل نیست۔''

میں عرض کرتا ہوں کہ یہ لفظ دراصل لاطینی زبان کا ہے، اور اس کا املا (Canon) ہے۔ عربی میں کاف نے قاف کی شکل اختیار کر لی ہے، اور ضمہ واو معروف ہو گیا ہے لیکن فارسی اور اردو میں قانون مستعمل ہے۔ اس معنی میں کانون کوئی نہیں بولتا۔

109. ''گل شدن فردوسی کے وقت سے آج تک کسی کے کلام میں بمعنی ظاہر شدن نہیں آیا۔ ہاں گل کردن بمعنی ظاہر شدن ہے اگر گل شدن بمعنی ظاہر شدن ہوتا تو گل کردن اس کا متعدی ٹھہرتا یعنی ظاہر کرنا اور یہ نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ حکیم دکنی نے یہ معنی اپنے قیاس سے ٹھہرائے ہیں 12 ''

قاطع برہان میں اس غلطی کا منشا ''نا آشنائی از علم فارسی'' کو قرار دیا ہے۔ لیکن موید برہان میں لکھا ہے کہ موید الفضلا اور مدار الافاضل میں ''گل شدہ سرو'' بمعنی کمالِ عظمت یافتہ لکھا ہے اور جہانگیری میں گل شدن اور کردن دونوں کو ظاہر شدن کا کنایہ بتایا ہے۔

110. لفظِ ''مران'' پر حسب ذیل حاشیہ لکھا ہے:

''ارے دکھنی گنوار، تیرا برا ہو۔ تو کیا بکتا ہے۔ ''مر'' اور ''آن'' یہ دو لفظ ہیں اور پھر ایسے کہ گلستاں پڑھنے والا لڑکا بھی ان کو جانے گا۔ اس کا ایک لغت کیوں بناتا ہے۔

''خیر، اس سے قطعِ نظر، یہ جو تو لکھتا ہے کہ ''منع از راندن ہم ہست۔'' تجھے لقائے بے بقا اور زمرد شاہ باختری کی قسم! مران بمعنی نہی میں الف ممدودہ کہاں؟ ''مرآن'' اس کے معنی تو ''خاص وہ'' کیا وہ لفظ بھی جس کے معنی ہیں ''نہ ہانک'' اس صورت سے ہے۔ وہ میم ناہیہ ہے اور ران صیغۂ امر ہے۔ اس میں الفِ ممدودہ کہاں؟

کیا بھاڑ جھونکنی، گھانس کھودنی، فصد کھولنی، حجامت بنانی، سینگیاں کھینچنی، جونکیں لگانی، کوئی اور کام دنیا میں نہ تھا جو تو فرہنگ لکھنے کو بیٹھ گیا۔ 12''

قاطع برہان میں صرف لقائے بے بقا اور زمرد شاہ کی قسم دہرائی ہے۔ آخری پیرے کی عبارت کا فارسی ترجمہ لفظ فرامشت کے تحت لکھ چکے ہیں۔

جہاں تک اعتراض کا تعلق ہے موید نے اسے بھی غلط بتایا ہے کہ مران اسمِ اشارہ میں الفِ ممدودہ ہونا ضروری ہے کہ جب دراں براں وغیرہ کو بدونِ الفِ ممدودہ فصیح مانا جاتا ہے تو مران میں ایسا کیوں صحیح نہ ہوگا۔

111۔ لفظِ ''نیام'' پر لکھا ہے:

''نیام قلب ہے میان کا، جیسے کراں قلب ہے کنار کا۔ اور یہ ترکیب فارسی میں بہت ہے۔ خیر، بہر حال بمعنی غلافِ شمشیر و خنجر و کارد مسلم۔ لیکن وسط ہر شے را نیام نگویند۔ آری، میان گویند۔ چون میان باوجود بودنِ قلبِ نیام معنی وسط می دہد، بیچارہ ہمیں حکم را بر نیام نیز جاری کرد۔ واز ہمہ طرفہ تر آن کہ نیام را بمعنی تعویذ می آورد۔ چگویم کہ چی می خورد۔ آن بنام است بہ بائے فارسی مفتوح کہ مجازاً تعویذ را گویند۔ وخود در بحث بائے فارسی با نون نوشتہ است کہ بنام تعویذ را گویند۔ واینجا تصحیف خوانی می کند۔

ایں فرہنگ نویسی است یا تمسخر 12''

قاطع برہان میں وسطِ ہر چیز کے لیے لفظِ ''نیام'' تجویز کرنے والے کو زمرۂ بنی آدم سے

خارج قرار دیا ہے۔

باقی اُن کا اعتراض صحیح ہے۔ خان آرزو نے بھی سراج اللغہ میں لکھا ہے کہ "بمعنی وسط تیغ ہرگز نیامدہ بلکہ وسط ہر چیز میان است، نہ نیام، و بمعنی تعویذ بنام است ببائے فارسی چنانکہ گذشت۔"

112. برہان کے لفظ نیش پر لکھا ہے:

"یہ نئی طرح کی تصحیف خوانی ہے۔ نیش کو لکھتا ہے کہ بمعنی زہر بھی ہے۔ معاذ اللہ۔ وہ بیش ہے ایک قسم اقسامِ زہر میں سے، نہ نیش 12"

موید برہان سے معلوم ہوتا ہے کہ نیش بمعنی زہر فرہنگِ فخر قواس اور مدار الافاضل میں موجود ہے۔ لیکن خان آرزو نے اسے تسلیم نہیں کیا بلکہ نوش و نیش میں نیش کو بمعنی "نیش گزندہ و خلندۂ عقرب و مار" ہی قرار دیا ہے۔ البتہ فرہنگ انجمن آرای ناصری میں لکھا ہے کہ "در مقابلِ نوش بمعنی زہر استعمال می شود۔"

میرزا صاحب نے قاطع برہان کے آخر میں غلط نامہ بھی چھاپا تھا لیکن ان کی اس کوشش کے باوجود صفحہ 85 میں 6 غلطیاں نظر انداز ہوگئی تھیں اور کتاب کے متعدد نسخے قیمتاً یا تحفے میں دوسروں تک پہنچ گئے تھے۔ میرزا صاحب نے ان اغلاط پر مطلع ہو کر مطبع احمدی دہلی میں 5 اگست 1862 کو ایک تتمہ، غلط نامہ چھپوا کر ان نسخوں میں شامل کیا جو باقی تھے، اور جن حضرات کے پاس بے تتمے کے نسخے پہنچ گئے تھے اُن سے درخواست کی کہ اس تتمے کے مطابق اپنے یہاں اصلاح فرمائیں یا آخر میں یہ ورق چپکا لیں۔

چونکہ عام طور پر یہ تتمہ شامل کتاب نہیں ہے، نیز اس کے ساتھ میرزا صاحب کی ایک تحریر بھی چھپی ہے اس لیے میں یہاں اُسے نسخۂ لوہارو سے جوں کا توں نقل کرتا ہوں۔ اس نسخے کے متن میں بھی میرزا صاحب نے اپنے قلم سے یہ اصلاحیں کر دی ہیں۔

تتمہ غلط نامۂ قاطع برہان

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
85	7	از زرداشت	بمیراث یافتہ بود
85	8	چوں خسروی	دران عہد کہ خسروی
85	8	رسید فرمود	رسیدہ بود فرمودہ بود
85	9	پہن کردند	پہن می کردند

85	9	بریدند	بریده
85	11	از ترنج موخراست	از ترنج مقدم است

درویشِ دلریش اسداللہ المتخلص بغالب جن صاحبوں کے پاس قاطعِ برہان بطریق ارمغان پہنچی ہو، یا انھوں نے خود از راہِ قدردانی مول لی ہو، ان کی خدمتِ عالی میں عرض کرتا ہے کہ اس بقیہ غلط نامہ کو دیکھ کر صفحۂ 85 میں 6 جگہ موافق اس غلط نامے (کے) تکلیف فرما کر بنادیں اور اگر اتنی تکلیف گوارا نہ ہو، تو اس ورق کو غلط نامۂ مشاملہ کے آگے لگا دیں کہ البتہ اس صورت میں مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔ واللہ لایضیع اجرالمحسنین۔

مرقوم پنجم اگست 1862

درمطبع احمدی دلہای اموجان طبع نمود

آخر میں ایک بات اور عرض کردوں۔

مولانا حالی مرحوم نے قاطعِ برہان کے بارے میں یادگارِ غالب میں تحریر فرمایا ہے کہ:

''شدہ شدہ ایک کتاب بن گئی جس کا نام قاطعِ برہان رکھا گیا اور 1276ھ میں چھپ کر شائع ہوگئی۔ پھر مرزا نے 1277ھ میں باضافۂ دیگر مضامین وفوائد اس کو دوسری بار چھپوایا، اور اُس کا نام درفشِ کاویانی رکھا۔'' (یادگارِ غالب، طبع اوّل، ص 42)

یہ تو کسی طرح باور نہیں کیا جاسکتا کہ مولانا نے قاطعِ برہان اور درفشِ کاویانی ملاحظہ نہیں فرمائی تھیں، کیونکہ انھوں نے قاطع کی عبارتیں تک کتاب میں نقل کی ہیں۔

قاطعِ برہان کے نثری خاتمۃ الطبع میں اس کے اختتام کی تاریخ 20 رمضان 1278ھ بتائی ہے، جو ازروئے حساب 22 مارچ 1862 کے مطابق ہے۔ یہی دونوں سنہ اُن قطعاتِ تاریخ سے بھی متخرج ہوتے ہیں جو کتاب کے آخر میں چھپے ہیں۔ اس کی تائید تتمۂ غلط نامہ کے آخر میں دی ہوئی انگریزی تاریخ سے بھی ہوتی ہے۔

درفشِ کاویانی مطبع اکمل المطابع دہلی میں چھپی تھی۔ اس کے آخر میں بھی قطعاتِ تاریخ ہیں۔ ان سے جو سنین نکلتے ہیں وہ 1282ھ اور 1865ء ہیں۔

ان قطعی شہادتوں کے پیشِ نظر یہی تسلیم کرنا پڑے گا کہ مولانا نے سہواً ان دونوں کتابوں کے سالہائے تاریخ غلط بتائے ہیں ورنہ ان کی طباعت علی الترتیب 1278ھ اور 1282ھ میں ہوئی تھی۔

○

غالبؔ اور قاطع برہان — چند غیر مطبوعہ تحریریں

مرزا غالبؔ نے فارسی کی مشہور لغت برہان قاطع پر جو تنقید کی تھی، وہ پہلے قاطع برہان کے نام سے اور پھر درفش کاویانی کے لقب سے ان کی زندگی میں چھپ چکی ہے۔

یہ تنقیدیں اصل میں انھوں نے برہان قاطع کے اُس نسخے کے حاشیوں پر لکھی تھیں جو اُن کے مطالعے میں رہتا تھا۔ یہ کم تر اردو میں اور زیادہ تر فارسی میں تھیں۔ جب انھوں نے ان کو کتابی شکل دی تو ازسرنو سب کو فارسی میں لکھا۔

برہانِ قاطع کا محولۂ بالا نسخہ لوہارو میں تھا۔ وہاں سے منتقل ہوکر رضا لائبریری رام پور میں آگیا ہے۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت سے لفظوں پر نشان لگا لیے تھے مگر سب پر نہ لکھ سکے اور جن الفاظ پر تنقیدی نوٹ لکھے تھے اُن میں سے بہت سے ترتیب کتاب کے وقت چھوڑ دیے۔

چوں کہ یہ عبارتیں اس لیے بہت اہم ہیں کہ بے ساختہ لکھی گئی ہیں اس لیے آج کی صحبت میں ان میں سے 52 کو غالب دوستوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ انھیں ''غالبیات'' میں معقول اضافہ شمار کیا جائے گا۔

میرے پیشِ نظر اسدی طوسی کے لغت فرس کے ساتھ برہانِ قاطع کا وہ نسخہ بھی رہا ہے، جو تہران سے ڈاکٹر محمد معین کے حاشیوں کے ساتھ شایع ہوا ہے۔ مناسب موقعوں پر میں ان دونوں کے حوالے دیتا گیا ہوں۔

1. برہان قاطع: باختر — مغرب را گویند، بہ معنی مشرق ہم آمدہ است۔

غالب: باختر — بہ معنی مغرب مسلم۔ این بزرگوار این لفظ را از اضداد شمردہ، و بہ معنی مشرق ہم

نیا دور، 26 جنوری 1965

آوردہ۔ خدا را اے خردمندان، این لفظ از اضداد چگونہ می تواند بود۔ فرقِ مغرب و مشرق نہ کم تفاوتیست، مثلاً در کتابی دیدیم کہ فلان شہر باختر سوی فلان شہراست حال آن کہ ما آن سرزمین وآن اقلیم راندیدہ ایم۔ اکنون چنان دانیم کہ آن شہر بہ جانب شرق است یا بہ جانب غرب۔ 12

قاطع برہان اور درفش کاویانی میں اس کو ذرا تفصیل سے لکھا ہے، اور درفش میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ ''جامع لطائف غیبی درین بارہ سخن ہای محققانہ آوردہ است، ہر کہ خواہد آن را بنگرد اما انصاف ورزد تعصب۔''

ڈاکٹر محمد معین نے لفظِ باختر کے حاشیے میں لکھا ہے کہ باختر، اوستا میں بہ معنی شمال (اُتر) آیا ہے، نیز شیاطین اور دیووں کے مسکن اور دوزخ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ پہلوی میں ان معانی پر ایک معنی یعنی سیارے کا اضافہ ہوگیا ہے۔ فارسی میں اکثر بہ معنی مغرب اور کم تر بالعکس بہ معنی مشرق و خاور بھی بولا گیا ہے۔ چنانچہ عنصری بلخی کا شعر ہے:

چو قہرآورد سوی خاور گریغ
ہم از باختر بر زند باز تیغ

میں عرض کرتا ہوں کہ لغت فرس میں اسدی طوسی نے خاور کو بہ معنی مغرب اور باختر کو بہ معنی مشرق ہی لکھا ہے اور اول الذکر کی سند میں رودکی کا یہ شعر لکھا ہے:

مہر دیدم بامدادان چون بتافت
از خراساں سوی خاور می شتافت

فرہنگ جہاں گیری میں ایک اور شعر بھی سند میں پیش کیا ہے، اور وہ ہے:

از خراسان بروند طاؤس فش
سوی خاور می شتابد شاد و کش

ساتھ میں یہ بھی لکھا ہے کہ یہ شعر رودکی نے کتاب دوران آفتاب میں لکھے ہیں۔

باختر بہ معنی مشرق کے سلسلے میں اسدی نے عنصری کا یہ شعر درج کیا ہے:

چو روزی کہ باشد بہ خاور گریغ
ہم از باختر برزند باز تیغ

ان اسناد کے پیشِ نظر میرزا صاحب کا دعویٰ قابلِ پیش رفت نہیں رہتا۔

2. برہان قاطع: بادپران بہ تشدید رای قرشت بہ معنی بادپراست۔ وآن شخصی باشد کہ پیوستہ از خود گوید۔

غالب: باد پران بہ تشدید رای قرشت می نویسد، و معنی آن خودستائی و خودنمائی می داند۔ باید دانست کہ تشدید نہ ضروری است، نہ ممنوع۔ اما معنی این لغت خوشامد گوست یعنی ستانیدۂ غیر، نہ خودستائی یعنی ستایندۂ خویش۔

3. برہان قاطع: بالان—بالانہ—دہلیز خانہ باشد

غالب: بالان و بالانہ در ضمیر باید دانست

قاطع اور درفش میں ان دونوں لفظوں کو چھوڑ دیا ہے۔

4. برہان قاطع: بپریشد—بہ معنی پریشاں کند و پراگندہ سازد۔

غالب: بپریشد را لغت قرارداد، واہ! پریشد مضارع مصنوعی است۔ بای موحدہ زاید است، اصلی نیست، محض بہر آن کہ بای عربی مع الیای فارسی لغتے چند یابد، این رنگ بردی کار آوردہ است، ہم چنین پسودن بہ معنی لمس آمدہ است۔ این مرد دکنی آن را بہ اضافۂ موحدہ، نوشتہ۔ اکنون باید کہ رفتن را برفتن و آمدن را بیامدن نویسند۔ 12

اس اعتراض کو خوب بڑھا چڑھا کر لکھا ہے، اور اس میں بپای بپسہ دیدن، بپسودان اور بیکن ان چار لفظوں کو بھی شامل کر لیا ہے اور بپسودان کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ کہ یہ جنات کی بولی ہوگی، کسی آدم زاد کی زبان پر تو یہ لفظ کبھی آیا نہیں ہے۔ ڈاکٹر محمد معین نے لکھا ہے کہ یہ لفظ بہ معنی مصدری یعنی لمس صحیح ہے۔

5. برہان قاطع: بخس۔ پژمردہ الخ

غالب: بخس، صیغۂ امر۔ بخسان الف نون حالیہ۔ بخساند صیغۂ مضارع از بحث متعدی۔ بخسانیدن مصدر متعدی۔ بخسید ماضی لازمی۔ بخسیدن مصدر لازمی۔ بخسیدہ صیغہ مفعول از بحث لازمی۔ از یک لغت ہفت لغت برآوردن و آن ہم بدین گونہ کوری کہ در لازمی متعدی تفرقہ نکردن و بخسانیدن و بخسیدن را یکی دانستن، لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

اس لفظ پر بھی قاطع اور درفش میں دکنی کا خوب مذاق اڑایا اور لکھا ہے کہ "کاش، آن جنی کہ بوی این لغت می آموخت، بمن آشنا شود تا ازو پرسم کہ این لغات آفریدہ سپید دیو است یا بہم آوردۂ ارژنگ دیو۔

6. برہان قاطع: بخش—بہ معنی برج ہم است، خواہ برج کبوتر و خواہ برج قلعہ و خواہ برج فلک۔

غالب: بخش بہ معنی برج ہرگز نیست، بے چارہ در کتب دیدہ است کہ آسمان را بہ دوازدہ بخش کردہ

اند، گمان کردہ است کہ اسم برج است حال آن کہ عبارت مذکور افادۂ معنی حصہ و بہرہ می کند و بس۔

اس کے بعد لفظ برخ پر نظہ بنا کر حاشیے میں لکھا ہے: ''یہاں چور پکڑا گیا۔ وہ جو بخش کے معنی برج لکھ آیا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ اُس دل اندھے نے کہیں دیکھا ہے کہ بخش جو صیغۂ امر ہے بخشیدن میں سے، وہ بہ معنی حصہ و بہرہ و برخ بھی آتا ہے۔ اُس نے برخ کو برج سمجھ لیا۔''12

قاطع اور درفش میں انھیں دونوں عبارتوں کو دوبارہ لکھ دیا ہے اور اس اعتراض میں وہ حق پر ہیں۔

7. برہان قاطع: بزان بروزن خزان

غالب: بزان بروزن خزان، درلغت اول موحدہ مفتوح و درلغت ثانی خای معجمہ مفتوح است، واین راہم وزن نوشت۔

قاطع اور درفش میں یہ اعتراض بھی شامل نہیں کیا ہے۔

8. برہان قاطع: بزدائیدن بہ کسر اوّل بہ معنی پاک کردن دنگ ازروی آئینہ و تیغ و امثال آن۔ بزدودن بروزنِ بربودن بمعنی بزدائیدن است الخ۔

غالب: بزدائیدن و بزدودن بہ اضافۂ بای زائد مگر فارسی دکن است مصدر اصلی زدودن و مصدر مضارعی زدائیدن۔

قاطع اور درفش میں تقریباً انھیں الفاظ میں اپنا اعتراض درج کیا ہے اور درست حرف گیری کی ہے۔

9. برہان قاطع: بزرا بروزنِ صفرا بہ لغت ژند و پاژند تخم زراعت را گویند مطلقا۔

غالب: بزرا تخمِ زراعت را گویند، واللہ غلط، باللہ غلط۔ اصل این است کہ تخم را در عربی بذر بہ ذال گویند، و در پارسی برزد این اتفاقی است، ہرگز در فارسی تقدیم زای معجمہ بہ زای مہملہ نیآمدہ است۔

وازین جا است کہ بعض نویسندگانِ مزارع را بذر گر نویسند۔ چون ترکیب لفظ عربی یا لفظ فارسی ذرا اکثر جا مستعمل است، بدین قدر مضائقہ نتوان کرد۔ لیکن برزرا بزر نتوان نوشت۔

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو بھی خوب تفصیل سے لکھا ہے، اور یہی فیصلہ کیا ہے کہ دکنی نے برز کو بزر پڑھ لیا اور یہ غلط ہے۔ لیکن ڈاکٹر محمد معین نے لکھا ہے کہ بزاروش زبان میں bazraz کے معنی تخم ہیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ چونکہ اسی زبان کو دکنی لغت زند و پازند کہتا ہے۔ اس لیے اس کا بیان درست ہے اور اعتراض غلط۔

10. برہان قاطع: برزکار با کاف بروزن شرم سار برزیگر و زراعت کنندہ را گویند۔

غالب: بزرکار و برزگرشش لغت نوشتہ است۔ والحال بہ تقدیم زای ہوز بررای قرشت لغتِ ہفتمین آورد۔ واین غلط محض است۔

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو خوب تفصیل سے لکھا ہے، اور کہا ہے کہ دکنی نے برز ہی کو بزر پڑھ لیا ہے لیکن ڈاکٹر محمد معین نے لکھا ہے کہ ازروی شرح قاموس ''بزر'' عربی میں ''دانہ ایست کہ انداختہ شود در زمین بہر روئیدن۔'' اس بنا پر گفتۂ دکنی کو درست ہونا چاہیے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اگر یہ لفظ بزر (عربی) اور کار (فارسی) سے مرکب ہو تو پھر اِسے بجائے شرم سار کے کردگار کے وزن پر کہنا چاہیے کیوں کہ بزر عربی بہ معنی دانہ بہ کسر اوّل ہے۔ ملاحظہ ہو اقرب الموارد۔[1]

11. برہان قاطع: بوشاسپ۔ بہ وزن لہراسپ بہ معنی خواب دیدن باشد۔

غالب: بوشاسپ بہ معنی رویا، یا دیا یدداشت، و در کاف فارسی مع الواو بایدید۔

بعد ازاں لفظ گوشاسپ پر لکھا ہے: گوشاسپ بہ معنی رویا۔ بینندہ دربای موحدہ مع الواؤ بیند کہ بوشاسپ بہ معنی رؤیا آوردہ۔ اکنوں کدام لغت را صحیح دانیم۔

قاطع اور درفش میں اس لفظ کے ساتھ ''بوشپاس'' کو بھی شامل کرلیا ہے اور کہا ہے کہ بوشاسپ اور بوشپاس تو قلب یک دیگر ہیں لیکن گوشاسپ و گوشاسپ ہذیان، و بہ معنی کابوس غلط، و بہ معنی احتلام وسوسہ شیطان لیکن ڈاکٹر محمد معین نے لکھا ہے کہ لغت فرس اسدی اور فرہنگ جہانگیری میں لکھا ہے کہ گوشاسپ اور بوشاسپ کے معنی خواب آتے ہیں۔ بوشکور بلخی کہتا ہے:

شنیدم کہ خسرو بہ گوشاسپ دید
چنان کاتشی شد بدورش پدید

نیز زرتشت بہرام کہتا ہے:

نہ در بیدار گفتم نی ببوشاسپ
نگویم جز بہ پیش تخت گشتاسپ

12. برہان قاطع: پاچایہ بفتح تحتانی ہلیدی ونجاست ہردوراہ راگویند کہ بول وغائط باشد۔

---

[1] بزر بہ معنی تخم بکسر اوّل وبفتح اول دونوں طرح سے ہے نیز بذر بہ معنی تخم بفتح اول، ذال سے ہے۔ ملاحظہ ہو قاموس—ایڈیٹر

غالب: پاچایہ بہ معنی مستراح است۔ چنان کہ اکنون بہ تصحیف زبان زد خاص و عام است، یعنی پاخانہ۔اسم بول و غائط نیست۔

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کا آغاز اس جملے سے کیا ہے: ''ہیچ کس نمی بیند کہ از دہانِ این مرد چہ فرومی ریزد۔'' اور یہی بات دہرائی ہے جو اس جگہ بیان کی ہے لیکن ڈاکٹر محمد معین بحوالۂ فرہنگ ایران باستان مولفہ ابراہیم پورداؤد (جلد 1، ص 74) وفرہنگ دساتیر (ص 237) لکھا ہے کہ یہ لفظ دساتیری ہے۔

13. برہان قاطع: پاو — بہ ہندی پای راگویند۔

غالب: پاوی گوید بہ ہندی پای راگویند۔ پای رادر ہندی پانوی گویند یا پاو، ہاں پاو ربع راگویند۔

قاطع اور درفش میں اس جگہ بھی اچھے الفاظ استعمال نہیں کیے ہیں۔ دکنی کے بارے میں فرماتے ہیں ''یارب! این چغد کدام ویرانہ وغول کدامین بیابان است۔'' تاہم اعتراض درست ہے کہ پای فارسی کے لیے ہندی لفظ پانو یا پانوں ہے۔ غالب اور خود میں بھی پہلے املا کو پسند کرتے ہیں۔

14. برہان قاطع: پریشد بروزنِ اندیشد یعنی پریشان کند الخ۔

غالب: پریشد، یاران ہمان مضارع جعلی را کہ بابی موحدہ آوردہ بود، این جابابای فارسی نوشت، واین قدر نمی داند کہ مصدر برمضارع مقدم است، و از ہر مضارع استخراج صیغۂ امر لابد۔تنہا پریشد بہ معنی پریشان کند، یعنی چہ

15. برہان قاطع: پذرفت، پذرفتگار، پذرفتن، پذرفتہ، پذیر، پذیرا، پذیرش، پذیرفت، پذیرفتگار، پذیرفتن، پذیرفتہ، پذیرہ۔

غالب: سبحان اللہ! زہی لغت دانی۔ از مشتقات یک مصدر دہ و دولغت تراشیدن، وآن ہم بعد قبول این مغالطہ کہ بجای زای ہوز ذال ثخذ آوردن۔ غالب

قاطع اور درفش میں یہ اعتراض شامل نہیں کیا ہے۔

16. برہان قاطع: پری افسای افسون گر باشد، یعنی صاحب تسخیر وشخصی کہ از برای تسخیر جن افسون خواند۔

غالب: پری خوان باخای نقطہ دار وواو معدولہ بروزن پریشان افسون گروشخصی کہ تسخیر جن کردہ باشد۔

غالب نے ان دونوں لفظوں پر ''نظہ'' لکھ کر حاشیے میں تحریر کیا ہے: ''پری افسای و پری

خوان بہ معنی واحد است، یعنی ملای کہ علاج آسیب کند۔

قاطع اور درفش میں بھی یہی بات لکھی ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ مؤلف نے پری گرفتہ اور پری دار کے معنی غلط بتائے ہیں۔

17. برہان قاطع: پشان بہ فتح اوّل بروزن و معنی چشان است۔ و معنی چشان را در یک فرہنگ لفظ گذر نوشتہ بودند با ذالِ نقطہ دار، و در دو فرہنگ دیگر گزر با زای نقطہ دار۔

غالب: گذر ما ذال نقطہ دار و گزر با زای نقطہ دار ہر دو یکی است۔ اختلاف املاست و بس۔ آری درصورتی کہ با زای ہوز نویسند، بہ تقدیم رای قرشت بر زای ہوز گرز می شود۔ جامع برہان ازین ہر سہ صورت گزشتہ در ''ہزار جشان'' بہ فتح جیم می نویسد کہ جشان بہ معنی گز باشد۔

قاطع اور درفش میں یہ اعتراض چھوڑ دیا ہے۔

18. برہان قاطع: پشنگ بروزن پلنگ نام پدر افراسیاب است۔

غالب: در بحث زای۔ منقوطہ یا الف زادشم نام پدر افراسیاب نوشتہ است۔ و این جا پشنگ نام پدر افراسیاب می نویسد۔ حقیقت این را در تحت لغت زادشم نوشتہ ایم۔ این جا خود این قدر نوشتن کافی است کہ واقعی پشنگ نام پدر افراسیاب است بہ بای فارسی مفتوح بروزن درنگ۔

بعد ازاں حسب وعدہ زادشم پر یہ حاشیہ لکھا ہے: نام پدر افراسیاب زادشم ہرگز نیست۔ نام جدّ وی زادشم ابن توراست۔ و نام پدر افراسیاب پشنگ۔

قاطع اور درفش میں ان دونوں لفظوں سے بھی بحث نہیں کی ہے۔

19. برہان قاطع: پندہ بہ کسر اوّل قطرہ را گویند الخ۔

غالب: پندہ بہ بای فارسی مکسور غلط است۔ بندہ بہ بای موحدہ مضموم قطرۂ آب را گویند۔ و بوند در ہندی از توافق لسانین است۔

قاطع اور درفش میں بھی یہی بات دہرائی ہے۔ ڈاکٹر محمد معین نے اس لفظ کے سلسلے میں فرہنگ وساتیر ص 239 کا حوالہ دیا ہے۔

20. برہان قاطع: پورہ، بہ زبان ہندی بہ معنی تمام باشد۔

غالب: آن بہ الف است، نہ بہ ہای ہوز۔

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو بھی شامل نہیں کیا ہے۔

21. برہان قاطع: پول بہ وزن غول معروف است۔ بہ عربی فلوس گویند، و بہ معنی پل رودخانہ ہم

آمدہ است الخ۔

غالب: پل ترجمہ جسری واو ہست واین لغت فارسی است واین کہ پول بہ معنی فلوس است، لفظ ترکی است۔ و چون در ترکی اعراب بالحروف وادمی نویسند۔ امانمی خوانند، چنانکہ در تیمور یای تحتانی علامت کسرہ و واو علامت ضمہ است۔ در نوشتن این چنین نویسند، لیکن تمر خوانند بہ تای مکسور و میم مضموم۔

قاطع اور درفش میں یہ اعتراض بھی شامل نہیں ہے۔

22. برہان قاطع: پولہ بابای مجہول۔ خربزۂ مضمحل شدہ را گویند و ہندوانہ ومیوہ ہای دیگر را نیز گفتہ اند کہ درون آنہا نرم و ضائع شدہ باشد۔

غالب: در ہندی نیز ہمین معنی دارد۔ وعجب از جامع برہان کہ اشعار بدین نکرد۔

قاطع اور درفش میں بھی بس یہی بات دہرادی ہے۔

23. برہان قاطع: پیرا با ثانی مجہول بروزن گیرا بہ معنی پیرایندہ باشد۔

غالب: پیرا با ثانی مجہول بروزن گیرا، سبحان اللہ اور لغت گیرا۔ یای مجہول کجاست، دیگر پیرا خود بہ کسرۂ بای فارسی چرا است کہ یای مجہول ومعروف محل داشتہ باشد۔ بای فارسی مفتوح است، دیگر این سادہ مرد گمان کردہ است کہ الف پیرا مانند الف گیرا الف فاعل است۔ واین نیز غلط است، پیرا مخفف پرای ہست۔ وآن صیغۂ امر است از پیراستن۔ چون اسمی در اول آن در آرند، مفید معنی فاعلیت گردد۔ دیگر پیرا، 1 پیراستن 2، پیرای 3، پیرایش 4، پیرایندہ 5، ہر لفظ را لغتی جداگانہ قرار دادہ۔ پیرایہ نیز اگر چہ از مشتقات این مصدر است۔ لیکن چون خود بہ صورتِ اسم جامد معروف است، آن را شمار نکردیم۔ غالب۔

قاطع اور درفش میں یہی بات مختصر الفاظ میں ادا کی ہے، نیز ''دیگر پیرا، پیراستن الخ'' کو خارج کردیا ہے۔

24. برہان قاطع پیش، بہ معنی مقدمہ ہم ہست۔

غالب: پیش ترجمہ مقدمہ نمی تواند شد۔ در دساتیر پیش رو بہ جای مقدمہ و رہبر بہ جای دلیل آوردہ است۔ غالب۔

قاطع اور درفش میں یہی بات بہ اختلاف دہرادی ہے۔

25. برہان قاطع، پیوگ: بہ معنی عروس باشد۔

غالب: بیو بہ بای موحدہ مفتوحہ عروس را گویند واین کہ بہ بای فارسی نوشتہ وگاف در آخر افزودہ، نمی توانم گفت کہ چہ خوردہ است۔ بیو عروس، و بیوگانی عروسی۔

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو پھیلا کر لکھا ہے، مگر زیر نظر عبارت کے الفاظ ''نمی توانم گفت کہ چہ خوردہ است، کو حذف کر دیا ہے۔ جہاں تک اس لفظ کے معنی اور آخری ''گ'' کا تعلق ہے تو اسدی طوسی نے اپنی فرہنگ میں رودکی کا یہ شعر سند میں پیش کیا ہے:

پس عزیزم پس گرامی، شادباش
اندرین خانہ بسان نو بیوگ

26. برہان قاطع: تدو، بہ فتح اول و ثانی بہ واو کشیدہ۔ نام مرغی است صحرائی۔ شبیہ بہ خروس در غایت خوش روی وخوش رفتاری۔

غالب: در بحث تای قرشت بادال نقطہ دار طرفہ تمسخر بہ کار بردہ است۔ تدرو را کہ بادال بی نقطہ است، در تای قرشت بادال بنوشت۔ ویک لغت از بہر بحث دال نقطہ دار نگہداشت، باز دروغگو را حافظہ نہ باشد۔ در بحث ذال نقطہ دار می نویسد کہ تذرج معرب تدرو است۔ باز تذرو را بادال نقطہ دار نوشت، واین غلط محض ومحض غلط است۔ باز تدو بہ فتح اوّل و ثانی مجہول الحرکت در بحث دال آوردہ است۔ ومکرر آن را در بحث ذال گنجاندہ ونگفتہ کہ معرب است۔ ہر چند آن حیلہ نیز پیش نمی رفت۔ گرفتیم کہ آمدن دال نقطہ دار در لغات فارسی ادا می دارد آخر در لغت یک حرف باید، خواہی دال مہملہ خواہی معجمہ۔ بہر دو صورت نوشتن یعنی چہ۔ اگر خود متردد بود، می نوشت کہ ہم بہ دال می نویسند وہم بہ ذال۔

از ہمہ بہ گزر، وتفرقہ دال وذال رایکسونہ۔ تدو یا تذو ہر چہ باشد، حرکت ثانی چرا ظاہر نکرد۔ الحال برای تحقیق بہ کتاب دیگر رجوع باید کرد۔ وچون چنین است این کتاب بچہ کار آید۔

27. برہان قاطع: تذو بہ فتح اوّل و ثانی — جانوریست الخ۔

غالب: تذو نیز اگر باشد۔ عربی باشد، فارسی خود نیست۔

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کے سلسلے میں میرزا صاحب کا لہجہ بہت زیادہ درشت ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ تدو کی حقیقت بتانے سے پہلے فرماتے ہیں کہ ''چنان کہ خدا پرستان را خدا از غلط نگاہ می دارد این اہرمن را اہرمن از گفتن کلمۂ حق صیانت می کند۔'' اور اس کے بعد بتایا ہے کہ تدو اور تذو ایک کیڑا ہوتا ہے جو حمام میں پیدا ہوا کرتا ہے اور یہ دونوں لغت عربی زبان کے ہیں۔ فارسی

نہیں ہیں اور تدرو اور اس کا معرب تذرو بٹیر کا ہم معنی ہے۔ رہا تدرج تو وہ نہ عربی ہے نہ فارسی۔

میں عرض کرتا ہوں کہ قاطع میں میرزا صاحب نے صاف بٹیر لکھا ہے۔ لیکن درفش میں کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاپی کی اصلاح کے وقت اُسے تیتر بنایا ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔ تدرو کبک کو کہتے ہیں اور وہ تیتر ہی کی قسم ہے۔

28. برہان قاطع: تر، بہ فتح اول وسکون ثانی — وکنایہ از حرام ملوث ومردار و فاسق ہم ہست۔

غالب: دیگر در بحث تای قرشت بارای قرشت درشرحِ لفظ تر می نگارد۔ بہ فتح اوّل وسکون ثانی۔ خدایا۔ در لفظ ثنائی یعنی دو حرفی توضیح سکون ثانی چہ معنی دارد۔

تر آمدن بہ معنی شرمندہ شدن است۔ و دیگر ہیچ وآن مستعار از پدیدار آمدن عرق است در وقت شرم۔

قاطع اور درفش میں اسے شامل نہیں کیا ہے۔

29. برہان قاطع: ترلیدن بایای حطی بہ وزن ومعنی تراویدن وتراوش کردن باشد۔

غالب: ترائیدن غلط است۔ ہمان تراویدن بہ واو وترابیدن بہ بای موحدہ، بس قاطع اور درفش میں یہ بھی لکھا ہے کہ غالباً مولف نے لفظ ترائی سے (جو ہندی لفظ ہے) اس لفظ کو بنا لیا ہے۔

30. برہان قاطع: ترشدن کنایہ از اعراض شدن وآزردہ گردیدن باشد۔ سبب ظرافت کردن کسی۔

غالب: ترشدن ہماں شرمگین شدنست۔

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو بھی شامل نہیں کیا ہے۔

31. برہان قاطع: ترک بہ کسر اول بروزن خرسک بہ معنی قساوت باشد وآن آنست کہ چون زحمتی بہ دیگری بہ رسد بروآسان گذرد، و در دل او رحمت وشفقت نہ باشد۔

غالب: از کلام اساتذہ سند می خواہد۔

یہ اعتراض بھی قاطع اور درفش میں نہیں ہے۔

32. برہان قاطع: تردوہ۔ باواو مجہول بروزن اندوہ، جفت راگویند۔ و بہ عربی زوج خوانند۔ و بروزن شگوفہ و نیز بایں معنی آمدہ است۔

33. برہان قاطع: تروہ، بہ ضم ثالث بروزن اندہ بہ معنی تردوہ است۔

غالب: ہر دو لغت بی سند مقبول ومسموع نیست۔

اس اعتراض کو بھی واپس لے لیا ہے۔

34. برہان قاطع: ترہات بہ ضم اوّل و فتح و تشدید ثانی بروزن امہات بہ معنی بے ہودہ و ہرزہ و خرافات و مہملات باشد۔ گویند عربی است۔

غالب: ترہات بہ تای مضموم غلط۔ و عربی بودن این لفظ نیز غلط۔ لغت فارسی است مرکب از ترہ و آت۔ ترہ بہ معنی بقول و آت افادۂ معنی مثلیت کند۔ یعنی سخنان بی سود و بی قدر۔ مانند ترہ۔

قاطع اور درفش میں ''ترہ'' کے معنی ''پودینہ و گندنا و امثال اینہا'' کے ہیں اور اسے فارسی لفظ ہی قرار دیا ہے۔ اقرب الموارد میں ترہات کو تُرَّہۃ کی جمع بتایا ہے اور بہ ضم اول و تشدید تا ہونے کی صراحت کی ہے اور فارسی سے معرب بتایا ہے۔ معنی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ ان چھوٹے چھوٹے راستوں کو کہتے ہیں جو کسی پگڈنڈی یا راستے سے پھوٹتے ہیں۔ بعد ازاں باطل چیزوں کو بھی ترہات کہنے لگے ہیں۔

35. برہان قاطع: تریوہ بہ فتح و رابع کہ داد باشد۔ و کسر ثانی و سکون تحتانی مجہول را پشتہ پشتہ ناہموار، پست و بلند را گویند۔

غالب: آن را گریوہ گویند، نہ تریوہ۔

یہ اعتراض بھی شامل قاطع و درفش نہیں ہے۔ نیز لغت فرس ص 483 سے معلوم ہوتا ہے کہ ''تریوہ راہی بود بر شبہ پشتہ۔

36. برہان قاطع: تژدک با دال ابجد بروزن نغزک، کرم گندم ضائع کن را گویند۔

غالب: در بحث رای۔ قرشتِ ہم نوشتہ است۔

درفش اور قاطع میں اسے بھی حذف کر دیا ہے۔

37. برہان قاطع: تژم، بروزن عزم میغ را گویند۔

غالب: تژم بہ معنی میغ غلط محض است نژم و نژم بہ نون است۔

قاطع اور درفش میں لکھا ہے کہ رژم ارنائیس دیو کی زبان ہو سکتی ہے۔

38. برہان قاطع، تسلیخ — سجادہ و جانماز را گویند۔

غالب: فارسی نیست۔ عربی اگر باشد گو باش۔

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو پیش نہیں کیا ہے۔ اسدی طوسی نے لغت فرس ص 77 میں اسے بہ معنی سجادہ لکھا ہے لیکن علامہ قزوینی مرحوم کا ایک بیان ڈاکٹر محمد معین نے نقل

کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ جو دو شکلوں میں مروج ہے، تسلیخ اور تشلیخ، یا تو کسی سامی زبان کا لفظ ہے اور یا تسبیج کا بگاڑ ہے فارسی بہر حال نہیں ہے۔

39. برہان قاطع: تکاب۔ تکاپوی۔ تکاؤ۔ تکاور۔

مرزا صاحب نے متن میں ان چاروں لفظوں کے مقابل 1، 4 کا ہندسہ لکھ کر حاشیے میں لکھا ہے: ''این ہر چہار لغت بہ کاف فارسی است، نہ بہ کاف عربی۔''

قاطع اور درفش میں اسی بات کو دہرایا ہے۔

40. برہان قاطع: تلک بہ فتح اول وثانی وسکون کاف الخ

غالب: ہر گاہ فتح اول وثانی گفت۔ سکون کاف چرا گفت 12

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو چھوڑ دیا ہے۔

41. برہان قاطع: تَنَہ۔ بہ فتح اول وثانی، بہ معنی قبول ورضا ہم است۔

غالب: تنہ، بہ معنی قبول ورضا غلط است۔

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو بھی چھوڑ دیا ہے۔

42. برہان قاطع: تورا بہ ضم اول وثانی مجہول، بروزن حورا، بہ ''لغت ژند و پاژند'' گاؤ را گویند۔

غالب: تورا بہ فتح است پس بہ ضم اول نوشتن و بہ وزن حورا آوردن لغو است۔

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو ایک صفحے سے زائد عبارت میں لکھا ہے اور اپنے حسب ونسب کو بھی بیان کیا ہے اور مولف نے آگے چل کر ''تورہ'' کو ہندی بہ معنی کم بتایا تھا۔ اس پر بھی لے دے کی ہے۔

43. برہان قاطع: توشک۔ در موید الفضلاء بہ معنی گریہ نوشتہ اند۔

غالب: بہ معنی گریہ پوشک است بہ بای فارسی مضموم نہ بہ تای قرشت۔

قاطع اور درفش میں یہ اعتراض بھی ترک کر دیا گیا ہے۔

44. برہان قاطع: تومن، با اوّل بہ ثانی مجہول رسیدہ ومیم مفتوح بہ نون زدہ الخ

غالب: آہ ازین بی چارہ کہ چہ قدر ہا کج می رود تومن را بہ واو مجہول می نویسد و این قدر نمی داند کہ رسم الخط ترکی اعراب بالحروف است۔ پس نوشتہ می شود بہ واو و خواندہ می شود تمن با تای مضموم بلکہ شایستہ آنست کہ تومان نویسند واو علامت ضمہ تا والف علامت فتح میم چنان کہ تیمور دراصل تمر است بہ تای مکسور ومیم مضموم۔ بعضَ برادران این حکیم دکنی تیمور را با رنجور و مذکور قافیہ کردہ

اند۔حاصل کلام تمن است درترکی بست را گویند۔

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو دہرایا ہے۔مگر اس میں سے ''تیمور'' کو حذف کر دیا ہے۔

45. برہان قاطع: تہم شخصی را گویند کہ در بزرگی جثہ وترکیب وقد وقامت وشجاعت ومردی و دلیری ودلاوری عدیل ونظیر نہ داشتہ باشد۔وتہمتن مرکب ازین است۔وسکون ثانی ہم بدین معنی آمدہ است۔

46. برہان قاطع: تہمتن، یکی از القاب رستم زال وبہمن است ومردم قوی جثہ وشجاع بی نظیر را نیز گویند۔چہ معنی ترکیبی این لغت بی ہمتا تن است یعنی تنی کہ عدیل ونظیر نداشتہ باشد و بہ معنی سپہدار ولشکرکش وخداوند سپاہ ہم ہست۔

غالب: تہم بہر دو فتحہ تنہا شخصی فربہ وتنومند را نہ گویند۔این خود از قیاسیات باطلۂ حکیم دکنی است۔ تہم در پارسی قدیم اسم فلک نہم است کہ آن را بلسان شرع عرش گویند۔تہمتن مرکب ازیں ست۔مثال پیلتن و روئین تن وسیم تن ازین صورت تہمتن مرد قوی ہیکل را گویند نہ تنہا تہم۔ وچون رستم از روی خلقت جسیم بود، تہمتن اسم توصیفی آن قرار یافت۔تہم گفتن و مرد توانا مراد داشتن حماقت است۔واین کہ ''حکیم دکنی بی ہمتا تن بہ معنی تہمتن نوشتہ است۔نمی گویند کہ چہ خوردہ است کجا بی ہمتا وکجا تہم۔اسپہدار ولشکرکش را نیز بہ گویند۔بسا سپہدان باشند کہ لاغر باشند۔

قاطع اور درفش میں ان دونوں لفظوں پر مذکورہ بالا اعتراض کے ساتھ یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ تہم بروزن دہم غلط ہے۔لیکن قاطع میں دکنی کو ریچھ قرار دیا تھا اور لکھا تھا کہ ''وای بر روزگار من کہ با کدام خرس در جدال شدہ ام۔'' درفش میں ''خرس'' کی جگہ ''کس'' بنا دیا ہے۔نیز اس عبارت میں جو لکھا ہے کہ ''نمی دانم کہ چہ خوردہ است'' قاطع اور درفش میں اس کو حذف کر دیا ہے۔

بہرحال مرزا صاحب کے اس پر یہ دو اعتراض کہ (1) تہم فربہ اور تنومند کو نہیں کہتے (2) اور تہم بروزن دہم غلط ہے، درست نہیں ہے۔تہم فارسی قدیم اور اوستا (Taxma) کی شکل میں بہ معنی قوی و تنومند ہی بولا جاتا ہے نیز یہ لفظ اصل میں بہ سکون ثانی ہی ہے اور اس سے مرکب ہیں، تہماسپ، تہمورث اور تہمتن۔فردوسی نے تہم اور تہمتن بہ حرکت ثانی ضرورتاً استعمال کر لیا ہے۔ملاحظہ ہو لغت فرس مولفۂ اسدی طوسی اور ڈاکٹر محمد معین کا حاشیہ بر لغت تہم و برہان قاطع ایرانی ایڈیشن۔

47. برہان قاطع: تہی، بہ کسر اوّل وثانی و بہ فتح اوّل وضم اول ہم گفتہ اند۔
غالب: نہ بہ فتح اوّل است، نہ بہ ضم اوّل تہی بروزن نہی بہ معنی خالی ست وبس 12
قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو چھوڑ دیا ہے۔
48. برہان قاطع: تیرکش بروزن پیش کش الخ۔
غالب: تیرکش بروزن پیش کش چگونہ می تواند بود۔ وتیر یای معروف است وپیش بایای مجہول۔ واین کہ اہل زبان ہر تحتانی رامعروف خوانند، امری دیگر است۔
قاطع اور درفش میں یہ اعتراض بھی شامل نہیں کیا گیا ہے۔
49. برہان قاطع: تیر ماہی، بروزن نیک خواہی۔ الخ۔
50. برہان قاطع: تیرہ بروزن خیرہ۔ الخ
غالب: تیر ماہی بروزن نیک خواہی نیز ازین عالم است ہان، تیرہ بروزن خیرہ صحیح است۔ این خوداز حماقت حکیم دکنی گواہ دیگر است۔ یعنی یای مجہول ویای معروف راہم نمی شناسد۔
قاطع اور درفش میں یہ اعتراض بھی موجود نہیں ہے۔
51. برہان قاطع: تیریز یا ثانی مجہول بروزن بی چیز شاخ جامہ راگویند الخ۔
غالبؔ: تیریز یا ثانی مجہول ہمیں قدر کافی بود۔ بروزن بی چیز کلام راازاعتبار ساقط کرد مگر چیز را بہ یای مجہول پنداشتہ است۔
قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو داخل نہیں کیا ہے۔
52. برہان قاطع: تیزی بہ کسر اوّل وثالث وسکون ثانی مجہول وتحتانی بہ معنی عربی است ومراد ازان عربی نژادان فارسی زبانان باشند عموماً، وایشان راتازیک وتاجیک نیز خوانند۔
غالب: تیزی املاۓ تازی است ورنہ لفظ تیزی بہ ذات خوداین ہمہ معنی ندارد۔ وآن کہ عربی دانان فارسی زبانان نوشتہ است، غلط کردہ است۔ تنہا عربی نژادراگویند فارسی دان باشد یا نباشد۔
پہلے تو یہ کہہ دوں کہ مرزا صاحب نے بجاۓ ''عربی نژادان'' کے ''عربی دانان'' سہواً لکھ دیا ہے اور پھر یہ عرض کردوں کہ قاطع اور درفش میں اس اعتراض کے اندر یہ اضافہ کیا ہے کہ ''عربی نژادان فارسی دانان'' غلط ہے۔ یہاں ''فارسی دان'' ہونا چاہیے تھا۔

غالب کی چند نئی فارسی تحریریں

میرزا غالب نے فارسی کے مشہور لغت 'برہان قاطع' پر جو تنقید کی تھی وہ پہلے 'قاطع برہان' کے نام سے اور پھر 'قاطع برہان' کے لقب سے ان کی زندگی میں چھپ چکی ہے۔

یہ تنقیدیں اصل میں انھوں نے 'برہان قاطع' کے اس نسخے کے حاشیوں پر لکھی تھیں جو ان کے مطالعے میں رہتا تھا۔ یہ کمتر اردو اور زیادہ تر فارسی میں تھیں۔ جب انھوں نے ان کو کتابی شکل دی، تو از سرِ نو سب کو فارسی میں لکھا۔

برہان قاطع کا محولہ بالا نسخہ لوہارو میں تھا۔ وہاں سے وہ منتقل ہو کر رضا لائبریری میں آ گیا ہے۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت سے لفظوں پر نشان لگائے تھے مگر سب پر لکھ نہ سکے اور جن الفاظ پر تنقیدی نوٹ لکھے تھے، ان میں سے بہت سے ترتیب کتاب کے وقت چھوڑ دیے۔

چونکہ یہ عبارتیں اس لیے بہت اہم ہیں کہ بے ساختہ لکھی گئی ہیں اس لیے آج کی صحبت میں ان میں سے 37 کو غالبؔ دوستوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں کہ انھیں غالبیات میں معقول اضافہ شمار کیا جائے گا۔ اس سلسلے کی ردیف جیم سے پہلے کی تحریریں ماہِ نو، نیا دور، اور نقوش میں شائع ہو چکی ہیں۔

میرے پیشِ نظر اسدی طوسیؔ کے لغت فرس کے ساتھ برہان قاطع کا وہ نسخہ بھی رہا ہے، جو تہران سے ڈاکٹر محمد معین کے حاشیوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ مناسب موقعوں پر میں ان دونوں کے حوالے دیتا گیا ہوں۔

اس مقالے میں 'ب' سے برہان قاطع اور 'غ' سے غالبؔ مراد ہیں۔ (عرشی)

ماہِ نو، کراچی، جنوری فروری 1969

1-ب: جغبت بروزن رغبت۔ وجغبوت بروزن فرتوت، پنبۂ لحاف وتوشک ونہالی باشد۔

غ: جغبت وجغبوت درحقیقت یک لغت است۔ لیکن در صفحۂ دیگر جغنوت، بجای موحدہ، نون می نویسد۔ ایں راچہ توان گفت۔ اوخویشتن گم است، کزا رہبری کند۔

عرشی: برہان ودرفش کاویانی میں چغبت وچغبوت چغنت ان تین شکلوں کا اور اضافہ کیا ہے، اور پھر لکھا ہے کہ ''درشش جہت از پراگندہ گوئی دم زد۔''

طوسی نے 'لغت فرس' (ص 41) میں صرف 'چغبوت' کا ذکر کیا ہے اور یہی شکل جہانگیری ورشیدی میں مذکور ہے۔ ڈاکٹر محمد معین نے برہان کے حاشیے میں (جلد 2 / 576) لکھا ہے کہ جغنوت اسی جغبوت کی تصحیف ہے۔ ایک بات میرے خیال میں یہ آئی کہ جغبت کو رغبت کے وزن پر نہ ہونا چاہیے، بلکہ اس کی ب مضموم ہوگی، کیونکہ یہ جغبوت کی مخفف شکل ہے۔ رہ گئیں آخری تین شکلیں جن کے شروع میں چ (جیم) فارسی ہے، تو ان کی تغلیط ڈاکٹر معین نے نہیں کی ہے، گویا انھوں نے ان کو مستقل لہجہ قرار دیا ہے، اور اس بنا پر ان شکلوں کو بھی صحیح مانا ہے۔

خان آرزو نے سراج اللغات میں پہلے چغت اور چغوت اور پھر چغبت اور چغبوت میں ذکر کیا ہے، اور یہ بھی بتایا ہے کہ بعضے چ کی جگہ جیم بھی بولتے ہیں۔ لیکن صحیح شکل چغت اور چغوت بتقدیم بابرغین ہے۔ 'انجمن آرای ناصری' میں چغبت اور چغبوت دو شکلیں لکھی ہیں۔

2-ب: جغد۔ مرغیست بنحوست مشہور

غ: جغد بجیم فارسی مشہور است 12

عرشی قاطع برہان (ص 36) اور درفش کاویانی (ص 58) میں صرف اتنا لکھا ہے کہ ''جغد را در فصل جیم عربی آورد، وباز در فصل جیم فارسی ذکر کرد۔'' ڈاکٹر معین نے اس اعتراض کو اہمیت نہیں دی، بلکہ 'چغد' کے حاشیے میں اس کی اصل cuqwd بتا کر قوسین میں امروز جغد لکھا ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ وہ جغد بجیم عربی کو موجودہ لہجہ قرار دیتے اور صحیح جانتے ہیں۔ خان آرزو نے سراج اللغات میں اور آقا محمد علی داعی الاسلام نے 'فرہنگ نظام' میں جیم سے لکھ کر 'چ' سے بھی صحیح بتایا ہے۔ 'انجمن آرای ناصری' میں صرف بجیم ہی لکھا ہے۔

3-ب: جکر بروزن شکر گرد، وخاک را گویند۔ وزبان علمی ہند نیز ہمیں معنی دارد۔

غ: لاحول ولاقوت الاباللہ۔ عرفی لفظ ہندی را در شعر بستہ است۔ آن باد کہ در ہند گرآید،

جکر آید۔ جھکڑ را جکر نوشتہ است۔ بچارہ صاحب برہان آن را توافق لسانین پنداشت۔
زہے محقق 12 غالبؔ

عرشی: قاطع برہان (ص 36) اور درفش کاویانی (ص 58) میں آغاز اعتراض اس طرح کیا ہے:
"زبان علمی ہند مانمیدانیم کہ دران پارہ سخن رانیم آہ" دراصل غالبؔ کا یہ اعتراض اس حاشیے کی تائید میں ہے، جو نسخۂ مطبوعہ کے مصحح نے حاشیے میں کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم نے زبان علمی ہند یعنی سنسکرت کے ماہرین سے دریافت کیا، مگر انھوں نے قبولِ مولف کی تائید نہیں کی۔ ڈاکٹر معین نے اپنے ایڈیشن کے حاشیے میں اسی نوٹ کو نقل کر دیا ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ وہ بھی اس اعتراض سے متفق ہیں۔ خان آرزو نے سراج میں یہی لکھا ہے ک "تحقیق آنست کہ ایں لفظ ہندی الاصل است و بجیم ہندی کہ تلفظ آن برغیر ہندی دشوارست۔"

4۔ ب: جلغوزہ باغین نقطہ دار بروزن ہرروزہ چیزی باشد مانند فستق آہ۔

غ: جلغوزہ صحیح بہ جیم فارسی است 12

عرشی: اس اعتراض کو قاطع اور درفش میں شامل نہیں کیا ہے، حالانکہ رشیدی، سراج اللغات، انجمن آرای ناصری اور فرہنگ نظام میں اس لفظ کو بجیم فارسی ہی لکھا ہے۔

5۔ ب: جلکارہ بروزن ہرکارہ رای و تدبیر و راہ روشہای مختلف را گویند۔

غ: اول جدگارہ نوشت۔ سپس جگارہ۔ ایں جا جلکارہ مینویسد۔ کدام لغت را صحیح دانیم 12

عرشی: قاطع (ص 36 اور درفش (ص 59) میں صاف لکھ دیا ہے کہ "حق تحقیق آں کہ جدکارہ بہ جیم عربی مضموم بروزن پشتارہ بمعنی رایہای مختلف آمدہ است۔ وباقی ہمہ وہم و سواس و گمان و قیاس۔"
لیکن ڈاکٹر معین نے 'جگارہ' کو مخفف جدگارہ مانا ہے، اور جلکارہ کو مبدل جدگارہ۔ نیز لغت فرس طوسی (ص 513) کی بنا پر 'جدگارہ' کے حاشیے میں کاف عربی بتایا ہے۔
خان آرزو نے سراج میں لکھا ہے کہ جلگارہ تصحیف جدگارہ ہے اور جدگارہ میں بفتح اول و کاف فارسی لکھا ہے مگر قوسی کے حوالے سے بضم اول بھی بتایا ہے۔ انجمن آرای ناصری میں اور فرہنگ نظام میں صرف بفتح اول بروزن گہوارہ درج کیا ہے۔

6۔ ب: جمار بفتح اوّل و ثانی مشدد بالف کشیدہ و تنوین رای قرشت مغز درخت خرما باشد آہ۔

غ: جمار معلوم نیست کہ زبان کدام ملک است۔ فارسی خود نیست 12

عرشی: قاطع (ص 37) اور درفش (ص 59) میں اس اعتراض کو پھیلا کر لکھا ہے، اور آخر میں

فرمایا ہے کہ "یا لغت عربیست یا اختراع ایں سادہ لوح۔"
ڈاکٹر معین نے اس اعتراض کو نظر انداز کر دیا ہے۔ لیکن اقرب الموارد (ج 1 ص 127) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عربی لفظ ہے اور اس کا صحیح تلفظ بضم اول ہے) اور یہ جمع ہے جُمارۃ کے معنی وہی شحم النخل بتائے ہیں۔

7۔ب: جمدر با دال ابجد بروزن خنجر سلاحے است کہ آں را در ہندوستان کتار گویند بروزن قطار۔ دراصل آن جَنب دَراست، یعنی پہلو شگاف۔

غ: لاحول ولا قوت لفظ ہندیست جمدھر۔ پارسیان اگر جمدر گفتہ باشند، موافق لہجہ گفتہ باشند۔ چنانکہ لکھنؤ را لکنؤ۔ ورنہ لغت فارسی نیست۔ جُنب در جَنب عربی و در فارسی، آدھا تیتر و آدھا بٹیر 12

عرشی: قاطع (ص 37) اور درفش (ص 59) میں اس اعتراض کو تفصیل سے لکھا ہے اور بتایا ہے کہ جمدھر اور کتار دو جداگانہ ہتھیار ہیں، جن کی صورتیں الگ الگ ہیں، تیز 'دندان عزرائیل' کے بارے میں لکھا ہے کہ 'درین حکایت خرد جز این قدر نمی پذیرد کہ در زبان سنسکرت عزرائیل را 'جم' گویند پس اگر دھر بدال مختلط التلفظ کہ در ہندی امراست، بہ معنی دندان تیز آمدہ باشد، جمدھر را دندان عزرائیل توان گفت۔ ورنہ این نیز منجملۂ ہندیانات خواہد بود۔" درفش کاویانی میں آخر میں یہ عبارت بڑھائی ہے: "فضلائی کلکتہ در صفحہ دو صد و ششم از برہان منطبعہ خاص در بحث جمدھر بر حاشیہ تجل تحمیق جامع برہان نبشتہ اند۔"

ڈاکٹر معین نے برہان (ج 2 ص 586) کے حاشیے میں لکھا ہے: در حاشیۂ چک آمدہ: معنی ایں لفظ کہ بہندی دندان عزرائیل می نویسد، غلط است۔ زیرا کہ بہندی جمدھر مختصر جمدھار است و جم بمعنی عزرائیل است ودھار بدال مخلوط التلفظ بہا بمعنی دم شمشیر و غیر آنست و بعضے در وجہ تسمیہ ایں لفظ چنیں گفتہ اند کہ جم بمعنی جفت است و دھار بمعنی مذکور۔ پس دریں صورت دودمہ باشد وایں اقربست۔"

خان آرزو نے سراج میں برہاؔن کا قول نقل کر کے لکھا ہے کہ "دراصل لفظ ہندیست و تحلیل آن بر جنب در کہ تصرف فارسیان است، ہر چند بے لطف نیست لما، اصل ندارد و بلکہ سند آن در اشعار قدما و کتب قدیمۂ لغت دیدہ نشدہ" انجمن آرائی ناصری میں بھی اسے ہندی قرار دیا ہے۔

8۔ب: جنبور فتح اوّل و ثانی، بتحتانی رسیدہ، وواوِ مفتوح برائے بے نقطہ زدہ پل صراط را گویند۔ وبتقدیم تحتانی بر حرف ثانی ہم آمدہ است۔

غ: ایہاالناظرین، پچنے دزرانگرید12

عرشی: قاطع اور درفش میں اس اعتراض کونظرانداز کردیا ہے۔لیکن ڈاکٹر معین نے برہان (ج2 ص 593) کے حاشیے میں لکھا ہے کہ یہ چنیود کا بگاڑ ہے اور چنیود کے تحت (ص 677 حاشیہ 8) لکھا ہے کہ یہ لفظ پہلوی میں Cinvat ہے اور خود پہلوی ہی میں اس کا مصحف Cinevar بھی ملتا ہے۔طوسؔی نے اپنی لغت فرس (ص145) میں چنیور کو بمعنی صراط بتا کرعنصریؔ کا یہ شعر سند میں پیش کیا ہے:

تراہست محشر رسول حجاز دہندہ بپول چنیور جواز

اس لغت کے مصحح ڈاکٹر عباس اقبالؔ نے حاشیے میں لکھا ہے کہ"ایں لغت کہ صحیح آن چنیوداز لغاتِ قدیم اوستائی است باشکال مختلفہ خواندہ، واز طرف گویندگان قدیم فارسی وفرہنگ نویسان استعمال وتلفظ شدہ بعضے آں راخنیور۔ وبعضی دیگر بتقدیم نون بریاء باخاء یاچ فارسی خواندہ اند۔ ومزدیؔ گوید:

اگر خود بہشتی و گر دوزخی گذارش سوی خنیور پول بود

واسدیؔ گفتہ:

بدانی کہ انگیزش است و شمار ہمیدوں بپول خنیود گذار

خاء رامی تواں تصحیف چ دانست۔ ولی از ایں کہ اسدی این لغت را در باب الراء آوردہ معلوم می شود کہ بہرحال ایں لغت رامختوم براء استعمال می کردہ اند۔"

فرہنگ نظام میں چنو، چنور اور چنیود کے تحت اوپر مندرج باتیں دہرائی ہیں۔

9۔ب: جور بضم اوّل و فتح ثانی وسکون رای قرشت بمعنی بالا باشد۔ وبفتح اول وسکون ثانی و ثالث درعربی بمعنی ستم باشد ونام یکی از خطوط جام جم نیز ہست کہ خط لب وجام و پیالہ باشد۔ و پیالہ جور بمعنی پیالۂ مالا مال است، چہ ہرگاہ حریف را دانستہ پیالہ مالا مال بدہند تامست شود وبیفتد و بے شعور گردد باو جور وستم کردہ خواہند بود۔"

آغ: جَور، خودمی نویسد کہ خط لب جمشید را خط جور گویند۔ وبازمی نویسد کہ درعربی ستم راجور گویند۔ ووجہ تسمیۂ آن خبط بہ خط جور مالا مال بودن جام قرار می دہد۔ واین مایہ خودنمی اندیشد کہ درعہد جمشید زبان عربی کجا بود۔اگر بود، جمشید چرا میدانستہ باشد۔ بعد فرض کردن این روایت کہ جام جم خطوط وخط نخستیں جور نام داشت، چرا بہ حسن اتفاق قایل

نباید شد کہ توجیہ ناوجیہ بمیان باید آورد۔ لاحول ولاقوت الاباللہ۔ (یہ غالب کا املا ہے،
جو ہے غلط۔ صحیح یہ ہے کہ 'قوۃ' اور 'باللہ' لکھا جائے۔ (غ) غالب 12`

عرشی: قاطع (ص 37) اور درفش (ص 60) میں اس اعتراض کو بھی اور بڑھا کر لکھا ہے، اور
اس میں ایک تو یہ بات کہی ہے ''کہ اگر بمثل جمشید ایں را می شنید، زبانش از قفا بیرون می
کشید۔'' اور آخر میں فرمایا ہے کہ ''معہذا جامِ جہاں نما نہ جامے بود کہ ساقی آن را در
انجمن بگردش آورد نہ ہر کس دران جام بادۂ گلفام خورد۔ خاصہ ایں چنیں فرومایہ کہ نقل
انجمن ودستخوش اہل بزم باشد، امانہ بمعنی ستم، ونہ از بہر این غرض۔''

ڈاکٹر معین نے اس اعتراض کو نظرانداز کر دیا ہے۔ فرہنگ رشیدی (ج 1 ص 528) میں
لکھا ہے کہ ''جور بالفتح یکی از خطوط جام کہ بالای ہمۂ خطہا باشد۔ و پیالۂ جور یعنی مالا مال
کہ بدان حریف را بیندازند، و در بسیار دادن شراب با جور کنند۔ خاقانی گوید مصرع: رسم
جور از ساقی منصف بنصفے حواستند۔'' بظاہر وجہ تسمیہ کے سلسلے میں رشیدی نے بھی 'جور' کو
عربی لفظ مترادفِ ستم سمجھا ہے۔ میرے نزدیک یہاں 'لبالب' مراد ہے، اور ظاہر ہے کہ
جب کسی کو لبالب جام شراب دیا جائے گا تو وہ بمقابلہ کم نوش کے جلد مدہوش ہو جائے
گا۔ نیز یہ بھی رشیدی سے معلوم ہوا کہ جور جام جمشید کے کسی خط کا نام نہیں تھا، بلکہ جامِ
شراب کے خطوط میں سے سب سے اوپر کا خط جور کہلاتا ہے۔ خان آرزو نے سراج
میں لکھا ہے کہ ''ایں خطاست، چرا کہ جور لفظ عربیست، نہ فارسی۔ پس نام خط جام جمشید
چہ قسم تواند بود۔ و بر تقدیر تسلیم تنہا جور نیست، بلکہ خط جور است۔

انجمن آرائی ناصری میں لکھا ہے کہ یہ لفظ 'جوز' بضم جیم و فتح واؤ ہے، اور اس کے معنی بالا
اور خط بالای جام جمشید ہیں۔ جور بمعنی بالا کی نقیض جرِ بکسر جیم ہے، اور معاملات و
محاورات میں استعمال ہوتا ہے کہ: ''بعد جر و جور بسیار بفلاں مبلغ و مقدار قرار گرفت،
یعنی بعد از زیر و بالای بسیار گفتن چنین شد۔''

اسی قسم کی رائے صاحب فرہنگ نظام کی ہے۔

10۔ب: جوش بروزن موش آہ

غ: جوش بروزن ہوش بایستے نبشت، نہ بروزن موش 12

عرشی: قاطع اور درفش میں یہ اعتراض بھی چھوڑ دیا گیا ہے، لیکن ہے درست۔ چنانچہ فرہنگ

انجمن آرائی ناصری نے بھی جوش کو باؤل مضموم وواؤ مجہول لکھا ہے۔

11۔ب: جوغ بروزن دوغ چوبی را گویند کہ در وقت زراعت گردن گاو نہند۔

غ: جوغ در بحث تحتانی باواو نیز بدین معنی آوردہ 12

عرشی: قاطع اور درفش میں یہ اعتراض بھی متروک ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر معین نے لفظ 'یغ' کے تحت حاشیے میں صراحت کردی ہے کہ فارسی میں جوغ، یوغ، جوہ، جو اور یغ اتنی شکلیں مستعمل ہیں۔

12۔ب: جولہ بضم اول و فتح ثالث وظہور باء مخفف جولاہ است کہ بافندہ وعنکبوت باشد جولہ بفتح ثالث وہاء مخفف جولاہہ است کہ بافندہ وعنکبوت باشد۔

غ: جولاہ و جولہ مسلم۔ لیکن اسم حائک است، ومجازاً کلاش را گویند کہ عربی آن عنکبوت است۔ جولَہَہ بہ فتح لام وہای بہ ہا پیوستہ، ندانم لغت کجای است۔ مگر آں کہ در ہندی جُلاہہ گویند اگر مخفف آن قرار دہند، جُلَہْ می شود نہ جَولَہَہ۔ دیگر باید دانست کہ دریں لغت در فارسی واو اصلی مضموم است بہ اشباع ضمہ۔ ودر ہندی بے واو ہست، یعنی جلاہہ۔ پس جولہہ نہ ہندیست نہ فارسی 12

عرشی: قاطع (ص 38) اور درفش (ص 61) میں اس اعتراض کو تفصیل سے لکھا ہے، اور درفش میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ ''دانشمندان کلکتہ در صفحہ 245 وصفحہ 646 برہان منطبعہ در معرض نامہ گی شرح لفظ جولہ دو جا تحمیق وتکذیب دکنی کردہ اند۔'

نیز انھوں نے ایک غیر متعلق مگر دلچسپ بات یہ لکھی ہے کہ فارسی میں علامت تانیث نہیں ہے، لہٰذا جو لوگ مرد کو بیکس اور عورت کو بیکسہ لکھتے ہیں وہ غلطی کرتے ہیں۔ ایرانیوں نے تو عربی کے لفظوں میں بھی ہ بڑھائی تو اس سے عورت مراد نہیں لی۔ چنانچہ موج اور موجہ اور معشوق اور معشوقہ میں ہ حرف زائد شمار ہوتا ہے، علامت تانیث نہیں مانا جاتا۔ دیکھو میرزا محمد قلی سلیم طہرانی نے لکھا ہے:

مفلس چو شدیم، رو بدو آوردیم　　معشوقۂ روز بے نوائی است خدا

دانشمندانِ کلکتہ کے جن اعتراضوں کا درفش میں حوالہ ہے، وہ اعتراض خود اس نسخے کے صفحے 254 کے حاشیے میں بھی موجود ہیں۔ چونکہ درفش کی ترتیب کے وقت ان کے پاس یہ نسخہ نہ رہا تھا، بلکہ اس کی جگہ دوسرا ایڈیشن تھا، اس لیے انھوں نے اس کا حوالہ دیا۔ اس نسخے میں پہلا اعتراض لفظ 'جولاہ' پر ہے، جس کے معنی بتاتے ہوئے صاحبِ برہان نے لکھا تھا کہ بافندہ را گویند۔ وعنکبوت را نیز گفتہ اند کہ عربان دلدل خوانند۔'' وہ اعتراض یہ ہے:

''پوشیدہ نماند کہ لفظ جولاہ و جولہ باظہار ہا بمعنی بافندہ و عنکبوت آمدہ است۔ و جولہ باخفای ہا بمعنی خار پشت وغیر آں، چنانچہ صاحب برہان و فرہنگ جہانگیری وغیر ہما نمودہ اند، و دلدل بضمتین در عربی بمعنی خار پشت بزرگ آمدہ، نہ بمعنی عنکبوت لیکن چون لفظ جولہ مخفف جولاہ ہم آمدہ و آن بصورت خطی بلفظ جولہ خفای ہا کہ بمعنی خار پشت آمدہ مشابہت دارد، صاحب برہان را اشتباہ واقع شدہ و گفتہ عنکبوت را نیز گویند کہ بعربی دلدل خوانند۔''
دوسرا اعتراض لفظ جولہ کے بمعنی فالج ہونے پر کیا ہے، اور وہ یہ ہے: ''در ہندی جھولہ باجیم مخلوط التلفظ بہا گویند۔''
پہلے نوٹ سے قاطع اور درفش کے اس بیان کی تردید ہوتی ہے کہ ''جولہ اسم عنکبوت چنانکہ ناقابل گمان کردہ است زنہار نیست۔'' فرہنگ رشیدی (ج ص 552) میں بھی میرزا صاحب کے خلاف لکھا ہے کہ ''جولاہ و جولاہہ و جولہہ و جولاہک، بافندہ، و عنکبوت۔ مولوی گوید:

چو گنج جان، بکنج خانہ آمد　　بگردش می تنیدم ہمچو جولاہ

ولہ:

چون جولہہ حرص دریں خانۂ ویران　　از آبِ دہن و ام مگس گیر تنیدیم

ان دونوں شعروں میں جولاہ اور جولہہ کے معنی مکڑی ہی ہو سکتے ہیں۔
خان آرزو نے بھی سراج میں فرہنگ جہانگیری کے حوالے سے جولاہ وغیرہ الفاظ بمعنی عنکبوت لکھا ہے، اور وجہ یہ قرار دی ہے کہ مکڑی جالا تننے میں جولاہے سے مشابہت رکھتی ہے۔ انجمن آرائی ناصری بھی اسی کی موید ہے۔
13۔ب: جہ، بکسرِ اول وسکون ثانی بلغت ژند و پاژند زبان فاحشہ و بدکارہ را گویند۔
غ: جہ بکسر اوّل وسکون ثانی بلغت ژند و پاژند زبان و بدکارہ را گویند۔ 12
من می گویم کہ چون لغت دو حرفی است، و در فارسی حرف آخر جز ساکن نمی باشد۔ لاجرم اشعار بسکون ثانی زاید بلکہ لغو است۔ دیگر آن کہ جو ہر لفظ مقتضی آنست کہ زن فاحشہ را گویند بہ انفراد، نہ زنان فاحشہ را۔ علاوہ ازیں جہن بمعنی زن بدکارہ سند می خواہد 12
عرشی: قاطع (ص 38) اور درفش (ص 62) میں صرف اتنا کہا ہے کہ ''ما می پرسیم کہ چون جہ را کہ کلمۂ ثنائی است بمعنی جمع آورد، مفرد آن چہ خواہد بود۔'' آخری اعتراض 'جہن' کے لیے سند چاہیے، ان دونوں کتابوں میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ

صاحب برہان نے جھن کے معنی زنِ بدکارہ لکھے ہی نہیں ہیں۔
میری دانست میں 'زن' کی جگہ 'منان' نسخہ نویسوں کی غلطی ہے۔ آقائی محمد علی داعی الاسلام نے فرہنگ نظام میں اور ڈاکٹر معین نے برہان (ج 2 ص 603) کے حاشیے میں لکھا ہے کہ پہلوی میں زن بدکار کو (Teh) کہتے ہیں اور اوستا میں یہی لفظ (Jahi) کی شکل میں ملتا ہے۔

14۔ب: جھن، بکسر اوّل و فتح ثانی و سکون نون، مخفف جہان است آہ۔

غ: جہاں بہ فتحہ نوشت۔ وجھن بکسر اوّل می نویسد کہ مخففِ جہان است، حال آن کہ در تخفیف تغیر اعراب ضرور نیست 12

عرشی: قاطع (ص 38) اور درفش (ص 62) میں اس اعتراض پر اضافہ کچھ نہیں کیا ہے۔ لیکن انھوں نے اس امر کو نظر انداز کر دیا کہ صاحب برہان نے جہان کو بفتح اول لکھنے کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ ''بکسر اول ہم آمدہ است۔'' اس صورت میں ان کا اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ خان آرزو نے بھی سراج میں جہان کو لکھا ہے کہ بفتح معروف و قیل بکسر آن۔''

15۔ب: جیبر، بکسر اول و فتح بای ابجد، بروزنِ دیگر، معنی فرادیس بود کہ جمع فردوس است آہ۔

غ: جیبر بروزن دیگر بمعنی فرادیس چہ معنی دارد۔ جوہر لفظ اقتضای معنی جمع نمی کند۔ می بایست کہ بمعنی فردوس می نوشت مع سند 12

عرشی: قاطع (ص 38) اور درفش (ص 62) میں صرف اتنا لکھا ہے کہ ''اینجا نیز از پرسیدن اسم مفرد گزیر نداریم۔'' ڈاکٹر معین اس لفظ کے بارے میں بالکل خاموش ہیں۔ اسدی نے لغت فرس میں اور رشیدی نے اپنی فرہنگ میں اس کا ذکر تک نہیں کیا ہے۔ خدا جانے یہ لفظ کیا ہے، اور کس زبان کا ہے۔ خان آرزو نے صرف قول برہان نقل کر دیا ہے۔

16۔ب: جینہ در بروزن کینہ ور پل صراط را گویند۔

غ: ایہا الناظرین، جینہ ور درانگرید 12

عرشی: قاطع اور درفش میں یہ اعتراض متروک ہے۔ ڈاکٹر معین نے لکھا ہے کہ یہ چنیود کا مصحف ہے۔ اس لفظ کی تحقیق کے سلسلے میں لفظ 'جنیور' دیکھیے، جو ابھی گزر چکا ہے۔ یہاں اتنا اور کہہ دوں کہ خانِ آرزو نے سراج میں اس لفظ کو چنیور (باول مکسور و یائے معروف و نون و واوَ مفتوح بمعنی پل صراط لکھ کر بتایا ہے کہ ''در شاہنامہ و گر شاسپ نامہ بتقدیم نون بہ تحتانی و برعکس مسطور است۔''

17۔ب: جیوہ بروزن میوہ سیماب را گویند آہ۔
غ: جیوہ بروزن میوہ غلط است۔میوہ بہ یای مجہول است وجیوہ بہ یای معروف 12
عرشی: قاطع اور درفش میں یہ اعتراض بھی نظرانداز کر دیا گیا ہے۔اگر چہ فرہنگ انجمن آرای ناصری برہان کی موید ہے لیکن میری دانست میں اعتراض درست ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر معین کی تحقیق کے مطابق اور رامانی میں زیو (ZIV) اوستا میں جیویا (Jivya) اور پہلوی میں زیوندک (Zivandk) اور سنسکرت میں جیوکا (Jiyaka) بکسر معروف ہی آتے ہیں۔ رشیدی (ص 555) میں جیوہ اور رژیوہ کو بالکسر بمعنی سیماب لکھا ہے اور زیبق کو اس کا معرب بتایا ہے۔لفظ زیبق بھی کسرہ معروف ہی کا موید ہے۔
18۔ب: چابک۔بمعنی تازیانہ ہم آمدہ است۔
غ: چابک بمعنی چست و چالاک مسلم۔وبمعنی تازیانہ ہندی است 12
عرشی: قاطع اور درفش میں یہ اعتراض شامل نہیں کیا گیا ہے۔ڈاکٹر معین نے بھی اس بارے میں کچھ نہیں لکھا۔فرہنگ رشیدی (ج 1 ص 479) میں لکھا ہے کہ ''بمعنی تازیانہ در غیر شعر خسرو دیدہ نشد وظاہراً ہندیست'' لیکن اس کے حاشیے میں مصحح نے لکھا ہے۔'' در شعر سنجر کاشی نیز کہ در سراج و بہار عجم مرقوم ست، بدین معنی آمدہ۔پس فارسی باشد۔نہ ہندی ولے چو مستند باشعار متقدمین نیست نمی تواند سند باشد۔''
خان آرزو نے سراج میں لکھا ہے کہ یہ ترکی لفظ ہے اور بے واؤ اور بواو دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔
19۔ب: چال۔ بزبان متعارف اہل ہند بمعنی رفتار است، وامر برفتن یعنی براہ رو۔
غ: چال در ہندی اسم رفتار مسلم لیکن صیغہ امر چنانکہ صاحب برہان می نویسد ہرگز نیست۔ چل امر ہست، نہ چال، ایں بیچارہ دکنی ہندی ہم نمی داند، تا بہ فارسی چہ رسد 12
عرشی: قاطع (ص 39 اور درفش ص 39) میں صرف اتنا لکھا ہے کہ ''ما برانیم کہ چال بمعنی رفتار مسلم۔اما صیغہ امر چل است نہ چال'' غالب کا یہ اعتراض درست ہے۔
20۔ب: چکری بضم اول بروزن مُقری نوعی از ریواس باشد۔ و بہ ہندوستان دختر را گویند۔
غ: چکری بمعنی دختر نوشتہ است۔شاید در دکن کہ مسکن جامع لغات است، میگفتہ باشند۔ ہر کہ در محاورہ ہائے اردو نادرست است، در فارسی چہ خواہد بود 12`

عرشی: قاطع (ص39) اور درفش (ص 63) میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ درہندوستان چھوکری گویند بجیم فارسی مختلط التلفظ وواو مجہول۔ درلہجہ مغلیت۔ چوکری میگویند بواؤ، نہ چکری بے واؤ۔ نیز درفش میں یہ بھی بڑھایا ہے کہ ''درصفحۂ 262 برہان، مطبوعۂ مطبع علمائی والا قدر صدر چکری زادۂ مطبع طبع فرتوت فرہنگ نگاردکن شمردہ اند۔'' علمائے کلکتہ کا یہ نوٹ زیرنظر نسخۂ برہان میں بھی موجود ہے۔

21۔ب: چنیود بروزن می رود پل صراط را گویند آہ۔

غ: چی نود بروزن می رود12

عرشی: قاطع اور برہان میں اسے نظرانداز کردیا ہے۔ مگر جیسا کہ ڈاکٹر عباس اقبال نے فرمایا ہے، اور میں لفظ جنیور کے تحت نقل کرآیاہوں، صحیح لفظ چنیود ہی ہے۔ انجمن آرائے ناصری میں بھی اسی کو اصح لکھا ہے۔

22۔ب: خاور بروزن داور بمعنی باختر است کہ مشرق باشد۔ وبمعنی مغرب ہم آمدہ است۔

غ: خاور بمعنی مشرق مسلّم۔ بمعنی مغرب از کجامیگوید۔ قباحت ایں معنی رادر لفظ باختر نوشتہ ایم 12

عرشی: قاطع اور درفش میں یہ اعتراض بھی نظرانداز ہوگیا ہے۔ باختر کے ذیل میں غالب نے جولکھا ہے، وہ یہ ہے:

''باختر بمعنی مغرب مسلّم۔ این بزرگوار این لفظ را از اضداد شمردہ، وبمعنی مشرق ہم آوردہ۔ خدا را ای خردمندان، ایں لفظ از اضداد چگونہ می تواند بود۔ فرق مغرب ومشرق نہ کم تفاوتے است، مثلاً درکتابی دیدیم کہ فلاں شہر باختر سوی فلاں شہر باختر وی فلاں شہراست، حال آں کہ ما آں سرزمین وآن اقلیم راندیدہ ایم، اکنون چسان دانیم کہ آں شہر بجانب مشرق است یا بجانب غرب 12۔''

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اہل زبان خاور کو مشرق ومغرب دونوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اسدی طوسی نے لغت فرس (ص 133) میں خاور کو بمعنی مغرب لکھ کر رودکی کا یہ شعر سند میں پیش کیا ہے:

مہر دیدم بامدادان چو بتافت   از خراسان سوی خاور می شافت

فرہنگ رشیدی (ج1 ص 188) میں لکھا ہے۔ ''تحقیق آنست کہ باختر مخفف بااختر است واختر ماہ وآفتاب ہردو را گویند۔ پس باختر مشرق ومغرب راتوان گفت۔ وہم چنین خاور

نیز مشرق ومغرب را تو ان گفت۔ وازیں جہت خاور بیش بمعنی مشرق استعمال کنند۔''
خان آرزو بھی سراج میں یہی رائے ظاہر کرتے ہیں۔ یہی خیال انجمن آرای ناصری نے لفظ باختر کے تحت تفصیل سے ظاہر کیا ہے۔اور سند میں اشعار شعرای متقدمین پیش کیے ہیں۔
آقای محمد علی داعی الاسلام نے فرہنگ نظام (2/ 541) باختر و خاور کے مشرق ومغرب دونوں معنوں میں استعمال کرنے کی وجہ یہ لکھی کہ ''حدس من این است دو لفظ معنی دیگر داشتہ ومجازاً در مشرق ومغرب استعمال شدہ، وبعد ہر یک برای ہر دو استعمال گشتہ است۔ اختر اصلاً اسم بلخ است کہ دراوستا باخذی و در پہلوی بخر بودہ۔ یونانیہا ورومیہا آن را بکٹریا:(Bactria) ساختند۔ وہمان بشکل باختر در فارسی آمدہ۔
یونانیہا ورومیہا برای اینکہ بکتریا (بلخ) در مشرق ایران بودہ، تمام حصہ شرقی ایران را بکتریا می گفتند استعمال در مغرب ازین جہت شدہ کہ یک حصہ ایران سابق مثل افغانستان وپنجاب در مشرق بلخ (باختر) واقع شدہ وبلخ نسبت بہ آنہا در مغرب است۔
''خاور ہم اصلاً نام ملکے بودہ در مغرب ایران۔ احتمال برود کہ خاور نام آسیای کوچک بودہ۔ وچون در مغرب ایران واقع بودہ مجازاً مغرب را ہم خاور گفتند وبعد مجازاً بمناسبت بلادی کہ در مغرب خاور واقع شدہ مشرق را ہم خاور گفتند۔''
ان وجوہ سے غالب کا یہ اعتراض غلط ہے۔
23-ب: خانہ گیر۔از جملہ ہفت بازی نرد کہ آن فاروز یاد ستارہ خانہ گیر طویل ہزاران منصوبہ باشد۔
غ: سراسر فقرہ بے معنی محض 12۔
عرشی: قاطع (ص 39) اور درفش (ص 63) میں اعتراض کو تفصیل سے لکھا ہے، اور ساتھ ہی اس فقرے کے بارے میں کہا ہے کہ ''ہمانا این کلام دیوسمندون ہزار دست خواہد بود۔''
اس میں شک نہیں کہ برہان میں نرد کی سات بازیوں ہی کے نام گنائے گئے ہیں۔ اس میں اگر تاخیر وتقدیم ہوگئی ہے، یا ہزار کی جگہ ہزاراں درج ہوگیا ہے،تو یہ بات ایسی نہیں ہے کہ دیوسمندوں کی علاوہ اور کوئی نہ جان سکے۔خود غالب نے جس بازی کو زیادہ کہا ہے، نفائس المفنون (ج2 ص 220) میں اسے 'زیادہ' نام سے، اور جسے غالب نے 'ہزار' بتایا ہے، اُسے 'وہ ہزار' اور جسے 'ستارہ' لکھا ہے، اسے 'سہ تارہ' تحریر کیا ہے نیز اس میں خانہ گیر اور طویل کو دو ہزار کے بعد گنا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بازیوں کے نام اوران کے تقدم وتاخر

میں اختلاف ہے۔ ملاحظہ ہو ڈاکٹر معین کا حاشیہ برہان ج2 کے صفحہ 708 و 709 پر۔

24۔ب: خرہ بفتح اول و ثانی باخفای ہا۔ ثفل ہر تخمی باشد کہ روغن آں را کشیدہ باشند اعم از کنجد و غیر کنجد۔ وبفتح اوّل وضم ثانی و اظہار ہا بمعنی نور باشد مطلقاً۔ وبعضی بایں معنی بضم اول و فتح ثانی و اخفای ہا گفتہ اند آہ۔

غ: خرہ بہ فتحتیں کنجارۂ کنجد وغیرہ را گویند وتشدید رای قرشت نہ ضروری است، نہ ممنوع۔ خرہ بہ خای مضموم ورای مفتوح نور قاہر را گویند۔ وازینجاست کہ اسم آفتاب خر قرار یافتہ است۔ و نیز ہمیں لفظ بمعنی قطعہ و حصہ مستعمل است۔ نہ بے واو۔ ہم چنیں بدو معنی نخست ہرگز بواو معدولہ صحیح نیست، غالب 12

عرشی: قاطع (ص 39) اور درفش (ص 64) میں اس کو تفصیل سے لکھا ہے مگر اس میں مولف برہان کے لیے پہلے تو یہ لکھا ہے کہ "آبروی دانش وبنیش ریخت۔ مگر در روز میثاق پیان بستہ کہ جز غلط نفہمد" اور دوسرے فرمایا ہے کہ "اشعار انیامیزد و در اعراب سررشتہ گم نکند مگر آں کہ نابینا باشد۔" یہ دونوں طرز غیر عالمانہ ہیں، نیز صاحب فرہنگ نظام اور ڈاکٹر معین ان میں سے کسی اعتراض کو درست نہیں جانتے۔ اسی لیے ڈاکٹر معین نے حواشی برہان میں اس طرف مطلق توجہ نہیں کی۔

25۔ب: خز بفتح اوّل وسکون ثانی، یارب درلغت دوحرفی معنی سکون ثانی چیست۔

عرشی: قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو شامل نہیں کیا ہے۔

26۔ب: خسانید بروزن رسانید ماضی خسانیدنا باشد۔ خسانیدن۔ خساید۔

غ: خسانید ماضی خسانیدن مصدر، خساید مضارع، سہ لغت جداگانہ قرار دادن یعنی چہ۔ قطع نظر ازین فضولی خسانیدن بمعنی گزیدن سند می خواہد 12۔

عرشی: قاطع (ص 40) اور درفش (ص 65) میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ "من چنان دانم کہ ایں ہمہ خستن است یا خائیدن کہ حکیم دکنی آں را مسخ کردہ است۔" جہاں تک پہلے اعتراض کا تعلق ہے، وہ درست ہے۔ لیکن لفظ کی حقیقت وہ نہیں ہے جو غالب نے تجویز کی ہے، بلکہ بقول ڈاکٹر معین یہ 'خسایدن' کا مصحف ہے، اور اس پر دلیل یہ ہے کہ مولف نے مضارع 'خساید' لکھا ہے۔ اگر مصدر 'خسانیدن' ہوتا تو مضارع 'خساند' ہونا چاہیے تھا۔ اس لفظ کو لغت فرس (ص 114) کے عنوان میں خشانید اور متن میں خشاید بمعنی 'بدندان ریش کند' لکھا ہے۔

اور سند میں رودکی کا شعر پیش کیا ہے۔ اس کے بعض خطوطوں میں یہ لفظ 'خسانید' بھی ہے، جو 'خسایید' ہی ہوگا۔ کاتب نے ی کو نون سے بدل دیا ہے۔ رشیدی (ج 1 ص 595) میں خشیدن اور خشودن کو بمعنی خاییدن و بدندان ریش کردن بتا کر لکھا ہے کہ برین قیاس خشاید وخشایید۔" اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ صحیح لفظ خساییدن یا خشاییدن ہے۔ انجمن آرای ناصری میں لکھا ہے کہ مجھے خسانیدن کی فرہنگ میں سوائے برہان کے نہیں ملا۔

27۔ ب: خجسپی بضم اوّل وسکون ثانی ویای فارسی بہ تحتانی کشیدہ ستارۂ مشتری را گویند۔

غ: سند می خواہد 12

عرشی: قاطع برہان و درفش میں یہ اعتراض مفقود ہے۔ ڈاکٹر معین کی رائے یہ ہے کہ 'برجیس' نے کسی کاتب کی غلطی سے یہ شکل اختیار کر لی ہے۔ انجمن آرائی ناصری میں برہان سے اس لفظ کو نقل کر کے لکھا ہے کہ کسی اور فرہنگ میں نہیں ملتا۔ لیکن فرہنگ جہانگیری (ج 1، ص 450) میں استاد سیفی کا یہ شعر نقل کیا ہے جو صفت شمشیر میں ہے۔ درندہ چو شیران، و مندہ چو شعبان ثعباں درفشاں چوں خجسپی، درخشاں چوں آذر۔

28۔ ب: خسیدن بروزن رسیدن بمعنی خاییدن است آہ۔

غ: سند می خواہد 12۔

عرشی: قاطع اور درفش میں یہ بھی شامل نہیں ہے۔ یہ وہی خشیدن ہے جس کا ذکر رشیدی کے حوالے سے ابھی گزر چکا ہے۔ شین اور سین دونوں لہجوں سے بولا جاتا ہوگا۔ اسی لیے ڈاکٹر معین نے اس پر کوئی حاشیہ نہیں لکھا۔ فرہنگ جہانگیری (ج 1۔ص 453) اور سراج اللغات میں یہ لفظ موجود ہے۔

29۔ ب: خشای بضم اول بروزن ہمای خوش کنندہ وخوش آیندہ باشد۔

غ: اگر باشد بہ واو معدولہ باشد نہ بے واوٴ 12

عرشی: ڈاکٹر معین نے حاشیہ برہان (ج 2 ص 750) میں اسے خوش آی (یعنی خوش آیندہ) کا مخفف بتایا ہے، اس لیے اس لفظ کو بواو معدولہ لکھنا چاہیے۔ رشیدی نے بھی (فرہنگ ج 1۔ص 594) اور اس کے تتبع میں خان آرزو اور صاحب فرہنگ انجمن آرای ناصری اور صاحب فرہنگ نظام نے بغیر واو ہی کے لکھا ہے، مگر معنی خوش کنندہ بتا کر سند میں نزاری کا یہ شعر پیش کیا ہے:

شہریارِ شرق، شمس الدین علی
خسرو ظالم کش عاجز خشای

خان آرزو کی رائے میں اسے بواوِ معدولہ ہونا چاہیے۔ غالباً اس لفظ کے وجود سے باخبر ہوجانے کے بعد غالب نے قاطع اور درفش میں اس سے بحث نہیں کی۔

30۔ب: خشنشار بفتح اوّل وشین نقطہ دار بالف کشیدہ بروزن بہمیار مرغابی بزرگے است تیرہ رنگ ومیان سروسفید میباش۔ وبترکی قشقلداق خوانند۔

غ: سندمی خواہد 12

عرشی: قاطع اور درفش میں اس لفظ کو بھی چھوڑ دیا ہے۔لیکن ان کا اعتراض درست ہے یہ لفظ اپنی موجودہ شکل میں غلط اور خشنسار کی تصحیف ہے، جیسا کہ ڈاکٹر معین نے بھی بتایا ہے۔ لغت فرس (ص 124) میں خشنسار کے یہی معنی بتا کر دقیقی کا شعر سند میں پیش کیا ہے:

ازاں کردار کو مردم رباید
عقاب تیز پر باید خشنسار

انجمن آرای ناصری میں خشنسار کی سند میں فردوسی اور اسدی طوسی کے شعر بھی نقل کیے ہیں۔

31۔ب: خشن خانہ بروزن طرب خانہ خانۂ راگویند کہ ازنے بوریا سازند آہ۔

غ: خشن خانہ غلط خیش خانہ لغتی است مشہور چنانکہ جامع درخامع الیاءنوشتہ است 12

قاطع (ص 2) اور درفش (ص 65) دونوں میں اس لفظ کو 'مضحکہ بیش نیست' لکھا ہے۔ درفش میں یہ بھی لکھا ہے کہ ''خشن خانہ رامضحکہ ازاں روگفتہ ام کہ حکیم بحران الدین معرف آن شدہ است بگیا ہے کہ ازاں جامہ بافند وبخانۂ کہ دران آب زنند تا ہوا سرد شود۔ واین خود صفت خیش خانہ است کہ از جامۂ تنک سازند، وآن خانہ راپاشیدن آب تردارند۔ وخشن خانہ بپاشیدن آب تعلق ندارد۔ خانۂ راگویند کہ بیابانیان ازنمد و پلاس و گلیم سازند خیشخانہ آرامگاہ منعمانست، وخشن خانہ ماندن جای مفلسان۔''

عرشی: غالب نے خشن خانہ کو تصحیف قرار دیا ہے۔ یہی رائے خان آرزو کی بھی ہے، اور انجمن آرای ناصری میں بھی یہی لکھا ہے لیکن ڈاکٹر معین نے (برہان ج 2 ص 755) کتاب جامع الحکمتین (ص 71) سے حسب ذیل عبارت نقل کی:

''ہمی بنیم کہ مردمان مرگرمای سخت راشتافتن بخانہا زیرزمین کندہ وخشن خانہا۔ وقع ہمی کنند۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خش خانہ اس معنی میں بھی مستعمل ہے جس سے غالبؔ و آرزوؔ وغیرہما؟ انکاری ہیں۔

32۔ب: خفچاق باجیم فارسی بروزن چخماق مردم اصیل وترکان صحرانشین باشند و نام بیابانی ہم ہست از ترکستان کہ بدشت قبچاق مشہور است۔

غؔ: درشرح لفظ خفچاق طرفہ تمسخر بکار بردہ است کہ دانا راخندہ می آورد۔ اول می نویسد کہ خفچاق مردم اصیل وترکان صحرانشیں را گویند۔ ودر آخر می نگارد کہ نام بیابانیست مشہور بدشت قبچاق 12 حاشا ثم حاشا۔ غلط۔ سراسر غلط۔ نہ خفچاق مردم اصیل را گویند، و نہ قبچاق نام دشت است اصل این کہ قبچاق درترکی درخت میان تہی را گویند و چوں آغور خان جد آنقوا بادشاہ شد، مغول را فرقہ فرقہ ساخت، دہر فرقہ را نامے نہاد۔ الغور، قارلغ، خلج، کلتہ، قبچاق ۔بس قبچاق نام فرقہ ایست از قوم مغل، نہ مردم اصیل را گویند، نہ ترکانِ صحرانشین را گویند۔ وخفچاق نام دشتے است مسکن ترکانست 12

عرشیؔ: قاطع (ص 40) اور درفش (ص 65) میں تقریباً یہی عبارت قدرے تغیر کے ساتھ لکھی ہے۔ ہاں، ایک تو یہ مزید کہا ہے کہ "خفچاق را قبچاق گفتن بدان ماند کہ کلاہ را ازار نام نہند، وقبا را عمامہ خوانند۔" دوسرے فرمایا ہے کہ "این ہر دو را نیا میز دمگر دیوانہ، و ترک ومغل را یکے نداند مگر از فرد بیگانہ۔"

ڈاکٹر معین نے (حاشیہ نمبری 10 ج 2 ص 761) مردم اصیل کے بارے میں تو کچھ نہیں لکھا، لیکن پہلے خفچاق کی دوسری شکلیں خفچاج، خفجاق اور قبچاق لکھیں اور پھر حدود العالم (ص 54) کی حسب ذیل عبارت نقل کی 'خفچاخ' راحد جنوبش بہ سجبا ک دارد۔ ودیگر ہمہ باویرانی شمال دارد کہ اندروی ہیچ حیوان نیست۔ وایشان قومے اند از کیماک جدا گشتہ، و بدیں جائے مقام کردہ۔ ولیکن بدخوتر انداز کیمیا کیان۔ وملک ایشان از دست ملک کیمیا کست۔" اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ خفچاک ان کے نزدیک حدود العالم کی شہادت کے پیش نظر مقام اور مردم دونوں کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔

23۔ب: خلج بفتح اول وثانی وسکون جیم فارسی، طائفہ باشند از صحرانشیناں وترکاں۔

غؔ: چنانکہ درحرف خفچاق نوشتہ آمد، نام قومیست از اقوام مغل۔ قید صحرانشینان وترکان لغو 12

عرشیؔ: قاطع (ص 41) اور درفش (ص 66) میں اس کو ذرا بڑھا کر لکھ دیا ہے۔ ڈاکٹر معین نے

(حاشیہ برہان (ج2 ص 764) میں 'دائرۃ المعارف الاسلامیہ' لفظ خلج، سے نقل کیا ہے کہ نام قبیلۂ ترک و اسم ترکی آن بدون شک قلج است۔ این قبیلہ از قرن چہارم ہجری در جنوب افغانستان کنونی بین سیستان و ہندسا کن بودہ اند۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں ہی کا خاندان ہے۔ رشیدی (ج1 ص 603) وخان آرزو نے بھی 'طائفہ از ترکان صحرانشین' لکھا ہے۔ خان آرزو نے یہ بھی بتایا ہے کہ ''بعضے سلاطین خلجی کہ در ہندوستان گذشتہ اندازیں قوم بودہ اند۔'' انجمن آرای ناصری میں لکھا ہے کہ ''نام طائفہ از اتراک و دراصل مغولی''، قال آج ''بودہ، یعنی بمان گرستہ واین لغت ترکی است واکنوں درعراق جای کہ این طائفہ ساکن اند، خلجستان گویند۔'' فرہنگ نظام میں ناصری ہی کا قول نقل کیا گیا ہے۔

34۔ ب: خنپور۔ بروزن طنبور آہ۔

غ: ایہا الناظرین، خنبور بروزن طنبور رانگرید 12

عرشی: قاطع اور درفش میں اسے ترک کردیا ہے۔ رشیدی (ج2 ص 611) میں اسے جنبور کی تصحیف لکھا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ خنپور، چنیود کا بگاڑ ہے، جیسا کہ ڈاکٹر معین نے (برہان حاشیہ ج2 ص 772) میں بتایا ہے۔

35۔ ب: خنیور۔ بروزن حلی گر آہ۔

غ: خنیور۔ بروزن حلی گر بمعنی پُل صراط 12

عرشی: قاطع اور درفش میں اسے بھی ترک کردیا ہے۔ رشیدی (ج1 ص 613) میں اسے جنیور کی تصحیف قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر معین نے (حاشیہ ص 778، برہان ج2) اسدی طوسی کی طرف منسوب یہ شعر خنیور کی سند میں پیش کیا ہے:

بدانی کہ انگیز شست و شمار
ہمیدوں بپول خنیور گذار

انجمن آرای ناصری میں لکھا ہے کہ ''اصح آنہا آں است کہ درزند وپازند بودہ، وآن چنیود بروزن میرود است۔

36۔ ب: خواگ باثانی معدولہ وسکون کاف فارسی مرغ خانگی راگویند۔ وتخم مرغ رانیز گفتہ اند۔ وخاگینہ تخم مرغ بروغن بریان کردہ باشد۔

غ: خواگ بواو غلط، نہ معدولہ نہ ملفوظ وبمعنی مرغ خانگی نیز غلط۔ خاگ۔ بکاف فارسی بیضۂ

مرغ را گویند و ازین مرکب است خاگینہ چنانکہ از زرزینہ، واز پشم پشمینہ 12

عرشی: قاطع (ص 21) اور درفش (ص 66) میں اتنا اور لکھا ہے کہ ''بروایتے ضعیف بیضۂ مرغ۔ راہاگ گویند۔ و چوں تبدل ہای ہوز بخائی شخذ دستوراست، خاگ نیز میتواں گفت۔ وخاگینہ ازین اسم مرکب تواں دانست۔''

خان آرزو نے بھی واو معدولہ کو غلط قرار دیا ہے اور خاگینہ کی اصل خایہ گینہ بتائی ہے۔ جس میں خایہ بمعنی بیضہ اور گینہ کلمۂ نسبت ہے۔ صاحب فرہنگ نظام بھی خان آرزو کے ہم خیال ہیں۔ ڈاکٹر معین نے نہ تو لفظ 'خاگ' کے تحت کوئی نوٹ لکھا، اور نہ یہاں اس طرف کوئی اشارہ کیا کہ ان کے نزدیک واو معدولہ کے ساتھ بھی یہ لفظ مستعمل ہے یا نہیں۔ لیکن رشیدی میں صرف خاگ کے تحت ہی اس کا ذکر کیا ہے، اور کہا ہے کہ 'خاگ' بکاف فارسی تخم مرغ کہ ہاگ نیز گویند و ازین ماخوذ است خاگینہ۔ واز ہمیں ماخوذ است خاگ کبک و آن قسم انگوریست نفیس در شیراز شبیہ است بتخم کبک و بعضے خاگینہ مخفف خایہ گینہ گفتہ۔ واول اصح است۔'' خان آرزو نے بھی اسی کو اصح کہا ہے۔ رہا غالب کا یہ کہنا کہ بروایت ضعیف ہاگ بمعنی تخم مرغ ہے، تو یہ درست نہیں۔ ڈاکٹر معین صاحب نے برہان (ج 4، ص 2308) لفظ 'ہاگ' کے تحت اسے پہلوی الاصل بتایا ہے۔

37۔ ب: خنیور بفتح واو بروزن بیخبر پل صراط را گویند۔

غ: ایہا الناظرین، جنے ور، وجینہ ور، وخن بور رایاد آورید۔ وخنیور بروزن بے خبر رانگرید، واین محقق بیخبر را آفریں گوئید 12 غالب 12

درجیم فارسی معاالیانیز چی نود بروزن میرود بنظر آمد 12

عرشی: قاطع (ص 41) اور درفش (ص 67) میں ایک تو یہ کہا ہے کہ مؤلف نے ایک اور ممکنہ صورت چیتور کو چھوڑ دیا۔ دوسرے انھوں نے کہا ہے کہ مؤلف کا دعویٰ یہ ہے کہ ژند و پاژند میں پل صراط کو کہتے ہیں۔ اسے اتنی بھی خبر نہیں کہ یہ باتیں سوائے اسلام کے اور کسی مذہب میں مذکور نہیں ہیں۔ تو جب زردشتیوں کے یہاں اس قسم کی کوئی راہ آخرت میں ہے نہیں، تو اس کے لیے نام کیوں ہوگا اور اگر یہ کہا جائے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے پل صراط کے لیے نام تجویز کیا۔ تو پھر یہ بتایا جائے کہ ان لفظوں میں سے کون سا لفظ انھوں نے وضع کیا تھا۔

○

برہانِ قاطع پر
غالب کے چند اعتراضات کا ایک جائزہ

میرزا غالب نے فارسی کے مشہور لغت برہان قاطع پر جو تنقید کی تھی وہ پہلے قاطع برہان کے نام سے اور پھر درفش کاویانی کے لقب سے اُن کی زندگی میں چھپ چکی ہے۔

یہ تنقیدیں اصل میں انھوں نے برہان قاطع کے اس نسخہ کے حاشیوں پر لکھی تھیں جو اُن کے مطالعے میں رہتا تھا۔ یہ کمتر اردو اور زیادہ تر فارسی میں تھیں۔ جب انھوں نے ان کو کتابی شکل دی تو ازسرِ نو سب کو فارسی میں لکھا۔

برہان قاطع کا محولہ بالا نسخہ لوہارو میں تھا وہاں سے منتقل ہو کر رضا لائبریری میں آ گیا ہے۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت سے لفظوں پر نشان لگائے تھے مگر سب پر نہ لکھ سکے اور جن الفاظ پر تنقیدی نوٹ لکھے تھے ان میں سے بھی بہت سے ترتیب کتاب کے وقت چھوڑ دیے۔

چونکہ یہ عبارتیں اس لیے بہت اہم ہیں کہ بے ساختہ لکھی گئی ہیں اس لیے آج کی صحبت میں ان میں سے 37 کو غالب دوستوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں کہ انھیں غالبیات میں معقول اضافہ شمار کیا جائے گا۔ اس سلسلے کی چند ردیفوں سے متعلق تحریریں ماہ نو، نیا دور اور نقوش میں شائع ہو چکی ہیں۔

میرے پیش نظر اسدی طوسی کی لغت فرس کے ساتھ برہان قاطع کا وہ نسخہ بھی رہا ہے جو تہران سے ڈاکٹر محمد معین کے حاشیوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ مناسب موقعوں پر میں ان دونوں کے حوالے دیتا گیا ہوں۔

نیا دور، 26 جنوری 1967

اس مقالے میں ب سے برہان قاطع اور غ سے غالب مراد ہیں۔

1۔ب: راستاد بسکون سین بروزن بامداد وظیفہ در اتب را گویند۔

غ: راستاد غلط است۔ رستاداست بہ رای مضموم۔ و این رستی داراست۔ چہ رُستی بمعنی روزی و ما حضر آمدہ است۔ رُستی دار بہ سبب کثرت استعمال رُست دادشد۔ چون دوحرف قریب المخرج را ادغام رسم است، رستاد ماند 12

عرشی: قاطع (ص 45) میں قدرے توضیح کے ساتھ دہرایا ہے۔ درفش میں قاطع کی عبارت کے بعد لکھا ہے کہ ''عزیزی بمن گفت کہ ترا از تخطئیہ جامع برہان قاطع غرض چیست؟ گفتم: ''اعلانِ حق۔ قلب از جید وجعل از اصل جدا می کنم چنانکہ مرشد کامل تفرقۂ وساوس شیطانی از حضرت رحمانی خاطر فشانِ طالبان راہِ حق می کند۔ اگر طبعِ سلیم داری، بپزیر واگر تردید کلام می کنی ناسزا مگوی، ودشنام مدہ۔ حرفہای سودمند خرد پذیر در ضمیر فراہم آر، وعبارتی ترکیب دہ کہ اگر فصیح نبود، بارے سوال دیگر و جواب دیگر نباشد۔ من در دسخن دارم، واز دروغ میرنجم، ازاں راہ جامع برہان قاطع رازشت می گویم، آں ہم طریفانہ وحریفانہ بہ بذلہ ولطیفہ، نہ مخنثانہ وسفیہانہ بہ فحش ودشنام۔''

کاش، میرزا صاحب نے یہی کہا ہوتا۔ مگر انھوں نے تو کھلم کھلا گالیاں دی ہیں۔ یہی سبب تھا کہ ہندوستانی اہل علم ان کے خلاف دشنام طرازی پر اُتر آئے۔

رہا لفظ راستاد کا غلط ہونا، تو ڈاکٹر معین نے اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ غالباً یہ اس وجہ سے ہوگا کہ رشیدی (ج 1 صفحہ 720) میں اس لفظ کی سند میں فردوسی کا یہ شعر درج کیا گیا ہے:

خدایا، بخواہم ز تو راستاد　　چو جودت ہمہ را وظیفہ بداد

خان آرزو بھی راستاد کو صحیح مانتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے رستاد کو مخفف استاد بتا کر اس کے معنی بھی راتب و وظیفہ لکھے ہیں۔ فرہنگ انجمن آرائی ناصری میں بھی راستاد کو اصل اور رستاد کو مخفف بتا کر دونوں کے معنی وظیفہ وراتبہ لکھے ہیں۔

2-ب: راوش بہ فتح ثالث بروزن آتش کوکب مشتری را گویند۔

غ: راوش ہم برای مہملہ دروغ، ہم بہ داد مفتوح غلط۔ زاوُس بروزن طاوُس و کاوُس است۔ باشد کہ برای ضرورت شعر ہمزہ رابیندازند۔ لیکن ضمۂ واو دران صورت نیز

برقرار خواہد ماند، بہ معنی زاوش بروزن خامش 12

عرشی: قاطع (ص 45) اور درفش (ص 74) میں قدرے اضافے کے ساتھ اسے دہرایا ہے۔ چونکہ برہان کے نسخۂ مطبوعہ کے حاشیے میں مصححین نے یہی بات کہی تھی، کسی جواب دینے والے نے اس پر اعتراض کر دیا کہ یہ تو چبایا ہوا لقمہ ہے، تو درفش میں لکھا کہ ''حاشیہ صفحہ 355 برہان منطبعۂ کلکتہ دید نیست تا دانند کہ اہل دانش و داد بودن رای بے نقطہ راؤ اسم مشتری کہ زاوش است، رواند اشتہ اند۔'' مصححین کا یہ نوٹ زیرنظر نسخے میں بھی صفحہ 367 پر ہے۔ مگر درفش کی ترتیب کے وقت یہ نسخہ ان کے پاس نہ تھا، اس سے صفحوں کا حوالہ دوسرا ہے۔

تاہم غالب کا اعتراض درست ہے، اور برہان کے بعد کے کسی مولف فرہنگ نے بھی اس لفظ کو باب الراء میں نہیں لکھا ہے۔ بلکہ انجمن آرائے ناصری نے تو برہان کی تغلیط کی ہے، اور صحیح زاوش کو بتایا ہے۔

3. ب رت، بہ فتح اوّل، برہنہ وعریان راگویند۔ و بہ ضم اوّل تہی دست و بےنوا و برہنہ وخالی راگویند۔

غ: ''رت بہ فتح برہنہ وعریاں راگویند، و بہ ضم تہی دست و بےنوا و برہنہ وخالی راگویند۔'' دیدہ دران، خدارا در ہر دو معنی کدام تفاوت پیدا شد۔ ہماں یک معنی بحال ماند۔ و ایں چنیں مقام ہمین قدر نوشتن کافی بود کہ قیل بالفتح، وقیل بالضم[1] 12

عرشی: قاطع (ص 46 اور درفش (ص 76) میں اسے الفاظ بدل کر لکھا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عبارت میں عیب ضعف تالیف موجود ہے۔ خان آرزو نے سراج اللغات میں لکھا ہے کہ ''درجہانگیری بہ فتح برہنہ و بہ ضم تہی دست است۔ و این خطاست۔ ہر دو بہ ضم اول است، چنانکہ در سروری است، زیرا کہ مخفف روت است بہ ہمین معنی چنانکہ قوسی آزردہ، وبعضے لوت بہ لام نیز گفتہ اند۔ و ایں نیز صحیح است، زیرا کہ بدل روت است۔ وتحقیق آنکہ بہ معنی تہی دست مجاز است، ومجازاً بہ معنی خالی ہم آمدہ، چنانکہ زمین رت گویند، یعنی زمین خالی از عمارت، و ویران انجمن آرائے ناصری میں رُت بہ ضم را بہ معنی برہنہ کو بتایا ہے کہ یہ اصل میں لخت تھا از راہ تخفیف لت ہوا، اور ل کار

1. یہ غالب کا خودنوشت املا ہے۔ صحیح بالفتح اور بالضم ہے۔

سے بدل ہوا تو رت بروزن بت ہوگیا۔ فرہنگ نظام میں بہ فتح را لکھ کر یہ بھی بتایا ہے کہ سنسکرت میں رکت रिक्त کہتے ہیں۔

4۔ب: رخنہ —— و بہ ضم اوّل کاغذ را گویند بعربی قرطاس خوانند۔

غ: سندمی خواہا۔ 12

عرشی: یہ اعتراض قاطع اور درفش سے خارج ہے۔ رشیدی (ج 1 ص 734) میں بھی بے سند کے مذکور ہے لیکن اسدی طوسی نے لغت فرس (ص 508) میں شہید کا یہ شعر ثبوت میں پیش کیا ہے:

پیش دُز را رخنہ اشعار مرا بیقدر مکن بگفت گفتار مرا

خان آرزو نے سراج میں تحفۃ السعادۃ کے حوالے سے بہ معنی کاغذ بھی بتایا ہے۔ انجمن آرائے ناصری اور فرہنگ نظام نے بھی بالضم کو کاغذ کا مترادف مانا ہے۔

5۔ب: رستاد بروزن ہفتاد مخفف راستاد است کہ بہ معنی وظیفہ وراتب وروزیانہ باشد۔

غ: راستاد خود غلط است، مخفف یعنی چہ 12

عرشی: راستاد کے سلسلے میں بحث اوپر گزر چکی ہے۔ قاطع اور درفش میں یہ اعتراض بھی جگہ نہ پاسکا۔

6۔ب: رُستہ۔ بہ معنی روئیدہ ہم آمدہ است۔

غ: رستہ رامی گوید کہ بہ معنی روئیدہ ہم آمدہ است۔ ہمانا رستہ رالغتے غیر منصرف و جامد شمردہ است۔ ایں قدر نمی داند کہ رستہ مفعول رستن است، و روئیدہ، مفعول روئیدن۔ رستن مصدر اصل است، روئیدن مصدر مضارعی 12

عرشی: قاطع اور درفش میں اسے بھی شامل نہیں کیا ہے، مگر ہے درست۔

7۔ب: رستی بہ معنی رزق و روزی و نان و حلوا و ما حضر و خورونی اندک ہم ہست آہ۔

غ: رُستی بہ معنی روزی و ما حضر و رُستاد بہ معنی روزینہ وعلوفہ 12

عرشی: یہ عبارت صرف رُستاد کی خاطر لکھی گئی ہے، اور کوئی مطلب معلوم نہیں ہوتا۔

8۔ب: رکیدن، بروزن مکیدن، بہ معنی خود بخود سخن گفتن از روی قہر و غضب۔

غ: غلط است۔ در بحث زای فارسی یا کاف باید آید 12

عرشی: قاطع (ص 46) اور درفش (ص 77) میں اسے بڑھا کر لکھا ہے، یہ اعتراض بھی

درست ہے۔

9۔ب: رگِ جان بکسر ثانی، کنایہ از شریان وحبل الورید۔

غ: رگِ جان، ہمان جانست، نہ حبل الورید 12

عرشی: یہ اعتراض بھی قاطع اور درفش میں جگہ نہ پا سکا۔ رشیدی (ج1 ص 745) میں برہان کی ہمنوائی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر معین بھی (حاشیہ برہان ج2 ص 959) گلستاں کا یہ شعر نقل کر کے اس کے موید نظر آتے ہیں:

گفتی رگِ جان می گسلد زخمۂ اسازش ناخوشتر از آوازہ مرگِ پدر آوازش

خان آرزو بھی سراج اللغات میں رگِ جاں کو بہ معنی ''شریان کہ بہ دل تعلق دارد'' بتاتے ہیں۔ انجمن آرائے ناصری میں یہی معنی بتا کر لسانی کا یہ شعر سند میں پیش کیا ہے:

بیدادگری پنجہ فروبرد بخونم بگرفتہ حریفی رگِ جانم کہ توان گفت

فرہنگ نظام میں بھی رگِ جاں کو بہ معنی شاہ رگ لکھا ہے۔

10۔ب: رگیدن بروزن رمیدن بہ معنی آہستہ آہستہ با خود از روی قہر وغضب سخن گفتن باشد۔

غ: ہم بہ کاف عربی نوشت، وہم بہ کاف پارسی۔ حال آں کہ نہ رای بے نقطہ دارد، نہ کاف فارسی 12

عرشی: قاطع (ص46) اور درفش (ص 77) میں لفظ رکیدن کے تحت اس کو جگہ دی ہے۔

11۔ب: رنجال بروزن چنگال، طعام وخوردنی را گویند۔

غ: رنجال بہ معنی طعام غلط، در بحث رای قرشت بایای حطی باید دید 12

عرشی: قاطع و درفش میں یہ اعتراض بھی شامل نہیں کیا گیا۔ ڈاکٹر معین نے بھی اس پر کوئی حاشیہ نہیں لکھا۔ مگر لغت فرس اور رشیدی میں بھی یہ لفظ نہیں ملتا۔ نہ ''ریجال'' کوئی لفظ ہے۔ ریچال البتہ ہے اور بہ معنی اچار ہے۔ خان آرزو نے سراج میں برہان کا قول نقل کر کے ''لیکن ریحال بہ تحتانی نوعے از خوردنیست، چنانکہ بیاید''، لکھا ہے۔ انجمن آرائے ناصری میں بھی اسے ریچار اور ریچال بتایا ہے۔

12۔ب: رواں کرد، بکسر کاف وسکون راو دال بے نقطہ بہ معنی ملکوت باشد چنانکہ کے آباد بہ معنی جبروت است۔

غ: رواں کرد بکسر کاف، خطای اول این کہ تصریح کاف فارسی نکرد۔ دوم این کہ بہ معنی عالم

ارواح ننوشت۔ اصل اینست کہ روان گرد بہ کاف فارسی مکسور عالم ارواح رانا مند 12

عرشی: قاطع اور درفش میں یہ اعتراض بھی موجود نہیں۔ ڈاکٹر معین نے فرہنگ دساتیر (ص 247) سے جو عبارت نقل کی ہے، وہ تلفظ میں غالب کی، اور معنی میں برہان کی موید ہے۔ یہی صورت فرہنگ انجمن آرائے ناصری کی ہے۔ خان آرزو نے سراج اللغات میں تلفظ برہان کا اور معنی غالب کے مطابق لکھے ہیں۔

13۔ ب: روزگار بردن کنایہ از عمر و اوقات ضائع کردن باشد۔

غ: روزگار بردن ہماں عمر بسر کردن است، خصوصیت تلف کردن لغو 12

عرشی: قاطع اور درفش سے یہ اعتراض بھی خارج ہے۔ ڈاکٹر معین نے برہان کے خلاف کوئی حاشیہ نہیں لکھا۔ رشیدی (ج 1 ص 757) اور انجمن آرائے ناصری میں ''یعنی عمر و وقت ضائع کردن'' معنی لکھے ہیں، جو برہان کی تائید میں ہے لیکن خان آرزو نے سراج میں برہان کے معنی لکھ کر کہا ہے کہ ''لیکن صرف کردن عمر است ''مطلقا'' غالب کی تائید میں ہے۔

14۔ ب: روکش بہ فتح اول و کاف بروزن مہوش بہ معنی ہر باشد آہ۔

غ: ''روکش بہ فتح اول و کاف بروزن مہ وش'' برای خدا وزن مہوش کجا درست می آید۔ بروزن نورس چرا ننوشت 12

عرشی: اس اعتراض کو بھی قاطع اور درفش میں جگہ نہیں دی ہے۔

15۔ ب: روم بہ ضم اوّل و ثانی مجہول بروزن موم موی زہار باشد۔

غ: روم بہ ضم اول و ثانی مجہول موی زہار را در کدام زبان گویند۔ فارسی خود نیست۔ عربی نہ خواہد بود۔ آری، در ہندی روم رونگٹہ را گویند، وآن ترجمۂ مسام است۔ در فارسی این رانامے جداگانہ نیست، مگر بن مو گویند۔ روم بہ معنی موی زہار تمسخر است 12

عرشی: قاطع میں یہ اعتراض نظر انداز ہو گیا ہے۔ لفظ ''رم'' کے تحت برہان میں لکھا ہے کہ ''بہ ضم اول موی زہار آدمی باشد'' اس پر بحث کرتے ہوئے درفش (ص 75) میں لکھا ہے کہ ''وانچہ در لسان عرب معنی این لفظ گرد آوردہ است یعنی گریختن و گریز و چیز خوردن و بہ علاج آوردن و بہ تغیر اعراب، موی زہار، پرسش عیب نیست خاصتاً وقتے کہ پرسندہ جویای تحقیق باشد — موی زہار را خود بروی خواجہ برہان آوردن سوء ادبست۔ ہر چند

از علما پژوہش رفت، و کتب مشہورۂ لغات عرب ورق ورق نگرستہ شد، کسے نگفت و در ہیچ فرہنگ بہ نظر نیامد کہ رم لغت عربیست بہ اول مفتوح بہ معنی فراز و بہ اول مضموم بہ معنی موی زہار — ایں قدر البتہ می تواند بود کہ خواجہ قطرب از عربی کردن لغت فارسی ثواب مسلمان کردن یک گبراندوختہ باشد، آں ہم در خیال، نہ در واقع۔"

اس عبارت میں جملہ "معنی موی زہار را خود بروی خواجہ برہان آوردہ سوء ادبست" اور اس کے بعد مولف برہان کو "خواجہ قطرب" کہنا جس کے معنی جاہل اور سفیہ بھی ہیں، اخلاق کے خلاف ہے۔

رہا غالب کا یہ کہنا کہ رم کے معنی سوائے بہ معنی رمہ کے سب غلط ہیں یا صاحب برہان نے رم بہ فتح اول کو عربی کہا ہے، یا بہ ضم اول بہ معنی موی زہار کو عربی بتایا ہے، یہ درست نہیں ہے، رشیدی (ج 1، ص 746) میں لکھا ہے کہ "رم، بالضم، موی زہار، و بالکسر مخفف ریم، و بالفتح مخفف رمہ، ورمیدگی و امر برمیدن، و گوشت اندرون، بیرون دہان۔ رودکی گوید:

آرزومند آن شدہ تو بکور   کہ رسد نان پارہ ات پی رم

خود برہان سے اور رشیدی سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کی اور شکلیں رنب اور رنبہ بھی ہیں، چنانچہ رشیدی (ج 1 ص 746) میں رنبہ بالضم و بای مفتوح کے معنی موے زہار لکھ کر لیبی کا یہ شعر سند میں پیش کیا ہے:

آں گاہ کہ من ہجات گویم   تو ریش کُنی و زَنت رُنبہ

اسی رُم کی دوسری اشباعی شکل روم ہے انجمن آرائے ناصری میں رم اور روم اور رومہ تینوں کو بہ معنی موے زہار لکھا ہے، اور رومہ کے لیے سوزنی کا یہ شعر سند میں پیش کیا ہے:

شد جامی جامی ریختہ از ننگ روی او   ریشے کہ تنگِ دارد از و رومۂ زہار

سراج اللغات اور فرہنگ نظام سے بھی برہان ہی کی تائید ہوتی ہے۔ خود برہان میں رومہ کے معنی موی زہار لکھے ہیں اور غالب نے اس کی تردید نہیں کی ہے۔ اس لیے اس میں شبہ نہیں رہتا کہ یہ لفظ بہ معنی موی زہار بے اصل اور تمسخر کسی طرح بھی نہیں۔

16۔ب: رہبان، بہ ضم اول و بای ابجد بہ الف کشیدہ بروزن بہتان زاہد و پرہیزگار باشد۔

دو جوہ تسمیہ اش محافظت کنندۂ نیکی و سیرت نیک باشد۔ چہ رہ بہ معنی نیکی دہان بہ معنی محافظت کنندہ است، چنانچہ باغبان وگلہ بان و امثال آن۔ و بہ فتح اول خداوند راہ۔

غ: رہبان بہ ضم می نویسد، و باز می نویسد کہ رہ بہ معنی نیکی و بان بہ معنی حافظ۔ گوئی ایں لغت را فارسی شمردہ، حال آن کہ در فارسی رُہ بمعنی نیکی ہرگز نیامدہ۔ راہب و رہبان یقین است کہ لغت عربی باشد بہ معنی زاہدان ترسا 12

عرشی: قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو جگہ نہیں دی ہے، حالانکہ یہ درست تھا۔

17۔ب: رہیدن — بہ معنی خلاصی شدن آہ

غ: ایں مصدر مضارع رستن است 12

عرشی: قاطع اور درفش میں یہ اطلاع بھی مندرج نہیں ہے۔

18۔ب: ریتہ بہ فتح فوقانی بروزن ریشہ بار درختے است آہ

غ: ریتہ ہرگز لغت فارسی نیست۔ ثمریست ہندی۔ مردم ولایت بہ تغیر لہجہ ریتہ گویند۔ ورنہ دراصل ریٹھہ نام آنست بہ تائ ہندی مختلط التلفظ بہ ہای ہوز 12

عرشی: یہ اعتراض بھی قاطع اور درفش میں شامل نہیں کیا گیا، حالانکہ ہے درست۔

19۔ب: ریچال بروزن قیفال بہ معنی ریچار است کہ مربای دوشابی وانچہ ارشیر و ماست گوسفند وغیرہ پزند۔

غ: ریچار بہ معنی آچار درست 12

عرشی: قاطع اور درفش میں یہ تصویب بھی شامل نہیں ہے۔

20۔ب: ریہانیدن بروزن پیچانیدن بہ معنی ویران کردن باشد۔ ریہانیدہ — یعنی خراب کردہ و ویران ساختہ۔

غ: در صحت این ہر دو لغت تامل بلکہ انکار است 12

عرشی: قاطع اور درفش میں یہ اعتراض بھی شامل نہیں کیا گیا۔ رشیدی، سراج اور انجمن آرائے ناصری میں یہ لفظ موجود ہے۔

21۔ب: ریہیدن بروزن پیچیدن بہ معنی افتادن باشد آہ۔

غ: ریہانیدن و ریہیدن، این ہر دو لغت جامع از پیش خود تراشیدہ است 12

عرشی: یہ اعتراض بھی قاطع اور درفش میں نہیں ملتا۔ اس کی وجہ بھی وہی رشیدی وغیرہ میں ان

لفظوں کا ملنا ہوگا۔

22۔ ب: زاج سور بہ سکون جیم نام شادی وجشن وسورمی باشد کہ در ہنگام زائیدن زناں وایام ولادت کنند۔

غ: زاج سور۔ بہ جیم عربی غلط۔ زاچ سورات بہ جیم فارسی۔ وہندی آں چھٹی کی شادی 12

عرشی: قاطع اور درفش میں یہ بھی شامل نہیں ہے، شاید اس لیے کہ زاج جیم عربی و فارسی دونوں سے درست ہے۔

23۔ ب: زادشم۔۔ نام پدر افراسیاب است۔ وبعضے گویند نام جد افراسیاب است آہ۔

غ: نام پدر افراسیاب زادشم ہرگز نیست۔ نام جدوی زادشم ابن تور است۔ و نام پدر افراسیاب پشنگ 12

افراسیاب ابن پشنگ ابن زادشم ابن تور ابن وندون ابن آتبین ابن جمشید 12

عرشی: قاطع اور درفش میں اس کو بھی جگہ نہیں دی ہے۔

24۔ ب: زادمرد۔۔ مخفف آزادمرد کہ جوانمرد وکریم وصاحب ہمت باشد۔

غ: زاد مرد مخفف آزادمرد سند می خواہد۔ و بہ معنی جوانمرد وسخی رادمرد است بہ رائے بے نقطہ 12

عرشی: قاطع اور برہان میں یہ اعتراض بھی شامل نہیں ہے۔ رشیدی (ج 1 ص 66) میں لکھا ہے: مخفف آزادمرد، مولوی گوید:

زاد مردے چاشگاہے در رسید

اما دریں بیت برای مہملہ نیز خواندہ اند۔ یعنی جوانمرد۔

خان آرزو نے بھی ''راد مرد'' بالراء المہملہ کو اقرب بصواب بتایا ہے۔ لیکن انجمن آرائے ناصری میں زاد کو آزاد کا مخفف بتا کر لکھا ہے کہ عنصری نے بہ معنی آزاد کہا ہے:

گفتم کہ ساعتے سیر من فرو نشیں
گفتا کہ زاد سرو زمانے فرو نشاں

نیز فرخی نے کہا ہے:

کنوں چو مست غلامان سبز پوشیدہ
بوستان شود از باد زاد سرو تواں

(یعنی متحرک) اور ظاہر ہے کہ سرو کو آزاد کہا جاتا ہے۔ لہٰذا یہاں رو نہیں ہوگا بلکہ زاد بہ

زای منقوطہ ہی ہوگا۔

25۔ ب: زاوش، بہ ضم واو بروزن خامش نام کوکب مشتری باشد۔ و باین معنی بروزن خموش وخاموش ہم آمدہ است و بروزن خاموش کوکب عطارد را نیز گفتہ اند۔

غ: غلط است۔ عطارد را نگویند۔

عرشی: قاطع اور درفش میں یہ اعتراض بھی جگہ نہ پاسکا، حالانکہ خان آرزو نے سراج میں صاف لکھا ہے کہ شمس فخری نے جو اسے بہ معنی عطارد لکھا ہے وہ غلط ہے اور کسی لغت سے بھی برہان کی تائید نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر معین بھی اس بارے میں خاموش ہیں۔ اس لیے یہ اعتراض بھی درست قرار پائے گا۔

26۔ ب: زندش بروزن رنجش بہ معنی تحیت و درود وسلام است۔

غ: زندش بہ زای مکسور است 12

عرشی: قاطع اور درفش میں یہ اعتراض بھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر معین نے لکھا ہے کہ یہ دساتیری لفظ ہے اور فرہنگ دساتیر (ص 249) میں موجود ہے۔

27۔ ب: زی بہ فتح اوّل وسکون ثانی، جان وحیات و زندگی را گویند کہ نفس وروح است۔ و بہ این معنی بکسر اوّل ہم آمدہ است، چنانکہ در امر باین معانی گویند کہ دیرزی یعنی بسیار بمان و پیوستہ زندہ باش 15 وبکسر اوّل بہ معنی اندازہ وحد باشد ہم چنانکہ گویند از می خود بیرون رفتہ است، یعنی از حد و اندازۂ خود بیرون رفتہ است و بہ معنی سوی وطرف و جانب ونزدیک ہم است چنانکہ گویند زی فلان، یعنی طرف فلان وسوی فلان و جانب فلان ونزدیک فلان۔ و باتشدید ثانی در عربی بہ معنی شعار باشد۔

غ: زی بہ فتح اوّل وسکون ثانی جان وحیات و زندگی را گویند۔ این عبارت تا جائے کہ نشانست (5) ہمہ مہمل و دروغ و پوچ است، ہرگز بہ فتح زای ہوز نفس وروح رانگویند۔ زیستن مصدر، یعنی جینا، زید مضارع یعنی جیے، زی امر یعنی جیتا رہ۔ واین کہ گفتہ است بمعنی اندازہ حد، محض غلط۔ ہماں بہ معنی شعار است کہ خود نوشتہ است۔ آرے بہ معنی سوی و جہت دراست۔ پس این لفظے است کہ در عربی باتحتانی مشدد بہ معنی شعار آید، و در فارسی صیغۂ امر است از زیستن۔ وبمعنی طرف و جہت مرادف سوی نیز آید۔ زی بہ فتح اوّل بہ معنی حیات و زندگی ونفس وروح شاید زبان اجنہ باشد 12۔

عرشی: پہلے عرض کردوں کہ یہ اعتراض بھی قاطع اور درفش میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ میرزا صاحب نے ''اجنہ'' غلط لکھا ہے، جن کی جمع جِنّہ ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں بھی آیا ہے: ''مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ.''

رہا ان معانی کا غلط ہونا، تو ڈاکٹر معین نے اس سلسلے میں بالکل خموشی اختیار کی ہے۔ خان آرزو نے سراج میں لکھا ہے کہ برہان کا اسے بہ معنی حد و اندازہ کہنا خطای فاحش ہے۔ یہ وہی عربی لفظ ہے بہ معنی شعار۔

28۔ ب: ژکیدن — بہ ضم اوّل ہم آمدہ است۔

غ: ژکیدن بہ زای فارسی مفتوح است، نہ بہ ژای فارسی مضموم، و نہ بہ رای مہملہ 12

عرشی: قاطع اور درفش میں یہ اعتراض اس جگہ چھوڑ دیا ہے کیونکہ لفظ رکیدن کی بحث میں یہ باتیں گزر چکی ہیں۔ فرہنگ نظام میں اس لفظ کو نہ حرف ر میں لکھا ہے، نہ حرف ز میں، بلکہ ژائے فارسی کی ردیف میں ذکر کیا ہے، جو برہان کی تائید ہے۔

29۔ ب: ستا بکسر اوّل — نوعے از چادر باشد کہ آں را شامیانہ و سائبان ہم می گویند ستارہ بہ فتح اول آہ

غ: در صفحۂ اوّل ستا، بہ کسرۂ سین شامیانہ و سائبان را گویند، حال آں کہ شامیانہ دیگر است، و سائبان دیگر۔

ازین در گزشتہ ستارہ بہ فتح اوّل می نویسد۔ لاحول ولاقوت الا باالله 12۔''[1]

عرشی: قاطع اور درفش دونوں میں اس اعتراض کو بھی شامل نہیں کیا ہے، حالانکہ یہ درست ہے۔

30۔ ب: ستوسر بروزن کبوتر ہوای باشد با صدا کہ بے اختیار از راہ دماغ بجہد۔ و آں را بعربی عطسہ خوانند۔

غ: ستوسر بروزن کبوتر عطسہ در بحث شین بانون شنوسہ می نویسد، و خود ہم دریں بحث ستوسہ می آرد، تا کدام لغت صحیح است 12

عرشی: قاطع (ص 48) اور درفش (ص 79) میں یہ بھی بتایا ہے کہ صحیح لفظ شنوسہ ہے، جو خود آگے چل کر برہان میں بھی مذکور ہوا ہے۔ ڈاکٹر معین نے بھی (حاشیہ برہان 2 ص 1102) اسے سنوسہ کا مصحف بتایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا املا شنوشہ دو شینوں کے ساتھ

---

[1] یہ غالب کا خود نوشت املا ہے۔ صحیح ''قوۃ'' اور ''باللہ'' ہے۔

بھی ہے۔ رشیدی میں یہ لفظ اشنوسہ اور شنوشہ دو شکلوں میں مذکور ہوا ہے، اور معنی وہی عسطہ (چھینک) ہیں۔ شنوشہ کی سند میں رودکی کا یہ شعر دیا ہے:

مرا امروز توبہ سود دارد　　چنانچہ دردِ دنداں را شنوشہ

اور اشنوشہ کی سند میں ابوالخیر کا یہ شعر لکھا ہے:

دماغ خشک او اشنوشۂ تر　　چو آرد، گوش گردوں را کند کر

خان آرزو نے سراج میں ستوسرا اور ستوسہ دونوں کو شنوشہ کا مصحف بتایا ہے، جو غالب کی تائید ہے۔ انجمن آرائے ناصری نے اس کی دو شکلیں بتائی ہیں۔ شنوشہ اور شنوسا۔ فرہنگ نظام میں صرف شنوشہ کو اختیار کیا ہے۔

21۔ ب: سدر۔ بہ فتح اوّل وثانی وسکون رائے قرشت آہ۔

غ: سدر بہ سکون رائے قرشت۔ یارب، درلغت فارسی اطلاع سکون حرف آخر چرا12

عرشی: قاطع اور درفش میں یہ اعتراض بھی نہیں ملتا۔ مگر ہے درست۔

32۔ ب: سراسیمہ، بہ معنی شورہ سر باشد، چہ آسیمہ بہ معنی شوریدہ آمدہ است۔ و بہ معنی مضطرب وحیران ہم گفتہ اند۔

غ: آسیمہ، بہ معنی آشفتہ، و سراسیمہ بہ معنی آشفتہ سر، قیاس مرددکنی است۔ سراسیمہ بہ معنی آشفتہ است، وتنہا آسیمہ بہ معنی ورم زدہ می تواند بود 2

عرشی: قاطع اور درفش سے یہ اعتراض بھی خارج ہے۔ رشیدی نے آسیمہ کو بہ معنی پریشان لکھا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ آسیمہ اصل میں آسامہ ہے، الف بہ صورت امالہ ہی سے بدل گیا ہے اور آسام یا تو قلب آماس بہ معنی ورم ہے اور یا بہ معنی آماس ہے، اور سام اُس کا مخفف ہے، یہی رائے صاحب انجمن آرائے ناصری کی ہے۔ خان آرزو نے فردوسی کا یہ قول نقل کر کے:

برہ گیو را دید پژمردہ روی　　ہمی زاید آسیمہ و پوی بوی

لکھا ہے کہ آسیمہ تنہا بھی بمعنی بیہوش ومتحیر آتا ہے۔

33۔ ب: سرانج، سراغوچ، سراغوش، سراگوش آہ

غ: یک لغت راپنج لغت ساخت۔ چہار دریک جاذکرنکرد 12

عرشی: یہاں غالب سے چوک ہوئی ہے۔ ''پنج'' کے بجائے ''چہار'' لکھنا چاہیے تھا۔ بہرحال،

یہ اعتراض بھی خارج از قاطع و درفش ہے، مگر ہے درست۔

34۔ ب: سرایاں— خوانندگی و گویندگی و نغمہ سرائی کناں را گویند۔

غ: سرایان، خوانندگی و گویندگی رانگویند۔ ایں و نون حالیہ ہست، چوں گریاں و خنداں 12

عرشی: قاطع (ص 48) اور درفش (ص79) اگلے لفظ سرایش کے ساتھ ملا کر یہ اعتراض لکھا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر اُن سے چوک ہوگئی۔ برہان میں سرایاں کے معنی خوانندگی و گویندگی نہیں لکھے ہیں، بلکہ ''خوانندگی و گویندگی و نغمہ سرائی کناں'' لکھے ہیں، اور یہ درست ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر معین نے بھی اس لفظ کو سرائیدن کا اسم فاعل اور حال بتایا ہے۔

35۔ ب: سرایش— بہ معنی زبان قال است کہ سخن گفتنی و نغمہ پردازی آدمیان و سرود مرغان باشد۔

غ: سرایش تنہا زبان قال رانگویند۔ زبان سرایش زبان قال و زبان ناسرایش زبان حال 12

عرشی: قاطع (ص 48) اور درفش (ص 79) میں یہ اعتراض ''سرایان'' کے ساتھ ملا کر لکھا ہے۔ رشیدی (ج 2، ص 845) اور سراج اللغات و انجمن آرائے ناصری میں اسے بہ معنی نغمہ پردازی و گویندگی لکھا ہے اور صاحب برہان نے بھی زبان قال کی تشریح ''سخن گفتنی و نغمہ پردازی آدمیان و سرود مرغان'' سے کی ہے۔ اس لیے یہ اعتراض قابل پیش رفت نہیں معلوم ہوتا۔

36۔ ب: سر پرست— بروزن زر پرست بہ معنی خادم و خدمت گار باشد۔

غ: سر پرست بہ معنی خادم و خدمت گار سند می خواہد۔ آرے در اردوی مشہور سر پرست بہ معنی مربی و محسن زباں زد عام و خاص است و در فارسی بہ معنی خادم بہ نظر نیامدہ 12

عرشی: قاطع (ص 48) اور درفش (ص 79) میں بھی اسے لکھا ہے اور سند مانگی ہے۔ ڈاکٹر معین نے (حاشیہ برہان ج10، ص 117) لکھا ہے: ''لغۃً بہ معنی پرستندہ (خدمت کنندہ) سر (سرور) در زبان کنونی بہ معنی رئیس و کفیل خانوادہ و موسسہ وغیرہ استعمال می شود۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہ معنی مربی و محسن اردو ہی کا محاورہ نہیں ہے، بلکہ فارسی میں بھی اسی طرح بولا جاتا ہے۔ خان آرزو نے سراج میں بہ معنی خادم و خدمت گار کو مجازی استعمال قرار دیا ہے۔ انجمن آرائے ناصری نے بہ معنی مہماندار و خادم

و بیماردار و پرستار بیمار' بتایا ہے۔ فرہنگ نظام میں لکھا ہے: زبان شعر میں سرپرست کے معنی خادم و تیماردار و پرستار ہیں۔ لیکن عام بول چال میں بہ معنی مربی و نگاہ دارندہ ہے۔

37۔ب: سکاد— بروزن سواد کوہ وفرق سر آدمی را گویند۔

غ: آں چکاد است بجیم فارسی۔ وجیم فارسی با سین بدل نمی شود 12

عرشی: قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو درج نہیں کیا ہے۔ خان آرزو نے سراج میں اور ہدایت نے انجمن آرائے ناصری میں، ڈاکٹر معین نے (حاشیہ برہان ج2 ص 1150) میں اسے چکاد کا بدل مانا ہے۔



قاطع برہان غالب کا مسودہ

مرزا غالب نے برہان قاطع پر جو تنقید کی تھی، اُس کا ابتدائی مسودہ وہ چھوٹی بڑی عبارتیں ہیں، جو انھوں نے برہان کے مطبوعہ نسخے کے حاشیوں یا بین السطور میں لکھی تھیں۔ یہ تحریریں اُردو میں بھی ہیں اور فارسی میں بھی۔ بعض مقامات پر آدھی فارسی اور آدھی اردو لکھی گئی ہے۔

میں نے مختلف اوقات میں یہ عبارتیں اپنی موافق یا مخالف رائے کے ساتھ ادبی رسالوں میں چھپوانا شروع کی تھیں اردو نوٹس سب شائع ہو گئے تھے اور فارسی بھی حرف سین تک اسی رسالہ 'نیا دور' میں چھپ چکے ہیں۔ آج کی صحبت میں کچھ اور فارسی تحریریں پیش کر رہا ہوں۔

پہلے میں نے برہان قاطع کی وہ عبارت نقل کی ہے، جس پر مرزا صاحب نے کچھ لکھا ہے۔ اس کے لیے صرف ''برہان'' جلی قلم سے لکھا ہے بعد ازاں مرزا صاحب کی وہ تحریر ہے جو انھوں نے اپنے قلم سے برہان قاطع کے نسخہ مطبوعہ کے حاشیے یا متن میں لکھی ہے۔ اسے لفظ ''غالب'' سے ظاہر کیا ہے۔ اپنے خیالات کا اظہار ''عرشی'' لکھ کر کیا ہے۔

غالب کی تحریریں نقل کرتے وقت اس کا التزام کیا ہے کہ غالب کے املا کی پیروی کی جائے خواہ وہ غلط ہو اور اگر انھوں نے الفاظ پر لکیر کھینچی ہے، تو اُسے بھی ترک نہیں کیا ہے۔ امید ہے کہ اہل علم ان تحریروں کو دلچسپی سے پڑھیں گے۔

(1) برہان: شابود بفتح واو بروزن چارقد بمعنی ہالہ وطوق وخرمنِ ماہ باشد۔

غالب: شاب ود بمعنی ہالہ ماہ 12

شاب ورد بوزن لاجورد ایضاً 12

---

1. قوسین میں مندرج الفاظ میں نے لکھ دیے ہیں تا کہ ناظرین کو کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ نیز جن الفاظ پر خط کھینچا گیا ہے، وہ خود غالب کے مسودہ کے مطابق ہے۔

نیا دور، جنوری فروری 1972

شادورد بمعنی ہالہ ماہ 12

شارودر بمعنی ہالۂ ماہ۔ ایں لغت چارم است۔ دریں بار ری قرشت از کجا آورد؟ اکنوں کدام لغت را صحیح دانیم و در عبارت بکار آریم 12 (غالب 12)

(شاہ ورد) سبحان اللہ ایں لغت پنجم است بمعنی ہالۂ ماہ۔

شای وردایں لغت ششم است بمعنی ہالہ ماہ۔ 12

عرشی: میرزا صاحب نے قاطع برہان اور درفش کاویانی دونوں میں اس ایک لفظ کی مندرجہ بالا چھ صورتوں کو ان کے ہموزن الفاظ کے ساتھ درج کر کے لکھا ہے کہ ''تا صحیح کدامست'' لیکن ان کا صرف یہ لکھ دینا حق تنقید کو ادا نہیں کرتا کہ خدا جانے ان چھ صورتوں میں سے کون سی درست ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ان میں صرف 3 شکلیں درست ہیں، شادورد، شاہ ورد اور شایورد۔ باقی سب مصحف ہیں۔ شادورد کی شہادت میں فرہنگ نظام نے اسدی طوسی کا یہ شعر پیش کیا ہے:

چہ ترکے کہ مہ گردِ او شادورد
بنا ورد گاہِ یلے در نبرد

اور شایورد کی سند میں خود اسدی طوسی نے (لغت فرس: 87) یہ شعر لکھے ہیں، جن کا قائل پیروز مشرقی ہے:

بخط و آں لب و دندانش بنگر   کہ ہموارہ مرا دارند در تاب
یکے ہمچو پرن بر اوج خورشید   یکے چون شایورد از گردِ مہتاب

فیروز کا شعر درج کیا ہے۔ چونکہ بقولِ فرہنگِ انجمن آرا دال اور ت کا بدل ہوتا ہے، اس لیے ہوسکتا ہے کہ اس نے شای ورد کو غلط پڑھ کر یہ شکل نہ پیدا کی ہو، بلکہ یہ لفظ بالتا بھی بولا جاتا ہو۔ شادورد کے لیے رشیدی میں لطیفی کا یہ شعر پیش کیا گیا ہے:

دل گشتہ از علامت خطت اُمیدوار   چوں برزگر کہ او شود از شادورد شاد

خانِ آرزو نے سراج اللغۃ میں شابورد کو شایورد کی تصحیف قرار دیا ہے، اور شادورد کے تحت لکھا ہے کہ ''تحقیق آن است کہ بمعنی فرشتے کہ اندازند، شادورد است بدال، وبمعنی ہالہ شای ورد بتحتانی۔ وشادرد ومخففِ آن، وشاہ ورد مبدل آن چنانکہ

شایگان وشاہ گان، وبمعنی گنج و پردۂ موسیقی بدال است۔''

ڈاکٹر معین نے حواشی برہان میں خانِ آرزو کی طرح مذکورۂ بالا تین صورتوں کو صحیح مانا ہے۔ فرہنگ نظام میں شاہورد کا ذکر نہیں، نیز اس میں شادورد اور شایورد کو ایک دوسرے کا بدل مانا ہے مگر میری نظر میں ایسی کوئی اور مثال نہیں۔

(2) برہان: شاخل۔ بروزن داخل نام نوعے از غلہ است و نان ازاں پزند۔ وبضم ثالث ہم آمدہ است۔

غالب: شاخل بکسرِ ثالث غلط است، چنانکہ خود بعد ازیں شاخول می نویسد، ونمی داند کہ واو از اشباع ضمہ پیدا می شود نہ از اشباعِ کسرہ۔ قطع نظر ازین غلطی در آخر می نویسد کہ ''قسمے از غلہ است و نان ازان پزند۔''

حال آنکہ شاخل بہ خای مضموم اسم ارہر است، واز ارہر نان کسے نمی پزد، مگر در دکن کہ مولد این ناقل است، می پختہ باشند 12

عرشی: قاطع برہان اور درفش کاویانی میں معمولی سی کمی وبیشی الفاظ کے ساتھ یہی عبارت نقل کردی ہے۔ اس میں مرزا صاحب نے برہان پر دو اعتراض کیے ہیں۔ پہلا یہ کہ بمعنی غلہ شاخل بضم خا یعنی بروزن کاکل ہے۔ دوسرا یہ کہ شاخل جس کی دوسری (اشباعی) شکل شاخول ہے، اور ہندی میں جسے ارہَر کہتے ہیں، روٹی پکانے کے کام میں نہیں آتی۔ پہلا اعتراض درست ہے، چنانچہ خانِ آرزو نے سراج اللغۃ میں لکھا ہے کہ ''بعضے بفتحِ خا و بعضے بکسر۔ گفتہ اند۔ وصحیح بضم خا است، زیراچہ شاخول بواو نیز بدیں معنی آمدہ'' بفتحِ خا لکھنے والے اینجوی شیرازی اور بالکسر برہان ہیں۔

لیکن دوسرا اعتراض قابلِ غور ہے، کیونکہ جہانگیری اور اس کے تتبع میں رشیدی، انجمن آرا اور فرہنگ نظام نے خاقانی کا یہ شعر ''نان شاخل'' کے ثبوت میں پیش کیا ہے:

می خوری تو گرچہ الوانِ نعمت اندر خوانِ کس
نانِ شاخل خوشتر آید، گر خوری برخوانِ خویش

اگر شعر کا متن درست نقل ہوا ہے، اور دیوان میں ''نان و شاخل'' نہیں تو پھر میرزا صاحب کو ماننا پڑے گا کہ دکن میں نہیں، خود ایران میں بھی ارہر کی روٹی پکائی جاتی ہے۔''[1]

---

1 دیوان خاقانی کے ایرانی ایڈیشن میں یہ شعر نہیں۔

(3) برہان: شاوور باواؤ بر بروزن و معنیِ شاپوراست۔ واو بادشاہے بود از آلِ اشک بن یافث۔ و شخصے را نیز گویند کہ میانِ عاشق و معشوق میانجی باشد، و پیغامِ ایشان را بیک دیگر برساند۔

غالب: (در قاطع و درفش): شاوور بواو اسم بادشاہ نوشت۔ و بازمی نویسد کہ شخصے را نیز گویند کہ میان عاشق و معشوق میانجی گری کند۔ نغز لغتے آورد کہ افادہ ہای بسیار دارد۔ اسم، ہیچ بادشاہ شادور نبودہ است آن شاپوراست مخففِ شاہ پور، یعنی پور شاہ۔ وآن را کہ میانِ زن و مرد میانجیگری کند، نیز شادور نگویند۔ آرے مصورے بود در زمانِ خسرو پرویز کہ شاور اسم اصلی آں بود۔ و چون شاورِ مذکور در شکارگاہِ شیرین تصویرِ خسرو کشید، و پیام آں پری چہرہ خاتون نزدِ خسرو مہر تمثال آورد، مردم در گمان افتادند کہ مگر شاوور اسم صفت است، و ہر کہ چنیں کند، اورا شاوور خوانند۔ کاتبان را مغلطۂ دیگر افتاد کہ شاوور را چون لغتے غریب بود، بشاپور غلط کردند، و مصورِ خسرو را کہ شاوور بواو نام اوست، شاپور نوشتند۔

حاصل گفتار آن کہ اسمِ بادشاہ شاپوراست بہای فارسی و واؤ، واسم مصورِ خسرو شادور است بہر دو واؤ، نہ بہائے فارسی و واؤ۔

عرشی: میرزا صاحب نے شاوور پر کوئی حاشیہ نہیں لکھا، بلکہ برہان کے متن میں اپنے قلم سے یوں اصلاح کردی ہے: ''شاوور با واو بروزنِ شاپور است۔ وبمعنی شاپور کہ او پادشاہے بود از آلِ اشک بن یافث، غلط است، بلکہ شخصے را گویند کہ میان عاشق و معشوق میانجی باشد و پیغامِ ایشاں را بیک دیگر رساند''

کسی کتاب پر تنقید کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ ناقد اپنی طرف سے متن کتاب میں اصلاح کردے، چاہے مصنف نے کیسی ہی فاحش غلطی کیوں نہ کی ہو۔ یہ اصلاح کسی طرح قبول نہیں کی جاسکتی، اور میرزا صاحب کو اس کی جواب دہی کرنا پڑتی، اگر ان کی زندگی میں یہ کتاب کسی مخالف کے ہاتھ آگئی ہوتی۔ رہا میرزا صاحب کا یہ اعتراض کہ بادشاہ کا نام شادور نہیں، شاپور ہے، اور مصورِ خسرو کا نام شاوور ہے، اور شاوور کے معنی میانجی نہیں، تو اس بارے میں خانِ آرزو نے یہ لکھا ہے: ''شاوور بروزن و معنی شاپور — بلکہ بدین معنی مبدّلِ شاپور است۔ و ازیں

معلوم می شود کہ بای فارسی نیز بواوٗ بدل شود، چہ شاپور دراصل شاہ پور است یعنی پسر شاہ۔ و در برہان نیز شخصے کہ میان عاشق و معشوق میانجی باشد۔ و اغلب کہ ایں حکایت خطاست، زیرا کہ بدین معنی نام شخصے است کہ میانجی بود میانِ شیریں و خسرو۔ وقصہٗ او در کتابِ شیریں وخسروِ نظامی و دیگر کتب مذکور است۔ غایتش اگر بہ ثبوت رسد، مجاز خواہد بود، چنانکہ حاتم بمعنیِ سخی و جوانمرد مطلقاً۔"

اس سے مرزا صاحب کے ایک اعتراض کی تائید ہوتی ہے اور چونکہ ابھی تک مجھے کوئی ایسی دوسری مثال نہیں ملی جس میں پ نے واو کی شکل اختیار کی ہو، اس لیے خانِ آرزو کے بیان سے میرزا صاحب کا پہلا اعتراض برجا رہا۔ انجمن آرا میں اس کی تصریح ہے کہ شادورنام بادشاہ نہیں، بلکہ ایک مردِ نقاشِ حیلہ گر کا نام تھا، اس سے میرزا صاحب کی تائید ہو جاتی ہے۔[1]

(4) برہان: شب — باتشدید ثانی نوعے از زاج باشد — وگویند، بایں معنی عربیست۔

غالب: گویند چہ معنی دارد۔ بیشک عربی است 12

عرشی: قاطع اور درفش میں یہ اعتراض نہیں دہرایا، حالانکہ درست تھا۔ عربی لغات میں انھیں معنی کے ساتھ یہ لفظ موجود ہے، اور کسی نے یہ نہیں لکھا کہ فارسی کی تعریب ہے۔

(5) برہان: شبالنگ بفتحِ لام وسکونِ نون وکاف فارسی نخچیر را گویند۔

غالب: سندمی خواہد۔ 12

عرشی: قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو بھی جگہ نہیں دی۔ جہانگیری، برہان از ڈاکٹر معین، رشیدی اور انجمن آرا میں لفظ موجود ہے، مگر سند نہیں۔ سراج اللغۃ اور فرہنگ نظام میں سرے سے لفظ ہی نہیں۔

(6) برہان: شبغا، شبغاز، شبغازہ، شبغاد، محوطہ و جاے را گویند کہ شبہا اسپ و گاو و خرو گوسفند دراں بسر برند۔

غالب: ان چار لغت میں سے صحیح کون سا ہے 12

عرشی: قاطع اور درفش میں اس سوال کو بھی داخل نہیں کیا۔ دراصل یہ چاروں لفظ صحیح ہیں۔

---

[1] ڈاکٹر معین نے برہان کے حواشی میں اس مسئلہ پر کچھ نہیں کہا جس کا یہ مطلب نکل سکتا ہے کہ وہ صاحب برہان کے ہم خیال ہیں۔

شبغا دوسری شکل ہے شبگاہ کی، اور شبغا مخفف ہے شب غاو کا۔ رہے شب غاز و شبغازہ، تو غاز کے معنی ہیں شگاف (یعنی غار یا کوہ) اور غازہ منسوب بہ غاز۔ لہٰذا شب غاز و شبغازہ سے مراد وہ کھوہ ہوئی جہاں خانہ بدوش لوگ اپنی بکریاں وغیرہ رات کو بند کردیتے ہیں۔ بعدازاں یہ لفظ بھی شبغاد کی طرح جای شب بسر کردنِ گوسفنداں کے لیے بولے جانے لگے۔

اس سلسلے میں لغتِ فرسِ اسدی طوسی (ص 488)، سراج اللغۃ تحتِ لفظ شوغا و شوغاہ و غاز اور رشیدی و انجمن آرا تحتِ لفظِ شبغا و غازہ ملاحظہ فرمائیے۔

(7) برہان: شبگرد بفتحِ کاف فارسی وسکونِ را و دالِ بے نقطہ ماہ را گویند۔ و بعربی قمر خوانند۔ وعسس وشبرو را نیز گفتہ اند۔

غالب: در تحتِ لفظِ شبگرد می نویسد کہ ماہ یعنی قمر را گویند۔ استغفراللہ۔ شبگرد و شب افروز صفتِ ماہ می تواند بود، نہ اسمِ ماہ۔ تنہا شبگرد گفتن و ماہ خواستن تمسخر است۔ ماہ شبگرد واختر شبگرد و ستارۂ شبگرد اگر گفتہ باشند، گفتہ باشند۔ بلکہ من می گویم کہ نباید گفت، زیرا کہ گردیدنِ ماہ منحصر بشب نیست۔ درروز نیز ہمی گردد۔ ہاں شب افروز اگر گویند، جا دارد۔ ایں را بگزار و ایں عبارت را نگر، عسس وشبرو را نیز گفتہ اند۔ عسس وشبرو ضد یکدیگر است نہ مرادفِ ہمدگر۔ غالب 12

عرشی: قاطع اور درفش میں بھی کم و زیادہ یہی بات کہی ہے کہ نہ شبگرد کے معنی چاند ہیں، اور نہ عسس وشبرد مرادف ہیں بلکہ ''راستی این کہ شبگرد شحنہ وعسس را گویند، نہ قمر و دزد وعیار را۔ وشبرد دزد را خوانند، نہ عسس و عابد شب زندہ دار را۔'' خانِ آرزو نے برہان کی تائید کی ہے، مگر عسس وقمر دونوں کو اس لفظ کے مجازی معنے قرار دیا ہے۔ انجمن آرا نے اس کے معنی عسس وشبرد بتائے ہیں۔ بہارِ عجم اور اس کے تتبع میں فرہنگِ نظام میں شبگرد کے معنی رند وعیار بھی لکھے ہیں اور یہ شعر سند میں پیش کیے ہیں:

امیر خسرو: شبہا منم و گوشۂ غم حالِ من این است
حال دلِ آوارۂ شبگر ندانم

صائب: شوخ و میخوارہ و شبگرد غزل خواں شدہ
چشمِ بد دور کہ سرفتنۂ دوراں شدہ

(8) برہان: شیداسپہبد بمعنی رواں بخش است کہ بعربی روح القدس خوانند۔

غالب: شیداسپہبُد بمعنی نفسِ ناطقہ است، نہ بمعنی روح القدس 12

عرشی: قاطع اور درفش میں صاحب برہان اور اپنی دونوں کی علم عربی سے ناواقفیت ظاہر کر کے لکھا ہے کہ اغلب ہے کہ عربی داں برہان کا قول قبول نہ کریں۔ ''من جز ایں قدر نمی دانم کہ شیداسپہبد واسپہبدی شید عبارت از نفسِ ناطقہ است کہ پارسیان آن را روانِ گویا نیز گویند۔''

عرشی: ڈاکٹر معین نے برہان کے حاشیے میں لکھا ہے کہ ظاہراً یہ اصطلاح فرقہ آذر کیواں کی بنائی ہوئی ہے۔ چنانچہ سوائے انجمن آرا کے اور کسی لغت میں یہ لفظ نہیں ملا اور انجمن آرا نے بھی برہان کے لفظ دہرائے ہیں۔

(9) برہان: صدا بروزنِ ادا معربِ سداست۔ وآں آوازے باشد کہ در کوہ وگنبد وامثالِ آں پیچد و باز ہماں شنیدہ شود۔ ودر عربی نیز ہمی معنی دارد۔

غالب: صدا بروزن ادا معربِ سدا، لعنت اللہ علی الکاذبین۔ وآن آوازی باشد کہ در کوہ وگنبذ پیچد۔ اینہم دروغ۔ صدا عربی الاصل است از تعریب حاصل نشدہ است۔ 12

عرشی: قاطع اور درفش میں لعنت بھیجنے اور جھوٹ کا الزام لگانے سے احتراز کیا ہے، اور جو لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ اگر سدا فارسی میں بمعنی آواز ہوتا، تو اس کی تعریب صدا کو مانا جاسکتا تھا۔ جب وہ نہیں تو یہ بھی نہیں۔ ہاں، ہندی میں سدا بمعنی ہمیشہ مستعمل ہے، مگر اس کی تعریب قرار دیا جائے تو معنی بدل جائیں گے۔

میرزا صاحب کا یہ اعتراض درست ہے۔ چنانچہ عربی لغات کے علاوہ لغتِ فرسِ اسدی طوسی کے ایک مخطوطے میں (ص 246 حاشیہ) ''نون'' کے ذیل میں لکھا ہے کہ عربی میں اسے صدا کہتے ہیں۔ رشیدی نے بھی یہی لکھا ہے کہ صدا عربی ہے۔

(10) برہان: غژک، بکسر اوّل وفتحِ ثانی وسکونِ کاف، سازے باشد کہ آن را کمانچہ خوانند۔ این لغت را در فرہنگِ سروری وسرمۂ سلیمانی باعین بے نقطہ وزای فارسی نوشتہ اند۔

غالب: غژک وغیچک مسلم [1] گشتہ بلبل غژکی، شاخِ گل وغنچہ غیچک۔ وہر کہ باعین بے نقطہ

[1] یہ مصرع شاہ طاہر دکنی کا ہے۔ فرہنگ شعوری

وزاے مثلثہ می داند، ایں قدر نمی داند کہ عینِ بے نقطہ در فارسی وزاے مثلثہ در عربی نیست۔ پس این ترکیب چگونہ جائز تواند بود، مگر گفتہ آید کہ این لفظ در لغات چنان ست کہ شتر وگاو و پلنگ در حیوانات ہمانا چنانکہ کمالِ اسمٰعیل خلاق المعانی لقب داشت، صاحب فرہنگ سروری وسرمۂ سلیمانی را خلاق الالفاظ خطاب باید داد 12

عرشی: میرزا صاحب کا یہ اعتراض درست ہے مگر انھوں نے قاطع اور درفش میں غوک کو عوک جاننا ''مسخرگی و بوالعجبی'' قرار دیا ہے۔ یہ اندازِ تحریر عالمانہ نہیں، مناظرانہ ہے۔

(11) برہان غشتہ بفتح اوّل — بمعنی آمیختہ وآغشتہ باشد۔ وبکسر اوّل ہم باین معنی آمدہ است۔

غالب: غشتہ نہ بفتح است ونہ لغتے جداگانہ۔ ہمان آغشتہ است بہ تخفیف 12

عرشی: قاطع اور درفش میں اس نے قدرے پھیلا کر لکھا ہے۔ ماحصل یہ ہے کہ آغشتہ بکسرِ غین آغشتن کا مفعول ہے۔ اس کا الفِ ممدودہ کہاں گیا اور کسرہ کہاں سے آ گیا۔ اگر صاحبِ برہان غشتہ کو مخففِ آغشتہ کہتا، تو میں سند طلب کرتا۔ اب کہ غشتہ کو بمعنی آغشتہ لکھا ہے، تو میں کیا کہوں۔ صاحب برہان نے آشتن کے مفعول آغشتہ کو بفتح غین لکھا ہے اور اس جگہ میرزا صاحب نے کوئی اعتراض نہیں کیا، گویا اس کے ہم رائے رہے۔ لہٰذا یہاں یہ کہنا کہ غشتہ بفتح نہیں، اور قاطع میں لکھنا کہ آغشتہ بکسر غین آغشتن کا مفعول ہے اور سوال کرنا کہ الف ممدودہ کہاں گیا اور کسرۂ غین کہاں سے آ گیا، یہ باتیں متضاد نظر آتی ہیں۔

رہا آغشتن و آغشتہ کا بکسر غین بھی بولا جانا، تو موجودہ لغت نویس بھی بکسر و بفتح ہر دو لکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نظامی و شرفِ شفردہ نے آغشتہ کو کشتہ (بکسر کاف) کا ہم قافیہ کیا ہے۔ نظامی فرماتے ہیں:

زمینش بہ آبِ زر آغشتہ اند تو گوئی دراں زعفران کشتہ اند

شفردہ نے لکھا ہے:

ہمہ دشت برختہ و کشتہ شد زمیں سر بسر چوں گل آغشتہ شد

جہاں تک غشتہ کی سند کا تعلق ہے، بدرِ چاچ کا یہ شعر فرہنگِ نظام میں نقل کیا گیا ہے:[1]

---

[1] قصائد بدر چاچ ص 7 طبع محمدی لکھنؤ 1261ھ میں دوسرا مصرع یوں لکھا ہے: ریشہ زر آغشتہ ند ہد الخ

صر صرِ صور ار فلک را ہفت دامن بردرد
رشتۂ زر غشتہ ندہد گوشۂ دستارِ من

(12) برہان: غفودہ بضمِ اوّل بروزنِ گشودہ بمعنی ایام ہفتہ باشد۔

غالب: غفودہ بمعنی ہفتہ معلوم نشد کہ لغتِ کجائیست۔ عربی اسبوع است، وفارسی ہفتہ 12

عرشی: قاطع اور درفش میں لکھا ہے کہ یہ لفظ دیو اور پری کی زبان کا ہوگا۔ ہاں، میں نے ایک فرہنگ میں یہ لفظ بغیر توضیحِ اعراب کے بمعنیِ ہفدہ (یعنی سترہ) دیکھا ہے۔ اس مرد دانشمند نے اس ہفدہ کو ہفتہ جانا، زہے قیاس:
میں عرض کرتا ہوں کہ یہ اعتراض درست ہے کہ غفودہ فارسی زبان کا لفظ نہیں۔ چنانچہ مجھے بھی کسی لغت میں نہ ملا۔ البتہ ڈاکٹر معین نے لکھا ہے کہ بظاہر لفظ ''شفودہ'' کا بگاڑ معلوم ہوتا ہے۔ میں نے جہانگیری میں دیکھا، تو یہ عبارت ملی: ''شفودہ با اوّل وثانیِ مضموم و واوِ معروف ہفتہ را گویند۔ حکیم علی فرقدی بقید نظم نمودہ:

بود ورد و حرزِ رہی وصفِ خلقت بماہ و بسال و بروز و شفودہ

خود برہان میں بھی باب الشین مع الفاء میں یہ لفظ موجود ہے، اور میرزا صاحب نے اس پر اعتراض بھی نہیں کیا۔ رشیدی و سراج نے بھی اس لفظ کو بمعنی ہفتہ درج کیا ہے۔ انجمن آرا اور فرہنگِ نظام میں تو جہانگیری کی پوری عبارت مع مثال نقل کر دی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے جس فرہنگ میں غفودہ بمعنی ہفدہ دیکھا، وہ بھی درست نہیں، بلکہ کسی لفظ کی تصحیف ہے۔

(13) برہان: غنو، غنود، غنودن، غنودہ، غنویدن، غنویدہ۔

غالب: از مشتقاتِ یک مصدر 6 لغت 12

عرشی: میرزا صاحب نے برہان کے مذکورۂ بالا چھ لغتوں پر ہندسے ڈال کر حاشیے میں یہ اعتراض کیا ہے، جو بالکل درست ہے۔ ایک مصدر کو لکھ کر مشتقات کو اس کے تحت لکھ دینا کافی تھا۔ قاطع اور درفش میں بھی یہ اعتراض قدرے تفصیل سے درج کیا ہے۔

(14) برہان: غوش، غوشا، غوشاد، غوشاک، غوشای۔

غالب: غوش وغوشا وغوشاد وغوشاک وغوشای، یک لغت بہ پنج وضع۔ زہے تحقیق 12

عرشی: میرزا صاحب نے قاطع اور درفش میں ان پانچ لفظوں کو لکھ کر کہا ہے کہ ''یک معنی

بہ پنج صورت آورد، تا اصلِ لغت چہ صورت دارد صورتِ راستی این است کہ غوشاک بغین مفتوح اسم پاچک است کہ اُپلا بالفِ مضموم ہندیِ آنست۔"

لیکن مرزا صاحب کا صرف لفظ غوشاک کو درست ماننا اور اُس کے معنی بھی صرف اُپلا بتانا درست نہیں۔ رشیدی نے غوشاک وغوشاد وغوشای کو "بالضم و واو مجہول" بتا کراس کے معنی سرگینِ حیواناتِ خشک شدہ (یعنی اُپلا) اور خوشۂ جو وگندم وانگور و خرما بتائے ہیں، اور لکھا ہے کہ شمسِ فخری نے غوشای کو بہر دو معنی نظم کیا ہے۔ نیز غوشاد کے معنی "جائگاہِ گاوان و گوسفندان کہ شب دران باشند" بتا کر لکھا ہے کہ بعضوں نے اسے بفتح بھی لکھا ہے اور اس معنی کو بھی فخری نے نظم کیا ہے۔ اس کے بعد رشیدی نے لفظ غوشت کو بمعنی برہنہ لکھ کر کہا ہے کہ ابوالحفص سغدی نے اسے بحذف تا (یعنی غوش) بھی لکھا ہے۔

جہانگیری میں بھی برہان کے سب لفظ سوای غوشای کے انھیں معانی کے ساتھ درج کیے ہیں۔ غوشای اس لیے نہیں لکھا کہ وہ غوشاہی کی دوسری شکل ہے اور غوش کے معنی برہنہ نہیں لکھے، غالباً اس وجہ سے کہ ابوالحفص سغدی کا بیان اس سے نظر انداز ہوگیا۔

سراج اللغۃ میں بھی غوشای کے ماسوا چاروں صورتیں اور سب معانی لکھے ہیں۔ مگر برہان میں جو "غوشاد" کو جاے فرود آمدنِ کارواں و قافلہ گاہ لکھا ہے، اسے معنوی تصحیف بتایا ہے۔ اس کے بعد غوشت بمعنی برہنہ مادرزاد لکھ کر کہا ہے کہ بظاہر غوش اس کا مخفف ہے، یا آخر میں ت زیادہ کردی گئی ہے جیسے فرامش اور فرامشت میں ہوا ہے۔

انجمن آرا میں بھی یہی سب باتیں لکھی ہیں، اور آخر میں کہا ہے کہ حق یہ ہے کہ یہ سب لغت اصل میں غین کی جگہ خ سے تھے۔ چونکہ غ اور خ باہم بدل جاتے ہیں، اس لیے بالغین مشہور ہوگئے۔ خوشا و خوشاد و خوشہ ہر سہ بمعنی سرگین خشک (یعنی اُپلا) درست ہے۔ چنانکہ خوشیدہ نیز بمعنی خشکیدہ است کہ سعدی گفتہ: بخوشید سرچشمہای قدیم و بمعنی خوشہ انگور و خرما و جو و گندم درست تر و واضح و جای خوابیدن شب گاہ و گوسفند خوشای بفتح صحیح است، چو خوف مخفف خواب است۔ و غوشا و شوغا بیکدیگر در پارسی قلب می شوند و جائز است، یعنی شب گاہ و خواب گاہ۔"

فرہنگِ نظام میں غوشای بھی درج کیا ہے اور خوشۂ جو و سرگین معنی لکھ کر سند میں

طیان کا یہ شعر پیش کیا ہے:

یکے ز راہ ہمی زر بر ندارد و سیم
یکے ز دشت بہ نیمہ ہے چند غوشای

(15) برہان: فاژ بسکون زای فارسی بمعنی دہان درہ است کہ خمیازہ باشد۔

غالب: سبحان اللہ فاز وفازہ را می گوید کہ بمعنی دہان درہ است کہ خمیازہ باشد۔ ہندی فازہ جمائی است، وآن را دہان درہ نیز گویند وخمیازہ چیزے دیگر است کہ در ہندی آں را انگڑائی گویند۔ دہان درہ وخمیازہ را یکی پنداشتہ است۔ کجا کس کجا دراتی 12

عرشی: میرزا صاحب نے قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو شامل نہیں کیا۔ علاوہ ازیں لغت ''دہانِ درہ'' کے حاشیے میں جو بات لکھنا چاہیے تھی وہ فاژ کے تحت لکھی، حالانکہ وہاں بھی صاحب برہان نے دہانِ درہ کے معنی خمیازہ ہی لکھے ہیں۔ اعتراض کے آخر میں جو کہاوت استعمال کی ہے اس کی داد کون دے سکتا ہے۔
جہاں تک اعتراض کا تعلق ہے، تو اس کی حقیقت سراج اللغۃ کی اس عبارت سے واضح ہو جاتی ہے کہ ''در رشیدی بمعنی خمیازہ نوشتہ'' وخمیازہ نزدیکِ او کشاکش اعضاء و بغل باز کردن است کہ از خمار و کوفت بود و ایں غلط است، بلکہ بمعنی فازہ است کہ کشادنِ دہان باشد بسبب خمار وغیرہ۔ وخمیازہ بہر دو معنی آمدہ۔'' یعنی خمیازہ کے معنی انگڑائی بھی ہیں اور جماہی بھی۔ مگر دہان درہ کے معنی صرف انگڑائی ہیں لہٰذا برہان کا فاژ کو بمعنیِ دہانِ درہ کہنا اور اسے خمیازہ کا ہم معنی بتانا درست ٹھہرا۔ انجمن آرا میں بھی دہان درہ کے معنی خمیازہ لکھے ہیں۔ فرہنگ نظام میں لکھا ہے کہ دہانِ درہ کردن کے لیے دوسرے لفظ خمیازہ اور فاژہ ہیں۔
حسنِ عمید نے اپنی فرہنگ میں لکھا ہے کہ ''خمیازہ حالتے کہ دراثر خستگی وکسالت و بے خوابی یا خوابِ آلودگی در انسان پیدا می شود و دہان بے اختیار کشود می گردد۔ و گاہے کشش در دستہا و سینہ نیز پیدا می شود۔'' اس کے بعد لکھا ہے کہ اسے خامیازہ وخامیاز وخمیاز ودہن درہ وفاژ وفاژہ وباسک وآسا وبیاستو بھی کہا جاتا ہے۔

(16) برہان: فتاریدن، فتال، فتالید، فتالیدن، فترد، فتردن، فترید، فتریدن، فتلیدن۔

غالب: (مذکورہ بالا الفاظ حاشیے میں لکھ کر فرمایا ہے) 9 لغت از یک لغت 12

عرشی: قاطع اور درفش میں لفظی و معنوی ہر دو حیثیت سے اعتراض کیا ہے۔ معنی کے لحاظ سے تو یہ فرماتے ہیں کہ ان الفاظ کے چھ معنے، کندن، ریختن، دریدن، شگافتن، پراگندہ و پریشان ساختن، و ازہم جدا کردن لکھ کر ورق کیوں کالا کیا اور لفظی یہ کہ اتنی صورتیں کیوں لکھ ڈالیں، جب کہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ فتاریدن اور اس کا مبدل فتالیدن بمعنی دریدن و گسستن مستعمل ہے۔ اسی کو فتریدن اور فتلیدن بھی کہا ہے اور جب مصدر کی تبدیل و تخفیف سے چار صورتیں بنیں تو سب کے مشتقات بھی چار صورت کے ہوں گے۔

میرزا صاحب کا یہ اعتراض بھی درست ہے۔ چنانچہ رشیدی نے فتار اور فتال بالفتح کے معنی شگافندہ و جدا کنندہ و گسلندہ، و امر بدیں معنی لکھ کر تحریر کردیا ہے، کہ فتر فتل بحذف الف بھی آیا ہے، اور اسی پر فتاریدن و فتالیدن اور فتریدن وفتلیدن و فتاریدہ وفتالیدہ وفتارد و فترد کو قیاس کرلیا جائے۔ سراج اللغتہ، انجمن آرا اور فرہنگ نظام میں بھی اختصار ہی سے کام لیا گیا ہے۔ سراج میں البتہ بکسرِ فا بھی بتایا ہے۔

(17) برہان: فَحت۔ در عربی شعلہ ماہ را گویند کہ مہتاب باشد۔

غالب: شعلۂ ماہ بمعنی مہتاب سند می خواہد 12

عرشی: غالباً قاطع اور درفش میں یہ اعتراض اس لیے جگہ نہ پاسکا کہ میرزا صاحب کو یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ فحت عربی میں ضوء القمر (Moon Light) کو کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو اقرب الموارد، المنجد اور الفرائد الدریہ۔ڈاکٹر معین نے منتہی الارب سے نقل کیا ہے کہ فحت بالفتح ماہتاب کو اوّل نمایاں گردد'' اس سے بھی برہان کی تائید ہوتی ہے۔

(18) برہان: فراتین۔ سخن و گفتار آسمانی باشد، چہ فراتین نواد بمعنی آسمانی زبان است بلغتِ ژند واستا۔ ونواد زبان را گویند۔ بفتح نون۔

غالب: تنہا فراتین گفتن و گفتارِ آسمانی خواستن یعنی چہ، حال آن کہ خود می نویسد کہ نواد زبان را گویند۔ اصل این ست کہ فراتین بمعنیِ آسمانی، ونواد بمعنی زبان، و فراتین نواد مضاف و مضاف الیہ مقلوب است۔ 12

عرشی: قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو بھی شامل نہیں کیا۔ حالانکہ تھا بالکل درست۔

(19) برہان: فراخ رو، بفتحِ رای بے نقطہ ـــ وبضمِ رای قرشت مردمِ کشادہ رو و شگفتہ وخنداں باشد۔

غالب: فراخ رو مسلَّم، فراخ رو سند می خواہد 12

عرشی: قاطع میں میرزا صاحب نے لکھا تھا کہ میرا گمان ہے کہ فراخ صفتِ دہان ہے، صفتِ رُخ نہیں۔ چونکہ یہ مسکین (یعنی مؤلفِ برہان) دہان و رُخ کو ایک جانتا ہے، اس لیے اس نے قیاساً فراخ رو بھی ایک لغت مستقل قرار دے لیا۔

اشاعتِ قاطع کے بعد فارسی دانوں میں ہنگامہ مچ گیا اور اس کی رد میں کئی رسالے لکھے گئے۔ ان میں سے ہر ایک میں میرزا صاحب کو گالی کا جواب گالی سے ملا جس سے یہ چڑھ گئے۔ نتیجتاً قاطع کا دوسرا ایڈیشن بنام درفش کاویانی نکلا، تو میرزا صاحب نے ان گالیوں کا بدلہ صاحب برہان سے لیا۔ چنانچہ زیرِ بحث اعتراض کے آخر میں صاحبِ برہان کے لیے اضافہ کیا۔ ''لاجرم تپانچہ برروی و مشتے بردہن صلہ دارد۔''

چونکہ اس قسم کے اضافۂ بد کی معذرت بھی ضروری تھی، مزید ارشاد ہوا کہ ''پوشیدہ نماند کہ آنچہ بعدِ انضمامِ دیباچۂ دوم در مذمت جامعِ برہان قاطع سخن تیز تر راندہ ام، وبالِ ایں در گردنِ مددگارِ نادر زیدہ کارِ اوست کہ درنامۂ ترقند ہنگامۂ خود مرا دشنام داد و بہ بدگفتنِ محبوبِ خود دلیری بخشید۔

اگر گویند، انتقام از دہندۂ دشنام بایستے کشید، گویم، آں بیچارہ درمعرضِ نظم ونثر فرومایہ تر از ان ست کہ نامش برند، اگر چہ بزشتی باشد صاحب برہان قاطع ہر چند بگزاف بود، نما نمائی دارد۔''

میرزا صاحب کی یہ منطق کہ چونکہ تردیدی رسالہ کا مولف کوئی علمی حیثیت نہیں رکھتا اور دکنی کی حیثیت کچھ نہ کچھ ضرور ہے، اس لیے میں نے صاحبِ رسالہ کی شان میں جو کچھ کہنا چاہیے تھا، وہ اس کے محبوب دکنی کو کہہ لیا، میری سمجھ میں نہیں آتی۔

رہا اصل اعتراض تو وہ بالکل درست ہے۔ باوجود تلاش مجھے ہنوز اس کی سند نہیں ملی۔

(20) برہان: فراز بروزن نماز چند معنی دارد۔2، بستہ وکشادہ باز کردہ شدہ و باز کردن وگشودن و پوشیدنِ درباشد۔ وبایں معنی از اضداد است۔

غالب: فراز ہرگز از اضداد نیست: باز کردن بمعنی کشودن، فراز کردن بمعنی بستن 12

عرشی: قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ درفش میں میاں داد خاں سیاح کے نام سے شائع کردہ اپنی کتاب میں سے خواجہ حافظ کے اس شعر:

حضور مجلسِ انس است و دوستاں جمعند و اِن یکاد بخوانید و در فراز کنید

کا مطلب فارسی الفاظ میں نقل کر دیا ہے۔ قاطع اور درفش میں یہ بھی لکھا ہے کہ کوئی یہ نہ کہے کہ یہ بات صرف صاحب برہان ہی نے نہیں، دوسروں نے بھی کہی ہے اور یہ امر اجماعی ہے، کیونکہ ہم جواب میں یہ کہیں گے کہ یہ ویسا ہی اجماع ہے کہ جیسا اہلِ شام نے خلافت یزید پر کیا تھا، یہ طنز میری دانست میں بیکار اور بے فائدہ ہے۔

رہا میرزا صاحب کا یہ ادعا کہ فراز لغتِ اضداد میں سے نہیں، اس کے معنے صرف 'بند یا بستہ ہیں' تو کلامِ اساتذہ سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ جہانگیری نے بمعنیِ کشادہ کی سند میں کمالِ اسمٰعیل کا یہ شعر لکھا ہے:

چو مطرح ارچہ کہ افگندہ ایم و پے سپریم　　بہ پشتیِ تو چو مسند شویم سینہ فراز

اور بمعنی بستہ کی شہادت میں یہ دو شعر پیش کیے ہیں:

صنعت مکن کہ ہر کہ محبت نہ راست باخت　　عشقش بروئے او درِ معنی فراز کرد

(حافظ شیرازی)

جہان پناہا، از من دولتت امروز　　دہانِ عافیہ باز است و چشم فتنہ فراز

(کمال اسمٰعیل)

رشیدی نے کمالِ اسمٰعیل کے شعر میں تامل کا اظہار کیا ہے۔ لیکن خانِ آرزو نے اس تامل کو بے وجہ ہونے کے باعث رد کر دیا ہے۔ انجمن آرا اور فرہنگِ نظام بھی اس لفظ کے لغت اضداد میں سے ہونے کے قائل ہیں، اور ڈاکٹر معین نے فرخی سیستانی کے یہ شعر لکھ کر برہان کی حمایت پر مہرِ توثیق ثبت کر دی ہے:

کس نبیند فروشدہ بہ نشیب　　ہر کہ را خواجہ برکشد بہ فراز

مہر و کینش مثل دو دربانند　　درِ دولت کنند باز و فراز

بر بداندیشِ تو فراز کنند　　باز دارند بر موافق باز

بظاہرِ حال کہا جاسکتا ہے کہ میرزا صاحب فرخی کے یہ شعر دیکھ لیتے تو اپنے دعوے سے دست بردار ہو جاتے مگر قاطع القاطع (ص 194) میں عطار کی مثنویِ منطق الطیر کا یہ شعر پڑھ کر بھی وہ اپنے خیال پر جمے رہے:

گر گنہ داری درِ توبہ است باز　　توبہ کن، دیگر نخواہد شد فراز

قاطعِ برہان کا پہلا مسودہ

آیندہ صفحوں میں قاطعِ برہان کے ابتدائی مسودے کا آخری حصہ پیش کیا جارہا ہے لیکن اس سے پہلے چند باتیں لکھ دینا مناسب ہوگا۔

(1) میرزا غالب نے قاطعِ برہان کا ابتدائی مسودہ برہانِ قاطع کے ایک مطبوعہ نسخے کے حاشیوں پر تیار کیا تھا۔ یہ نسخہ 1251ھ مطابق 1836ء میں افضل المطابع، کلکتہ میں محمد اعلم لکھنوی کے اہتمام سے چھپا تھا۔ اس نسخے کی بنیاد کپتان ٹامس روبک Thomas Roebuck, کے چھاپے ہوئے نسخے پر رکھی گئی تھی۔ روبک نے برہانِ قاطع کلکتے میں تین بار چھاپی تھی: پہلے 1818 میں، دوبارہ 1822 میں، تبارہ 1834 میں۔ محمد اعلم نے غالباً آخری ایڈیشن کو اپنے سامنے رکھا ہوگا، جو بعدِ تصحیح و ترمیم چھاپا گیا تھا۔

سرورق پر محمد اعلم نے لکھا ہے کہ روبک ایڈیشن میں یہ نقصان تھا کہ ''گفتارِ بیست و نہم کہ متضمنِ لغاتِ متفرقہ بترتیبِ علیحدہ مابینِ اصل کتاب و ملحقات بود، و بعدمِ اہتمامِ طابعین سابق بمحلِ خود واقع نبود، وازین سبب مردمان بلحاظِ ترتیب از مضمونش بہرہ مند نبودند، لہٰذا آن را بترتیبِ حروف در ملحقات مندرج نمودہ، و اغلاطے کہ بجہت بے اعتنائی طابعین [تابعین] پیشینِ بطبع درآمدہ بود'' لہٰذا میں نے ''حتی الوسع والامکان باخراجش پرداختہ باہتمامِ تمام و تصحیحِ تام'' اس نسخے کی طباعت سے مذکورۂ بالا سنہ میں فراغت حاصل کی۔

محمد اعلم کے بیان کے مطابق حسبِ ذیل علما اس کام میں ان کے ممد و معان رہے۔ (1) مولوی حافظ حاجی احمد کبیر[1]، امینِ مدرسۂ عالیہ عربی (2) مولوی عبدالرحیم، مدرس قانونِ فارسی

1. مولانا حافظ احمد کبیر مجددی 1207ھ کے قریب رام پور میں پیدا ہوئے۔ تحصیلِ علوم مفتی شرف الدین رام پوری سے کی۔ حرمین شریفین جا کر حدیث پڑھی۔ ممالکِ اسلامیہ سے واپس آکر مدرسۂ عالیہ، کلکتہ کے امین مقرر ہوئے۔ 1265 (1849) میں بیمار ہو کر رامپور آئے اور یہیں انتقال کیا۔ اپنے دادا کے خطیرے کے سامنے زیرِ دیوارِ مسجد مدفون ہیں۔ (ملاحظہ ہو تذکرہ کاملانِ رامپور: 29؛ وگنج تواریخ: 30)

(3) مولوی قدرت اللہ، ممتحنِ کمیٹی (4) مولوی منصور احمد، معاونِ مدرسہ (5) مولوی افضل علی لکھنوی (6) منشی سعید بخش سلہٹی (7) منشی امداد حسین بریلوی، منشی صدر کمسریٹ (8) منشی عبداللہ خان (9) مولوی اصغر علی خان (10) میرزا حامد علی خان (11) شیخ نصیرالدین۔ (الف) اس کے خاتمے میں لکھا ہے کہ ''ذیحجہ 1251ھ کو اس کا چھاپا تمام ہوا جو 23 مارچ 1836 کے مطابق ہے۔ (ب) سرورق پر درج ہے: ''در عہدِ حکومتِ نوابِ معلی القاب لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل بہادر در کلکتہ بمطبعِ مسمی بافضل المطابع در 1251 ہجریہ قدسیہ مطابق 1836 مسیحیہ بطبع در آوردم''

لارڈ آکلنڈ کا گورنر جنرل ہونا 14 اپریل 1836 کا واقعہ ہے، جو 17 ذی حجہ 1251ھ کے موافق ہے۔

چونکہ کتاب کی طباعت 1251ھ میں ہوئی ہے، اور 30 ذی حجہ سنہ مذکور موافق ہے۔ 17 اپریل 1836 کے، لہٰذا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اصل کتاب کا چھاپا ذیحجہ 1251ھ مطابق 23 مارچ 1836 کو تمام ہوا۔ ابھی کتاب کا سرورق نہیں چھپا تھا کہ لارڈ آکلینڈ 4 اپریل 1836 گورنر جنرل مقرر ہوگئے۔ یہ تاریخ موافق ہے۔ 17 ذی حجہ 1251ھ کے پس سرورق کو ان تاریخوں کے بعد چھپنا چاہیے اور چونکہ سرورق کی تصریح کے مطابق 1251ھ ہی میں سرورق چھپا ہے، لہٰذا اسے 30 ذی حجہ 1251ھ مطابق 17 اپریل 1836 سے قبل چھپ جانا چاہیے۔

آغاز کتاب اور بسم اللہ کے درمیان سادہ جگہ میں لکھا ہے: ''محمد اسفندیار بیگ خرید نمود در 1251ھ مقام کلکتہ بقیمتِ بیست دو روپیہ۔'' نواب علاء الدین احمد خان بہادر علائی نے پہلے صفحے پر، جو سادہ ہے، انگریزی میں ایک یادداشت لکھی ہے۔ ان کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یکم اگست 1858 کو یہ کتاب میرزا غالب نے اپنے ''یار بھتیجے گویا بھائی'' یعنی علاء الدین احمد خان علائی کو تحفے میں دی تھی۔[1] علائی نے اسے اپنے والد کی خدمت میں پیش کر دیا، اور ایک کاغذ پر یہ تحریر لکھ کر اسفندیار بیگ کی تحریر پر چپکا دی۔ ''بخشایندہ و بخشندہ راستایم کہ این نادرہ بہ ارمغانِ پدرِ نامور میرود۔ یارب، چون آرزوی ہوا خواہ پزرفتہ [پذیرفتہ] باد۔ از گنہ پیشِ خداوند شرمسار علاء الدین آمرزشِ خواستار۔'' اسی تحریر کے دائیں طرف حاشیے میں لکھا ہوا ہے:

وصول (؟) دولتِ فرہنگِ معنوی ارتنگِ مانی روزِ اول از محرم 1276ھ ونخست

---

1. میرزا صاحب نے ایک مکتوب بنام علائی مورخہ 21 جولائی 1860 میں لکھا ہے کہ ''برہانِ قاطع تم کو دے چکا ہوں۔'' (خطوط غالب، 1:321)

از اگست 1859 بہ چنگ آمد۔

یہ تحریر نواب امین الدین احمد خان بہادر کی معلوم ہوتی ہے، اور ہمیں بتاتی ہے کہ علائی نے ایک سال بعد اس کتاب کو اپنے والدِ ماجد کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔[1]

بہر حال میرزا غالب نے مختلف اوقات میں اس کتاب کو پڑھا تھا اور جابجا حواشی میں اپنے اختلافی نوٹ لکھتے رہے تھے۔ جب یہ کام ختم ہو گیا، تو ان سب یاداشتوں کو ''قاطعِ برہان'' نام رکھ کر کتابی شکل میں شائع کر دیا۔

(2) میرزا غالب نے برہان کے حاشیوں میں جو تنقیدی خیالات ظاہر کیے ہیں وہ زیادہ تر فارسی اور کمتر اردو میں ہیں۔ ایک دو جگہ ایک ہی نوٹ کا کچھ حصہ فارسی میں ہے اور کچھ اردو میں۔

(3) اُنھوں نے لفظِ ''دولہ'' پر یہ حاشیہ لکھا ہے: ''یہ سب عبارت نقل کر کر اس کی حقیقت لکھی جائے گی۔'' اس سے مترشح ہوتا ہے کہ کم از کم یہاں تک پہنچ کر وہ طے کر چکے تھے کہ ان یادداشتوں کو جداگانہ مرتب کریں گے؛ ایسا نہیں ہوا کہ ساری کتاب پر تنقیدی حاشیے لکھنے کے بعد انھیں کتابی شکل دینے کا قصد کیا ہو۔

(4) انھوں نے قاطعِ برہان کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں دستنبو کی تالیف کے بعد تنہائی کا غم غلط کرنے کے لیے برہانِ قاطع دیکھا کرتا تھا۔ اس میں مجھے جابجا غلطیاں نظر آئیں۔ میرا پیشہ تعلیم و تدریس تھا۔ اپنے شاگردوں کی آگاہی کے لیے ''از بسیار اندکے'' اور ''از صد یکے'' اس کتاب میں جمع کر دیں۔'' دستنبو 31 جولائی 1858 مطابق 19 ذیحجہ 1274ھ کو ختم ہوئی تھی۔[2] اس حساب سے برہانِ قاطع کا تنقیدی مطالعہ اگست 1858 میں شروع ہونا چاہیے لیکن میرزا صاحب نے چودھری عبدالغفور سرور کو ایک تحریر لکھی تھی؛ اس میں لکھا ہے کہ 22 ماہ سے پنشن بند ہے، یہ زمانہ مئی 1857 سے شروع ہو کر فروری 1859 پر ختم ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ خط مارچ 1859 کا نوشتہ ہوگا۔ اس میں صاحبِ عالم مارہروی کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''ان دنوں میں

---

[1] صدیقِ محترم سید یوسف بخاری صاحب نے اپنی کتاب ''یہ دلی ہے'' کے صفحہ 37 میں نواب علائی کا ایک خط بنام سید محمد بخاری امام مسجد جامع دہلی مورخہ 14 مئی 1859 نقل کیا ہے۔ اس میں علائی نے امام صاحب سے درخواست کی ہے کہ وہ نواب امین الدین احمد خان بہادر والیِ لوہارو کے لیے شاہ نامہ، دبستانِ مذاہب، قاموس اور برہانِ قاطع تلاش کر کے ارسال فرمائیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ برہانِ قاطع اس ذریعے سے حاصل نہ ہو سکی، تو علائی نے اپنا مذکورۂ بالا نسخہ پیش کر دیا تھا۔ [2] دستنبو (طبع اوّل) 53.

برہانِ قاطع کو دیکھ رہا ہوں، اور اس کے فہم کی غلطیاں نکال رہا ہوں۔ اگر زیست باقی ہے، تو ان نکات کو جمع کر کے اُس نسخے کا نام قاطعِ برہان رکھوں گا۔''[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مارچ 1859 میں میرزا صاحب برہان کے تنقیدی مطالعے میں مصروف تھے لیکن اوپر گزر چکا ہے کہ یکم اگست 1858 کو یہ نسخہ میرزا صاحب نے علائی کو دے دیا تھا۔ لہٰذا مذکورہ مطالعہ اس سے قبل کی بات ہوگی، اور اگست 1858 سے پہلے ہی سب تنقیدی نوٹ کتابی شکل میں مرتب ہو چکے ہوں گے، اور صاحب عالم کے خط میں ان کو دوبارہ لکھنے کا ذکر ہوگا۔ دیباچۂ قاطع سے معلوم ہوتا ہے کہ 1276ھ میں قاطع نے کتابی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ سالِ ہجری یکم اگست 1859 سے شروع ہو کر 20 جولائی 1860 پر ختم ہوتا ہے۔ بہر حال برہان کی غلطیاں نکالنے کے بعد میرزا صاحب نے اپنی چند تحقیقات کا تذکرہ کیا ہے اور ہر تحقیق کو لفظِ ''فائدہ'' سے شروع کرتے ہیں۔ اس بحث کے شروع میں اپنی عمر کا 66 واں سال بتایا ہے، جو از روے حساب 1277ھ ہوتا ہے۔ آخرِ بحث میں لکھا ہے ''نگارشِ فوائد کہ از ملحقاتِ قاطعِ برہان است، در سالِ ''رستخیز'' انجام یافت۔'' اسی کتاب کے دیباچے میں وہ خود لکھ چکے ہیں کہ اس لفظ کے عدد 1277 ہوتے ہیں۔ ان بیانوں سے واضح ہوتا ہے کہ قاطعِ برہان 1276ھ میں اور اس کے ملحقات 1277ھ میں انجام پذیر ہوئے۔

(5) لیکن میرزا صاحب کی مختلف تحریروں کے مطالعے سے جو نتیجہ نکلتا ہے، وہ یہ ہے کہ 1275ھ میں قاطعِ برہان تیسری چوتھی نظر کے بعد کتابی شکل اختیار کر چکی تھی۔ وہ صاحبِ عالم مارہروی کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ''حضرت، نسخۂ قاطعِ برہان تیسری چوتھی نظر میں مکمل ہو کر مسودات ایک کاتب کے حوالے ہوئے۔ آٹھ جزو لکھے گئے۔ کم و بیش دو جزو باقی ہیں۔ پرسوں تک آجائیں گے۔ بعد اس کے انطباع کی فکر ہوگی۔ جب وہ عزیمت امضا پذیر ہو جائے گی، حضرت کی نظر سے بھی شرف پائے گی۔''[2]

اس خط کے بعد پھر اُنھیں کو لکھا ہے[3] کہ ''اس درماندگی کے دنوں میں چھاپے کی برہانِ قاطع میرے پاس تھی۔ اس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ ہزار ہا لغت غلط، ہزار ہا بیان لغو، عبارت پوچ، اشارات پادر ہوا؛ میں نے سو دو سو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ہے اور قاطع برہان اُس کا نام رکھا ہے۔ چھپوانے کا مقدور نہ تھا۔ مسودہ کاتب سے صاف کروالیا ہے۔ اگر کہو تو سبیلِ مستعار

1۔ عودِ ہندی (طبعِ اوّل): 17 2۔ اردوے معلیٰ (طبع اوّل): 204، 3۔ عود ہندی (طبعِ اوّل): 31

بھیج دوں۔ تم اور چودھری صاحب اور جو اور سخن شناس اور منصف ہوں، وہ اس کو دیکھیں اور پھر میری کتاب میرے پاس پہنچ جائے۔"

اس خط کے شروع میں دستنبو کا مطبوعہ نسخہ بھیجنے کا ذکر ہے۔ مرزا تفتہ کے نام کے خط مورخہ 13 نومبر 1858 سے معلوم ہوتا ہے کہ 12 تاریخ کو مرزا صاحب کے پاس دستنبو کے 33 نسخے بسبیل پارسل پہنچے تھے۔[1] اور مرزا تفتہ کے نام کے خط مورخہ 18 نومبر سنہ مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخ تک سب کتابیں تقسیم ہوگئی تھیں۔[2] لہٰذا صاحبِ عالم کے خط کو 18 نومبر 1858 سے پہلے کا مکتوبہ ہونا چاہیے اور چونکہ 18 نومبر 1858 مطابق ہے 11 ربیع الآخر 1275ھ کے، لہٰذا قاطع برہان کا مسودہ اس تاریخ سے پہلے صاف کروالیا گیا ہوگا۔

(6) میرزا صاحب نے میر مہدی مجروح کو لکھا ہے کہ[3] کہ "قاطعِ برہان کے مسودے سب میں نے پھاڑ ڈالے، اس واسطے کہ ہر نظر میں اُس کی صورت بدلتی گئی، وہ تحریر بالکل مغشوش ہوگئی۔ ہاں، اُس کی نقلیں صاف کہ جس میں کسی طرح کی غلطی نہیں، نواب صاحب نے کر لی ہیں۔ ایک میرے واسطے، ایک بھائی ضیاء الدین خان کے واسطے۔ میری مِلک جو کتاب ہے، اس کی جلد بندھ جائے، تو بطریقِ مستعار بھیج دوں گا۔ تم اس کی نقل لے کر میری کتاب مجھ کو پھیر دینا اور یہ امر بعدِ محرم ہوگا۔"

اس خط میں تاریخ نہیں ہے، مگر آخر میں میر اشرف علی کے بیٹے کا تاریخی نام "میر کاظم دین" لکھا ہے، اور یہ بھی صراحت کی ہے کہ اس کے عدد 1275 ہوتے ہیں۔ مرتب خطوط نے اسے جولائی 1859 کا مکتوبہ قرار دیا ہے جو 29 ذی قعدہ 1275ھ سے شروع ہوکر 30 ذی حجہ سنۂ مذکور پر ختم ہوتا ہے۔ لہٰذا آخرِ ذی حجہ 1275ھ سے پہلے کتاب تیار ہوجانا چاہیے جو سابق خط کا بھی مضمون ہے۔

اس خط سے مزید دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ قاطع کے دو مخطوطے تیار کیے گئے

---

1. خطوطِ غالب، 1:56، نواب انور الدولہ شفق کے نام کے خط مورخہ 5 نومبر 1858 سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نسخہ اس تاریخ سے قبل ان کو مل چکا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آخرِ اکتوبر میں طباعت ختم ہوگئی اور نسخوں کی تقسیم ابتدائے نومبر سے شروع ہوگئی۔ (ملاحظہ ہو خطوط، 1:138) یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ شیونراین کے خط میں کتابوں کی تعداد ہندسوں میں 32 لکھی ہے۔ (ملاحظہ ہو خطوط، 1:386)

2. خطوط، 1:58

3. خطوط، 1:253

تھے اور دوسری یہ کہ ان نسخوں کے کاتب نواب غلام فخرالدین خان تھے، جنھوں نے میرزا صاحب کی تقریباً سب ہی کتابیں نقل کی ہیں۔

(7) میرزا صاحب نے قاطع برہان کے دیباچے اور صاحبِ عالم مارہروی کے خط میں یہ صراحت کی ہے کہ دستنبو اور قاطعِ برہان کی ترتیب کے دوران میں ان کے پاس سوائے دساتیر اور برہانِ قاطع کے دوسری کوئی لغت کی کتاب نہ تھی۔ لیکن خود انھیں کے ایک خط سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ وہ 20 اپریل 1858 کو میر مہدی مجروح کے خط میں لکھتے ہیں[1] کہ "کتنے اوچھے ہو۔ 'مصطلحات الشعرا، مصطلحات الشعرا، بھائی، وہ کتاب تمھاری ہے۔ میں نے غصب نہیں کی۔ میرے پاس مستعار ہے۔ دیکھ چکونگا، بھیج دوں گا۔ تقاضا کیوں کرو؟"

ظاہر ہے کہ 31 جولائی 1858 سے پہلے اور فروری 1858 کے بعد کا واقعہ ہے، اس لیے دستنبو کی تالیف کے وقت کم ازکم مصطلحات الشعرا کا ان کے پاس ہونا ثابت ہے، اور اس صورت میں قاطع برہان کا بیان درست نہیں قرار پاتا۔

درفشِ کاویانی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب کے وقت میرزا صاحب کے پاس برہانِ قاطع کا دوسرا ایڈیشن تھا، اس لیے درفش میں جہاں کہیں برہان کے صفحوں کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ 1251ھ والے مولوی محمد اعلم لکھنوی کے نسخے کے خلاف ہے، جو میرزا صاحب علائی کو اور وہ اپنے والد کو دے چکے تھے۔

(8) میرزا صاحب نے میر مہدی کے محولۂ بالا خط میں یہ بھی لکھا ہے[2] کہ "یہ یاد رہے کہ جو صاحب اس کو دیکھیں گے، وہ ہرگز نہ سمجھیں گے، صرف برہانِ قاطع کے نام پر جان دیں گے۔ کئی باتیں جس شخص میں جمع ہوں گی، وہ اس کو مانے گا۔

"پہلے تو عالم ہو۔ دوسرے فن لغت کو جانتا ہو۔ تیسرے فارسی کا علم خوب ہو، اور اس زبان سے اُس کو لگاؤ ہو؛ اساتذۂ سلف کا کلام بہت کچھ دیکھا ہو اور کچھ یاد بھی ہو۔ چوتھے منصف ہو، ہٹ دھرم نہ ہو۔ پانچویں طبعِ سلیم و ذہنِ مستقیم رکھتا ہو؛ معوج الذہن اور کج فہم نہ ہو۔ نہ یہ پانچ باتیں کسی میں جمع ہوں گی اور نہ کوئی میری محنت کی داد دے گا۔"

میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر محمد معین، جو ایران کے مشہور محقق زبانِ فارسی تھے اور جنھوں نے برہانِ قاطع کا ایک تنقیدی ایڈیشن مفصل تحقیقی حواشی کے ساتھ چار جلدوں میں، اور اسی کا دوسرا

---

1. خطوطِ غالب (مرتبہ مولانا مہر): 267 2. خطوط، 253:1

اڈیشن پانچ جلدوں میں شائع کیا تھا، میرزا صاحب کی مذکورہ پانچ خصوصیات رکھتے ہیں۔ قاطعِ برہان کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے:[1] ''چنانکہ دیدہ می شود، در برخے موارد حق با غالب است، ودر برخے دیگر ایرادنا بجاست، ودر مواضعِ بسیار نزاعِ لفظی است وکرائی گفتن نکند۔''

رہی اس کی زبان، تو مفتی محمد عباس شستری لکھنوی نے میرزا صاحب کو اس بارے میں جو لکھا تھا، اُس کا ماحصل یہ ہے کہ اس کی زبان بھی شایستہ ہونا چاہیے تھی، اور ان کا یہ ارشاد ہر اُس شخص کو پسند آئے گا، جو علمی بحث میں تیز وتند لہجے کو ناپسند کرتا ہے۔

اس تمہید کے بعد میرزا صاحب کے ارشادات ملاحظہ فرمائیے۔ یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ میں نے مسودۂ قاطع کی عبارت کا املا میرزا صاحب کی تحریر کے مطابق درج کیا ہے، حتیٰ کہ اگر انھوں نے کچھ لفظوں پر لکیر کھینچی ہے، تو وہ بھی یہاں نظر آئے گی۔

1. برہان: فرجد بروزنِ ابجد پدرِجد را گویند کہ پدرِسیم است، خواہ مادری باشد خواہ پدری۔

غالب: لاحول ولاقوت الا باللہ[2] فرجود بمعنی کرامت وقدرت صحیح ومخفف آن فرجد بجیم مضموم۔

این کہ بمعنی پدرجد می نویسد غلط درغلط است۔ فر فارسی وجد عربی۔ فر بمعنی بزرگ آوردن وجد بمعنی پدرِ پدر، این چہ ترکیب است۔ بلکہ چون در فارسی فا بابای فارسی مبدل می شود، پرجد نیز می توان گفت، چنانکہ در ہندی پردادا گویند۔ این فرہنگ نویسی است یا تمسخر۔

عرشی: قاطع اور درفش میں حاشیے کی اردو اور فارسی دونوں عبارتوں کو تفصیل سے لکھا ہے۔ اُس میں سے یہ بات یہاں عرض کردوں کہ غالب کے خیال میں امیر خسرو نے قران السعدین میں لکھا تھا: فرِّ جد از فرجدِ خود یافتہ۔ شارحینِ قران السعدی نے فرجد کو جو فرجود بمعنی بزرگی وکرامت کا مخفف تھا، پردادا بتایا۔ صاحبِ برہان اس کو سچ مان گیا، اور اُس کا ذہن لفظِ فرجود کی طرف منتقل نہ ہوا، جو اس لفظ کے متصل بعد ہی آیا ہے۔ ورنہ یہ غلطی نہ کرتا۔

میں عرض کرتا ہوں کہ میرزا صاحب کا یہ خیال درست نہیں کہ خسرو نے فرجود کے مخفف فرجد کو یہاں نظم کیا ہے کیونکہ جیسا کہ ڈاکٹر معین نے حاشیۂ برہان میں لکھا ہے، فرجود

---

1. دیباچۂ برہانِ قاطع: 113

2. یہ عربی مقولہ اسی املا کے ساتھ بین السطور میں، اور فارسی عبارت حاشیے میں لکھی ہے۔ فارسی کے بعد کچھ باتیں اُردو میں درج کی ہیں، مگر وہ اب سے پہلے چھپوائی جا چکی ہیں۔

آتش پرستوں کی من گھڑت ہے۔ اسی لیے سوائے دساتیر کے کسی کتاب میں استعمال نہیں ہوا، اور نہ برہان سے پہلے کسی لغت میں فرجود کا نشان ملتا ہے۔ اس کے برخلاف ملا الہ داد فیضی سرہندی نے مدار الافاضل میں جد کے تحت فرجد لکھا ہے، اور سند میں اپنا یہ شعر پیش کیا ہے:

دہد حق فرِّ جدش از طفیلِ جدّ و فرجدّش
ہمیں باشد دعا ہاے نہان و آشکارِ من

کشف اللغات میں بھی ''فرجد'' کو بمعنی پدرِ جد بتایا ہے اور غالباً یہ معنی ان دونوں لغات نے موید الفضلاء سے لیے ہیں جو ان کا ماخذ ہے۔

رہا امیر خسرو کا مصرع، تو مناسب یہ ہوگا کہ اس سے پہلے اور بعد کے چند شعروں کے ساتھ اُسے پڑھا جائے۔ وہ شعر یہ ہیں:

برجِ شرف، چون فلک، از ہفت پشت ہفت فلک خنصرِ او را بمشت
باشرفِ ماہ سر افراختہ جاے شرف بر سرِ مہ ساختہ
پشت بہ پشت از دو طرف شہریار ہر طرف از ہر دو طرف تاجدار
میوۂ دلہای بلند افسران شاخ بشاخ نسب سروران
نورِ جد از جبہۂ اُو تاختہ فرِّ جد از فرجدِ خود یافتہ
شمسِ جہانگیر جدِ بافرش اظہر من شمس جدِ دیگرش
ناصرِ حق، شاہِ فرشتہ سرشت خوے خوشِ نسخۂ باغِ بہشت
جدِّ سوم، شاہِ غیاثِ اُمم حاکمِ فرمان، ز عرب تا عجم
ہر سہ جدش، کعبۂ ارکانِ جود کردہ دو عالم سہ جدش را سجود
پایۂ شاہی کہ ز مہ برتر است کیست کہ این پایہ بدو درخورست

ان اشعار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ شاعر کا مقصد شرفِ ذاتی و صفاتی دونوں کا بیان ہے، مگر اُس کا زور اس پر زیادہ ہے کہ میرا ممدوح، کیقباد، خاندانی سلطنت کا مالک ہے۔ چنانچہ وہ سب سے پہلے شمس الدین التتمش کا، اس کے بعد ناصر الدین محمود بن التتمش کا اور آخر میں غیاث الدین بلبن کا ذکر کرتا ہے۔ اگر ہم کیقبادی ددھیال کو دیکھیں، تو سلسلۂ نسب ہے: معز الدین کیقباد بن ناصر الدین محمود (بغرا خان والی بنگالہ) بن غیاث الدین بلبن، اور

ننھیالی نسب اس طرح ہے: کیقباد ابن بنتِ ناصرالدین محمود بن شمس الدین التتمش۔

ان نسبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کیقباد کا دادا بلبن تھا، نانا ناصرالدین محمود اور پرنانا التتمش۔ اور جیسا کہ تمام مورخوں نے لکھا ہے کہ، کیقباد اپنے باپ کا وارث نہیں ہوا تھا، جو والیِ بنگال تھا، بلکہ اپنے دادا بلبن کے مرنے کے بعد تختِ دہلی پر بیٹھا تھا، اور اس طرح دادا کا وارث ہوا تھا۔ چنانچہ خود امیر خسرو نے بھی یہی لکھا ہے:

کرد چو در شش صد و ہشتاد و شش   برسر خود تاجِ جدِ خویش خوش

ضبط چنان کرد جہان را، ز داد   کز کے و جُمشید نکردند یاد

اور یہ بھی تاریخی واقعہ ہے کہ بلبن زرخرید غلام تھا، التتمش کا اور التتمش کے بیٹے اور اپنے سسر ناصرالدین محمود کے بعد بادشاہ ہوا تھا۔ لہٰذا کیقباد کو جو سلطنت ملی، وہ اس کے پرجد (پرنانا) کی تھی۔ اُس سے نانا کو اور نانا سے دادا کو ملی، اور دادا کے مرنے پر کیقباد اُس کا وارث بن بیٹھا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر خسرو کے شعر:

نورِ جد از جبہۂ اُو تافتہ   فرِّ جد از فرجدِ خود یافتہ

کا مطلب یہی ہونا چاہیے کہ میرے ممدوح کی پیشانی پر نورِ خوش بختی چمکتا ہے۔ اس نے اپنے دادا کی شان وشوکت، جو دادا کو ممدوح کے نانا سے ملی تھی، گویا براہِ راست پرنانا سے حاصل کرلی۔

2. برہان: فرختار — بمعنیِ فروشندہ باشد۔

غالب: فرختار مخفف فروختار است، نہ بجای خود لغت جداگانہ 12

عرشی: قاطع اور درفش میں اس طرح اعتراض کیا کہ لغت اصلی فروختار ہے۔ اُسے بعد میں لکھا اور مخفف کو پہلے لکھ دیا، یہ کہاں کا قاعدہ ہے۔ میری دانست میں یہ اعتراض بھی درست ہے۔ فروختار، فرختار وغیرہ کو فروختن کے تحت لکھنا چاہیے تھا۔

3. برہان: فرخواگ — قلیہ وگوشتابہ را گویند کہ بر بالای آن تخمِ مرغ بریزند و بخورند، چہ فر بمعنی بالا و خواگ تخمِ مرغ را گویند۔

غالب: خاگ بہ کافِ فارسی تخمِ مرغ را گویند، لیکن بے واوِ معدولہ۔ خواگ از خرافاتِ حکیمِ دکنی است 12

عرشی: میرزا صاحب نے قاطع اور درفش میں لفظِ خواگ کے تحت لکھا ہے کہ ''خواگ باواوِ

معدولہ و کافِ فارسی غلط— خایہ و خایک باضافۂ کافِ تصغیر بیضہ را گویند— و بروایتِ ضعیف بیضۂ مرغ راہاک[1] گویند۔ و چون تبدلِ ہاے ہوز بخاے شخذ ستورست، خاک نیز میتوان گفت۔"

میری دانست میں یہ اعتراض درست نہیں کہ خاگ بکافِ فارسی غلط ہے، کیونکہ تمام اہلِ لغت جس میں جدید لغوی بھی شامل ہیں، اس لفظ کو جب بمعنیِ تخمِ مرغ لکھتے ہیں، تو کافِ فارسی ہی سے لکھتے ہیں۔ واوِ معدولہ البتہ جدید کتب لغات میں نہیں ملتا۔ ہاں، صرف فرہنگِ نظام میں خاگ اور خواگ دونوں کے وجود سے انکار کیا ہے۔

4 برہان: فرزام— بمعنی لائق و سزاوار و درخور باشد۔

غالب: سند می خواہد 12

عرشی: قاطع اور درفش میں یہ مطالبہ ترک کردیا ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ لغتِ فرس (ص 349) میں اسدی نے دقیقی کا یہ شعر سند میں پیش کیا ہے:

مکن اے روی نکو، زشتی با عاشقِ خویش
کز نکورویان زشتی نبود فرزاما

ڈاکٹر معین بھی اس شعر پر لفظِ فرزام کو درست تسلیم کرتے ہیں۔

5. برہان: فرنہ بفتحِ اول و ثالث بمعنی لعنت و نفرین باشد۔

غالب: فرنہ اینجا نوشتہ بہ نون و در آخرِ این بحث بجاے نون یاے تحتانی نوشتہ 12

برہان: فریہ بکسرِ اول و فتحِ ثالث بمعنیِ نفرین باشد و در عربی بمعنی دروغ و بہتان گفتہ اند۔ و بفتحِ اول بمعنی لعنت باشد۔

غالب: فریہ بکسرِ اول و فتحِ ثالث بمعنی نفرین نوشتہ، و بفتحِ اول بمعنی لعنت آوردہ۔ مگر نزدِ این ابلہ نفرین چیزِ دیگر و لعنت چیزِ دیگر است! و چون ازیں بگزری، در صفحۂ 558 بنگری کہ بجاے تحتانی نون نبشتہ است 12

عرشی: قاطع اور درفش میں صاحبِ برہان کے لیے لفظ ابلہ تو استعمال نہیں کیا، مگر اس نے فریہ کے معنی میں سے لفظِ لعنت حذف کردیا تھا، اُس پر فرمایا کہ "لعنت را فرد خورد۔" نیز مذکورہ بالا دونوں اعتراض یکجا لکھ کر فرمایا کہ اگر عربی میں فریہ کے معنی تہمت و دروغ

1. قاطع ص 41 میں باگ چھپا ہے۔

ہوں تو ہوں، مجھے یہ بتایا جائے کہ فارسی میں بمعنیِ نفرین فرنہ (بوزنِ ورنہ) ہے، یا فریہ (بوزن گریہ)۔

میں عرض کرتا ہوں کہ فرنہ تصحیف ہے فریہ کی، اسی لیے جہانگیری، رشیدی، سراج، انجمن آرا اور فرہنگِ نظام کسی میں بھی یہ لفظ نہیں[1] ہاں فریہ موجود ہے، جسے فرہنگِ جہانگیری میں بکسرِ فا اور برہان میں بفتح وبکسر ہر دو لکھا ہے۔ سراج کی تحقیق میں صحیح تلفظ بفتح فا ہے، اور لعنت ونفرین دونوں کو اس کے معنی قرار دینا درست ہے۔

6. برہان: فغستان — بضمِ اول وثالث بمعنیِ زن ومنکوحہ وصورتِ سلاطین وامرا باشد۔

غالب: (محشّیِ برہان نے حاشیے میں لکھا ہے کہ بمعنی صورتِ سلاطین وامرا کاتبوں کی غلطی ہے۔ کسی اور کتاب میں یہ معنی نظر نہ آئے۔ اس کے آگے میرزا صاحب نے لکھا ہے) اینہم باید نوشت کہ فغ بفتح بمعنیِ بت نوشتہ، و در فغستان بہ ضم آوردہ ومعنی بتخانہ نوشتہ۔ ضمۂ گل در گلستان وفتحۂ رز در رزستان مبدل نمی شود۔ فتحۂ فغ در فغستان چرا مضموم گردد کہ مذموم است۔ دیگر فغاک رانیز بہ ضم مینویسد و در شرحِ معنی طرفہ خبط می ورزد۔ ابلہ ونادان وبی عقل یک معنی را سہ بار می آورد، و باز می نویسد کہ حرامزادہ را نیز گویند۔ معلوم نمی شود کہ حرام زادہ بمعنی شریر است یا بمعنی ولد الحرام۔ اکنون حقیقتِ این لفظ باید شنید۔ فغاک است بہ فای مفتوح۔ فغ ہمان بُت، والف وکاف افادۂ معنیِ نسبت می کند۔ یعنی این شخص مثلِ بُتِ سنگین یا پیکرِ چوبین از حواسِ ظاہر وباطن خالیست، یعنی نادانِ محض 12

فغفور نیز فغ پور است یعنی پسرِ بُت۔ چون پدرش را پسر نمی زیست، یکبار کہ زنش پسر آورد، آنرا در بتکدہ بپایے بُت افگند وگفت کہ این پسرِ بُت است۔ قضارا آن کودک زیست وآن اسم در خاندانِ ایشان علم قرار یافت، تا ہر کہ بادشاہ شد او را فغفور گفتند۔ در ہند نیز پسر ودختر را بہ مسجد می برند ومسیتا بیگ ومسیتی بیگم نام می نہند۔ میست مسجد، والف موافقِ قاعدۂ ہندی از بہر مذکر علامتِ نسبت، ویای تحتانی از برای مونث علامتِ نسبت 12

فغوارہ بفای مضموم می نویسد ومعنیِ آن بُت مانند میگوید۔ و در بحثِ فغ فای را مفتوح و در فغاک وفغوارہ مضموم میخواند۔ لاحول ولا قوت الا باللہ۔ فغاک وفغوارہ ہر دو بمعنی یکس و حرکت است، لیکن بفاے مفتوح۔

---

1. ڈاکٹر معین نے فرہنگِ نظام ج 5 ص لط کے حوالے سے لکھا ہے کہ سراج اللغہ میں فرنہ کو تصحیف فریہ قرار دیا ہے۔

عرشی: قاطع اور درفش میں بھی یہی باتیں ان الفاظ کے بارے میں لکھی ہے۔ ان میں سے فغستان وغیرہ کی فا کا مفتوح ہونا، بالکل درست ہے۔ فغ بالضم ہرگز نہیں، پھر اس کے مرکبات بالضم کیسے ہوں گے۔ ہاں، فغاک کے بارے میں یہ کہنا کہ حرامزادہ اس کے معنی نہیں، صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ اسدی نے لغتِ فرس (ص 254) میں لکھا ہے کہ فغاک ابلہ ہوتا ہے اور حرامزادے کو بھی کہتے ہیں۔ لغتِ فرس کے حاشیے میں دوسرے نسخوں سے جو معنی لکھے ہیں وہ احمق و حرامزادہ اور حرامزادہ وقلتبان وابلہ ہیں۔[1]

فغفور کی وجہِ تسمیہ کے بارے میں رشیدی نے لکھا ہے کہ "دراصل فغپور بودہ یعنی پسرِ بُت، زیرا کہ پدر و مادرش نذرِ بت کردہ بودند۔ ایرانی ایڈیشن کے مصحح نے حاشیے میں یہ اضافہ کیا ہے کہ جیسے عربی میں عطاء اللہ، فارسی میں خداداد، ترکی میں تاری وردی اور فرنگی میں ویوڑن کہا جاتا ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ یہاں پور کو بمعنی عبد بھی قرار دیا جا سکتا ہے یعنی عبداللہ یا خدا بندہ۔

7. برہان: فگانہ بفتحِ اول و کاف — و بکسرِ اول ہم آمدہ است و بجاے نون، میم ہم دیدہ شدہ۔

غالب: بجاے نون، میم غلط۔ و بکافِ فارسی نیز غلط۔ فکانہ و افکارنہ واپکانہ ہمین سہ صورت دارد۔ دراصل افکنانہ بود۔ افکن صیغۂ امر است از افکندن، دانہ افادۂ معنیِ نسبت و مانند کند، چون دیوانہ منسوب بہ دیو و مانندِ دیو، و فرزانہ منسوب بہ فرز یعنی حکمت و بزرگی۔ ہمانا افکنانہ کہ بہ افکن منسوب بود، بسببِ کثرتِ استعمال افکانہ شد۔ و چون فکندن و افکندن یکیست و فای سعفص و باے سہ نقطہ نیز یکے است، ہر آئینہ فکانہ و افکانہ واپکانہ یکیست۔ و باید دانست کہ فکندن بکافِ تازی است، نہ بہ کافِ فارسی کہ حکیمِ دکنی آنرا بکافِ فارسی نوشتہ 12

عرشی: قاطع اور درفش میں یہ اعتراض شامل نہیں، سراج اللغہ میں آفگانہ، افگانہ اور فگانہ تینوں کو بکافِ فارسی لکھا ہے، اور آفگانہ کے تحت کہا ہے کہ افگندن سے مشتق معلوم ہوتا ہے، مگر ہنوز معنیِ ترکیبی غیر واضح ہیں۔ فگانہ کے آخر میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ بعضے بکافِ تازی کہتے ہیں، اور کچھ نے بجائے نون کے میم پڑھا ہے۔ میری دانست میں میرزا صاحب کا یہ اعتراض درست ہے کہ فگانہ غلط ہے؛ مگر ان الفاظ کو بکافِ تازی قرار دینا اور کافِ

---

1. درفش میں میرزا صاحب نے یہ کہا ہے کہ ظریف لوگ بطور طنز مجہول النسب کو فغفور کہہ دیتے ہیں۔

فارسی سے انکار درست نہیں۔ افگندن اور اس کے مشتقات دونوں کافوں سے صحیح ہیں، چنانچہ ڈاکٹر معین نے حاشیۂ برہان میں لکھا ہے کہ پہلوی میں افگندن اور اپکندن دونوں ہیں۔ چونکہ افگندن بکافِ فارسی مشہور ہے، اور اس لیے بیشتر اہلِ لغت اسے یونہی لکھتے ہیں، لہٰذا کافِ فارسی کی تغلیط نادرست ہے۔

8. برہان: قبچاق بکسرِ اول، نام دشتے وصحرائی است از ترکستان۔ و طائفۂ از ترکانِ ہمان نواحی راقبچاقی گویند۔

غالب: قبچاق بکسرِ اول محض غلط۔ قاف مفتوح است، نامِ دشت وصحرا غلط در غلط و طائفۂ ترکان را قبچاقی گفتن ہمان مثل است کہ یک خطا، دو خطا، خطاے سیوم ما در بخطا۔ لاحول ولا قوت الا باللہ۔ اول اینکہ ترک قومِ دیگر و مغل قومِ دیگر۔ دوم اینکہ نامِ دشت خفچاق است، نہ قبچاق۔ ہان قبچاق لفظِ ترکیست بمعنی درختِ میانِ تہی، واسم طائفہ ایست از مغول کہ اقوامِ چنگیز خان اند۔ وصحراے خفچاق دشتے است مسکن ومولدِ ترکان۔ بہ بین تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا۔'' [1]

عرشی: قاطع اور درفش میں قدرے اختصار کے ساتھ یہی بات کہی ہے، اور غنیمت ہے کہ وہاں وہ گالی نہیں دی، جو یہاں لکھ گئے ہیں۔ جہاں تک اعتراض کا تعلق ہے، وہ فرہنگِ نظام کی تحقیق کے مطابق غلط ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ ''قبچاق (بکسرِ کاف) قومے است از اتراک کہ بشجاعت و دلیری مشہور اند۔ از ظفر نامۂ شرف الدین علی یزدی معلوم شد نامِ جائی است۔ و آن اتراک را نیز از عالمِ تسمیۃ الحال باسم المحل قبچاق گویند۔ از تصنیفِ مجد الدین علی قوسی تحقیق گردید۔'' ابراہیم قوامِ فاروقی نے شرف نامے میں لکھا ہے کہ ''قبچاق'' بادوم وسیومِ فارسی، بیابانی، و نیز اصلی است۔ ترکان را کہ ایشان را قبچاقیانِ وخفچاقیان گویند۔ ویک نفر قبچاقی را نیز قبچاق گویند۔ وخفچاق درین لغت است۔'' کشف اللغات میں یہی عبارت نقل کردی ہے۔ البتہ شرف نامے کے آخری جملے کی جگہ لکھا ہے: ''واین لغت ترکی است۔''

یہ بیان بھی برہان ہی کا موید ہے۔ نیز ڈاکٹر معین نے حواشیِ برہان میں اس کی تردید نہیں کی، جس سے تائیدِ مزید حاصل ہوجاتی ہے۔

---

1. لفظ خفچاق پر جو حاشیہ میرزا صاحب نے لکھا ہے، وہ بھی ملاحظہ فرمالیا جائے۔

9. برہان: کادی بروزنِ شادی نباتے است بسیار خوشبوی۔

غالب: کاذی بمعنی کیوڑہ۔

عرشی: لیکن ڈاکٹر معین نے حاشیۂ برہان میں دوزی کی عربی لغت (434:2) سے دال اور ذال دونوں سے درست بتایا ہے۔

10. برہان: کارگیا، بکسرِ ثالث وکافِ فارسی وتحتانی بالفِ کشیدہ بمعنیِ پادشاہ و وزیر و کارفرما و کاردان باشد۔

غالب: کارگیا بکسرِ ثالث، حرفِ ثالث رائے قرشت است۔ پس از کسرۂ ثالث چنان فہمیدہ می شود کہ کار بطرفِ گیا مضاف است، حال آنکہ درین صورت لفظ مہمل میشود۔ فرض باید کرد کہ سہوِ کاتب است، بجاے رابع ثالث نوشتہ است۔ دریں صورت گیا بکسرِ کافِ پارسی ہیچ معنی ندارد۔ اصل اینست کہ کیا بفتح کافِ عربی بمعنیِ خداوند و مالک است۔ و کارکیا و دِہ کیا یعنی خداوندِ کار و مالکِ دہ۔ غالب

عرشی: قاطع اور درفش میں یہی بات ذرا تفصیل سے لکھی ہے۔ چنانچہ یہ بھی کہا ہے کہ گیا بکسرِ کافِ فارسی گیاہ کا مخفف ہے اور گیا بالفتح، ہندی میں جانا مصدر کا ماضی ہے۔ رہا اعتراض، تو وہ درست ہے، چنانچہ ڈاکٹر معین نے حاشیۂ برہان میں تصریح کی ہے کہ ''صحیح کارکیا بکافِ تازی است۔''

11. برہان: کاس بروزنِ طاس بمعنی کوس باشد کہ نقارۂ بزرگ— و در عربی کاسہ و پیالہ را گویند۔

کاسہ بفتح ثالث معروف است، و آن ظرفے باشد کہ چیزے در آن خورند۔ و بمعنی طبل وکوس و نقارۂ بزرگ ہم آمدہ است۔

غالب: کاس را خود می نویسد کہ در عربی کاسہ و پیالہ را گویند۔ باز در تحتِ بحثِ لغت کاسہ خلطِ مبحث کردہ چنان می نویسد کہ آدم در یابد کہ کاسہ در فارسی ہم پیالہ را گویند و ہم نقارہ را۔ اصل اینست کہ کاس و کاسہ مانندِ موج و موجہ عربیست، و کاس بمعنی نقارہ فارسی۔

عرشی: قاطع اور درفش میں چند الفاظ کی کمی بیشی کر کے یہی عبارت نقل کردی ہے۔ ویسے اعتراض درست ہے اور برہان کی عبارت میں ضعف تالیف پایا جاتا ہے۔

12. برہان: کاشت، بروزنِ چاشت ماضیِ کاشتن است۔ و ماضیِ برگردانیدن ہم ہست، یعنی

برگردانید۔ وبمعنیِ روے برگرداینِد ہم بنظر آمدہ است کہ ماضیِ روے برگردانیدن باشد۔

غالب: کاشت اول می نویسد کہ ماضیِ برگردانیدن ہم است۔ باز می نویسد بمعنی روی برگردانید ہم بنظر آمدہ است۔ یارب، این شخص چہ میگوید و چہ می اندیشد؟ اول این کہ باشتن تنہا، بمعنیِ گرداندن نیامدہ است۔ ہان، برکاشتن مرادف برتافتن آمدہ است۔ دوم اینکہ خصوصیتِ روے از پیشِ خود تراشیدہ است۔ مثلاً اگر گویم کہ فلانے از ما کاشت، موافقِ مذہبِ جامعِ لغات معنیِ آن خواہد بود کہ از ما روے برگردانید۔ استغفراللہ، تا روے را مذکور نہ کنند، معنی روے برگرداندن ندہد۔

عرشی: قاطع اور درفش میں ذرا زیادہ جذباتی رنگ دے دیا ہے۔ فرماتے ہیں: ''وغم ازین کہ می گوید ماضیِ برگردانیدن ہم ہست۔ و داغ بالاے داغ این کہ می گوید، بمعنیِ روے برگردانید ہم بنظر آمدہ است۔'' جہاں تک اعتراض کا تعلق ہے وہ درست ہے۔ کاشت کے معنی برگردانید نہیں ہوتے لیکن یہ توجیہ درست نہیں کہ برکاشت کہنا چاہیے تھا، کیونکہ برکاشت کے معنی بھی وہ نہیں، جو میرزا صاحب نے لکھے ہیں جیسا کہ ڈاکٹر معین نے لکھا ہے، کاشت اور کاشتن بمعنی برگردانید و برگردانیدن بکافِ فارسی گاشتن و گاشت ہے۔ چنانچہ گاشت اور گاشتن خود برہان میں بمعنی گردانیدن بابِ کافِ فارسی میں آرہا ہے اور برگاشت باب الباء میں گزر چکا۔ لہٰذا یہ کہنا درست ہوگا کہ صاحبِ برہان نے یہاں تصحیف خوانی کی ہے۔

13. برہان: کافت— ماضی شکافتن است یعنی شکافت وترکانید۔ و ماضی کافتن ہم ہست یعنی جستجو کرد و تفحص و تجسس نمود۔

کافتیدہ— بمعنی ترکیدہ وشکاف بہم رسانیدہ باشد۔

کافد— یعنی بشکافد و بترکاند و جستجو کند۔

غالب: کافت را اول ماضیِ شکافتن می گوید۔ واین گفتار آنچنان غلط است کہ ہر طفل کہ آمدنامہ می خواند، می داند ماضیِ شکافتن شکافت و ماضیِ کافتن کافت، ماضیِ شکافتن کافت نمی تواند بود۔ باز می نویسد کہ کافتن بمعنیِ شکافتن و کاویدن۔ باز می نویسد کہ شکافتن بریدنی باشد در درازی، و کاویدن عمق پیدا کردن است۔ گوئی خود تکذیبِ خود می کند۔ باز می نویسد کہ کافد یعنی بشکافد و بترکاند۔ لاحول ولا قوت الا باللہ مگر درگیتی کارِ دیگر نبود کہ این

دکھنی قصدِ فرہنگ نگاری کرد۔ اصل اینست کہ شکافتن مصدریست جداگانہ بمعنیِ 'چیرنا' شکافد مضارعِ آنست۔ کافتن مصدریست جداگانہ بمعنیِ 'کھودنا' کاود مضارعِ آنست، و کاویدن مصدرِ مضارعی است۔ کافد و کافتیدہ خرافات، و باقی سراسر بیان لغو۔

عرشی: جہاں تک ضعفِ تالیف کا تعلق ہے، میرزا صاحب کا اعتراض درست ہے۔ کافت کو کافتن کا ماضی اور شکافت کو شکافتن کا ماضی کہنا چاہیے تھا۔ باقی یہ صحیح نہیں کہ کافتن و شکافتن ہم معنی نہیں۔ اسدی طوسی نے لغت فرس (ص 243) میں لکھا ہے کہ ''کاف شکاف باشد۔ بوشکور گفت:

کشاورز و آہنگر و پائباف چو بیکار باشند، سرِ شان بکاف

لغتِ فرس کے ایک اور نسخے (حاشیہ نمبر 6 ص 243) میں یہ عبارت ملتی ہے: ''کاف ترا کے بود کہ در چیزے افتد، اشکاف و شکافتہ و کافتہ و کافتیدہ ہمہ یکے باشند۔'' فرہنگ نظام میں بھی کاف کو امر کافتن بمعنی شکافتن لکھا ہے۔ انجمن آرا میں کاف کے معنی شکاف اور شکافندہ لکھ کر سنائی وغیرہ کے سندی اشعار درج کیے ہیں۔

14. برہان: کشاورز، بفتحِ اول و واو، بروزن فرامرز، بمعنیِ دہقان و برزیگر و زراعت کنندہ باشد۔ و زمینِ زراعت و کشت زار را نیز گویند۔

غالب: کشاورز بہ فتحِ اول غلطِ محض۔ این کشت ورز است، یعنی ''کھیتی کرنے والا'' چنانکہ کشتاورز ہم آمدہ است۔ کشاورز بہ کسرۂ کاف است۔

عرشی: قاطع اور درفش میں تفصیل سے لکھا ہے، اور برہان کی عبارت میں چار غلطیاں اور ایک تمسخر بتایا ہے۔ پہلی غلطی بکسرِ کاف کی جگہ بفتح لکھنا۔ دوسری کشاورز کو فرامرز کا ہموزن بتانا، حال آنکہ کشاورز کا واو مفتوح اور فرامرز کی میم مضموم ہے۔ تیسری برزیگر کو بمعنی مزارع کہنا، جب کہ صحیح لفظ برزگر ہے۔ چوتھی کشاورز کو زمینِ زراعت یا کھیت کا مترادف بتانا۔ رہا تمسخر، تو وہ ظاہر ہے کہ کشاورز کے معنی بتاتے ہوئے تین لفظ اختیار کیے۔ یہ مسخرہ پن نہیں تو کیا ہے۔

لیکن مرزا صاحب کے چاروں اعتراض درست نہیں۔ پہلا اس لیے کہ خود لفظِ کشتن مخفف ہے کاشتن کا، لہٰذا اسے بفتح کاف ہونا چاہیے۔ فرہنگِ نظام میں لکھا ہے کہ ''مخففِ کاشتن است و باید بافتحِ اوّل باشد۔ اما بیشتر باکسرِ اوّل استعمال می شود۔''

دوسرا اس وجہ سے کہ مولفِ برہان کے نزدیک فرامرز بفتحِ اوّل و میم ہے۔ میم کے مفتوح ہونے کی توجیہ انجمن آرا میں یہ کی گئی ہے کہ یہ لفظ (فر) اور (مرز) سے مرکب ہے، بمعنیِ شکوہ زمین اور ڈاکٹر معین نے کہا ہے کہ (فر) اور (آمرز) سے مرکب ہے بمعنیِ آمرزندۂ دشمن۔ رہا یہ شعر:

چنان گفت رستم فرامرز را　　که دل مشکن و بشکن البرز را

تو اس سے یہ ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ فرامرز کی میم مضموم ہے، مگر یہ شعر میرزا صاحب کو فرامرز کی حرکات پر اعتراض کرتے ہوئے پیش کرنا چاہیے تھا۔ یہاں یہ بے محل ہے کیونکہ صاحبِ برہان کا مقصد صرف یہ ہے کہ کشاورز کا واو مفتوح ہے اور چونکہ وہ فرامرز کی میم کو (غلط یا صحیح) مفتوح مانتا ہے، لہٰذا اس کا مدعا ثابت ہو گیا۔ تیسرا اعتراض کہ برزیگر کو مزارع نہیں کہتے، وہ برزگر ہے، یہ بھی جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، درست نہیں۔ یہ لفظ پہلوی میں وَرِزی ہکَر، مازندرانیِ رحال میں وَرزیگر اور گیلکی میں بَرزِے گر بولا جاتا ہے، ملاحظہ ہو حواشی ڈاکٹر محمد معین بر لفظ برزیگر۔

چوتھا اعتراض کہ کشاورز کے معنی کھیت یا کشت زار نہیں، یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ رشیدی نے اس معنی کی سند میں ناصرِ خسرو کے یہ دو شعر پیش کیے ہیں:

در کشاورزِ دینِ پیغمبر　　این فرومایگان خس و خارند

چون کشاورز خون و خار گرفت　　تخم اگر بفکنی، بود تاوان

ان شعروں سے برہان کی مکمل تائید ہوتی ہے۔

رہا برہان کا ایک لفظ کی تشریح و توضیح کے لیے چار مترادفات کا ذکر کرنا، تو اگر یہ مسخرہ پن ہے، تو اس سے کون لغت نویس بچ سکے گا۔

15. برہان: کشکول بروزن مقبول بمعنی گدا باشد — و کاسۂ کشکول کاسۂ گدا را گویند۔ و معنیِ ترکیبیِ آن کشیدن بدوش است، چہ کش بمعنی کشیدن و کول دوش و کتف را گویند۔ و کاسۂ را نیز گویند کہ گدایان دارند۔

غالب: نہ کشکول بمعنی گدا، و نہ بوزنِ مقبول۔ کشکول بہ واوِ مجہول کاسۂ را کہ بصورتِ کشتی سازند خصوصاً و کاسۂ گدائی را گویند عموماً۔

عرشی: قاطع اور درفش میں اس لفظ پر تفصیلی ریمارک کیا ہے۔ اس میں ایک اعتراض یہ ہے کہ

کشکول بروزنِ مقبول نہیں، بلکہ اس کا واو مجہول ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ جہانگیری نے اسے بواوِ معروف ہی لکھا ہے۔ نیز انجمن آرا میں علامہ بہائی کا یہ شعر نقل ہوا ہے، جو برہان کا مؤید ہے:

دلم از قیل و قالِ کشتہ ملول   اے خوشا، خرقہ و خوشا کشکول

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ کشکول فقیر کو ہرگز نہیں کہتے، بلکہ کاسۂ گدائی کا نام ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تمام اہلِ لغت کے نزدیک کشکول کی ایک شکل نچکول بھی ہے۔ رشیدی نے اس کے معنی گدا اور کاسۂ گدا لکھ کر کہا ہے کہ اسے کجکول بھی کہتے ہیں اور انوری کا یہ شعر سند میں پیش کیا ہے:

بروزگارِ ملک شہ، عرابی نچکول   مگر بیار گہش رفت از قضا گہِ بار

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اسے کش بمعنی کشیدن اور کول بمعنی دوش سے مرکب کہنا غلط ہے، کیونکہ ایک تو کشکول کو ہاتھ میں لٹکاتے ہیں، کاندھے پر نہیں، دوسرے کوئی ایسا مرکب فارسی میں نہیں ملتا جس کا پہلا جزو امر اور دوسرا اسم ہو۔ میں عرض کرتا ہوں کہ برہان کی اس توجیہ کو درست نہیں کہا جا سکتا، لیکن غالب کا یہ کہنا کہ کشکول کا کش امر ہے، قابلِ غور ہے۔ قاطع القاطع میں اسے اسم بمعنی کشیدن لکھ کر مثال میں کشاکش پیش کیا ہے۔ اس طرح یہ لفظ دو اسموں سے مرکب ہوا۔ نیز امر اور اسم سے مرکب لفظ کی مثال میں ساطعِ برہان کے مولف نے سعدی کا یہ شعر لکھا ہے:

کسے می برد از جہان کامِ دل   کہ یک دل بود باوے آرامِ دل

اور یہ دعوا کیا ہے کہ اس شعر میں آرامِ دل مرکبِ اضافی نہیں بلکہ دلارام کا مقلوب ہے۔ فرہنگِ نظام میں اس لفظ کو ''کش'' مخففِ کرش بمعنی سیاہ اور کول (بواوِ معروف) بمعنیِ ساحل سے مرکب بتایا ہے اور معنیِ ترکیبی لکھے ہیں ''چیزِ سیاہِ حاصل شدہ از ساحلِ دریا۔'' چونکہ یہ نارجیلِ دریائی کے پوست کا نصف حصہ اور کالے رنگ کا ہوتا ہے، نیز خطِ استوا کے قریب کے جزیروں میں پیدا ہوتا ہے، اس لیے توجیہِ مذکور قابلِ توجہ ہے۔

16. برہان: کفانہ بروزنِ بہانہ بچہ را گویند کہ نارس از شکمِ مادر بیفتد۔

غالب: کفانہ درست است زیرا کہ مقلوبِ فکانہ است چون میان و نیام و پلارک و پرالک۔ لیکن غور باید کرد کہ در تحتِ لغتِ افکانہ و فکانہ بہ کافِ فارسی نوشتہ۔ و اینجا حق برز بانش

جاری شد و بہ کاف عربی نوشت۔

عرشی: یہ اعتراض درست نہیں، اس لیے کہ افگندن تازی و فارسی دونوں کافوں کے ساتھ موجود ہے۔

17. برہان: گازی بروزنِ بازی نامِ گلے است خوشبوی کہ بہندی کیوڑہ گویند بکسرِ کاف۔

غالب: گازی کیوڑہ۔

عرشی: اس لفظ کو مولفِ برہان پہلے بابِ کافِ تازی کی فصل الف میں، پھر کندی کے تحت ''کاذی'' لکھ چکا ہے۔ میرزا صاحب نے قاطع اور درفش میں اس پر کچھ نہیں لکھا۔ رشیدی نے ''گازی'' کے تحت لکھا ہے کہ صحیح کاذی ہے بکافِ تازی و ذالِ معجمہ بمعنی گلِ کیوڑہ، اور عربی لفظ ہے۔ چونکہ فارسی لغات میں گازی بھی لکھا گیا تھا، اس لیے رشیدی نے مزید کہا کہ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ زاور گ کے ساتھ فارسی اور ذاورک کے ساتھ عربی ہو۔

میرزا صاحب نے درفش (ص 134) میں لکھا ہے کہ ''کندی بروزن بندی نامِ گلے است خوشبو۔ عربی آن کاوی و ہندی کیوڑہ۔''

لیکن اقرب الموارد سے معلوم ہوا کہ برہان اور رشیدی کا بیان درست ہے کہ عربی میں کیوڑے کو کاذی کہتے ہیں۔ غالباً درفش میں سہوِ کتابت ہوا ہے۔

18. برہان: گذاردن بضمِ اوّل بروزن شماردن بمعنیِ گذاشتن باشد و بمعنیِ ادا کردن وحبا نمودن یعنی پیش کش کردن ہم ہست۔ و بمعنیِ گذرانیدن ہم آمدہ است بچند معنی۔

غالب: گذاردن بذالِ نقطہ دار قطعِ نظر از انکہ مشتقاتِ یک مصدر را لغاتِ جداگانہ قرار دادہ است، واین خوی اوست، گذاردن بذالِ معجمہ از کجا گفت۔

عرشی: قاطع اور درفش میں مزید تفصیل سے لکھا ہے لیکن واقع یہ ہے کہ گذشتن و گذاردن و گذاشتن ذال اور زے دونوں سے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر معین نے بتایا ہے کہ بمعنی ادا کردن زاے ہوز سے ہے۔ رہا میرزا صاحب کا یہ خیال کہ ذ فارسی زبان کا حرف ہی نہیں، تو یہ غلط ہے۔ حسن عمید اپنی فرہنگ میں لکھتے ہیں: ''ذ، حرفِ یازدہم الفبای فارسی کہ ذال تلفظ می شود۔ آن را ذالِ معجمہ و ذال منقوطہ ہم میگویند۔ این حرف در فارسی در اوّل کلمہ پیدا نمی شود۔ یعنی در فارسی کلمۂ نیست کہ اوّل آن ذال باشد مگر کلمۂ ذرخش۔''

19. برہان: گزاردن بضم اول و فتحِ دالِ ابجد بمعنی ادا کردن باشد۔

غالب: گزاردن بہ زاے ہوز ہمان بحث است کہ در ذالِ شخذ آوردہ است۔

20. برہان: گل کردن این لفظ را بجای خاموش کردن استعمال کنند چنانکہ گویند: ''چراغ را گل کن'' یعنی خاموش کن۔ و بمعنیِ ظاہر شدن و نمودار گردیدن ہم ہست۔ چہ ہرگاہ گویند ''کچہ گل کرد'' معنی آن باشد کہ ظاہر شد و نمودار گردید۔

غالب: گل کردن بمعنیِ ظاہر شدن خود می نویسد۔ پس از اینجا دانستہ می شود کہ گل شدن و گل کردن را یکے دانستہ۔ و این غایتِ نادانیست۔ دیگر این کہ بمعنی کشتنِ شمع و چراغ روزمرۂ فارسی ہرگز نیست۔ آرے، در ہند متعارف است ''چراغ گل ہوگیا'' یا ''چراغ گل کردو'' این محاورہ را در فارسی آوردن از کم تتبعی است۔

عرشی: برہان میں ''گل شدن'' کو کنایہ از ظاہر شدن و خاموش گردیدن قرار دیا گیا تھا۔ اس پر میرزا صاحب نے اردو میں یہ حاشیہ لکھا تھا: ''گل شدن فردوسی کے وقت سے آج تک کسی کے کلام میں بمعنیِ ظاہر شدن نہیں آیا۔ ہاں، گل کردن بمعنی ظاہر شدن ہے۔ اگر گل شدن بمعنی ظاہر شدن ہوتا تو گل کردن اوس کا متعدی ٹھہرتا یعنی ظاہر کرنا، اور یہ نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ حکیم دکنی نے یہ معنی اپنے قیاس سے ٹھہرائے ہیں۔

عرشی: میرزا صاحب کا یہ اعتراض درست ہے کہ گل شدن یا گل کردنِ چراغ ہندی محاورہ ہے، چنانچہ فرہنگِ نظام میں لکھا ہے کہ اہلِ ایران کے کلام میں یہ محاورہ نظر سے نہیں گزرا۔ ڈاکٹر معین نے بھی اسے محاورۂ اہلِ ہند قرار دیا ہے۔ اسی طرح گلِ شدن بمعنیِ ظاہر شدن بھی اہلِ ایران کے یہاں نہیں ملتا۔ لیکن ڈاکٹر معین نے برہان کے اس مقام پر کوئی حاشیہ نہیں لکھا، یہ بات حیرت انگیز ہے۔

21. برہان: گوشاسپ۔ بمعنیِ خواب دیدن باشد کہ عربان رویا گویند۔

غالب: گوشاسپ بمعنیِ رویا۔ بیننده در باے موحده مع الواو بیند کہ بوشاسپ بمعنیِ رویا آوردہ۔ اکنون کدام لغت را صحیح دانیم۔

عرشی: قاطع اور درفش میں لکھا کہ بوشاسپ اور اس کا مقلوب بوشباس تو درست لکھا ہے، کہ کوشاسپ اور گوشاسپ جو بابِ کافِ عربی و کافِ فارسی میں لکھا، یہ درست نہیں، جیسا کہ ہم بوشاسپ کی شرح میں لکھ چکے ہیں۔

ڈاکٹر معین نے بوشاسپ کے تحت لکھا ہے کہ فارسی میں بوشاسپ اور گوشاسپ یہ دو شکلیں صحیح ہیں، بوشاست اور کوشاسپ درست نہیں۔ سراج میں بھی بکافِ فارسی کو ترجیح دی ہے۔ گوشاسپ کو بقولِ رشیدی فردوسی نے اور اسدی کے نزدیک بوشکور بلخی نے اس شعر میں نظم کیا ہے:

شنیدم کہ خسرو بہ گوشاسپ دید چنان کاتشے شد بدورش پدید

بوشاسپ اور بوشپاس بقولِ جہانگیری و رشیدی زراتشت بہرامِ یزدی کے ان شعروں میں باندھے گئے ہیں:

نہ در بیدار گفتم من، نہ بوشاسپ نگویم جز بہ پیشِ تختِ گشتاسپ
شدم در زمان تا برِ خواب گوی خردمند ہمسایۂ نیک خوی
جہان دیدہ بُد پیرِ اختر شناس بدو باز گفتم من این بوشپاس

22. برہان: مابون— نام علتے و حیز و مخنث و پشت پایے را ہم میگویند و در عربی نیز ہمین معنی دارد۔ چہ مفعولِ اُبنہ است۔ و اُبنہ علتی باشد در موضع مخصوص۔

غالب: تحتِ لفظِ مابون می نویسد کہ در عربی نیز ہمین معنی دارد۔ یارب، این چہ معنی دارد۔ خود این لغت عربی الاصل است، بقولِ جامعِ برہان مفعولِ اُبند، فارسی ہرگز نیست۔

عرشی: قاطع اور درفش میں اس اعتراض کی عبارت مختصر کردی ہے۔ باقی یہ لفظ عربی ضرور ہے، مگر اہلِ فارس نے اس کے معنی میں تصرف کیا ہے، اس لیے اس لفظ کو فارسی کہنا درست ہوگا۔ ڈاکٹر معین نے منتہی الارب سے نقل کیا ہے کہ مابون کے معنی متہم (جس پر تہمت لگائی گئی ہو) ہیں۔ یہ خیر و شر دونوں کے لیے بولا جاتا ہے مگر جب مطلق استعمال کریں، تو فقط متہم بشر مراد ہوگا۔ اس صورت میں صاحبِ برہان کا حیز و مخنث و پشت پای کے معنوں میں عربی بتانا غلط ہے۔

23. برہان: مارافسا، مارافسار، مارافسائے، افسون گرِ مار و مار آموزندہ است کہ مارگیر باشد۔

غالب: مار افسائے و مار افسا درست مثل رہنمائے و راہ نما۔ مار افسار غلط محض، و مار افسان مذبذب۔

عرشی: قاطع اور درفش میں بھی یہی بات دہرائی ہے۔ ساطع برہان (ص 147) سے معلوم ہوتا ہے کہ مار افسان جہانگیری میں اور مار افسار نوادر المصادر، موید الفضلا اور مدار الافاضل

میں درج کیے گئے ہیں۔ میں نے ابراہیم قوام فاروقی کا شرفنامہ دیکھا۔ وہ فرماتے ہیں:
''عمار افسان[1] افسون گرے کہ مار را بگیرد۔ و آن را مار افسار نیز گویند۔'' تحفۃ السعادہ
میں مار افشان لکھ کر کہا ہے کہ ''آن را مار افسان[2] نیز گویند۔'' فرہنگِ شعوری نے مجمع
الفرس سروری سے مار افسان نقل کیا ہے۔ فرہنگِ نظام نے بھی مار افسان کو درست مانا
ہے۔ ڈاکٹر معین نے حواشی برہان میں مار افسار کو مار افسای کی تصحیف قرار دیا ہے۔
چونکہ مذکورۂ بالا لغات میں سے کسی ایک میں بھی ان دونوں شکلوں کی سند پیش نہیں کی
گئی، اس لیے مجھے دونوں مصحف معلوم ہوتے ہیں۔

24. برہان: ماردی، بوزن خارجی۔ وبسکونِ ثالث ہم آمدہ است۔

غالب: در ہر دو صورت سند میخواہد۔

عرشی: قاطع اور درفش میں میرزا صاحب نے اس مطالبے کو شامل نہیں کیا۔ لغتِ فرس اسدی
(ص 525) میں خسروی کا یہ شعر اس لفظ کی سند میں موجود ہے:

خردشان و کفک افگنان و سلیجش   ہمہ ماردی گشتہ و خنگش اشقر

رشیدی نے اس لفظ کو بسکونِ را پڑھا ہے، اور سند میں دو شعر پیش کیے ہیں، ایک یہی خسروی کا
مگر بنامِ دقیقی، اور دوسرا منوچہری کا:

چو بردارد ز پیشِ دستِ اوثان   حجابِ ماردی دستِ برہمن

25. برہان: ماندر — مخففِ مادراندر است کہ زنِ پدر باشد۔

غالب: لاحول ولاقوت ماندر بہ رائے قرشت ہرگز نیست؛ ہمان ماوندر است بدالِ ابجد۔

عرشی: قاطع اور درفش میں بھی یہ اعتراض موجود ہے لیکن یہاں خود میرزا صاحب سے چوک
ہوگئی کیونکہ جس طرح ''مادر'' کی جگہ ''ماد'' بالدال بولا جاتا ہے، اُسی طرح ''مار'' بالراء
بھی بولتے ہیں۔ اس صورت میں مادرندر، مادندر اور مارندر تینوں صورتیں درست ہیں۔
ملاحظہ ہو برہان بحواشی ڈاکٹر معین۔

26. برہان: مدنگ — کلیدِ چوبین باشد۔ وباذالِ نقطہ دار نیز درست است۔

غالب: باذالِ نقطہ دار ہرگز درست نیست۔

---

1. مخطوطے میں افشان سین معجمہ سے لکھا ہے؛ تحفۃ السعادہ میں بھی باشین ہے۔
2. یہ بظاہر افسار کی تصحیف ہے۔ لیکن اصلی لغت باشین ہے، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ چوتھی شکل ہوئی۔

عرشی: قاطع اور درفش میں یہ اعتراض بھی شامل نہیں کیا گیا۔ بظاہر اس اعتراض کی بنا یہ معلوم ہوتی ہے کہ میرزا صاحب فارسی الفاظ میں ذالِ معجمہ کے قائل نہ تھے۔

27. برہان: مدہوش۔ بروزن سرپوش، سرگشتہ وحیران را گویند و در عربی صاحبِ دہشت باشد۔

غالب: مدہوش بروزنِ سرپوش می نویسد یعنی بہ یاے[1] مجہول۔ و این خطاے فاحش است۔ ہمانا گمانِ حکیمِ دکھنی آنست کہ در فارسی مدہوش بواوِ مجہول بمعنی سرگشتہ و حیران و در عربی بمعنی صاحبِ دہشت است۔ این تقریر سراسر ہذیانست۔ اصل این کہ مدہوش لغتِ عربی الاصل است بواوِ معروف مفعولِ دہشت یعنی ترسیدہ و خوفناک۔ شاعرانِ عجم این لفظ را بواوِ مجہول بمعنی مست و بیہ مست استعمال می کنند وحیران معنیِ اختراعیِ این مردِ دکھنی است۔

عرشی: قاطع اور درفش میں اسے ذرا اور نمک مرچ لگا کر پیش کیا ہے مگر میرزا صاحب کا ارشاد کہ عربی میں ''ترسیدہ و خوفناک'' کا مترادف ہے، درست نہیں۔ بقولِ ڈاکٹر معین منتہی الارب میں اس کے معنی بیخود حیران لکھے ہیں۔ میں نے اقرب الموارد اور المنجد کو دیکھا، تو وہاں بمعنی متحیر پایا۔

اسی طرح میرزا صاحب کا علی الاطلاق یہ لکھنا کہ مدہوش کو بروزنِ سرپوش بواوِ مجہول لکھنا خطاے فاحش ہے، درست نہیں۔ جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں: فارسی میں یہ لفظ بواوِ مجہول ہی بولا جاتا ہے۔ ہاں عربی معنی لکھنے سے پہلے یہ ضروری تھا کہ صاحبِ برہان لکھتے کہ ''و بواوِ معروف در عربی صاحبِ دہشت باشد۔''

28. برہان: مُذ بضم اول وسکونِ ثانی بمعنی صاحب و خداوند باشد، و مرکب می آید ہمچو اسفندارمذ۔

غالب: اسفندارمذ بذال غلط۔ و این تقریر کہ مُذ بمعنی صاحب و خداوند است غلط در غلط۔ نہ مذ بذال است، نہ بمعنی خداوند است۔ نہ اسفندارمذ ازین مرکب است۔ اُور مُزد و اور مز، ہرمُزد و ہرمز، اسفندارمُزد و اسفندارمز فارسی است؛ اول نامِ کوکب، دوم نام ماہ و روز۔

عرشی: قاطع اور درفش میں بھی اس اعتراض کو دہرایا ہے، اور آخر میں لکھا ہے کہ یہ تحقیق مولانا عبدالصمد کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مُذ کے معنی خداوند نہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اُرمز اور ہرمز کے آخر میں زاے ہوز ہے، مگر اسپندارمذ یا اسفندارمذ میں زے نہیں، ذال ہے۔ یہ پہلوی میں سپندار مت تھا۔ سپند کے معنی مقدس اور مت کے معنی فروتنی اور

1. غالب نے ازراہِ سہو ''یاے'' لکھا ہے۔ یہاں ''واوے'' ہونا چاہیے۔

مرکب لفظ کا مطلب فروتنیِ مقدس ہے۔ تفصیل کے لیے اسپندارند پر ڈاکٹر معین کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیے:

29. برہان: مذاب بضمِ اول بروزنِ گلاب بمعنی گداختہ باشد۔ بفتح اول ہم آمدہ است۔

غالب: این خود عربی است۔ توضیح چرا نکرد۔

عرشی: قاطع اور درفش میں یہ اعتراض شامل نہیں، مگر ہے درست۔

30. برہان: مذنگ بروزن و معنی مدنگ است۔

غالب: غلط۔ ہمان مدنگ است بدالِ بے نقطہ۔

عرشی: لفظ مدنگ کے تحت جو لکھا ہے، اسے ملاحظہ فرمائیے۔

31. برہان: ناپسود — ہر چیز کہ آن نو باشد الخ۔

غالب: بسودن بہ بائے فارسیِ مکسور لمس کردن یعنی چھونا، پسودہ مفعولِ آنست یعنی دست زدہ و مساس کردہ۔ ناپسودہ و ناپسود مرکب ازین است بمعنی اچھوتا، نہ چنانست کہ صاحبِ فرہنگ این را لغتِ جامد فہمیدہ است نہ بہ بائے ابجد۔

عرشی: یہی بات قدرے اختصار کے ساتھ قاطع اور درفش میں لکھی ہے۔ خانِ آرزو نے سراج اللغہ میں پسودہ کے تحت لکھا ہے کہ تحقیق یہ ہے کہ پسودہ (بمعنیِ دست زدہ) مخفف ہے پرسودہ کا جس کا مبدل فرسودہ ہے اور اس میں ب فارسی ہے اور بمعنی مالیدہ دوست رسیدہ ب تازی سے بمعنی سودہ، اور ب اصلی نہیں زائد ہے۔

32. برہان: ناہبرہ — بمعنیِ بزرگ و عظیم باشد، و فرومایہ و دون و خسیس را نیز گویند۔ و بمعنی نہبرہ نیز ہست کہ زرِ قلبِ ناسرہ باشد۔ و بمعنی پوشیدہ و پنہان ہم آمدہ است۔

غالب: ناہبرہ را ہم بمعنی بزرگ و عظیم و ہم بمعنی فرومایہ و خسیس می آرد۔ و این غلط فہمی است۔ نہبرہ زرِ قلب و کاسد را گویند و مردِ فرومایہ کمقدر را مجازاً گفتہ باشند۔ و ناہبرہ بہ اضافۂ الف جز و نظم بضرورتِ وزن نیارند۔

عرشی: قاطع اور درفش میں یہ لکھا ہے کہ "بمعنیِ بزرگ و عظیم زنہار نیست۔" دوسرے نہبرہ کو اصلِ لغت اور ناہبرہ کو بضرورتِ شعر جائز قرار دیا ہے لیکن پہلا اعتراض غلط ہے، بقولِ جہانگیری و رشیدی وغیرہما مولانا جامیؔ نے اس شعر میں بمعنیِ بزرگ و عظیم باندھا ہے:

کہ وادیلا عجب کاریم افتاد بسر ناہبرہ دیواریم افتاد

لیکن محمد گلھوی نے شرحِ یوسف زلیخا (ص 88) میں لکھا ہے کہ عام نسخوں میں ''نابہرہ'' کی جگہ ''ناہردہ'' ہے۔ شرح قدیم میں ہے کہ صحیح نابہرہ ہے اور نابہرہ بمعنیِ نامبارک صفتِ دیوار ہے۔ محمد رضا نے فرہنگ نورالدین سے نقل کیا ہے کہ نابہرہ کے معنی بزرگ وعظیم ہیں۔ برہان نے نبہرہ کو نابہرہ کا مترادف بتایا ہے۔ فرہنگِ نظام میں نبہرہ کو نابہرہ کا مخفف بتایا ہے اور اس کے چار معنی لکھے ہیں: (1) قلب و ناسرہ (2) پست و فرومایہ۔ خاقانی وکنون نگر کہ ازین عالمِ نبہرہ فریب۔ برسم طالع خود واپس است رفتارم (3) پوشیدہ و پنہان در تاریخِ بیہقی — آوردہ اند کہ — مطربان میداشت مردوزن کہ ایشان را از راہِ ہای نبہرہ نزدیکِ وی بردند۔ (4) بمعنیِ بزرگ۔ حکیم نزاری قہستانی: از آنجا پس روِ جاسوسِ رہ شدہ نبہرہ برسرِ چندین سپہ شد۔

ان شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب کا بیان درست نہیں۔

33. برہان: ناچخ — تبرزین را گویند — و بعضے گویند سنانے است کہ سرآن دو شاخ باشد۔ و نیزۂ کوچک را نیز گویند۔

غالب: ناچخ ہندی آن برچھی، یعنی نیزۂ کوچک وبس۔

عرشی: قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو شامل نہیں کیا اور اچھا ہی کیا، کیونکہ بمعنیِ تبرزین نظامی نے اس شعر میں نظم کیا ہے:

ز پُولادِ چینن ناچخِ دہ منی بگردن بر، از بہرِ گردن زدنی

مسعودِ سعدِ سلمان کہتا ہے:

فگندہ ناچخ در مغزِ کفر تا دستہ نشائدہ بیلک درچشمِ شرک تا سوفار

نیزۂ دوشاخہ اس شعر سے ثابت ہوتا ہے:

ز بہرِ خونِ بداندیشِ تو ہوا و فلک ز برق زوپین سازد، ز ماہِ نو ناچخ

34. برہان: نارو — رشتۂ را نیز گویند کہ از اعضای مردم برمی آید۔

غالب: نارو بمعنیِ مرض ہندیست۔ در فارسی رشتہ گویند نہ نارو۔

عرشی: قاطع اور درفش سے یہ اعتراض بھی خارج رہا۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ رشیدی نے سوزنی کا یہ مصرع نقل کیا ہے: زدہ نیروی من از پای تو بیرون نارو۔ جہانگیری نے عمید لویکی کا یہ شعر سند میں لکھا ہے:

ناروش پای بند شد، ارنہ بکام دل کردے تجرع از کرمت روح پرورآب

ہندی اور پشتو میں بھی اس مرض کا نارو ہی نام ہے۔ شاید میرزا صاحب نے اسے توافقِ لسانین قرار دے کر چھوڑ دیا۔

35. برہان: ناسپال— پوستِ انار را گویند۔

غالب: ہندیست، نہ فارسی۔

عرشی: میرزا صاحب نے یہ اعتراض بھی واپس لے لیا ہے۔ خانِ آرزو نے لکھا ہے کہ ناسپال ہندی میں بھی بولا جاتا ہے، اور یہ توافق لسانین کا نتیجہ ہے۔

36. برہان: ناطوری— کشت بان را گویند کہ زراعت نگاہ دارندہ باشد۔

غالب: (درمتن): محل تامل، و (برحاشیہ): ناطوری بمعنی کشت بان فارسی خودنیست۔ عربی نیز معلوم نمی شود۔ یاد دارم کہ درکلامِ قدماجاے ناطورِ باغ بہ حرکت راے قرشت دیدہ ام، و شارح معنیِ آن نگہبانِ باغ نوشتہ است۔ بالجملہ فارسی نیست۔

عرشی: میرزا صاحب کا یہ اعتراض صرف نزاع لفظی ہے۔ صاحبِ برہان جب نگاہ دارندۂ کشت کو ناطوری کہہ رہا ہے، تو قاطع اور درفش میں یہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی کہ ''صاحبِ برہان ناطوری کے معنی مزارع بتاتا ہے، حال آنکہ اس کے معنی نگاہبانِ کشت و باغ ہیں۔ شاید اُس نے کسی لغت میں اس لفظ کے معنی حارس (بمعنی نگاہ بان) دیکھے ہوں گے۔ نادانی سے حارث (بمعنی کاشتکار) جان کر ناطوری کے معنی مزارع لکھ دیے۔''

37. برہان: ناغوش— غوطہ خوردن را نیز گویند۔

غالب: ناغوش غلط است۔ آرے پاغوش بمعنی غوطہ مسلم۔ ناغوش تصحیف خوانی است۔ واین خودشیوۂ جامعِ لغات است۔

عرشی: رشیدی نے پاغوش ہی لکھا ہے۔ خانِ آرزو نے باغوش، پاغوش اور ناغوش تین شکلیں لکھی ہیں اور اپنی رائے یہ لکھی ہے کہ ناغوش اوّل الذکر دو میں سے کسی ایک کی تصحیف ہے مگر اسدی طوسی نے لغتِ فرس (ص 200) میں ناغوش لکھا ہے، اور ڈاکٹر معین اور فرہنگِ نظام نے اسے قبول کرلیا ہے۔ میری دانست میں خانِ آرزو اور غالب کی رائے درست ہے۔ ناغوش کتابت کی غلطی سے پیدا ہوا ہے۔

38. برہان: نبید بضم اوّل وتحتانیِ مجہول بروزن و معنیِ نوید است کہ مژدگانی وخبرِ خوش باشد۔

وبفتح اوّل در عربی شرابِ خرمارا گویند۔

غالب: نبید بضمِ نون بمعنی خبرِ خوش غلط۔ وبمعنی شراب در عربی مسلم۔ لیکن خلطِ مبحث چہ ضرور۔

نبید بہ دالِ بے نقطہ و دالِ منقوطہ و در ہر دو حال بہ یاے معروف اسمِ شرابیست کہ از خرماے تازہ سازند۔ ونون در ہر دو صورت مفتوح است۔ نوید بہ نون مفتوح و یای مجہول لغتِ فارسی است بمعنی خبرِ خوش۔ و از آنجا کہ واوِ ہوز را بہ باے ابجد مبادلہ جائز است، نبید بہ یاے مجہول نیز گویند۔ نوید و نبید بنونِ مضموم مذموم است۔

عرشی: قاطعِ اور درفش میں اس اعتراض کو خوب تفصیل سے لکھا ہے اور آخر میں کہا ہے کہ "اگر دکنی آدمزاد بودے، در شرحِ این لغت چنین جادہ پیمودے کہ نبید بفتحِ نون و یای معروف در عربی شرابِ خرمارا گویند۔ و باتحتانی مجہول بدلِ نوید است کہ لغتے است فارسی بمعنی خبرِ خوش۔"

میرزا صاحب کا یہ ارشاد ہے کہ نوید و نبید بمعنیِ مژدہ بفتحِ نون ہے، بضمِ نون نہیں، بے ثبوت دعویٰ ہے۔ جہانگیری و رشیدی و انجمن آرا و فرہنگِ نظام میں اسے بالضم لکھا ہے لہٰذا دونوں صورتوں کو جائز تسلیم کرنا چاہیے۔ بلکہ ڈاکٹر معین نے نوید کے تحت جو حاشیہ لکھا ہے، اُس سے نبید کا بضمِ نون ہونا مرجح معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح نوید کی یای حطّی کا مجہول ہونا بھی مسلم نہیں۔ متعدد اہلِ لغت نے اس کو بیای معروف لکھا ہے۔ ڈاکٹر معین کے حواشی سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بیاے معروف مرجح ہے۔ رہا مژدگانی کو مژدہ (خبرِ خوش) کی جگہ استعمال کرنا، تو اس کی سند میں مولفِ ساطعِ برہان (ص 157) نے انوارِ سہیلی کی یہ عبارت نقل کی ہے: ماجرایا گرگ درمیان نہاد، وبفریفتہ شدنِ روباہ مژدگانی داد۔

رضا لائبریری میں انوارِ سہیلی کا ایک مطبوعہ نسخہ محفوظ ہے، جو مدراس میں 1241ھ مطابق 1826 میں حروفِ سربی میں چھپا تھا۔ اُس کے ورق 43 ب کی پانچویں سطر میں یہ جملہ موجود ہے اور اس میں بھی بجاے مژدہ مژدگانی ہی استعمال کیا گیا ہے۔ اگر یہ درست ہے، تو میرزا صاحب کا اعتراض دور ہو جاتا ہے۔

39. برہان: نجوان — بروزنِ ارزان زعفران باشد۔

غالب: سند می خواہد۔

عرشی: قاطع اور درفش میں بیان پنجم میں مذکور سب الفاظ کو جو تعداد میں 9 ہیں، غیر مستند قرار دیا ہے، اور فرمایا ہے کہ "یارب ماخذِ این ہیژ دکدام فرہنگ است۔"
مگر واقع یہ ہے کہ یہ سب لفظ مختلف فرہنگوں میں موجود ہیں۔ چنانچہ نجوان بھی فرہنگ جہانگیری سے ماخوذ ہے۔

40. برہان: نسیج، بفتح اوّل و ثانی بہ تحتانیِ کشیدہ و بجیم فارسی زدہ، جامۂ حریرِ زر بافتہ باشد۔ و باجیم ابجد در عربی نیز ہمین معنی دارد۔

غالب: نسیج و نساج و منسوج ہمہ عربیست۔ و نسیج لغتِ غیر منصرف و اسم جامد نیست۔ و این کہ بجیمِ فارسی نوشتہ است، محض غلط و تہمت و بہتان ست۔ ظاہر اً بسیچ کہ لغتِ فارسی الاصل است بمعنی قصد، آنرا دیدہ و از روے تصحیف کہ دین و مذہب این حکیم دکنی ہمان ست، آنرا نسیچ بجیمِ فارسی بمعنی حریر گمان کردہ است۔ لاحول ولاقوت الا باللہ۔

عرشی: قاطع اور درفش میں یہ اعتراض موجود ہے اور بالکل درست ہے۔ یہ لفظ چ کے ساتھ تصحیف نسیج بالجیم ہے لیکن یہ تصحیف زفانِ گویا سے موید الفضلاء میں آئی اور وہاں سے برہان میں داخل ہوئی یا یہ دونوں کتابیں صاحبِ برہان کے سامنے ہوں گی۔

41. برہان: نشارہ بکسرِ اوّل بروزنِ اشارہ چوبِ پوسیدہ را گویند کہ مانندِ آرد شدہ باشد۔

غالب: عربی است۔ فارسی آن برادہ۔

عرشی: یہ اعتراض قاطع اور درفش میں نہیں مگر ہے صحیح۔ چنانچہ میرزا صاحب کی تائید خانِ آرزو کی اس عبارت سے ہوتی ہے:

"مولف گوید کہ این از چند وجہ خطاست۔ اوّل بضم است چنانکہ قوسی گفتہ۔ دوم لفظِ عربیست۔ سیوم بمعنی خردۂ ہر چیز است مثل نشارۂ عاج و نشارۂ فولاد امثالِ آن۔"

42. برہان: نولہ بروزنِ لولہ بمعنیِ کلام است مطلقاً — بمعنیِ قول ہم آمدہ است کہ در برابرِ فعل است۔

غالب: نولہ را بمعنیِ کلام می نویسد و بازمی گوید کہ بمعنی قول ہم آمدہ است۔ مگر در کلام و قول مغایرتے ہست۔

عرشی: قاطع اور درفش میں یہ اعتراض انھیں الفاظ میں موجود ہے۔ چونکہ یہ لفظ دساتیری اور اس بنا پر جعلی ہے، اس لیے کسی اور لغت میں اس کا مذکور نہیں، جو حقیقتِ لفظ معلوم ہوتی۔ باقی

میرزا صاحب کا کلام وقول کو ایک جاننا درست نہیں۔ ان دونوں میں فرق ہے اور ضرور ہے۔

43. برہان: نیام بکسر اوّل بروزنِ حسام بمعنی غلافِ شمشیر است۔ ومیان ووسطِ تیغ وغیر تیغ را نیز گویند ہر چیز باشد۔ وبمعنی تعویذ ہم بنظر آمدہ است۔

غالب: نیام قلب ہے میان کا، جیسے کران قلب ہے کنار کا اور یہ ترکیب فارسی میں بہت ہے۔ خیر، بہرحال بمعنی غلافِ شمشیر وخنجر وکارد مسلم۔ لیکن وسطِ ہر شے را نیام نگویند۔ آرے میان گویند۔ چون میان باوجودِ بودنِ قلبِ نیام معنیِ وسط می دہد، بیچارہ ہمین حکم را بر نیام جاری کردہ۔ واز ہمہ طرفہ تر آن کہ نیام را بمعنی تعویذ می آورد۔ چگویم کہ چہ می خورد۔ آن پنام است بہ بائے فارسیِ مفتوح کہ مجازاً تعویذ را گویند۔ وخود در بحث بائے فارسی با نون نوشتہ است کہ پنام تعویذ را گویند۔ واین جا تصحیف خوانی میکند۔ این فرہنگ نویسی است یا تمسخر۔

عرشی: قاطع اور درفش میں یہ اعتراض موجود ہے۔ یہاں میرزا صاحب نے مولفِ برہان کے بارے میں فرمایا تھا کہ ''چہ گویم کہ چہ میخورد۔'' قاطع میں یہ تو نہیں لکھا مگر یہ حکم صادر کر دیا کہ ''از زمرۂ بنی آدم خارج است۔''

جہاں تک نیام کے بمعنیِ وسط ہونے کا تعلق ہے، خانِ آرزو نے بھی یہی لکھا ہے کہ ''بمعنیِ وسطِ ہر چیز میان است نہ نیام۔'' اسی طرح خانِ آرزو نے یہ بھی فرمایا ہے کہ بمعنی تعویذ پنام ہے ببای فارسی۔ ان بیانوں سے میرزا صاحب کی تائید ہوتی ہے۔

44. برہان: نیسو، بروزن گیسو، نشترِ فصاد وحجام باشد۔ وآن را نیسو یا ہم گویند۔

غالب: واینکہ نیسو بہ سینِ مہملہ بمعنی نشترِ فصاد آوردہ، نیز نیشو است مخففِ نیشتر، چنانکہ نشتر نیز مخففِ آنست۔ غایت اینکہ شینِ نقطہ دار ما سینِ بے نقطہ مبدل می شود۔ این حکیمِ ذکی بہرہ از تحقیق ندارد۔ مدارِ نقل یا بر تصحیف است یا بر قیاس۔

عرشی: قاطع اور درفش میں نیشو کو نیشتر کا مخفف نہیں کہا، بلکہ یہ لکھا کہ ''نشتر دراصل نیشتر است۔ وآن را نیشو نیز گویند۔'' باقی خان آرزو کے اس بیان سے میرزا صاحب کی تائید ہوتی ہے۔ ''صحیح شینِ معجمہ باشد مرکب از نیش بمعنیِ معروف واو کہ افادہ بمعنی صاحبی کند۔''

45. برہان: ہرگز-- بمعنی ہیچ وقت وہیچ زمان باشد۔ وبمعنیِ ہمیشہ ولایزال ہم آمدہ است۔

غالب: تامل دارد۔

عرشی: قاطع اور درفش میں اس تامل کا اظہار نہیں کیا۔ فرہنگِ نظام اور حواشیِ برہان از ڈاکٹر معین
میں ناصرِ خسرو (دیوان ص 462) کا یہ شعر برہان کی تائید میں نقل کیا ہے:
ای طمع کردہ بہ نادانی بعمرِ ہرگزی   بافزونی و کمی مر ہرگزی را کے سزی

46. برہان: یوغ -- چوبے باشد کہ برگردن گاوِ زراعت وگاوِ گردون گذارند۔
غالب: یوغ در بحثِ جیم باواو جوغ بروزنِ دُوغ ہم بدین معنی آوردہ۔
عرشی: قاطع اور درفش میں بھی یہ اعتراض موجود ہے اور وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ صاحبِ برہان
بیگانۂ تحقیق ہے، ورنہ جوغ کو یوغ نہ لکھتا۔ مگر یہ اعتراض غلط ہے۔ ج اور ی کا باہم بدل
ہوتا ہے۔ یہ لفظ بالیاء بھی مستعمل ہے۔ لغتِ فرس (ص 229) میں اسدی نے بوشکور بلخی
کا یہ شعر نقل کیا ہے:
ہمی گفت با او گزاف و دروغ   مگر کاندر آرد سرش را بہ یوغ



غالب کی چند نئی اردو تحریریں

عام طور پر خیال یہ ہے کہ میرزا غالبؔ نے صرف برہانِ قاطع پر تنقیدی نوٹ لکھے تھے، جو قاطعِ برہان کے نام سے پہلے اور بعد ازاں درفشِ کاویانی لقب پا کر شائع ہوئے تھے۔ لیکن حال میں لوہارو سیکشن (رضا لائبریری) میں چند ایسی مطبوعہ کتابیں ملی ہیں جن پر ان کے قلم کے ریمارک ہیں۔ آج کی صحبت میں اُن میں سے چند اردو تحریریں پیش کرتا ہوں:

(1) لوہارو سیکشن میں خان آرزو اکبر آبادی متوفی 1169ھ (1756) کی ایک کتاب ''موہبت عظمیٰ'' ہے جو دہلی کے شرف المطابع میں 1268ھ (1852) میں چھپی تھی۔ اس کے صفحہ 14 پر آرزو فرماتے ہیں:

''گاہے اسم اشارات حذف کنند از جہتِ نکتہ کہ ترحم یا مذمت یا غیر آن باشد، چنانکہ فرماید:

پیشِ رُخِ تو، برگِ گل لاف زند ز تازگی
رنگِ حیا دھد خدا چہرۂ بے حیائی را

واین بنا بر ادعاءِ آنست کہ غیرِ او گویا بیچیا نیست، چنانکہ گویند: فلان را سلام کردم۔ بیدرد مطلق بحالِ من نپرداخت، یا 'فلانی را زدند۔ مسکین مطلق فریاد نکرد۔' ومنظورِ قائل آنست کہ گویا سوای او بیدرد یا مسکین نیست۔''

اس پر میرزا صاحب لکھتے ہیں:

''یہاں خان صاحب کے بیان کو میں نہیں سمجھا۔ شعر کے مطلب کو ان دو مثالوں کا نظیر کیونکر ٹھہرایئے؟ شعر میں پہلے موصوف کا نام مذکور ہوگیا ہے،

شاعر، بمبئی (خاص نمبر)، 1959

یعنی برگِ گُل۔ دوبارہ اُس کا نام لینا کیا ضرور تھا۔ صفت کا ذکر کافی ہے۔
'فلان را سلام کردم' بیدرد جواب نداد–فلان را زدند، مسکین فریاد نکرد، وہ
مفعولِ سلام اور یہ مفعولِ ضرب۔ اُس کو بیدرد اور اس کو مسکین کہنا یہ چاہتا
ہے کہ اس کو سوائے بیدرد کے اور اس کو سوائے مسکین کے کچھ کہنا نہ
چاہیے۔ نہ یہ کہ سوائے اس کے کوئی اور بیدرد، اور سوائے اس کے کوئی اور
مسکین نہیں۔''

(2) اِس کتاب کے صفحہ 16 پر آرزو نے لکھا ہے:

''اضافت گاہی برای آں باشد کہ مستغنی گرداند از تفصیل متعذر یا متعسر ...
وگاہی برای آن باشد کہ تقدیم بعضے بربعضے ترجیح بلا مرجح باشد، چنانکہ گوئی:
امروز علمای شہر حاضراند۔ وگاہی تصریح بہ بدی و اہانت باشد، چنانکہ گوئی:
ابنای زمان چنیں می گویند۔''

اس پر میرزا صاحب نے لکھا ہے:

''امروز علمای شہر حاضر اند، یہ جملہ اجمالی ہے۔ اِس سے دفعِ ترجیح بلا مرجح
منظور نہیں۔ 'ابنای زمان چنیں می گویند' یہ جملہ ہرگز بدی و اہانت کی تصریح
نہیں کرتا۔ اُس قول کو دیکھا چاہیے کہ ابنای زمان کیا کہتے ہیں۔''

(3) اِسی کتاب کے صفحہ 45 پر آرزو نے فرمایا ہے:

''مفعولِ کلمہ ندارد گاہی کہ لفظ حساب بود آں را حذف کنند، چنانکہ بار خوردہ
گوید:

بوسۂ ز لبِ تو خوردم و رفت از رفتنِ حال غم ندارد

اِس پر میرزا صاحب نے لکھا ہے:

''کلمۂ ندارد کے مفعول کا حذف کرنا جائز نہیں، لیکن 'دارد' بمعنی باید اور
'داشت' بمعنی بایست اِسی طرح نونِ منفی کے ساتھ بمعنی نمی باید و نمی بایست،
روزمرۂ فصحائی ایران ہے۔ ظہوری:

گر اسیرِ زلف و کاکل گفتہ باشم خویش را
گفتہ باشم، این قدر برخویش پیچیدن نداشت''

(4) اِسی کتاب کے صفحات 50 و 51 پر افعال متعدی بدو مفعول سے بحث ہے اور اس میں آرزو نے لکھا ہے کہ:

''چوں مقام خطابی و مقتضی مدح باشد، حذف کنند برای عموم و شمولِ افراد، یعنی ہر چہ بخاطرِ سامع رسد چنانکہ گذشت۔ وازین عالم است کہ گوید''

جاوید ہمی بخشد و از مایہ نکاہد   رشحِ قلمت ثروتِ اصنافِ اُمم را

واین برتقدیریست کہ ثروت بسوی اصناف مضاف باشد۔ وآنچہ بعضے نوشتہ اند کہ برین تقدیر باید کہ ثروتِ اصناف پیش از بخشیدن ممدوح باشد و آن منافی مقامِ مدح است، از قلتِ تامل است۔ زیرا کہ ہر گاہ ثروتِ مذکور دست پروردۂ وممنون علیہ ممدوح باشد، چہ میشود کہ پیش از بخشیدنِ او باشد، چرا کہ پیش از و چیزی نبود کہ موردِ بزرگی تواند شد۔ و برتقدیری کہ برکلمۂ ثروت سکوت واقع شود، ہمیں مفعولِ دوم خواھد شد—

وآنچہ بعضی نوشتہ اند کہ فکِ اضافت فصاحت ندارد و این بی تصنع سہوی از قلمِ عرفی چکیدہ وروی معنی خراشیدہ، نیز از عدمِ تتبعِ کلامِ قوم است، زیرا کہ ازین نوع سکتہ ہا بسیار بسیار واقع شود، چنانچہ استاد ظہیرالدین فاریابی گوید:

در برگرفتۂ دلِ چوں خودِ آہنین   وان زلفِ چوں زرہ را بر سرنہادۂ

اِس پر میرزا صاحب نے لکھا ہے:

''پہلے اپنا عقیدہ ظاہر کرتا ہوں۔ عرفیؔ اور نظیریؔ کا ثالث نہ کبھی تھا اور نہ کبھی ہوگا۔ قدما کی طرز اور ہے۔ کلام نازک خیالوں میں ہے، جو فغانیؔ کی روش کے پیرو ہیں۔ اُن میں ان دونوں کے برابر کوئی نہیں۔ بااین ہمہ یہ بزرگوار اپنے کلام پر نظرِ ثانی نہیں کرتے۔ اگر مولانا اِس شعر کو کہہ کر دوبارہ دیکھتے، تو ثروت کی جگہ بہت لفظ مفید مطلب پیدا ہو جاتے، اور یہ سکتہ اور فکِ اضافت اور اضافت کی تاویلات کا قصہ جاتا رہتا، مثلاً:

جاوید ہمی بخشد و از مایہ نکاہد   رشحِ قلمت فائدہ اصنافِ اُمم را

رشحِ قلمت کامِ دل اصنافِ اُمم را

(5) اِسی کتاب کے صفحہ 56 و 57 پر خان آرزو نے لکھا ہے:

''از انجملہ است کلمۂ 'مر' کہ مفیدِ معنیِ حصر است، افادۂ قصر کند چنانکہ گوید:

مر او را رسد کبریا و منی　　کہ ملکش قدیم است و ذاتش غنی

وتحقیقِ این پیشتر گذشتہ۔ بشنو، ہر چند در قصر افراد چنانکہ گذشتہ کہ اعتقادِ اشتراک ضروریست، لیکن گاہی بہ تنزیل خالی الذہن در مقام معتقد اعتقاد مذکور آرند از جہتِ آنکہ چنین گمان نکنی و ترا نشاید۔ چنانکہ گوید:

این زمزمہ مرکبی است مر روحِ ترا　　بردارد و خوش بعالم یار برد

یعنی، نشاید کہ مرکبِ تن گردانی کہ ترا سببِ رفتن بسوی لذاتِ نفسانی وشہوانی گردد، ومحرکِ این کار شود؛ بلکہ مرکبِ روحِ تست کہ بی تکلف ترا بعالمِ اطلاق رساند۔ پس آنچہ بعضی نوشتہ اند کہ کلمۂ مر در ینجا محض برای زینتِ کلام است و زائدہ، محلِ تامل است۔

وازین قبیل است کہ شیخ فرمودہ: منت مر خدای راعز وجل کہ طاعتش موجب قربتست، یعنی منت کہ بارِ منت بردیگری نہادن ومنعم علیہ را مرہونِ احسانِ خود داشتن باشد، خاصۂ اوست جل شانہٗ کہ نعمتہایش از حد و عدبیرونست، ونعمت دیگران بوی راجع است۔ درحقیقت جزوی منعمے نیست۔ وشکرِ نعمت بلفظِ منت ابلغ است از شکر، چہ این را ہرجا اطلاق می توان کرد، بخلافِ منت کہ خاصۂ اوست۔''

اِس پر میرزا صاحب نے لکھا ہے:

''کیا اچھی تقریر اور کیا خوب توجیہ ہے! اب ہمارے عہد میں حضرات نے لفظ مر نکال ڈالا ہے اور 'منت خدای را' لکھتے ہیں۔ یہ بھی بے تکلف صحیح ہے مگر 'منت مر خدای را' میں کیا قباحت ہے۔ وہ تو ابلغ ہے۔ خانِ آرزو سچ کہتا ہے۔انصاف کا طالب، غالب۔''

(6)　صفحہ 56 پر آرزو نے لکھا ہے:

''وہمچنین لفظ شاید کہ برای شک است، در تمنی مستعمل شود، چنانکہ گوید:

کشتی شکستگانیم، ای بادِ شرطہ، برخیز　　شاید کہ باز بینم آن یارِ آشنا را

وہمچنین لفظ 'بو کہ' چنانکہ گوید:

بادِ صبا بفرست ہمراہِ از رخت گلدستۂ بو کہ بوی بشنوم از خاکِ بستانِ شما"

اِس پر میرزا صاحب نے لکھا ہے:

بو کہ، کلمۂ جداگانہ نہیں۔ 'آیا بود' کا مخفف ہے۔ غالب"

(7) صفحات 60 و 61 پر آرزو نے لکھا ہے

"پس آنچہ در معنی این بیت نوشتہ آمد

من کہ باشم عقلِ کل را ناوک اندازِ ادب مرغِ اوصافِ تو از اوجِ بیان انداختہ

کہ فاعلِ انداختہ ناوک انداز ادب است و عقلِ کل و مرغِ اوصاف ہر دو مفعول، یعنی من چہ استعداد داشتہ باشم کہ وصفِ تو توانم گفت؟ زیرا کہ ناوک اندازِ ادب مرغِ وصفِ بیچوں را کہ عقلِ کل است، از اوجِ بیان انداختہ، محلِ نظر باشد، زیرا چہ معنی کہ باشم، بمعنی کدام شخص باشم، نہ آنکہ چہ استعداد داشتہ باشم، چنانکہ ظاہر است۔ مگر آنکہ گویم: حاصلِ معنی است۔ وہنوز ہم از تعسفات خالی نیست۔

چنانکہ بعدِ معنی از عبارتِ بیت مخفی نیست۔

پس حق ہمانست کہ ما نوشتہ ایم کہ کلمۂ مرا از مصرعۂ دویم بقرینۂ مصرعۂ اوّل کہ دران کاف صفت واقع شدہ، محذوف باشد۔ یعنی، من کہ ادب آموزِ عقل کلم، مرغِ اوصافِ تو مرا از اوجِ بیان انداختہ۔ و درین عکس نہایت مبالغہ خواہد بود۔"

اس پر میرزا صاحب نے لکھا ہے:

"واقعی معنی یہی ہیں کہ جو خانِ آرزو نے لکھے ہیں۔ چاہو لفظِ مرا مصرع دوم میں سے محذوف سمجھو، چاہو لفظِ را مصرع اوّل میں سے بعد من کے محذوف سمجھو۔ غالب۔"

(8) اِسی کتاب کے صفحہ 68 پر خان آرزو نے لکھا ہے:

"گاہی معنی امر را مکرر آرند و در واقع زائد باشد، و نظر بمقام لطف پیدا کنند، چنانکہ گوید:

یک دو رطل گراں بحافظ دہ گر عذاب است ور ثواب، بیار

زیراچہ لفظِ بیار من حیث المعنی زائد است۔ و چون مستان را 'بیار' بیار، می باشد، نظر بران آوردہ، وخیلی لطف بہم رسانده ونمی فهمد این رامگر کسی کہ کمال ماہرِ سخن باشد۔"

اِس پر میرزا صاحب نے لکھا ہے:

''یہاں بھی بیان خانِ آرزو کا سچ ہے، بلکہ میں کچھ اور بڑھ کر کہتا ہوں، یعنی مصرع ثانی میں دفع دخلِ مقدر ہے۔ مبادا مخاطب کو یہ خیال آجائے کہ شراب لانی گناہ ہے، پس یہ غُل مچاتا ہے کہ عذاب ثواب جو ہو، بلا سے۔ تو شراب لا۔ معہذا بیار میں استجال ہے۔"

ان سب تحریروں سے میرزا صاحب کی سخن رسی اور دیدہ وری ظاہر ہوتی ہے۔ نیز یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خوانخواہ ہی برہانِ قاطع پر نہیں برسے ہیں۔ اُس میں ترتیبی وتشریحی اسقام کی بہتات اتنی تھی اور پھر اُس زمانے میں کلکتے سے کئی بار چھپ جانے کی وجہ سے استعمال بھی اتنی زیادہ ہو رہی تھی کہ اُنھیں ڈر ہوا کہ اگر اُس کی غلطیوں کو اجاگر نہیں کر دیا گیا تو مبتدی ہی نہیں اکثر اہلِ علم بھی بہک جائیں گے۔ یہ وجہ ہے کہ اُس کی تنقید میں اُن کا لہجہ سخت اور قابلِ اعتراض ہو گیا ہے۔



سبد باغ دو در

مصنفہ: میرزا اسداللہ خان غالب — تعارف، تلخیص، حواشی: امتیاز علی عرشی

تعارف

میرزا غالب نے کلیات نظم فارسی کی طباعت کے بعد 'سبد چین' کے نام سے اپنے وہ شعر اکٹھے کیے تھے، جو یا تو سہواً کلیات میں درج نہ ہو سکے، یا اس کی طباعت کے بعد کہے تھے۔ خیال یہ تھا کہ یہ تتمہ ان کی آخری فارسی تالیف ہے مگر سید وزیر الحسن عابدی صاحب کو 'باغ دودر' کے نام سے ایک ایسا مجموعہ دستیاب ہوا جو غالب کی کلیات نظم ونثر دونوں کا تتمہ کہا جا سکتا ہے۔

موصوف الذکر نے اپنے ایک مضمون (مطبوعہ رسالہ 'آجکل' 10 فروری 1947) میں تحریر فرمایا ہے:

> ''میرے پاس اس مجموعے کا اصل نسخہ ہے جس کی کتابت، طباعت کی غرض سے مصنف (غالب) کی زندگی میں سنہ 1283ھ میں شروع ہوئی تھی اور مصنف کی وفات کے ایک سال چار مہینے بائیس دن بعد 7 ربیع الآخر 1287ھ کو ختم ہوئی۔ مگر اس مجموعے کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ 'سبد باغ دودر' غالب کا رکھا ہوا تاریخی نام ہے جس سے آغاز کتابت کا سال 1283ھ حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ خاتمے کی عبارت میں درج ہے، کاتب نے یہ نسخہ غالب کے شاگرد منشی ہیرا سنگھ کی فرمائش پر لکھا تھا۔ یہ منشی ہیرا سنگھ حوض قاضی کے قریب گندھی گلی میں رہتے تھے۔ اس نسخے میں بعض اشارات سے قیاس ہوتا ہے کہ اس کا بیشتر حصہ غالب کی نظر سے گزرا تھا۔''

ماہ نو، کراچی، جنوری فروری 1969

اس عبارت کے ایک حصے کی بنیاد دیباچے کے اس جملے پر ہے کہ: ''از انجا کہ سبد باغ دو در یک ہزار و دوصد و ہشتاد و سہ عدد دارد۔ واز روی حسن اتفاق با آغاز نگارش این صحیفہ مطابق افتاد، این نام لطفے دیگر دارد۔''

بقیہ معلومات اس خاتمۂ کاتب پر مبنی ہیں:

> ''آفریدگار مہر و ماہ را سپاس کہ دریں زمان فرخندہ توامان کتاب فیض انتساب سبد چین از تصنیف جناب والا شان شہنشاہ قلمرو سخن گستری، یکہ تاز عرصۂ معنی پروری، علامۂ عصر، بانی مبانی نظم و نثر، رشک عرفی و طالب، نجم الدولہ دبیر الملک میرزا اسداللہ خاں غالب رحمۃ اللہ علیہ، حسب فرمایش منشی ہیرا سنگھ صاحب کھتری ساکن دہلی واقع کوچۂ گندھی گلی کہ یکی از شاگردان حضرت مصنف اند بخط بدنمط احقر العباد عنایت علی بتاریخ ہفتم جولائی 1870 روز پنجشنبہ صورت اختتام پذیرفت۔''

مجھے یہاں دو تین باتیں عرض کرنا ہیں، پہلی یہ کہ 'سبد چین' 'باغ دو در' سے پہلے کی تالیف معلوم ہوتی ہے، کیونکہ باغ کے دیباچے میں اس کا ذکر ہے۔ مرزا صاحب نے فرمایا ہے حصۂ نظم (سبد چین) کی ترتیب کے بعد بعض دوست حصۂ نثر کا مواد لائے۔

دوسری یہ کہ 1283ھ کتابت کے آغاز کی نہیں، بلکہ تالیف کے آغاز کی تاریخ ہے کیونکہ یہ کتاب اتنی بڑی نہیں کہ اس کے لکھنے میں ایک سال 4 مہینے اور 22 دن صرف ہوتے۔ میری رائے میں باغ کے زیر نظر مخطوطے کی کتابت کا آغاز و انجام دونوں میرزا صاحب کی وفات کے بعد ہوا ہے۔ اسی سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ 'سبد چین' 1283 سے پہلے کی تالیف ہے، اس لیے کہ یہ سند تو 'سبد باغ دودر' سے برآمد ہوتا ہے جو بعد کو اختیار کیا گیا ہے۔

تیسری بات یہ کہ کتاب کے آغاز میں ایک بادامی ورق چسپاں ہے، اس پر معمولی بلکہ برے اور کچے خط میں لکھا ہے:

> ''ایزد کارساز را سپاس کہ ایں کتاب مستطاب بقیۂ دیوان فارسی موسوم بہ سبد چین و بعد اضافۂ مطالب دیگر نثر دیباچہ وتقریظ و مکاتیات و یافتن خطاب 'سبد باغ دو در' از تصنیف جناب معلیٰ القاب، زبدۂ کملای اہل کمال، سخن سنج بے شل و بے مثال، رشک عرفی وفخر طالب، جناب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا

اسد اللہ خاں غالب رحمۃ اللہ علیہ مشہور بہ مرزا نوشہ، حسب فرمائش منشی ہیرا سنگھ صاحب کھتری ساکن دہلی واقعہ کوچۂ گندھی گلی بخط فقیر حقیر عنایت علی بتاریخ..... 1874ھ صورت اختتام پذیرفت۔"

اس تحریر کے اوپر لکھا ہے 'خاتمہ از سرخی' اس تحریر نیز تاریخ کی جگہ سادہ چھوڑنے اور صرف سنہ لکھ دینے سے میں قیاس کرتا ہوں کہ ہیرا سنگھ نے اس کاتب سے 1874 میں پیش نظر نسخے کی نقل کرائی تھی اور مندرجۂ بالا عبارت اپنے قلم سے لکھ دی تھی تا کہ خاتمے میں سابق کی جگہ اسے درج کیا جائے۔

اس کتاب کا کاغذ ولایتی نیلا ہے۔ جدولیں سنہری ہیں، اندرونی دوشنجرفی اور بیرونی لاجوردی۔ باریکا بھی لاجوردی ہے۔ اشعار کو باہم جدا کرنے والی لکیریں شنجرفی ہیں۔ متن کتاب سیاہ بخط نستعلیق اور عنوانات اور نظم میں تخلص شنجرفی ہیں، جگہ جگہ خطی اصلاحوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مقابلہ بھی کیا گیا ہے مگر پھر بھی اغلاط کتابت کہیں کہیں موجود ہیں۔ مخطوطے میں کئی جگہ 'لا-الیٰ' علامت حذف پائی جاتی ہے، جس کی نشان دہی حواشی میں کردی گئی ہے۔ بظاہر ہیرا سنگھ نے دوسری نقل میں علامت زدہ عبارتوں کو حذف کردینے کے لیے کاتب کی ہدایت کے طور پر یہ علامت لکھ دی ہے۔ حصۂ مکاتیب کے آغاز میں بھی ایک جگہ لکھا ہے "ازیں جا باید نوشت" یہ بھی ناقل کے لیے ہدایت ہے۔ ایک صورت یہ بھی ممکن ہے کہ میرزا صاحب کے اصل نسخے سے زیرِنظر نسخہ نقل ہوا ہو اور یہ ساری ہدایات خود میرزا صاحب کی ہوں مگر موجودہ نسخے میں یہ بالیقین میرزا صاحب کے قلم کی نہیں ہیں۔

اوراق مکتوبہ کی تعداد 99 ہے۔ فی صفحہ 10 سطریں ہیں اور ناپ فل اسکیپ ہے۔ ترکیں موجود ہیں۔ ورق 1 ب کے حاشیے اور 6 شعر اور 2 الف کے حاشیے پر 6 شعر کل 12 شعر اس قطعے کے بڑھائے گئے ہیں:

ہر شب بقدح ریختمی بادۂ گلفام

اور اس پر 3 کا ہندسہ ڈالا ہے اور 12 الف کے آخر میں یہ دو قطعے اس طرح تھے:

پہلا: دوبارۂ اسم و سال مولود سعید

اور

دوسرا: اندازۂ اسم و سال مولود

ان میں سے دوسرے پر ہندسہ (1) اور پہلے پر (2) ڈالا گیا ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ پہلا، اندازہ الخ اور دوسرا، درباره الخ اور تیسرا، ہر شب الخ ہونا چاہیے۔

موجودہ ترتیب میں اس کتاب کی تلخیص پیش کر دی گئی ہے، بایں صورت کہ 'باغ دودر' کا وہ کلام جو سبد چین کی اشاعت اوّل (ربیع الثانی 1284ھ) مطبوعہ مطبع محمدی دہلی اور اسی کتاب کی اشاعت دوم (1938) مرتبہ جناب مالک رام، شائع کردہ مکتبہ جامعہ دہلی میں شامل ہو چکا تھا، اس کا صرف پہلا شعر حوالے کے لیے لے لیا گیا ہے اور دونوں اشاعتوں میں محولہ نظم کے اندراج کا حوالہ صفحہ نمبر اور تمام اشعار میں جو اختلاف یا سہو تھا، حواشی میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔ حواشی میں سبد 1 سے اشاعت اوّل اور سبد 2 سے اشاعت دوم مراد ہے۔

لہٰذا ان حواشی سے فائدہ اٹھانے کے لیے سبد چین کی مذکورہ دونوں اشاعتیں یا کم از کم دوسری اشاعت سامنے ہونا چاہیے۔ ان دونوں اشاعتوں کے علاوہ بھی اگر وہ کسی مزید قابل ذکر جگہ شائع ہوا ہے تو اس کا سہو و اختلاف بھی درج کر دیا ہے، مثلاً باغ دودر کے قطعہ نمبری 22 کا پہلا شعر:

گفتم بخرد بخلوت انس کای شمع و چراغ ہفت ایواں

نقل کر کے حاشیے میں لکھا گیا:

"سبد 1 ص 30 و سبد 2 ص 46 و انشای نور چشم ص 48 مطبع نظامی کانپور 1289ھ۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ قطعہ مندرجہ بالا حوالوں کے مذکورہ صفحات پر درج ہوا ہے۔

پھر حاشیے میں لکھا گیا ہے "باغ میں شعر 5 کے اندر 'زانسو' بدون یا ہے اور انشای نور چشم میں شعر 23 کے اندر 'خواہش' کی جگہ 'مشکل' ہے اور آخری شعر میں 'توقیع' کے عوض 'تعجیل' ہے اور سبد 2 میں آخری شعر کے اندر 'عطا و بذل احسان' ہے۔":

اس قطعے کا شعر نمبری 5 یہ ہے:

این ہر دو رسید و نیست پیدا زانسوی اثری ہیچ عنواں

اور شعر نمبری 23 یہ ہے:

من نیز طلب کنم برایش ایں خواہش اگرچہ نیست آساں

نیز آخری شعر یہ ہے:

توفیق جواب نامۂ خویش توقیع عطا و بذل و احساں

ان اشعار کے پیش نظر ہونے کے بعد متعلقہ حاشیے کو سمجھنا دشوار نہ ہوگا۔

باغ دودر کی زیرِنظر تلخیص کے حواشی مکمل حصۂ نظم کو محیط ہیں۔ حصۂ نثر کے اختلاف نسخ واغلاط کی نشاندہی اس وجہ سے چھوڑ دی گئی ہے کہ یہ تحریریں مختلف کتابوں میں بکھری ہوئی ہیں جن کا فراہم کرنا قارئین کے لیے دشوار ہے۔

باغ کا آخری حصہ مکاتیب پر مشتمل ہے جو بیشتر غیر معروف ہیں، البتہ چند خطوط مطبوعہ بھی شامل ہوگئے ہیں۔ یہ تمام خطوط حقیر عرشی کی مرتبہ آہنگ پنجم میں مع توضیحی حواشی کے شامل ہوں گے۔ آہنگ پنجم کی مذکورہ ترتیب میں غالب کے تقریباً پانچ سو خطوط جو تا حال دریافت ہوسکے ہیں، پیش کیے جارہے ہیں۔ لیکن اس غرض سے کہ باغ کی کیفیت بڑی حد تک قارئین کے سامنے رہے، اس میں شریک خطوط کے مکتوب الیہم کے نام اور مکاتیب کا آغاز وانجام بھی نقل کردیا گیا ہے۔

باغ دودر کی زیارت مجھے صدیق مکرم ڈاکٹر اظہر علی صاحب استاد تاریخ سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی کے توسط سے ہوئی۔ میں موصوف کا نیز مالک کتاب جناب سید وزیر الحسن عابدی صاحب کا ممنون ومشکور ہوں کہ مجھے اس نادر کتاب کو استعمال کرنے کا موقع عطا فرمایا۔

امتیاز علی عرشی

کتاب خانۂ عالیہ، رام پور

پس نوشت:

سبد باغ دودر کی تلخیص وحواشی نگاری کا کام کیے اتنی مدت گزر چکی ہے کہ مجھے یاد بھی نہ تھا کہ یہ کام میں نے کیا تھا۔ چونکہ مالک کتاب عابدی صاحب اسے شائع کرنا چاہتے تھے، اس لیے میں نے اشاعت روک دی تھی۔ اب جو عزیز مکرم مشفق خواجہ صاحب سلمہ کی فرمائش رسالۂ اردو کے غالب نمبر کے لیے آئی اور پے در پے تقاضے آئے تو اکبر سلمہ کو اس کا مسودہ یاد آیا۔ انھوں نے میرے پرانے کاغذات سے اسے تلاش کیا اور اب غالب دوستوں کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ کئی سال ہوئے خود جناب عابدی نے بھی اس کتاب کا متن اورینٹل کالج میگزین میں شائع کردیا ہے۔ اس طرح میرے حواشی کو سمجھنے کے لیے سہولت پیدا ہوگئی ہے۔ اب ڈاکٹر صاحب کے شائع کردہ متن کو بھی سبد چین طبع اوّل و دوم کے ساتھ پیش نظر رکھا جائے۔ افسوس یہ ہے کہ میری حالیہ علالت نے اس امر کا موقع نہ دیا کہ مطبوعہ باغ دودر کے حوالے درج کیے جاسکتے۔

دیباچہ

دو در دارد ایں باغ آراستہ

درو بند از ہر دو برخاستہ

بنامیزد 'سبد چین' میوہ را گویند کہ پایان موسم بر شاخسار ماند، و چون آن را بچینند، شاخسار سراسر بی بار ماند۔

ہر آینہ آنچہ پس از انطباع کلیات فارسی گفتہ شد، یا آنچہ ہنگام فراہم آوردن نگارش دست بہم نداده بود، اینک در اوراق جداگانہ ضبط کرده شد، وایں را 'سبد چین' نامیده آمد۔

دانم کہ فراہم آوردن دہ ہزار بیت کلیات چہ کشود کہ ازیں ابیات کہ در شمار بہزار نتواند رسید، خواہد کشود۔ ناسور کہن را از تراوش گزیر نیست۔ تا باید زیست، سخن باید گفت۔ ناچار تا زندہ ام، ایں مجموعۂ مقالات پریشان انتہا نخواہد پذیرفت۔ چنانکہ در علم و عمل ناتمام میگزرم، ایں نیز ناتمام خواہد ماند۔

چوں زنجیرۂ نظم کران پذیرفت، ناگاہ یاران نثری چند در آوردند۔ آں را نیز دریں مجموعہ گنجانیدم و 'باغ دو در' نامیدم۔ از آنجا کہ 'سبد باغ دو در' یک ہزار و دو صد و ہشتاد و سہ عدد دارد، واز روی حسن اتفاق بآغاز نگارش ایں صحیفہ مطابق افتاد، ایں نام لطفی دیگر دارد۔ فقط۔[1]

1۔ اس دیباچے کا سر بیت اور 'ناسور کہن را' سے آخر تک کی عبارت خاص اس کتاب کے لیے لکھی گئی ہے۔ پہلا پیرا ہے جو 'سبد چین' کے لیے لکھا گیا تھا اور مطبع محمدی دہلی کے مطبوعہ نسخے میں موجود ہے۔ دوسرے پیرے میں پہلے جملے کے خاتمے کے بعد سے شروع کر کے آخر تک عبارت یوں ہے: ''وآنچہ یاراں از دیریں مسودات داشتند و من ازاں خبر نداشتم واینک بمن رساندند، در اوراق جداگانہ ضبط کرده شد، وآں را 'سبد چین' نام نہاده آمد۔'' چوتھے پیراگراف کے ابتدائی جملے کے الفاظ میں معمولی تغیر کیا گیا ہے، یعنی: ''دانم کہ فراہم آوردن کلیات کہ دہ ہزار بیت دارد، چہ کشود کہ ازیں ابیات کہ در شمار بہزار بیت نتواند رسید، خواہد کشود۔'' اور اس کے بعد یہ عبارت ہے جو باغ کے دیباچے میں محذوف ہے۔: ''تفرقۂ اقسام شعر و تقدیم و تاخیر و قید ردیف و سال برتافتہ ام۔ آنچہ گفتہ ام واز دیگران یافتہ ام، نگاشتہ ام۔ واکنوں ناسور کہن را تراوش نماند، کلک از کف فرو گذاشتہ ام۔ پس اگر سخنی در اندیشہ خواہد گذشت، روشناس صفحہ نخواہد شد، یارب، گسستن پیوند جان و تن برمن آسان باد، و دران دم جز حمد تو و نعت محمد علیہ السلام در دل و بر زبان مگذر راد۔''

اس عبارت کے بدلے میں جو کچھ یہاں لکھا گیا ہے، وہ گویا عملی تجربے کے بعد سابق کی تردید ہے۔

پانچواں پیرا خاص 'باغ دو در' کے لیے لکھا گیا ہے، اور اس میں کتاب کا نام اور تاریخ تالیف کا ذکر ہے۔

قطعات

1۔قطعہ(2 بیت)

غالب ایں رنگیں کتاب 'گلشن بے خار' نام
روکش جنات تجری تحتہا الانہار ہست 1

2۔قطعہ(4 بیت)

احترام الدولہ فرماں داد تا دل کشا گرمایۂ انجام یافت 2

3۔قطعہ(5 بیت)

در ہزار و دوصد وشصت وشش از دنیا گزشت بانوی شاہ اود مریم مکانی نام او 3

4۔قطعہ(10 بیت)

سپہر مرتبہ، ای ویسرای کشور ہند
کز التفات تو دل بشگفد چو گل ز نسیم 4

5۔قطعہ(12 بیت)

بزم نواب جم حشم مکلوڈ بوستانیست پر ز نعمت و ناز 5

6۔قطعہ(14 بیت)

فلک مرتبت منٹ گمری بہادر کہ در سروری میکنی بادشاہی 6

7۔قطعہ(6 بیت)

در آخر دسمبر و آغاز جنوری سال نوست و روز کلاں روزگار را 7

8۔قطعہ(12 بیت)

نوروز و مہرگاں نبود در طریق ما اما شگفتہ روئی گلہای تر خوش است 8

9۔قطعہ(5 بیت)

دگر در سرستم کہ از روی مستی شرابی بہ ساقی کوثر فرستم 9

10۔قطعہ(2 بیت)

جاں عزیز است، و اہل عزت را عزت از جاں عزیز تر باشد 10

11۔قطعہ(3 بیت)

ترا، ای آفتاب عالم افروز پس از نو روز سال نو مبارک 11ے

12۔قطعہ(4 بیت)

میر سعادت علی کرد در اجمیر طرح مسجد و چاہی کہ ہست چشمۂ آب بقا12ے

13۔قطعہ(4 بیت)

باخرد گفتم، شہ فرزانہ فتح الملک را خود چہ گویم؟ گفت، فخر دودۂ آدم بگو13ے

14۔قطعہ(2 بیت)

نہادہ بنا احسن اللہ خان سر رہ بد انسان در دلکشا 14ے

15۔قطعہ(2 بیت)

تاریخ وفات ذوق، غالب با خاطر دردمند مایوس 15ے

16۔قطعہ(2 بیت)

باخرد گفتم ار تو فرمائی شویم از دل خیال بادۂ ناب 16ے

17۔قطعہ(3 بیت)

گیر کہ در روز حشر چوں تو بیفتی برسر دوزخ نہند تیرہ نہنبن 17ے

18۔قطعہ(2 بیت)

بمن ز مقدم فرزند میرزا باقر سروش تہنیت زبدۂ مطالب گفت 18ے

19۔قطعہ(9 بیت)

صبح دم با ابوالبشر گفتم پارۂ زر بدہ کہ زر داری 19ے

20۔قطعہ(5 بیت)

خواندی بنوبہار مرا جانب چمن زیں برگہای سبز چہ گردآورم نوا20ے

21۔قطعہ(9 بیت)

روزی ز رہ ستم ظریفی بر لاشۂ جعفر چہارم 21ے

22۔قطعہ(27 بیت)

گفتم بخرد بخلوت الس کای شمع و چراغ ہفت ایوان 22ے

23۔قطعہ(10 بیت)

ہزار و دو صد و ہشتاد و دو شمار کنید بحسب ضابطہ از ہجرت رسول اللہ 23ے

24۔قطعہ(2 بیت)

خجستہ جشن دبستاں نشینی بیگم بفیض ہمت نواب و یمن اقبالش 24ے

25۔قطعہ(3 بیت)

چو نواب از بہر اجلاس کونسل بہ کلکتہ از رام پور آورد رخ 25ے

26۔قطعہ(31 بیت)

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخۂ درخصوص گفتگوی پارس انشا کردہ است26ے

27۔قطعہ(6 بیت)

نمایش گہی در خور شان خویش بر آراست نواب عالی جناب 27ے

28۔قطعہ(2 بیت)

بجق بادہ چنیں حکم دادہ حاکم وقت کہ نی برند ز شہر و نیاورند بشہر 28ے

29۔قطعہ(2 بیت)

امروز شنیدہ ام کہ از مہر تقصیر پسر معاف کردی 29ے

30۔قطعہ(15 بیت)

از دوست بہر بندہ زہی شیشہ ہای می از بندہ سوی دوست بہر شیشہ یک سلام30ے

31۔قطعہ(17 بیت)

پس از ادای سپاس خدای عز و جل ثنای حضرت نواب میکنم انشا 31ے

32۔قطعہ(3 بیت)

الا ای شناسندۂ ہندسہ نباید کہ موجود فہمی مرا 32ے

33۔قطعہ(3 بیت)

مفلس، اگرش مال نباشد، چہ کم است ایں کز ہیچ کس اندیشۂ آزار ندارد 33ے

34۔قطعہ

کرنیل جارج ولیم ہملٹن 34ے فرخندہ حاکم، فرزانہ داور
صبح طرب را مہر درخشاں شام شرف را ماہ منور
در باغ دانش، سر سبز گلشن در بحر بینش، یک دانہ گوہر
صیت کمالش برہفت گردوں ذکر جمیلش در ہفت کشور

یارب، بگیتی بافر و شوکت پیوستہ بادا ایں داد گستر 35

35۔ قطعہ

کرم پیشہ ڈپٹی کمشنر بہادر 36 کہ نقش نگین دل ماست نامش
دراں بزم ہچوں منی را چہ یارا کہ خم گشتہ گردوں ز بہر سلامش

36۔ قطعہ

گویند: رای چھج مل 37 شیریں کلام مرد دیرینہ دوست رفت ازیں تنگ نا، دریغ!
گفتم: کسی ز سال وفاتش نشاں دہد غالب شنید وگفت، چہ گویم؟ 'بسادریغ' 1277ھ

37۔ قطعہ

گویند: رفت ذوق ز دنیا، ستم بود کاں گوہر گراں بہ تہ خشت وگل نہند 38
تاریخ فوت شیخ بود 'ذوق جنتی' 1269ھ بر قول من رواست کہ احباب دل نہند

38۔ قطعہ (2 بیت)

فتح سید غلام بابا خان خود نشان دوام اقبالست 39

39۔ قطعہ

سہ تن ز پیمبران مرسل گشتند بقرب حق مشرف
عیسیٰ ز صلیب و موسیٰ از طور ختم الرسل از براق و رفرف 40

40۔ قطعہ

تا بود چار عید در عالم بر تو، یارب، خجستہ باد و ہجیر
عید شوال و عید ذی الحجہ عید بابا شجاع و عید غدیر 41

41۔ قطعہ

کرد چوں ناظر وحید الدین ز دنیا انتقال گفتم، آیا بر کدام آئیں بود سال وفات؟
گفت غالب کز سر زاری اگر نامش برند خود ہمیں 'ناظر وحیدالدین' بود سال وفات 42

1274+7=1281ھ

42۔ قطعہ

طراز انجمن طوی میرزا یوسف 43 قرار یافت دریں مہ بحکم رب ودود
دوشنبہ بست و دویم روز از مہ شعبان دمی کہ مہر نہد سوی قبلہ سر بسجود

کرم کنند و فزایند زیب بزم نشاط — به فر فرخ فرخندگی فزای ورود
بسر برند شب اینجا کہ تا سفیدۂ صبح — ہمیں نظارۂ رقص است و استماع سرود
سپیدہ دم کہ ز فیض شمول نکہت گل — دم نسیم سحر مشکبار خواہد بود
شوند جانب کاشانۂ عروس رواں — بہ شادمانی بخت مبارک و مسعود
سپس بہرہی جمع وقت برگشتن — سپاس بندہ نوازی ہمی تواں افزود

43۔ قطعہ (2 بیت)

اندازۂ اسم و سال مولود — معلوم کن از خجستہ فرزند 44

44۔ قطعہ

دربارۂ اسم و سال مولود سعید — رفت است ز غالب سخنور توضیح
'ارشاد حسین خاں' سنین ہجریست — بنگر کہ 'خجستہ رخ' بود سال مسیح 45

1285ھ — 1868ء

45۔ قطعہ

ہر شب بقدح ریختمی بادۂ گلفام — آری، ز دو سی سال مرا قاعدہ ایں بود
شش روز شد اینک کہ بہ دسترسم نیست — شد 46 غمزدہ تر دل کہ ازیں پیش حزیں بود
امشب چہ سرایم کہ شب اوّل گوراست — شش روز بہ بیتابی و تلواسہ جبیں بود
ناگاہ در آں وقت کہ در قطع رہ عمر — از من دو قدم تا بدم باز پسیں بود
یک رہ دو تن از شرب میم منع نوشتند — وآں منع نہ از بغض، بل از غیرت دیں بود
ہر چند بداں منع، من ازمے نگذشتم — اما دم گیرای عزیزان بکمیں بود
دانی کہ چہ شد؟ چوں زر سوداگر صہبا — کش داد و ستد با من ویرانہ نشیں بود
بگذشت ز اندازۂ بایست، بمن گفت — 'دیگر ندہم بادہ کہ معمول نہ ایں بود'
باکاسۂ خالی چہ کند کیسۂ خالی — تا خواستہ در خواستہ دل صبر گزیں بود
گر زر بدی، از جای دگر مے طلبیدم — کو نقد دراں دست کہ پشتش بزمیں بود
در غرۂ شعباں چو ز من بادہ گرفتند — خود 'غالب پژمردہ' نشانی زسنیں بود 47

1285ھ = 6-1291

رو، شش بدر آر از مہ شعباں کہ درینجا — مقصود من از تخرجہ البتہ ہمیں بود

46۔ ترکیب بند (84 بیت)

خواہم از بند بزنداں سخن آغاز کنم غم دل پردہ دری کرد، فغاں ساز کنم [48]

47۔ ترجیع بند (30 بیت)

ورود سرور سلطاں نشاں مبارکباد بہ شہر مقدم نوشیرواں مبارکباد [49]

48۔ مثنوی (9 بیت)

دریں سال نواب عالی جناب بروی زمیں غیرت آفتاب [50]

49۔ مثنوی

وفا جوہرا [51] کہ از تو غم دور باد دلت سرخوش بادۂ سور باد
رسید از تو الفت فزا نامۂ رواں تازہ کن دلکشا نامۂ
نخواہم کہ در عرصۂ روزگار نشیند ترا بر دل از غم غبار
ز رنجوری من مخور غم کہ من ندارم غم ہستی خویشتن
نہ جاں از منست و نہ جسم آن من خود از مردن من چہ نقصان من؟
حدیثی است شایستہ و سودمند ز شایستگی بودہ دانا پسند
گر از من نباشی نکوئی شنو ازاں کس کہ فرزند اوئی شنو
چنیں دادہ فرماں کہ در ساز راہ نباشی بحیلت گری عذر خواہ
عزیزاں رہرو گرامی کسند بشادی دراں ناحیت میرسند
بشادی بدیں جمع انباز گرد چہ گردند اینان، توہم باز گرد
الا تا نسنجی کہ ایں زاں بہ است چنیں خواستہ است آں کہ فرماندہ است
مشو سخت کوش و مشو سخت گیر دریں آمدن باش فرماں پذیر
بحکم پدر چوں گزیدی سفر بگرد از سفر ہم بحکم پدر
دریں رفتن و آمدن شاد باش بہ تبعیت از طعنہ آزاد باش
ز ہجر تو مادر بتاب اندر است گدازاں چو شکر بہ آب اندر است
پدر نیز مشتاق دیدار تست بصد گونہ خواہش طلب گار تست
ترا خواہد، از بس کہ خواہد ترا نخواہد گر او، پس کہ خواہد ترا؟
بیاد دو خونیں جگر را بہ بیں بمادر نشین و پدر را بہ بین

دگر من چراغ سحرگاہیم قدم نہ براہ، ہوا خواہیم
بیا، تا ببینی کہ چوں می تپم چساں دیدہ تا دل بخوں می تپم
بیا، تا تنم غرق خون بنگری درون مرا از بروں بنگری
بیا، تا بہ بنی کہ از روزگار کنونم بجای رسید است کار
کہ می نوشم از خستگی، نز ورع بجای می ناب، ماء القرع
بیا و بیا و بیا و بیا سر آمد سخن، و الدعا، و الدعا
بخواں، چوں بخوانی ورق را تمام ز نیر سلام و ز عارف سلام

حواشی

1. سبد 1 ص 24 وسبد 2 ص 35 وخاتمہ گلشن بے خار ص 365، طبع اوّل 1837 وپنج آہنگ ص 166، طبع 1853
2. سبد 1 ص 25 وسبد 2 ص 35
3. ایضاً
4. مثنوی ابر گہر بار: 38، اکمل المطابع دہلی 1280ھ، وسبد 1 ص 25 وسبد 2 ص 36
5. ایضاً ص 26 وایضاً ص 37
6. ابر گہر بار: 38، حاشیہ وسبد 1 ص 26 وسبد 2 ص 38
7. سبد 1 ص 27 وسبد 2 ص 39
8. ایضاً
9. سبد 1 ص 28 وسبد 2 ص 40
10. ایضاً وسبد 2 ص 41
11. ایضاً
12. ابر گہر بار: 39، ایضاً 'باغ' میں 'بدل اجر آن' اور سبد 1 میں 'بذل' ہے۔
13. ایضاً، وسبد 2 ص 42
14. ایضاً
15. سبد 1 ص 29 وایضاً، 2 سبد میں 'دردمند و مایوس' ہے۔
16. سبد 1 ص 29 وسبد 2 ص 43
17. سبد 1 ص 29 وسبد 2 ص 43۔ سبد 1 میں پہلے شعر کے اندر 'نہیں' ہے جو کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔
18. ایضاً،
19. ایضاً وسبد 2 ص 44

20 ایضاً
21 سبد 1 ص 30 و سبد 2 ص 45
22 ایضاً و سبد 2 ص 46۔ وانشای نورچشم ص 48، مطبع نظامی کانپور سنہ 1289ھ
باغ میں شعر 5 کے اندر 'زانسو' بدون یا ہے۔ اور انشای نورچشم میں شعر 23 کے اندر 'خواہش' کی جگہ 'مشکل' ہے، اور آخری شعر میں 'توقیع' کے عوض 'تقبیل' ہے۔ سبد 1 میں آخری شعر کے اندر 'بذل و احسان' ہے۔
23 سبد 1 ص 31 و سبد 2 ص 48۔ شعر 7 میں سبد 1 و 2 میں 'درناگاہ' ہے۔ شعر 10 کے پہلے مصرعے کا آخری لفظ سبد کے دونوں نسخوں کی طرح باغ میں بھی 'بگریز' تھا مگر تصحیح کے وقت اسے چھیل کر 'بگزر' بنایا گیا ہے، جو موزوں تر ہے۔
24 سبد 1 ص 32 و سبد 2 ص 48
25 سبد 1، ص 32 و سبد 2 ص 49 و مکاتیب غالب ص 86 طبع اوّل
26 ایضاً و سبد 2 ص 33۔ و مکاتیب غالب ص 71 طبع اوّل
میرزا صاحب نے سب سے پہلے اسے یک رختہ اشتہار کی طرح چھاپ کر شائع کیا تھا۔ اس کے بعد سبد 1 میں چھپا۔ بعد ازاں جواب اور جواب الجواب وغیرہ کے ساتھ 'شمشیر تیز تر' کے شروع میں 1868 میں چھاپا گیا۔ نیز ملاحظہ ہو مکاتیب غالب طبع اوّل ص 71۔ شعر 10 میں 'باغ' کے اندر 'فرمود ودروی' ہے۔
27 سبد 1 ص 37 و سبد 2 ص 51 و مکاتیب غالب ص 93 طبع اوّل۔ سبد 1 میں 'خدایا پسند والخ' نہیں ہے۔
28 سبد 1 ص 37 و سبد 2 ص 52۔ ان میں 'حکم داد' ہے۔
29 ایضاً۔ چوتھے مصرعے میں ان دونوں کے اندر 'کنم' کی جگہ 'نکنم' چھپ گیا ہے۔
30 ایضاً۔ سبد 1 میں پہلے مصرعے میں 'زہی' کی جگہ 'زھی' ہے۔ سبد 2 کے حاشیے میں رسالہ 'رومان' لاہور کے فروری سنہ 37 کے پرچے کے حوالے سے، جناب مالک رام نے لکھا ہے کہ یہ قطعہ میرزا صاحب نے 'الگزنڈر اسکنر' کے نام ان کے ایک منظوم خط کے جواب میں لکھا تھا، اس قطعے کے لیے سبد 2 ص 53 و 54 کا حاشیہ دیکھیے۔ سبد 2 میں شعر 3 کے اندر 'آن شراب' کی جگہ 'این شراب' چھپ گیا ہے۔ اسی طرح سبد 2، شعر 10 میں 'پوٹ وبن' کی جگہ 'پوٹ وائن' لکھا گیا ہے۔
31 سبد 1 ص 39 و سبد 2 ص 55
32 سبد 1 ص 39 و سبد 2 ص 56۔ باغ میں شعر 2 و 3 میں 'یا' کی جگہ 'با' اور شعر 3 میں 'بشارات' کے عوض 'اشارات' ہے۔
33 سبد 1 ص 20 و سبد 2 ص 56۔ دوسرے شعر میں 'بردار دبدو' کے معنی اُٹھائی گیرا، اور 'کیسہ بر' کے معنی

گتھ کشا ہیں۔

34 میرزا صاحب نے لفظ 'جارج' کی رای ساکن کو عام ہندوستانی لہجے کے مطابق بالفتح نظم کیا ہے۔ اس سے بدیسی الفاظ کے دیسی بگڑے تلفظ کی بڑی ہمت افزائی ہوتی ہے۔

35 یہ اور اگلے تین قطعے سبد میں نہیں ہیں۔

36 اپنے موجودہ وسائل کے پیش نظر میرے لیے ان ڈپٹی کمشنر صاحب کی شخصیت کا تعین دشوار ہے۔ لیکن یہ گمان غالب ہے کہ اس سے مراد او برائن صاحب ہوں، جن کے سامنے میرزا صاحب کا دعویٰ ازالۂ حیثیت عرفی بنام مولوی امین الدین مولف قاطع القاطع پیش ہوا تھا۔

37 راے چھج مل، منشی جواہر سنگھ جوہر، شاگرد غالب کے والد تھے۔ ان کے نام غالب کے کئی فارسی خط شائع ہو چکے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی ان سے بڑی پرانی دوستی تھی۔ چھج مل کا سنہ وفات پہلی بار 'باغ دودر' کے اس قطعے سے معلوم ہوا ہے۔

38 اس قطعے کے پہلے تین مصرعوں پر عربی حرف نفی 'لا' اور چوتھے مصرعے کے آخری کلمے کے اوپر عربی حرف جر 'الی' لکھ دیا گیا ہے، جو اس کی علامت ہے کہ یہ سارا قطعہ کالعدم قرار دے دیا گیا۔ ذوق کا ایک قطعۂ تاریخ وفات اس سے پہلے گزر چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو یہ دوسرا قطعہ پسند نہ تھا، اس لیے 'باغ' میں درج کرانے کے بعد پھر قلم زد کرا دیا۔ مادۂ تاریخ 'ذوق جنتی' سے 1269ھ نکلتے ہیں۔

39 اردوے معلی، ص 11، طبع اول 1869۔ سبد 2 ص 57

40 قطعات 39 تا 42 سبد میں نہیں ہیں۔

41 ان چاروں عیدوں میں سے دو عام اسلامی عیدیں اور دوسری دو صرف اہل تشیع کے ساتھ خاص ہیں۔

42 اس قطعے پر بھی 'لا' اور 'الی' لکھ کر کالعدم قرار دے دیا ہے۔ مادۂ تاریخ 'ناظر وحید الدین' سے 1274ھ نکلتے ہیں۔ اس میں 'زاری' کے 7 عدد جمع کر دیے جائیں تو 1289 ہو جاتے ہیں، جو سال وفات ہے۔

43 یہ قطعہ میرزا صاحب کے چھوٹے بھائی میرزا یوسف خان کی شادی کا دعوت نامہ ہے۔ ان کی شادی کا سنہ معلوم نہ ہو سکا۔ از روے حساب 1227ھ، 1232ھ، 1240ھ، یہ تین سال ایسے ہیں کہ ان میں شعبان کی 22 تاریخ دوشنبے کو واقع ہوئی تھی۔ ان میں سے پہلے سنہ میں یوسف خان 13 برس کے، دوسرے میں 18 برس کے اور تیسرے میں 26 برس کے ہوتے ہیں۔ اگر یہ رسم ملحوظ رہے کہ ان کے خاندان میں 13، 14 برس کی عمر میں شادی ہوتی تھی، جیسا کہ خود غالب کا واقعہ ہے، تو پہلا ورنہ دوسرا سنہ تقریبی سال نکاح قرار پا سکتا ہے۔

44 آردوی معلی، ص 237 طبع اول اور سبد 2 ص 59 میں پہلا مصرع اس طرح ہے: 'غالب حال سنین ہجری'

45 یہ دونوں قطعات (44 و 45) بھی سبد میں نہیں ہیں۔ یہ قطعہ بھی مثل قطعہ ماقبل نواب سید ابراہیم علی

خاں بہادر کے فرزند کا سال ولادت بتاتا ہے۔ لیکن کسی وجہ سے میرزا صاحب نے نواب صاحب کے نام کے خط میں جو اردوے معلیٰ، ص 237 پر موجود اور قطعہ نمبری 43 پر مشتمل ہے، اس قطعے کا ذکر نہیں کیا ہے۔

46 باغ: شدہ

47 'غالب پژمردہ' کے 1291 عدد ہوتے ہیں۔ ان میں 6 منہا کردیے جائیں تو 1285 رہ جاتے ہیں جو اس حادثے کا سنہ ہیں۔ غالب کے سوانح نگاروں نے اس واقعے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ میرزا صاحب نے پانچویں شعر میں جن دو صاحبوں کو لکھا ہے کہ انھوں نے مجھے شراب سے روکنے کی تحریری کوشش کی تھی، ان میں سے ایک غالباً مولانا حالی تھے، کیونکہ انھوں نے خود یادگار غالب میں اسی قبیل کی اپنی ایک کوشش کا ذکر کیا ہے۔

48 سبد 1 ص 14 و سبد 2 ص 24۔ سبد 1 میں بند 6 کے پہلے شعر میں 'زہرۂ تنگم' چھپ گیا ہے، اور آخری بند کے شعر 5 کے پہلے مصرعے میں 'سود بیند' اور دوسرے مصرعے میں 'جفا قالب' ہے۔ سبد 2 ص 26 میں شعر 3 کے آغاز میں 'خستِ تن' بکسرۂ اضافت چھپا ہے جو درست نہیں، کیونکہ 'خست' یہاں فعل ماضی کا صیغہ واحد غائب ہے، اور فعل مضاف نہیں ہوا کرتا۔ اسی طرح سبد 2 ص 28 کے آخری شعر میں 'از بعد' غلط ہے، درست 'اربعد' ہے جو 'اگر بعد' کا مخفف ہے۔ صفحہ 29 کے شعر 3 میں 'خشنود' کی جگہ 'خوشنود' بھی میرزا صاحب کے املا کے خلاف ہے، چنانچہ سبد 1 ص 18 میں بے واو ہی چھپا ہے۔ نیز ص 30 کے شعر اوّل کے پہلے مصرعے میں 'بندِ رقم' باضافت درست نہیں۔

49 سبد 1 ص 19 و سبد 2 ص 31۔ موخر الذکر میں بند 2 کے آخری شعر میں 'آویزِ نغمہ' باضافت غلط چھپ گیا ہے۔

50 سبد 1 ص 36 و سبد 2 ص 34۔ سبد 1 میں 'روم روس' بدون واو عطف غلط چھپا ہے۔

51 یہ منشی جواہر سنگھ جوہر کی طرف اشارہ ہے، اور یہ مثنوی منظوم خط ہے، جو رائے چھجمل کے التماس پر میرزا صاحب نے جوہر کو لکھا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ جوہر اپنے چھوٹے بھائی کی شادی میں آکر شرکت کریں۔ غالباً وہ کسی بات پر والدین سے روٹھے ہوئے تھے، اور باپ کو ڈر تھا کہ میرے بلاوے پر نہ آئیں گے، اس لیے میرزا صاحب سے یہ سفارشی خط لکھوایا تھا۔ میرزا صاحب نے جوہر کے نام جو خط 20 فروری سنہ 1849 کو لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شادی اس تاریخ سے پہلے ہو چکی تھی، مگر ہنوز برات امروہے سے واپس نہیں آئی تھی اور اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ یہ منظوم خط آخر 1848 یا آغاز 1849 کا ہے۔

قصائد

1۔ قصیدہ (31 بیت)

بیا کہ مدح خداوند دادگر گویم از آنچہ گفتم ازیں پیش بیشتر گویم[1]

2۔ قصیدہ (48 بیت)

وقت آنست کہ خورشید فروزاں ہیکل گردد آیندہ گر آیندہ بفرگاہ حمل[2]

3۔ قصیدہ (36 بیت)

تعظیم غسل صحت نواب کم مکیر زاں عید کاں مضاف بود جانب غدیر[3]

4۔ قصیدہ (35 بیت)

تجلی کہ ز موسیٰ ربود ہوش بطور بشکل کلب علی خاں دگر نمود ظہور[4]

5۔ قصیدہ (51 بیت)

زہی دو چشم تو در معرض سیہ کاری چو بختیارک و بخنک بمردم آزاری[5]

6۔ قصیدہ (30 بیت)

تا چہ نیرنگ است ایں کاندر جہاں آوردہ اند نوبہاری طرفہ در فصل خزاں آوردہ اند[6]

7۔ قصیدہ

حیدرآباد دکن روضۂ رضوان شدہ است ساز و برگ طرب و عیش فراواں شدہ است

والی شہر کہ جاوید بماناد بدہر بود وی آصف و امروز سلیماں شدہ است

افضل الدولہ بہادر[7] کہ ز فر رخ او بارکہ مطلع خورشید درخشاں شدہ است

آں کہ در عہد وی از کثرت ایثار و عطا خلق را یافتن کام دل آساں شدہ است

مردہ را زندہ کند جنبش کلکش، گوئی کلک او موجۂ سرچشمۂ حیواں شدہ است

فر و فرہنگ فریدوں کہ نہاں داشت سپہر اینک از بردہ دگر بار نمایاں شدہ است

بہ دکن آیی و بہ بیں ریزش دست کرمش کہ زمیں ز آب گہر غرقۂ طوفاں شدہ است

تا شود روشنی چشم خلایق افزوں گرد در رہگزرش کحل صفاہاں شدہ است

نہ ہمیں نیک بود نظم امور دنیا کار دیں نیز دریں وقت بساماں شدہ است

نفس امارہ کہ خود کافر و کافر گر بود از نہیب شہ دیندار مسلماں شدہ است

می تراشند ز اعضای بتاں اجزا را   کفر در راستہ بازیچۂ طفلاں شدہ است
رفت توقیع بآتش کہ نسوزد جاندار   ہیزم وخار وخسش را تبہ خواں شدت است
لا جرم از رہ اخلاص پر پروانہ   شمع را از ضرر باد نگہباں شدہ است
روزگاریست گراں مایہ و فرخ کہ جہاں   ہم بداں گونہ کہ بایست ہمانساں شدہ است
شاہ فرخندہ فرا، خسرو والا گہرا   چشم بد دور کہ آدم بتو نازاں شدہ است
قدر آدم بدلش از تو چناں جای گرفت   کہ عزازیل ز انکار پشیماں شدہ است
سنگ فرساست چناں نعل سمندت کہ براہ   ہر کجا آمدہ، کہسار بیاباں شدہ است
ابر، رخشی است کہ در زیر تو جولاں دارد   برق، تیغی است کہ در دست تو عریاں شدہ است
رند [8] روشن نفسی ہست ز آل سلجوق   ایں کہ بر مائدۂ فیض تو مہماں شدہ است
تو چناں داں کہ غریبی ز دیار دہلی   بہ دکن نامدہ از دور ثنا خواں شدہ است
تیغ تیز است ثنا گوی تو، لیکن دانی   جوہر تیغ تہ مورچہ پنہاں شدہ است
نیست جز گرد و غبار آنچہ بہر سو نگرم   خواب در دیدۂ من بس کہ پریشاں شدہ است
غنچۂ ہست دل من ز شگفتن نومید   خوں شود سینہ از ان غنچہ کہ پیکاں شدہ است
بدم گرم خودم زندہ و بیدل زانم   کہ دل از فرط ریاضت خورش جاں شدہ است
غالب غمزدہ درویش و تو درویش نواز   بخلش باد، اگر طالب احساں شدہ است
صلہ گر می نفرستی، بستایش بنواز   کایں کلامی است کہ داغ دل حساں شدہ است[9]
سخن این است کہ قطع نظر از حسن کلام   واہ جوئی بہ سخن سلسلہ جنباں شدہ است
چشم بر لطف و کرم دوختۂ را در باب   کہ زکاہش بدنش صورت مژگاں شدہ است
ایں کہن پیر، بہ آوازۂ شیئاً للہ   گدیہ گر بر در آن قبلۂ گیہاں شدہ است
در ثنای تو چہ گفتم، کہ گر آیم بدعا   این بدل می سپرم، گر بزباں آں شدہ است
باد جاوید گلستان ترا فصل بہار   ای کہ از فیض تو آفاق گلستاں شدہ است[10]

حواشی

1. ابر گہر بار: 35، اکمل المطابع دہلی 1280ھ سبد 1 ص 3 و سبد 2 ص 7 سبد 1 شعر 13 میں 'بمز دومژدہ دہی' غلط چھپا ہے۔ سبد 2 ص 8 شعر 12 میں 'براہ حدیث' اضافت کے ساتھ درست نہیں ہے۔ اس طرح سبد 2 ص 9 شعر 5 میں 'طراز دعا' ہونا چاہیے۔ سبد 1 میں اس شعر کے اندر 'اینت' کی جگہ 'اینست' چھپ گیا ہے۔ یہ قصیدہ لارڈ الگن بہادر وائسرائے ہند کی مدح میں ہے۔
2. ابر گہر بار: 36، سبد 1 ص 4 و سبد 2 ص 9۔ سبد 1 شعر 4 میں 'گداز' کی جگہ 'گراز' چھپا ہے۔ اسی طرح شعر 5 میں 'سیقل' لکھ گیا ہے۔ سبد 2 ص 10 کے شعر 6 میں 'کام ذوق' باضافت درست نہیں ہے۔ سبد 1 ص 5 کے شعر 7 میں 'گو' کی جگہ 'گھر' ہے۔ یہی لفظ 'باغ' میں بھی تھا مگر تصحیح کے وقت اسے چھیل کر درست کر دیا گیا ہے۔ سبد 1 ص 5 کے شعر 8 میں 'ماہ بہ شور' غلط چھپ گیا ہے۔ 'ماہ بہ ثور' ہونا چاہیے اور شعر 11 میں 'درنامیہ' میں 'در' زائد ہے۔ سبد 2 ص 11 کے شعر 3 میں 'آہنگ' بکسرۂ توصیفی ہونا چاہیے، اور چوتھے شعر میں 'زمزمہ' کی ہمزہ نہ ہونا چاہیے۔ سبد 1 ص 5 شعر 7 میں قافیہ غلطی سے 'احول' کی جگہ 'احوال' چھپ گیا ہے۔ یہ قصیدہ لارڈ جان لارنس بہادر وائسرائے ہند کی مدح میں ہے۔
3. سبد 1 ص 9 بعنوان قطعہ و سبد 2 ص 15 و مکاتیب غالب ص 42 حاشیہ طبع اوّل و انتخاب یادگار ص 250۔ نواب سے نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم تخلص مراد ہیں۔ جن کے غسل صحت کی مبارکباد میں یہ قصیدہ لکھا گیا تھا۔ انتخاب یادگار میں اس کے صرف 6 شعر نقل کیے گئے ہیں۔ سبد 2 ص 15 شعر 6 میں 'حمام حوض' ہے لیکن 'حمام خاص' ہونا چاہیے جو سبد 1 اور باغ میں ہے۔ سبد 2 ص 16 شعر 3 میں 'ایام روشناس' اور 'عمود عصا' کو بدون کسرہ ہونا چاہیے۔ سبد 1 ص 9 شعر 13 و سبد 2 ص 16 شعر 8 میں 'درد میر' ہے، لیکن باغ میں 'درد و میر' ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔ سبد 1 ص 9 شعر 18 میں قافیہ غلطی سے 'ایسر' چھپ گیا ہے۔ 'اسیر' ہونا چاہیے۔ سبد 1 ص 10 شعر 3 میں 'رزخم' اور شعر 6 کا قافیہ 'غذیر' غلط چھپ گیا ہے۔ یہ علی الترتیب 'زخم' اور 'غدیر' ہونا چاہئیں۔ سبد 2 ص 17 شعر 12 میں 'ثنا می کنم' ہونا چاہیے۔
4. سبد 1 ص 7 و سبد 2 ص 13 و مکاتیب غالب ص 50 طبع اوّل حاشیہ۔ سبد 2 ص 13 شعر 7 میں 'حروف سطور' ہونا چاہیے، جب کہ 'حروف طور' چھپ گیا ہے۔ سبد 1 ص 8 شعر 13 میں 'تہی' کتابت سے رہ گیا ہے۔ سبد 1 ص 8 شعر 15 میں 'خشکی' بجائے 'خستگی' لکھ گیا ہے۔ اور مصرع 2 میں 'است' غائب ہے۔ اور شعر 17 میں 'آئین' کی 'آہن' اور 'نے' کی جگہ 'لے' چھپ گیا ہے۔
5. سبد 1 ص 10 و سبد 2 ص 18 و مکاتیب غالب ص 59 طبع اوّل۔ باغ اور سبد 1 ص 11 شعر 11 میں 'آنچوب' ہے۔ نیز شعر 12 میں 'غیبی' کی جگہ 'غشی' ہے اور شعر 14 میں 'ارمایس' ہے۔ اور شعر 15 میں 'نبود' ہے۔ سبد 2 ص 19 شعر آخر میں 'آب گہر' کی جگہ 'آب کہر' کتابت کی غلطی ہے، اور ص 20 شعر 1 میں 'درکشیدہ' کی جگہ 'درکشید' ہے۔ سبد 1 ص 12 شعر 3 میں 'بدام دام بدال' ہے، اور اسی طرح باغ

میں بھی ہے، مگر یہ ہے غلط۔ صحیح وام (بواو) بمعنی قرض ہے۔ مکاتیب غالب طبع اوّل ص 59 وسبد 2 ص 20 شعر 2 میں 'لقا' کی جگہ 'بقا' چھپ گیا ہے۔ باغ اور سبد 1 ص 12 شعر 5 میں 'آدم اد باری' ہے اور شعر 14 میں 'قندز' ہے۔ یہ قصیدہ نواب کلب علی خاں کی مدح میں ہے اور مرزا صاحب نے اپنے مکتوب بنام ممدوح مورخہ 21 اگست 1865 کے ساتھ بھیجا تھا، ملاحظہ ہو مکاتیب غالب متن ص 42 چہارم۔

6. سبد 1 ص 13 وسبد 2 ص 21۔ سبد 1 شعر 4 میں 'گز' چھپ گیا ہے۔ سبد 2 ص 22 شعر 9 میں 'آوردہ' کی جگہ 'آوردد' ہونا چاہیے۔ اسی طرح شعر 6 میں 'انگلنڈ' مناسب ہے جو سبد 1 میں پایا جاتا ہے۔ سبد 1 ص 14 شعر 11 میں 'ہم زوری' غلط ہے۔ یہ قصیدہ نواب کلب علی خان بہادر والی رامپور کی تعریف اور تہنیت میں لکھا ہے، جبکہ گورنمنٹ کی طرف سے دسمبر سنہ 1865 میں انھیں خلعت مسند نشینی عطا ہوا تھا۔ ملاحظہ ہو مکاتیب غالب دیباچہ ص 120 و 121 و متن ص 34 طبع چہارم۔

7. افضل الدولہ بہادر سے آصف جاہ پنجم نواب میر تہنیت علی خان بہادر مراد ہیں، جو 24 رمضان سنہ 1273ھ مطابق 19 مئی سنہ 1857 کو تخت نشین ہوئے۔ نہایت پرہیزگار، خداترس، درویش دوست، سخی، اور علم و ہنر کے سرپرست تھے۔ 12 سال ایک ماہ 20 دن کی حکومت کے بعد 42 سال کی عمر میں 13 ذیقعدہ سنہ 1285ھ مطابق 26 فروری 1869 کو جمعے کے دن انتقال کیا۔ نواب میر محبوب علی خاں بہادر آصف جاہ ششم آپ کے اکلوتے فرزند آپ کے جانشین ہوئے۔ ملاحظہ ہو 'افضل الدولہ' از سید مراد علی طالع، طبع حیدرآباد، سنہ 1943

غالب کے سوانح نگاروں کو ابھی تک اس کا علم نہیں ہے کہ غالب نے نواب افضل الدولہ بہادر سے بھی مداحی کا علاقہ پیدا کیا تھا۔ اس حیثیت سے یہ قصیدہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

8. 'رند روشن نفس' سے اپنی ذات مراد لی ہے۔ سلجوقی بادشاہ بھی ترک نسل کے تھے، اور میرزا صاحب بھی اسی قوم کے نام لیوا تھے، اس لیے اپنے آپ کو 'آل سلجوق' کہا ہے، ورنہ کوئی ایسا رشتہ ان کے اور سلجوق کے درمیان نہ تھا، جس کے باعث وہ اپنے آپ کو اس کی اولاد کہہ سکتے۔

9. حضرت حسان بن ثابتؓ مراد ہیں، جو مداح رسولؐ تھے۔

10. یہ قصیدہ سبد میں شامل نہیں ہے۔

غزلیات

1۔ غزل (9 بیت)

اے خداوند خردمند جہاں داور دانا[1] وی بہ نیروی خرد بر ہمہ کردار توانا

2۔ غزل (8 بیت)

جز دفع غم ز بادہ نبود است کام ما گوئی چراغ روز سیاہست جام ما[2]

3۔ غزل (16 بیت)

منع ز صہبا چرا؟ بادہ رواں پرور است[3] خوف ز عصیاں عبث، خواجہ شفاعت گر است

4۔ غزل (10 بیت)

خوشم کہ چرخ بکوی توام ز پا انداخت[4] کہ ہم ز من پی من خلد را بنا انداخت

5۔ غزل (10 بیت)

ہم 'انا اللہ' خواں درختی را بگفتار آورد[5] ہم 'انا الحق' گوی مردی را سردار آورد

6۔ غزل

عجب کہ مژدہ دہاں رو بسوی ما آرند[6] کدام مژدہ، کہ آرند، و از کجا آرند

ز دوستان نبود خوشنما دریں ہنگام کہ دایہ بہر گدای شکستہ پا آرند

ز غم چنان شدہ ام مضمحل کہ اعدا را سزد کہ گنج گہر بہر رونما آرند

نہ روی خواستن از حق بود جز آناں را کہ بندہ وار ہمی طاقتش بجا آرند

نہ بیرضای خدا کارہا رواں گردد سپہر و انجم اگر ساز مدعا آرند

نماند ساز مرا ہیچ نغمہ، ہمنفسان جز آں کہ بر شکنندش، چو در نوا آرند

نخست عمر دگر خواہد از خدا غالب اگر نوبد پذیرائی دعا آرند

7۔ غزل (13 بیت)

بمقصدی کہ مر آں را رہ خدا گویند برو، برو کہ ازاں سو 'بیا، بیا' گویند[7]

8۔ غزل (9 بیت)

درد ناساز است و درماں نیز ہم دہر بی پروا و یزداں نیز ہم[8]

9۔ غزل (10 بیت)

آسمان بلند را میرم ابر کحلی پرند را میرم 9

10۔ غزل (11 بیت)

بلہ، من عاشق ذاتم، تنہ نا ہا یا ہو ناظر حسن صفاتم، تنہ نا ہا یا ہو 10

11۔ غزل (7 بیت)

از جسم ایجان نقاب تا کے این گنج درین خراب تا کے 11

حواشی

1. سبد ا، ص 20 و سبد 2 ص 66 و مکاتیب غالب ص 69 طبع اوّل۔ شعر 2 میں مکاتیب کے اندر 'بزیبائی' ہے۔
2. سبد 1 ص 21 و سبد 2 ص 66۔ مطبوعہ میں یہ شعر زائد ہے:

مقصود ما ز دہر ہر آئینہ دوستی است

یارب کہ ہیچ دوست مبادا بکام ما

3. سبد ا ص 21 و سبد 2 ص 67۔ اس غزل کے شعر 5 کا دوسرا مصرع یوں پڑھا جائے گا: ''ورنہ بود گل، زگل مہمل گل خوشتر است'' اور مطلب یہ ہے کہ اگر موسم برشگال میں گل یعنی کیچڑ نہ ہو، تو گل کا بگڑا ہوا لفظ گل یعنی پھول اور بھی زیادہ بھلا لگتا ہے۔ سبد 1 و 2 میں شعر 11 کے اندر مصرع 1 میں 'برد' بصیغۂ امر ہے، حالانکہ ہونا چاہیے 'برد' فعل مضارع از صدر بردن۔
4. سبد 1 ص 38 و سبد 2 ص 71
5. سبد 1 ص 22 و سبد 2 ص 68
6. یہ غزل سبد میں نہیں ہے۔
7. یہ غزل سبد 1 میں نہیں تھی۔ یادگار غالب ص 54 طبع نامی پریس 1897 میں پہلی بار شائع ہوئی جس سے نقل کر کے سبد 2 ص 72 میں بھی درج کر دی گئی۔ سبد 2 ص 73 کے شعر 4 میں 'باغ' کے اندر 'وجود زما' ہے نیز اس شعر کے مصرع دوم اور مقطع میں 'گوئی' غلط چھپا ہے 'گوی' ہونا چاہیے جو باغ میں ہے۔
8. سبد ا ص 22 و سبد 2 ص 69۔ سبد ا شعر 4 میں 'خمیر' کی جگہ 'خمر' چھپ گیا ہے۔
9. سبد 1 ص 40 و سبد 2 ص 72۔
10. سبد 1 ص 24 و ایضاً ص 69۔ سبد 1 شعر 2 میں 'موسیٰ و خضر' ہے۔ سبد 2 شعر 3 میں 'میلاد و فاتم' غلط چھپ گیا ہے۔ 'میلاد و وفاتم' ہونا چاہیے۔
11. سبد 1 ص 23 و سبد 2 ص 70۔

فردیات[1]

1۔ نازم آں فتنہ، الخ
2۔ ورود سرور سلطان، الخ
3۔ اینک ہزار وہشتصد، الخ
4۔ نواب نامدار بدہلی، الخ
5۔ مرحبا ویسرای، الخ
6۔ بیا کہ دادہ بدہلی، الخ
7۔ زہی لاڑد لارنس، الخ[2]
8۔ ملکہ آں کہ بریں، الخ[3]
9۔ زہی زشملہ، الخ
10۔ مرحبا لشکر نواب، الخ
11۔ درتن مردم ایں، الخ
12۔ ذریعۂ شرف وعز، الخ
13۔ عیاں بود ز، الخ
14۔ دوروز دیر کن، الخ[4]
15۔ عبودیت نکند، الخ[5]
16۔ بو کہ ہنجار نو زخمہ ز تار آوری
کن فیکون دگر برسر کار آوری[6]

حواشی

1۔ یہ عنوان میں نے قرار دیا ہے۔ خود باغ میں ہر شعر سے پہلے لفظ 'فرد' لکھا گیا ہے۔ سبد 1 ص 24 اور سبد 2 ص 74 میں یہ سب شعر موجود ہیں۔ صرف شعر 2 و 12 سبد 2 میں نہیں، جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ دونوں شعر ترجیع بند کے ہیں، پھر تکرار سے کیا فائدہ۔

2۔ سبد 2 میں 'لارڈ' لکھا گیا ہے، جو میرزا صاحب کے املا کے خلاف ہے، وہ ہمیشہ اسے 'لاڑد' لکھا کرتے تھے۔

3. سبد 2 میں 'چرخ سریش' سہواً چھپ گیا ہے۔ بدون اضافت ہونا چاہیے۔
4. سبد 2 میں 'وایۂ' کی جگہ 'وایۂ' ہونا چاہیے۔
5. سبد 1 میں مصرع 2 میں 'دعای' غلط چھپ گیا ہے۔
6. یہ شعر سبد 2 میں نہیں ہے۔

خمسہ

برغزل مولانا قدسی قدس اللہ سرہ

کیستم تا بخروش آوردم بی ادبی [1]
قدسیاں پیش تو در موقف حاجت طلبی
رفتہ از خویش بدیں زمزمۂ زیر لبی
مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

اے کہ روے تو دہد روشنی ایمانم
کافرم کافر، اگر مہر منیرش خوانم
صورت خویش کشید است مصور دانم
من بیدل بجمال تو عجب حیرانم
اللہ، اللہ، چہ جمالست بدین بوالعجبی

اے گل تازہ کہ زیب چمنی آدم را
باعث رابطۂ جان و تنی آدم را
کردہ دریوزۂ فیض تو غنی آدم را
نسبتی نیست بذات تو بنی آدم را
برتر از عالم و آدم، تو چہ عالی نسبی

---

1. یہ خمسہ سبد 1 و 2 دونوں میں نہیں ہے۔ خود باغ کے اندر بھی اسے 'لا-الیٰ' لکھ کر خارج قرار دیا ہے۔ مگر عرصہ ہوا کہ اسی غزل پر دوسرے بہت سے خمسوں کے ساتھ ایک مجموعے 'حدیث قدسی' میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔

اے لبت را بسوے خلق ز خالق پیغام
روح را لطف کلام تو کند شیریں کام
ابر فیضی کہ بود از اثر رحمت عام
نخل بستان مدینہ ز تو سرسبز مدام
زاں شدہ شہرۂ آفاق بشیریں رطبی

خواست چوں ایزد دانا کہ بساطی از نور
گسترد در ہمہ آفاق چہ نزدیک چہ دور
حکم اصدار تو در ارض و سما یافت صدور
ذات پاک تو دریں ملک عرب کرد ظہور
زاں سبب آمدہ قرآن بزبان عربی

وصف رخش تو اگر در دل ادراک گذشت
نہ ہمین است کہ از دائرۂ خاکِ گذشت
ہمچو آن شعلہ کہ گرم از خس و خاشاک گذشت
شب معراج عروج تو ز افلاک گذشت
بمقامیکہ رسیدی نرسد ہیچ نبی

چہ کنم چارہ کہ پیوند خجالت گسلم
من کہ جز چشمۂ حیواں نبود آب و گلم
من کہ چوں مہر درخشاں بدمد نور دلم
نسبت خود بسگت کردم و بس منفعلم
زانکہ نسبت بسگ کوی تو شد بی ادبی

دل زغم مردہ و غم بردہ ز ما صبر و ثبات
غمگساری کن و بنمای بما راہ نجات
داد سوز جگر ما کہ دہد نیل و فرات
ما ہمہ تشنہ لبانیم و توئی آب حیات
رحم فرما کہ ز حد میگذرد تشنہ لبی

غالب غمزدہ را نیست دریں غمزدگی
جز بامید ولای تو تمنای بہی
از تب و تاب دل سوختہ غافل نشوی
سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی
آمادہ سوے تو قدسی پی درماں طلبی



رباعیات[1]

1۔ بخشید بہ ثاقب سخنور یزداں
2۔ امروز کہ روز عید و نوروز بود
3۔ نازم بہ نشاط ایں چنیں برگشتن[2]
4۔ خواندیم سخنہای محبت بسیار
5۔ ای روی تو ہمچو مہر گیتی افروز
6۔ ای آنکہ بدہر نام شاہ رخ است
7۔ ای دادہ بباد عمر در لہو و فسوس[3]
8۔ جائی کہ ستارہ شوخی چشمی ورزد
9۔ در کالبد شہر رواں باز آمد
10۔ از دہر دلم وایہ بہر درمی جست
11۔ زینساں کہ ہمیشہ در روائی مائیم
12۔ گویند جہانیاں دو رویند، مگوی[4]
13۔ ہر روز تنم ز سایہ لرزاں گردد[5]
14۔ ای پایہ بلند ساز والا جاہی
15۔ نام اب و جد و عم نگیرند ایں قوم
فیض از دم مادراں پذیرند ایں قوم
از مادر و از مادر مادر گویند
کس در کس، امیر ابن امیر اند ایں قوم[6]
16۔ یارب، تو کجائی کہ بما زر ندہی
17۔ آں کیست کہ جسم ملک را جان باشد[7]
18۔ در دیدۂ آں کہ محو رنج و یاس است
خاک است، اگر لعل و گر الماس است
آن دل کہ ز دہر بود آزاد، کنون

در بند محبت نراین داس است

19۔ ہر چند خرد ز تاب می پست شود
و ز ضعف خرد، وہم قوی دست شود
ہر کس کہ خرد دارد، ازیں جوہر ناب
آں مایہ چرا خورد کہ بدمست شود

20۔ حق دادہ بہ سید از پی الغامش
فرخ پسری کہ واجب است اکرامش
تاریخ ولادتش بود بی کم و بیش
'ارشاد حسین خان' کہ باشد نامش 8

1285ھ

حواشی

1. یہ عنوان میں نے قرار دے دیا ہے۔ باغ میں اس کی جگہ ہر رباعی سے پہلے لفظ 'رباعی' لکھا ہوا ہے۔ نیز یہ سب رباعیاں ابر گہربار، اور سبد 1 و 2 میں موجود ہیں، بجز ان کے، جو میں نے اوپر پوری نقل کی ہیں۔
2. سبد 2 مصرع 4 کے اندر بجائے 'ایں' کے سہواً 'اندریں' چھپ گیا ہے۔
3. باغ میں اس رباعی پر 'لا-الی' لکھ کر خارج قرار دے دیا ہے۔
4. سبد 2 میں 'مگوی' کو 'مگو' چھاپا گیا ہے۔
5. سبد 2 میں مصرع 3 'خواہم کہ زلطف' کی جگہ بدون 'کہ' چھپ گیا ہے۔
6. یہ رباعی سبد 2 میں نہیں پائی جاتی، اس لیے یہاں مکمل نقل کی جاتی ہے۔
7. یہ رباعی مکاتیب غالب: 96 طبع اوّل نیز بعد کی اشاعتوں میں شامل ہے۔
8. باغ میں اس رباعی پر بھی 'لا-الی' لکھ کر خارج قرار دے دیا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اسی 'ارشاد حسین خان' کی ولادت کا قطعہ تاریخ میرزا صاحب کہہ چکے تھے، جو قطعات میں 44 ویں نمبر پر درج ہو چکا ہے۔ اس کے مقابلے میں یہ رباعی قدرے پست تھی، اس بنا پر اس کا خارج کر دینا مناسب معلوم ہوا۔

منثورات[1]

1۔ عبارتی کہ در رامپور رقم فرمودہ اند:
''کمال کلام وابستہ بہ افتتاح باب کلام'' الخ[2]

2۔ عبارتی کہ در تہنیت جشن در رامپور رقم کردہ اند:
''جہان خدای را سپاس و جہانیان را نوید'' الخ[3]

3۔ عبارت در صنعت مقطع الحروف در رامپور رقم کردہ بہ نواب کلب علی خان بہادر در دادہ اند:
''داور دارا در، آں زور آور اژدر'' الخ [4]

4۔ دیباچۂ قاطع برہان: ''یزدان دانش بخش داد پسندی پناہم'' الخ[5]

5۔ دیباچۂ ثانی جدید: ''اللہ اللہ، غالب خاکسار ہرزہ کار را از آسمان بزمین فرستادند۔''[6]

6۔ تقریظ قاطع ارہان: ''از من بمن سلام و ہم از من بمن پیام'' الخ[7]

7۔ دیباچۂ مثنوی ابر گہر بار: ''بنامیزد سخن در سپاسگزاری مبدا فیاض است'' الخ[8]

8۔ تقریظ مثنوی ابر گہر بار: ''در انجام این نظم نظامی نظام۔'' الخ[9]

9۔ تقریظ سفرنگ دساتیر تصنیف مولوی نجف علی صاحب: ''اللہ اللہ، ہفتاد سال کو، دہ سال ازاں میان بشمار دانش اندوزی۔'' الخ[10]

10۔ تقریظی کہ بر کتاب دری کشا تصنیف مولوی نجف علی خان صاحب نگاشتہ اند: ''یزدان روان بخرد فروز'' الخ[11]

11۔ تقریظ تذکرۂ اردو تالیف مولوی محمد ظہور علی صاحب: ''خدایا چہ گویم کہ شاہی تو است'' الخ[12]

حواشی

1. یہ عنوان میں نے قرار دے لیا ہے۔ اصل نسخے میں بغیر کسی اشارے کے نثر میں شروع کر دی گئی ہیں۔
2. کلیات نثر: 90، مطبع نولکشور 1871 میں بغیر تمہیدی عبارت کے چھپ چکی ہے۔ اصل میں اس پر اور نمبر 3 و 4 پر 'لا-الیٰ' بنا دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ سب کلیات نثر میں شائع ہو چکی ہیں۔
3. یہ بھی کلیات مذکور کے ص 91 پر بے تمہید شائع ہو چکی ہے۔
4. ایضاً، 81، بدون تمہید۔
5. دیباچہ قاطع برہان، مطبع نولکشور 1278ھ کے ص 372 میں ملاحظہ ہو۔
6. یہ دیباچہ درفش کاویانی، مطبع اکمل المطابع دہلی 1282ھ کے ص 4 تا 7 اور دیباچۂ اول کے بعد چھپا ہے۔
7. یہ تقریظ نسخۂ مذکور کے ص 97 پر چھپی ہے۔

8،9. یہ دیباچہ مثنوی مذکور، اکمل المطابع دہلی 1280ھ 2 تا 4 پر، اور اس کی تقریظ اسی ایڈیشن کے ص 40 پر چھپی ہے۔

10. یہ تقریظ سفر لگ، مطبع سراجی 1280ھ کے ص 194 کے بعد چھپی ہے۔
11. یہ تقریظ دری کشا، اکمل المطابع دہلی 1280ھ کے آخری صفحے (نمبری 66) پر چھپی ہے۔
12. اس تقریظ پر اصل میں 'لا-الیٰ' کا نشان بنا ہوا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ میرزا صاحب اسے کلیات نثر میں شائع کرا چکے تھے۔ ملاحظہ ہو کلیات ص 94۔ اس تذکرۂ اردو کے متعلق کچھ پتا نہیں چلتا کہ یہ شائع ہوا یا نہیں۔ اگر کسی اہل ذوق کو کچھ معلوم ہو تو بغرض افادۂ عام شائع فرمائیں۔

خطوط

[1] بنام منشی جواہر سنگھ

1۔ امروز خونگرمی مہرگی را، الخ 1
2۔ ایضاً: چشم و چراغ دودۂ مردمی، الخ
3۔ ایضاً: جان من نامۂ شما دیر است، الخ
4۔ ایضاً: بنام جواہر سنگھ جوہر سعادت و اقبال نشانا، ہم بخت خود را آفریں گویم، الخ 2
5۔ ایضاً: سعادت و اقبال نشان رای جواہر سنگھ جوہر از عمر و دولت برخوردار باشند، الخ
6۔ ایضاً، سعادت و اقبال نشان رای جواہر سنگھ را چرخ یاور و بخت فرمانبر باد، الخ
7۔ ایضاً: جان من و جانان من، روزی بود کہ نامہ بمن رسید، الخ
8۔ ایضاً: اقبال نشانا، نامہ نگاشتۂ دوازدہم فروری رسید، الخ
9۔ ایضاً: سعادت نشانا، نامہ رقمزدۂ بستم فروری و نامہ نگاشتۂ 25 فروری پی ہم رسید، الخ
10۔ ایضاً: سعادت و اقبال نشانا جانا، نامۂ شما و منشور عطوفت مولانا در نوردآں بمن رسید، الخ
11۔ ایضاً: اقبال نشانا، مسرت افزا نامہ نگاشتہ 13 دسمبر بورود خویش خوشنودم کرد، الخ
12۔ ایضاً: نور دیدہ و سرور سینۂ غالب منشی جواہر سنگھ از عمر و دولت برخواند، الخ
13۔ ایضاً: سعادت و اقبال نشانا منشی جواہر سنگھ از عمر و دولت برخوردار باشند، الخ
14۔ ایضاً، جان من مادر آن ہنگام سرگرانی از اندازہ گزشت، الخ
15۔ ایضاً، از اسداللہ دعا خوانند، الخ
16۔ ایضاً: کامگار سعادت آثار اقبال نشان منشی جواہر سنگھ جوہر دعا خوانند، الخ

[2] بنام رای چھج مل کھتری

مہاراج با چوں منی کہ جز محبت کیش دیگر ندارم، الخ

[3] درسفارش منشی جواہر سنگھ بہ محمد فضل اللہ خان دیوان راج الور

مخلص نواز، غمزدگان را بمہر اندوہ گدازا، الخ

[4] بنام منشی نبی بخش مرحوم

صبح است و پرده ہای ایوان فروہشتہ، الخ

[5] نامہ بنام نواب علاء الدین احمد خان بہادر

1۔ جانشین غالب را از غالب دعا، الخ

2۔ ایضاً: دانشہای بسزا و اندیشہ ہای رسا را بہ فرگاہ تنکبار و الا یزداں بار نداده اند، الخ 3

[6] خط بنام جان جاکوب صاحب

فرخندہ خوی سرورا، الخ

[7] از اسد اللہ گم کردہ راہ معروض بخدمت میر ولایت علی صاحب المخاطب بمشرف الدولہ بہادر

نفرین خدای بر من، الخ

[8] بنام دو تن از فرزانگان پنجاب

آن یکی سپر مردمی را مہر، الخ

[9] بنام آغا محمد حسین ناخدای شیرازی

نظم مجلبند صدیقہ تحقیق، الخ

[10] بنام مولوی رجب علی خاں

1۔ سپاسی کز ان نامہ نامی شود، الخ

2۔ بنام مولوی رجب علی خاں بہادر ارسطو جاہا، سکندر سپاہا، الخ

[11] عرض داشت بنام نامی نواب مختار الملک نائب والی حیدرآباد

بعو عرض حضرت فلک رفعت، الخ

[12] عرضداشت باسم سامی اشرف شاہزادگان میسور بہ رباعی۔ سبحان اللہ شان اعلیٰ حضرت

[13] خطوط بنام خطوط تفضل حسین خانصاحب مرحوم

1۔ حضرت سلامت، رافت نامہ کہ از جے پور، الخ

2۔ ایضاً: بخدمت وافر المسرت حضرت اخوان پناہی، الخ

3۔ ایضاً: قبلہ جان و دل سلامت، الخ

4۔ ایضاً: داغم ز سوز غم کہ خجل داردم ز خلق، الخ

5۔ ایضاً: یارب این فردوسی نسیم، الخ

6۔ ایضاً، روان پرور صاحبا، الخ
7۔ ایضاً، ای بفروغ فرہنگ وفرخی، الخ
[14] خطوط بنام منشی ہرگوپال تفتہ
1۔ مشفق من لالہ ہرگوپال تفتہ از جانب اسداللہ، الخ
2۔ ایضاً، والا جاہا خاقانی دستگاہا، الخ
3۔ ایضاً: مخلص نوازا، دیراست کہ، الخ
4۔ ایضاً، خامہ دوزبان، الخ
5۔ ایضاً: ہان وہان، الخ
6۔ ایضاً، جان من، نامۂ شما کہ بنام منشی ہرگوبند سنگھ، الخ
7۔ ایضاً: اگر جان بے وفا نبودی، الخ
8۔ ایضاً، جان من اوراق اشعار، الخ
9۔ ایضاً، صاحب من، الخ
10۔ ایضاً: فرزانہ مہرورز آزرم گسترا، الخ
11۔ بنام منشی ہرگوپال تفتہ، غالب ازخود رفتہ، الخ
[15] خط بنام جانی بانکے لال وکیل راج بھرتپور یزداں کہ دربا آفرید، الخ
[16] بنام میر احمد حسین المتخلص بہ میکش
1۔ برخوردار اقبال نشان میر احمد حسین، الخ
2۔ ایضاً، عزیز تر از جان، الخ
3۔ ایضاً، نور دیدۂ غالب، الخ
4۔ ایضاً، اقبال نشانا، الخ
5۔ ایضاً: دل وجان من فدای تو باد، الخ
6۔ ایضاً: سعادت نشانا، الخ
7۔ ایضاً: جانا فرہنگ دانا، الخ
8۔ ایضاً: اقبال نشانان، بحساب متعارفہ رسمیہ، الخ
9۔ ایضاً: نامۂ شما رسید، الخ

10۔ ایضاً: صاحب من، الخ

11۔ ایضاً، با آن کہ ہیچ مطلب، الخ

12۔ ایضاً، جانا سعادت نشانا، الخ

13۔ ایضاً: سعادت نشان بشنوید، الخ

[17] نامہ بنام نامی قطب الدولہ بہادر

1۔ بہ ہمایوں خدمت جناب، الخ

2۔ نامہ بنام نامی نواب ایضاً: بخدمت وافرالمسرت، الخ

[18] نامہ بنام نامی شاہ صاحب

اگر چہ نیک نیم، الخ

[19] نامہ بنام نامی نوروز علی خاں بہادر

عالی جاہا، الخ

[20] بنام دوستی

خامہ کہ گویای خموش است، الخ

[21] نامہ بنام منشی احمد صاحب

شفیقی خلیلی، الخ4

[22] بنام منشی ہیرا سنگھ صاحب

سعادت و اقبال نشان منشی ہیرا سنگھ صاحب، الخ

[23] ترقیمہ5

حواشی

1. حصہ مکاتیب کا آغاز منشی جواہر سنگھ جوہر کے خطوط سے ہوتا ہے مگر آغاز کے تین خط پنج آہنگ میں شامل ہو چکے تھے، اس سے ان تینوں پر علامت حذف 'لا-الی' پائی جاتی ہے۔
2. انھیں کے نام چوتھے خط کے حاشیے پر لکھا ہے 'ازیں جا باید نوشت' یعنی ناقل چوتھے خط سے نقل شروع کرے، پہلے کے تینوں خط حذف کر دے۔
3. یہ فارسی جانشینی کی سند ہے جو مرزا صاحب نے علائی کو عطا کی تھی۔ خود مرزا صاحب کے ہاتھ کی لکھی اس تحریر کا عکس مولانا مہر نے اپنی کتاب 'غالب' کی اشاعت اوّل میں چھاپ دیا ہے۔ 1، 2، 3، 4، 5 ان تمام خطوط پر بھی علامت 'لا-الی' پائی جاتی ہے اس لیے کہ یہ سب پنج آہنگ میں شامل ہو چکے ہیں۔
4. اس خط پر بھی مخطوطے میں 'لا-الی' علامت حذف موجود ہے مگر اس ہدایت کی وجہ کیا ہے، نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے کہ یہ خط پنج آہنگ میں موجود نہیں ہے۔
5. ترقیمے کی عبارت تعارف میں نقل ہو چکی ہے۔



انشائے غالب

میرزا صاحب کی اردو نثر کی برتری و دلچسپی کے متعدد اسباب ہیں۔ ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ اردو زبان کی نثر ان کی پختہ عمر کا کارنامہ ہے۔ جب وہ فردوسی و نظامی سے حزیں وقاآنی تک تقریباً ہزار سالہ فارسی نظم و نثر مطالعہ کر کے اس زبان کی سادگی و پرکاری سے آگاہ ہو چکے تھے۔ انھوں نے کامیاب کوشش کی کہ اس دیسی زبان میں بھی وہی جدت شیرینی، سادگی، اور لطف پیدا کریں، جو سعدی جیسے اساتذۂ ایران کی نثر کا طرۂ امتیاز ہے۔ اگر وہ فارسی کے بلند پایہ ادیب نہ ہوتے یا اپنے کلام اردو میں فارسی جیسی جدت، شیرینی اور تناسب پیدا کرنے کی کوشش نہ کرتے، تو ناممکن تھا کہ ان کا کلام زبان اردو میں پائدار حیثیت حاصل کر سکتا۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ اردو مکاتیب اُن کے تفریحی مشغلوں کا جز بن گئی تھی۔ وہ جو کچھ لکھتے تھے اپنا اور مکتوب الیہ کا دل بہلانے کی خاطر لکھا کرتے تھے۔ قدرت نے بذلہ سنج طبیعت عطا کی تھی اس لیے خطوط سے خود لطف اٹھانے اور دوسروں کے لیے سامان انبساط مہیا کرنے میں انھیں خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی۔ غدر 57ء کے بعد تمام مشاغل میں سے صرف اسی ایک مشغلے پر انحصار کرنا پڑا۔ یہ دور اہلِ ہند کے لیے عموماً اور اہل دہلی کے لیے خصوصاً، سخت ابتلا و مصائب کا دور تھا، جس نے اعزا و احباب کی بڑی تعداد کو موت کے گھاٹ اتار کر بقیہ اصحاب کو شہر بدر کر دیا تھا، اور میرزا صاحب ہندوستان کے براعظم میں اپنے آپ کو یکہ و تنہا محسوس کرنے لگے تھے، اس عہدِ افسردگی کو فرحت و انبساط کے ساتھ گزارنے کی یہی ایک ترکیب باقی تھی کہ جو دو چار دوست آشنا رہ گئے تھے، ان سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا جائے، تا کہ اپنا دکھ انھیں

کتاب نما، مارچ 1969

سنانے اور ان کا درد خود سننے سے کچھ غم غلط ہو جایا کرے۔ چنانچہ مجروح، تفتہ، بے خبر اور چند دوسرے اصحاب سے میرزا صاحب کی کثرتِ مراسلت کا باعث یہ بھی تھا۔ اُن میں سے جس کا خط آتا اُس کو جواب، اور جس کا نہ آتا اس کو شکوہ وعتاب لکھتے رہتے۔ اس زمانے میں ایک بار تفتہ نے کوتاہ قلمی سے کام لیا، اور ایک ماہ تک کوئی خط نہ بھیجا، تو میرزا صاحب نے 19 جون 58ء کو پُرحسرت انداز میں لکھا:

''کیوں صاحب، مجھ سے کیوں خفا ہو! آج مہینے بھر ہو گیا ہوگا۔ یا بعد دو چار دن کے ہو جائے گا، کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو، کتنا کثیرالاجناب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں، اب یاروں میں ایک شیو جی رام برہمن اور بالمکند اُس کا بیٹا، یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں، اس سے گزر کر لکھنؤ اور کالپی اور فرخ آباد کس کس ضلع سے خطوط آتے رہتے تھے۔ ان دوستوں کا حال ہی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں۔ وہ آمد خطوط کی موقوف، صرف تم تین صاحبوں کے خط آنے کی توقع۔ اُس میں وہ دونوں صاحب گاہ گاہ، ہاں، ایک تم کہ ہر مہینہ میں ایک دو بار مہربانی کرتے ہو۔ سنو، صاحب، اپنے پر لازم کر لو ہر مہینے میں ایک دو خط مجھ کو لکھنا گر کام آ پڑا دو تین خط، ورنہ صرف خیر و عافیت لکھی اور ہر مہینے میں ایک بھیج دی۔''

اُس کے بعد پھر تفتہ سے تاخیر ہوئی، میرزا صاحب نے 13 نومبر 58ء کو مزاحاً تحریر کیا:

''کیوں، صاحب، کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں؟ بھلا اگر یہ حکم ہوا ہوتا، تو یہاں بھی تو اشتہار ہو جاتا کہ زنہار، کوئی خط سکندر آباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جاوے۔''

لیکن تفتہ نے اس کے بعد تساہل سے کام لیا، تو میرزا صاحب نے 27/ دسمبر 58ء کو لجاجت سے لکھا:

''کیوں، صاحب، روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی؟ اور اگر کسی طرح نہیں منتے، تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو، میں اس تنہائی میں صرف خطوط کے بھروسے جیتا ہوں، یعنی جس کا خط آیا، میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لے

آیا، خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا، جو اطراف و جوانب سے دو
چار خط نہ آتے رہتے ہوں بلکہ ایسا دن بھی ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ
خط لاتا ہے، ایک دو صبح کو اور ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے، دن
ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔ یہ کیا سبب، دس دس بارہ
بارہ دن سے تمہارا خط نہیں آیا، یعنی تم نہیں آئے۔ خط لکھو صاحب نہ لکھنے کی
وجہ لکھو آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو۔''

اُس زمانے میں میرزا صاحب غم غلط کرنے کے اس قدر درپے تھے کہ جب خط و کتابت کے بعد بھی وقت بچ رہتا، تو آئندہ مراسلت کے لیے لفافے بنانے لگتے۔ منشی نبی بخش کو 22/ ستمبر 58ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''اللہ! اللہ! یہ دن بھی یاد رہیں گے، خط سے خط لکھے گئے ہیں! مجھ کو اکثر
اوقات لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ لکھوں گا، تو لفافے بناؤں گا۔''

منشی شیونرائن نے کچھ لفافے بھیجے اور بذریعہ تحریر ارسال کی اطلاع دی، تو اُس کے جواب میں میرزا صاحب نے لکھا ہے:

''لفافوں کی خبر پہنچی، آپ نے کیوں تکلیف کی؟ لفافے بنانا دل کا بہلانا
ہے۔ بیکار آدمی کیا کرے۔ بہر حال جب لفافے پہنچ جائیں گے، ہم آپ کا
شکریہ بجا لائیں گے، ہر چہ از دوست میرسد، نیکوست۔''

تیسرا سبب یہ ہے کہ میرزا صاحب نے تحریر کو تقریر کا پیرایہ دے دیا تھا۔ وہ جب کسی دوست کو خط لکھتے، تخاطب میں وہی انداز اختیار کرتے جو اس مکتوب الیہ سے ملاقات کے زیبا ہوتا اور چونکہ ہر شخص گفتگو میں سادگی، برجستگی اور ظرافت پسند کرتا ہے اور یہ سب خوبیاں ان کی تقریر میں موجود تھیں، اس لیے ان کی تحریر میں بھی وہی دلچسپی نظر آتی تھی، جو تقریر کا طرۂ امتیاز تھی۔ دراصل میرزا صاحب اس قسم کی مراسلت کرنے پر مجبور بھی تھے۔ انھیں دور افتادہ دوستوں کو اپنی پریشانیاں سنانی تھیں، اگر یہ پریشانیاں قدیم انداز تحریر کے لباس میں جلوہ گر ہوتیں، تو مکتوب الیہ بہت جلد اکتا جاتے، اور میرزا صاحب کو مراسلات کا زیادہ موقع نہ ملتا۔ لہٰذا انھوں نے اپنے تمام خطوط مکالمہ بنا کر اس میں طبعی ظرافت کی تخم ریزی کی، جس کے سبب سے احباب و اعزا اُن کے خطوں کے انتظار میں رہا کرتے۔

چونکہ مرزا صاحب نے یہ طریقہ جان بوجھ کر اختیار کیا تھا۔ اس لیے جب انھیں اس کامیابی کا یقین آ گیا تو اس کی ایجاد کو فخراً اپنی ذات کی طرف منسوب بھی کرنے لگے تھے۔ مہر کے نام کے ایک خط میں فرماتے ہیں:

''مرزا صاحب، میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے، ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔''

تفتہ کو لکھا ہے:

''بھائی، مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہے کو ہے، مکالمہ ہے۔

منشی نبی بخش کو تحریر کیا ہے:

''بھائی، مجھ کو اس مصیبت میں کیا ہنسی آتی ہے، کہ یہ ہم تم اور مرزا تفتہ میں مراسلت گویا مکالمت ہوگئی ہے۔ روز باتیں کرتے ہیں غنیمت ہے کہ محصول آدھ آنہ ہے، ورنہ باتیں کرنے کا مزا معلوم ہوتا۔''

حکیم غلام نجف خاں کے آخر خط میں لکھا ہے:

''اس وقت جی تم سے باتیں کرنے کو چاہا۔ جو کچھ دل میں تھا وہ تم سے کہا۔''

شفق کی خدمت میں بھی اسی طرح عرض کیا ہے:

''پیر و مرشد یہ خط لکھنا نہیں ہے باتیں کرنی ہیں۔''

انھیں کو ایک خط کے آخر میں لکھتے ہیں:

''اب میں حضرت سے باتیں کر چکا، خط کو سرنامہ کر کے کہار کو دیتا ہوں، بے خبر کو لکھا ہے۔''

''اس افسردگی میں جی چاہا کہ حضرت سے باتیں کروں۔ بآنکہ خط جواب طلب نہ تھا، جواب لکھنے لگا۔''

میرزا صاحب احباب سے بھی اسی طرح کی مراسلت کے امیدوار رہتے تھے۔ کوئی شاگرد ان کے تتبع میں مراسلت کو مکالمے کا رنگ دیتا، تو تعریف کیا کرتے۔ ایک بار تفتہ کا پیرایۂ بیان پسند آیا، تو اظہار خوشنودی کے لیے لکھا:

''جیتے رہو، اور خوش رہو! زیادہ خوشی کا سبب یہ کہ تم نے تحریر کو تقریر کا پرداز دے دیا تھا۔''

مراسلت کا محمد شاہی طرز

میرزا صاحب کے وقت تک اردو فارسی دونوں زبانوں کی خط کتابت کا انداز یہ تھا کہ شروع میں بھی بھاری بھرکم القاب و آداب لکھے جاتے، زاں بعد متعلقین کی خیریت کی اطلاع واستفسار ہوتا اور اس کے بعد استعاروں، تشبیہوں اور کنایوں کے پردے میں دو چار مطالب لکھ کر عربی یا فارسی دعائیہ جملے پر ختم کر دیا جاتا۔ میرزا صاحب ابتدا سے اِس روش کو پسند کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مکتوب الیہ کے مناسب حال دو چار لفظ کا القاب لکھ کر سیدھے سادھے جملوں میں اظہارِ مطالب کر دیا جائے۔ پنج آہنگ کے دیباچے میں اس روش سے بیزاری ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بیگانگیَ این روش از شیوهٔ غالبِ مستمند نہ چندانست کہ بگفتن نیاز داشتہ باشد۔ دادا شناش داند کہ ہنجارِ من درنگارش این ست۔ کہ چون کلک، و ورق بکف گیرم، مکتوب الیہ رابلفظی کہ فراخورِ حالتِ اوست، در سرِ آغازِ صفحہ آواز دہم، وزمزہ سنج مدعا کردم۔ القاب وآداب وخیریت گوئی و عافیت جوئی حشوِزائداست، وپخنگان حشورادفع نہند۔

میرزا صاحب نے مراسلت کی اس روش کا نام، جس میں بڑے بڑے القاب و آداب اور حشو و زائد سے پُرخیریت گوئی و عافیت جوئی کے جملے ہوتے، محمد شاہی روش رکھا تھا اور اس سے اس قدر بیزار تھے کہ مجروح کے نام کے خط میں اس کی ہنسی اڑائی ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''ہاں صاحب، تم کیا چاہتے ہو؟ مجتہد العصر کے مسودے کو اصلاح دے کر بھیج دیا اب اور کیا لکھوں؟ تم میرے ہم عمر نہیں، جو سلام لکھوں میں فقیر نہیں، جو دعا لکھوں تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافہ کو کریدا کرو، مسودے کو بار بار دیکھا کرو، پاؤ گے کیا؟ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں۔'' یہاں خیریت ہے وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ خط تمہارا دن کے بعد پہنچا۔ جی خوش ہوا، مسودہ بعد اصلاح کے بھیجا جاتا ہے۔ برخوردار میر سرفراز حسین کو دینا، اور دعا کہنا اور ہاں حکیم میر اشرف علی اور میر افضل علی کو بھی دعا کہنا۔ لازمہٗ سعادت مندی یہ ہے کہ ہمیشہ اسی طرح خط بھیجتے رہو، کیوں سچ کہیو، اگلوں کے خطوط کی تحریر

کی یہی طرز تھی؟ ہائے کیا اچھا شیوہ ہے! جب تک یوں نہ لکھو، وہ خط ہی نہیں
ہے۔ چاہ بے آب ہے، ابرِ باراں ہے، نخلِ بے میوہ ہے، خانۂ بے چراغ
ہے، چراغِ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں، تم زندہ ہو، تم جانتے ہو کہ ہم زندہ
ہیں۔ امر ضروری کو لکھ لیا۔ زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا اور اگر تمہاری
خوشنودی اُسی طرح کی نگارش پر منحصر ہے، تو بھائی ساڑھے تین سطریں ویسی
بھی میں نے لکھ دیں کیا نماز قضا نہیں پڑھتے اور وہ مقبول نہ ہوگی۔''

شفق کے خط میں القاب و آداب سے آغاز کرنے کی جگہ انتہائی پاکیزہ انداز سے اس متعارف طرز کی سبکی اور عدم احتجاج کا اظہار کیا ہے، فرماتے ہیں:

''کیوں کر کہوں کہ میں دیوانہ نہیں ہوں! ہاں اتنے ہوش باقی ہیں کہ اپنے کو
دیوانہ سمجھتا ہوں۔ واہ کیا ہوشمندی ہے، کہ قبلۂ اربابِ ہوش کو خط لکھتا ہوں،
نہ القاب و آداب، نہ بندگی نہ تسلیم! سن غالب، ہم تجھ سے کہتے ہیں، بہت
مصائب نہ بن۔ ای ایاز، حدِ خود بشناس مانا کہ تو نے کئی برس کے بعد تو بیت
کی غزل لکھی ہے اور آپ اپنے کلام پر وجد کر رہا ہے، مگر یہ تحریر کی کیا روش
ہے؟ پہلے القاب لکھ، پھر بندگی عرض کر، پھر ہاتھ جوڑ کر مزاج کی خبر پوچھ، پھر
عنایت نامے کا شکریہ ادا کر... (اقتباس)



غالب کے فارسی خطوط

(ایک نئی تحقیق)

مرزا غالب کی 'پنج آہنگ' کا پانچواں آہنگ اُن خطوط پر مشتمل ہے جو انھوں نے مختلف اوقات میں بزرگوں دوستوں اور شاگردوں کو لکھے تھے۔ یہ ان مسودوں سے مرتب کیے گئے ہیں جو مرزا صاحب کے پاس محفوظ تھے اور بظاہر مبیضوں کے مطابق ہیں۔

'مکاتیب غالب' کی ترتیب کے بعد میں نے غالب کے فارسی خطوں کی جمع، تصحیح اور ترتیب کا کام شروع کیا تو سب سے پہلے مخدومی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب (الہ آباد) نے اس خط کی نقل عطا کی جو مرزا نے میر واجد علی خاں بلگرامی کو لکھا تھا۔

چونکہ 'پنج آہنگ' کا متن بہت غلط سلط چھپا ہے جس کی تصدیق غالب کے بیان سے بھی ہوتی ہے اس لیے میں نے مطبوعہ متن کا اس خط سے مقابلہ کیا۔ کاتب کی غلطیوں کے ماسوا دو ایسے اختلاف نظر آئے جو قابل توجہ تھے۔

یعنی ڈاکٹر صاحب کے مرسلہ خط کی حسب ذیل عبارت 'حرز رواں آسایی تواں افزا رسید و در بن ہر موئے تن زار جداگانہ جانی دمید' میں سے لفظ 'زار'، 'پنج آہنگ' کے مطبوعہ نسخے میں ندارد تھا اور 'تواں افزا رسید' نے 'توان فزا رسیدہ' کی شکل اختیار کر لی تھی۔

نیز 'حضرت مولانا ظہیر الدین' میں سے 'حضرت' بھی ساقط ہو گیا تھا۔ اس کے بعد نواب یار محمد خاں شوکت بھوپالی کی 'انشائے نور چشم' (اردو) میں غالب کا وہ خط نظر پڑا جو انھوں نے محمد عباس رفعت بھوپالی ابن مرزا احمد یمنی شروانی صاحب فتحہ الیمن کو لکھا تھا۔ یہ خط بھی 'پنج آہنگ' میں چھپ چکا ہے!

ان دونوں مطبوعہ خطوں کا تقابل کرنے پر حسب ذیل اختلافات پائے گئے۔

ماہ نو، کراچی، جنوری فروری 1969

پنج آہنگ [1]	انشائے نور چشم
(1) باز پسینِ آں گردہ، باخداوند درنام انبازی دارد	(1)........ .آں جمع با......... ....
(2) بہر ہنگام ہر یکے بجائے اوست	(2) ہر یکی بہر ہنگام..............................
(3) اگر دریں مردہ دلی سوی کلک و کاغذ گرایش میرود بی منِ توانائی آں نیایش و نیرو فزائی ایں ستائش میرود	(3) غالب سخن گزار ہیچ منگارا گر دریں...... گرایش دارد، نامہ نگاررا..........................
(4) نیرنگ روزگار دو رنگ نگرستن و بسر شکی کہ در شدت خندہ از چشم کشاید گرستن دارد۔ حاشا کہ ایں چنیں پست پایہ بلند نام کہ خود از فروماندگی خاک نشین یک شہر باشد و بمیان جیگری نامہ و خامہ روشناس اعیان دہر باشد جز من در دھر تواں یافت	(4) نگرستنی است۔ پست پایگی بدان پایہ کہ از فروماندگی خاک نشین یک شہرم و بلند نامی بدان اندازہ کہ بمیانجی گری بہ اعیان دھرم حاشا کہ ایں چنیں پست پایہ بلند نام خبر............ ...
(5) از دیر باز نبشتن نثر بپارسی زبان آئین من نیست۔ نامہ ہا یکدست بہ اردو نبشتہ می شود	(5) بنظم ونثر نمی گرایم۔ نظم خواہی پارسی وخواہی اردو خوانی است فراموش۔ نامہ در پارسی نوشتن نیز آئین نماندہ ہر چہ نوشتہ می شود یکدست
(6) اینک خواجۂ روشن گہر فرخ اثر حق پرست حق شناس مولانا محمد عباس	(6) اینک خواجہ حق پرست حق شناس بلند پایہ مولانا عباس
(7) غالبِ فرسودہ رواں در پارسی زبان بنام آں ہمہ داں نامہ نویسد	(7) بنام آں ہمہ دان نامہ در پارسی زبان نویسد
(8) باری جنبش خامہ لفظی چند کہ اگر بخواندن ارزد بستودن نیرزد بردیٔ ورق ریخت تا آنی ورق بہم پیچیدہ سوی کارفرما رواں داشتہ آمد	(8) باری نہ از توانائی بناں بلکہ از اثر روائی آن فرمان جنبش کہ بخواندن نیرزد بروی ورق

[1] پنج آہنگ: 434 طبع دہلی 1853ء، کلیات نثر فارسی۔ 36 طبع نول کشور 1171 موخرالذکر میں کاتب مطبع نے بہت غلطیاں کی ہیں ان سب کو میں نے نظرانداز کر دیا ہے۔

چشم داشت آن کہ برگ سبز از درویش بحققی .... نگاشتہ سہ شنبہ و چہارم ربیع الاوّل
پذیرفتہ آید سال رستاخیز

بلگرامی والے خط میں جو تغیر و تبدل تھا وہ پھر بھی کاتب کے سہو کا نتیجہ مانا جاسکتا تھا لیکن اس رفعت کے نام کے مکتوب نے بالکل واضح کردیا کہ مسودے اور مبیضے کا یہ اختلاف خود غالبؔ کا رہینِ منت ہے۔ الفاظ ہی نہیں جملوں تک کا بدلا ہوا ہونا، مطالب کا تقدم و تاخر اور ان سب باتوں کو کاتب، رفعت یا شوکت کی طرف کسی طرح منسوب نہیں کیا جاسکتا۔

اس صورت حال کے پیش نظر میں نے کوشش شروع کردی کہ 'پنج آہنگ' کے مطبوعہ خطوں کی اصلیں یا وہ نقلیں بھی فراہم کی جائیں جو مکتوب الیہ کے پاس پہنچے ہوئے خطوط سے تیار کی گئی ہوں۔ اس طرح توقع کی جاسکتی تھی کہ متعدد مکاتیب کی واقعی تاریخ کتابت متعین ہوجائے گی اور بہت سی کتابتی غلطیوں کا ازالہ ممکن ہوگا۔ جن کا رونا خود غالبؔ جگہ جگہ رو چکے ہیں اور جن کی وجہ سے غالبؔ کی تحریروں کا صحیح مطلب اخذ کرنا بھی کسی نہ کسی حد تک دشوار ہوگیا ہے۔

لیکن مجھے یہ کسی طرح بھی خیال نہیں گزرا تھا کہ غالبؔ کے مطبوعہ خطوں کے بعض اہم حصے دانستہ حذف بھی کردیے گئے ہیں۔ اس امر کا یقین اس وقت ہوا جب غالبؔ کے 48 فارسی خطوط کی نقلیں جناب سید مسعود حسن صاحب رضوی (لکھنؤ) نے ازراہ عنایت ارسال فرمائیں۔

ان خطوں میں سے 11 خط 'پنج آہنگ' میں شامل اور عرصے سے اہل ذوق کے زیر مطالعہ ہیں۔ ان کے متن کا مطبوعہ متن سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ تغیر و تبدیل کی تمام شکلیں ان خطوط میں برتی گئی ہیں۔ طوالت سے بچنے کے خیال سے مختلف شکلوں کی دو دو چار چار مثالوں پر بس کرتا ہوں۔

تغیر الفاظ: مفرد اور مرکب الفاظ کے تغیر کی مثالیں ان خطوں میں قدم قدم پر نظر آتی ہیں، مثلاً:

پنج آہنگ	متفرقات غالب[3]
(1) در عالم مہر شرمسار بودہ باشم سپاس مہربانی	(1) ———— وداد ————
بجای آوردہ باشم	———— عنایت ————

---

[1] کلیات نثر فارسی و 245 [2] انشائی نور چشم (اردو)، 51 نظامی کانپور 1289ھ

[3] یہ خطوط چند نظموں کے ساتھ 'متفرقات غالب' کے نام سے 1947 میں کتاب خانہ رامپور کی طرف سے چھپ کر شائع ہوچکے ہیں۔

(2) مشاہدۂ صفوت نامہ دیدہ را	(2) ——نامۂ خلقت رقم——
آئینہ دار جلوۂ شاہد آرزو ساخت[1]	——شاہد مدعا——
(3) وطن را بمذاق من آشفتہ مشرب	—— شوریدہ مشرب
تلخ تر از غربت ساختہ	—— ساختہ است
(4) از دوستاں یکدل گروہی...... درزوایای	(4) ——موافق——
خمول فرورفتہ، وسفلگان وسفیہان را روزگار	خزیدہ و—— سفیہان
بروی کار آوردہ[2]	رونق عرصۂ دار وگیر گردیدہ
(5) نقش دیوارِ غمکدۂ خویش گردیدہ ام[3]	(5) ——غم خانۂ——
(6) اگر کار خود را کار شما نمی دانستم چگونہ	(6) ——نمی دانستمی——
ایں رازِ سترگ درمیاں می نہادم	سترگ را زہا بہ شما می نہادم، و
	خود را سراسر بشمامی سپردم
(7) ہر نامہ کہ از من میرسیدہ باشد بعد	(7) ہر نامہ—— برسد آن را بخوانید و
خواندن و بمولانا نمودن می دریدہ و	——بنمائید و از ہم بدرید——
بآب و آتش می افگندہ باشید[4]	——افگنید!
(8) وشیرہ ہمدران باب خار خاری دارم کہ	(8) خاصہ ہمدران——
محاسب خیال روزگار رسیدن پاسخ	مدت——
را از روی شمار منزل بپایاں برد۔ وہنوز	——پاسخ را بپایاں——
رنگی از اں بہار پدیدار نیست	——پدید——
(9) چشم بداد گریہای فرماندہانِ صدر دوختہ	(9) ——حکامِ صدر——
دارم[5]	
(10) درنگ درنگارش پاسخ از ناپروائی نبود[6]	(10) —— لاابالیانہ نبود۔
(11) نختہ آنچہ بنظر درآمد خرد آشوب خبری بود	(11) —— درنظرم جلوہ کرد —— خاطر آشوب——

1. کلیات نثر 133 ومتفرقات غالب 12
2. کلیات نثر 145 ومتفرقات غالب 1
3. کلیات نثر، 129 ومتفرقات غالب 16
4. کلیات نثر 133 ومتفرقات غالب 13
5. کلیات نثر 129 متفرقات غالب 19
6. کلیات نثر 134، متفرقات غالب 19

(12) کلکتہ را غنیمت باید پنداشت شارستانی بدیں تازگی در گیتی کجاست[1]	(12)——— باید دانست۔ شہری بدیں پاکیزگی و بہارستانی بدین خرمی

اضافۂ عبارت: 'پنج آہنگ' کے متن میں جگہ جگہ نئے لفظ، فقرے اور جملے بڑھائے بھی گئے ہیں، مثلاً:

(1) ناگہان دی کہ دوشنبہ پانزدہم ذی الحجہ بود، آوازہ در افتاد کہ مجموعۂ مکارم اخلاق را شیرازہ و جوو ازہم گسیخت، شمع ایوان سروری مرد و نہال باغ آگہی را برگ و بار فرو ریخت دستگیر درماندگان را دست از کار رفت و گرہ کشائی بستہ کاران رائی بناخن شکست—— خاکم بدہن! چگونہ گویم واگر من نگویم کیست کہ نمی داند کہ مستر اندرو استرلنگ مرد و از گیتی جز نام نیک باخود نبرد[2]	(1) دی کہ پانزدہم ذی الحجہ روز دوشنبہ بود کہ خبر رسید کہ گسیخت۔ خاک بدہنم مستر استرلنگ جان بجان آفریں باز داد
(2) فرماندہ ایں خراب آباد کہ فرانسس ہاکنس بہادرش نامند باوالی فیروز پور پیمان یکدلی بست و رپوٹ چنانکہ خواست بصدر فرستاد۔ ہر چند پردہ داراں در پردہ بارم دادند و لخت ازاں را بمن باز گفتند۔ مرا دل از جای نرفت۔ گفتم استرلنگ حق پرست و حق شناس کسی است کہ سررشتۂ ہر کار بدست اوست بچارہ گری خواہد نشست۔ قضا برمن خندید و طرح آن افگند کہ پیش ازاں کہ رپورٹ بصدر رسد امیدگاہ مرا اجل فرو رسید و چشم جہان بینش فرو بستہ شد[3]	(2)—— کہ مستر—————— با جاگیردار فیروز پور عقد موافقت و مرافقت بستہ خواست کہ مرا بکشتن دہد۔ ورپورٹ فرستاد می سنجیدم کہ مرجع کار دادر فرشتہ خوی حق شناس است بچارہ گری واصلاح حال رپورٹ خواہد کرد۔ قضارا اتفاق چناں افتاد کہ پنج روز بعد از رسید رپورٹ امیدگاہ مرا اجل در رسید!

---

1. کلیات نثر 146 و متفرقات غالب 22
2. کلیات نثر 139 و متفرقات غالب 25
3. کلیات نثر، 130 و متفرقات غالب 31

(3) روز شانزدہم از مئی بود و وقت برافروختن شمع و چراغ کہ چپراسی سررشتۂ اجنٹی دہلی رسید و نامہ مہری ولیم فریزر بہادر بمن داد چون بمیزان نظر سنجیدم گراں تر ازاں بود کہ آں را یک نامہ تواں انگاشت۔ باری ازہم کشودم و دیدم کہ نامۂ مہری ولیم مسٹر جی مکناٹن صاحب بہادر در نوردآں است۔[1]

(3)——بود از مئی—————— کہ چپراسی رسید و نامۂ ایجنٹ بہادر بمن داد۔ کہ آنرا شاہنامہ تواں گفت۔ باری عنوانش ازہم نامۂ جناب ولیم بہادر در نوردِ آن است

کمی عبارت: بہت سے خطوں میں مرزا غالبؔ نے عبارت کے اندر کمی بھی کی ہے۔ مثلاً:

(1) رسیدن بدہلی تلافی اندوہ ہجراں کلکتہ نکرد[2]

(1) باللہ واللہ ثم تاللہ کہ رسیدن .... ہرگز تلافی ....

(2) اوضاع آں محکمہ در نظر دارم۔ حقا کہ راست می گویند لیکن ماتم زدہ را دل جز بمویہ نیارامد و خستہ جز مرہم نخواہد۔[3]

(2) اوضاع اعیانِ آں گرامی محکمہ.......... حقا کہ ہم چنیں است کہ رقم کردہ آید۔ اما دردمند چہ کند اگر ننالد۔ ماتم زدہ جز مویہ چہ دارد مجروح جز مرہم چہ جوید۔

(3) بخدا اگر جارج سوئنٹین مہربان گردد و ظہور حق حقیقی کوشد بکام دل رسیدن من آسانست و ایں قدر خود می دانم کہ رای وی دریں داوری راجع بہ استحقاق من است۔[4]

(3) حال پرنسپ صاحب می دانم کہ بدین معاملہ علاقہ ندارند لیکن چوں از من و کار من پارۂ آگاہند و در عہد حکومت خود مراپیش نواب معلیٰ القاب بجلالت قدر و اشاعت استحقاق ستودہ اند دوستانہ مکتوبی نوشتہ ام۔ خدایا این قدر بہ ظہور آید کہ نامۂ مرا فرو گیرد و وکیل مرا بوکالت بپذیرد آں گاہ کارہا انسبت و امیدہا فراواں

---

1. کلیات نثر، 148، متفرقات غالب 53
2. کلیاتِ نثر 145، متفرقات غالب 1
3. کلیات نثر 123، متفرقات غالب 13
4. کلیات نثر 133، متفرقات غالب 13

(4) ہے ہے این مخدومۂ مرحومہ ہمانست کہ تا درکلکتہ خبر رنجوری وی شنودہ بودید دل از دست رفتہ بود[1]   (4) ازاں گروہ نیم کہ چوں از دوست جدائی روی دہد۔ رسم وراہش از یاد برند و معاملات فراموش کنند ایں مخدومہ۔

اسماء کا تغیر: بعض خطوں میں مرزا غالبؔ نے اشخاص کے نام بدل دیئے ہیں۔ مثلاً:

(1) مولوی محمد محسن بجرم خفیہ نویسی ماخوذ شدہ اند[2]   (1) ....ظاہر علی.........................

(2) بخدا اگر جارج سونٹین مہربان گردد۔   (2) حال پرنسپ صاحب می دانم کہ..........

(3) ہم از نگارش مخدوم پدید آمد کہ قبلۂ جان و دل مرزا احمد بیگ خاں از درد پہلو رحمت کشیدہ و بحسن تدبیر جناب سید احمد علی خاں روی افاقت دیدہ اند[3]   (3) وارسیدم کہ جناب مولوی صاحب قبلہ بعارضۂ بواسیر رنجہا کشیدہ اند اما بفضل ایزدی راحت ازاں زحمت یافتہ اند۔

حذف مطالب: مرزا صاحب نے متعدد خطوں کے بعض مطالب بھی حذف کردیئے ہیں۔ اس نوع کی مثال میں صرف حسب ذیل دو تحریروں کا پڑھ لینا کافی ہوگا۔

'پنج آہنگ' میں مرزا صاحب مولوی سراج الدین احمد کو لکھتے ہیں:

> ''نامۂ نامی کہ در باندہ بمن رسیدہ و جوابش ہم ازاں منزل مرقوم گردیدہ سطری از نہفت لوای جہاں کشای گورنری داشت ہنوز آنچناں بر روی کار نیامدہ۔ ہمانا آں فرماں روائی نیافتہ باشد چہ جزو اعظم کونسل میخواہد کہ ارباب کونسل را با دفتر آں محکمہ بہند باخود آورد۔ داعیان آن کدہ بدیں رای یکدل و یک زبان نیستند۔''
>
> امید کہ بیخبرم نگزارند و ہرچہ درین باب دانستہ باشند، بمن برنگارند۔ دولت روزافزوں باد۔[4]

'متفرقات غالب' میں اس خط کا مذکورۂ بالا حصہ اس طرح مندرج ہوا ہے۔

'نامۂ نامی کہ درباندہ بمن رسیدہ بود سطری از اخبار نہفت رایت جہاں کشائی صاحبان

---

1. کلیاتِ نثر، 146، متفرقاتِ غالب 22
2. کلیاتِ نثر، 148، متفرقاتِ غالب 54
3. کلیاتِ نثر 146، متفرقاتِ غالب 24
4. کلیاتِ نثر، 145

خسرو نشان داشت ہنوز آں چناں برروی کار نیامدہ۔ ہمانا کہ آن حکم نفاذ نیافتہ باشد۔ می خواستم عرضداشتی بداور مظلوم پرور نبشتن وبشما فرستادن چوں ندانم سراپردۂ بارگاہش رونق افزای کدام موزوبوم است نقش این آرزو را درو گداختہ ام۔

وہم حال عرضداشتی کہ از باندہ فرستادہ بودم ندانم کہ بروجہ گذشت ومراد و دل داور جای چہ مقدار است۔ ناچار بشما دردسر میدہم کہ خدا رابیکسھائے مرادرنظر اوردہ، حال عرضداشت مرسلہ ازباندہ وطریق گرشتن دی بنظر داور ومقدار توجہ دی بسوی من آنچہ ازانداز داد پدید آمدہ باشد، رقم فرمایند۔ اگر ملفوف عنایت نامہ مرزا صاحب بفرستند آسان تر۔ واگر خواہند کہ جداگانہ بفرستند عنوان رافت نامہ رابطغرای ایں رقم بیارایند کہ ''ایں خط بہ دہلی درحویلی نواب عبدالرحمٰن خاں بمطالعۂ اسد پرسد۔''

خدایگانہ چوں برزہ رقم نامۂ من از نقوش ولولۂ شوق سادہ است افسردہ دل ازخودم ندانند۔ بلکہ این مکتوبی است کہ در جوش پراگندگی واشفتگی بشمانبشتہ ام۔ تا حال من شما مجہول نماند۔ پس ازاں کہ خود را گرد آوردہ ونفس راست کردہ خواہم زیست نیاز نامہائے عشقانہ من آں مایہ خواہد رسید کہ دفتر دفتر کاغذ پارۂ ہا فراہم خواہد شد۔ والسلام خیر ختام۔''[1]

انھیں مولوی سراج الدین احمد کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''دیگر ندانم کہ دران ہنگامہ برسرآن کاغذ پارہ ہا کہ فرستادۂ ایں داور بیگنہ کش بود چہ گذشت۔ اینقدر دانم کہ صاحب سکرتر بہادر مرا نزدخود خواند وگفت تجویز فرانسس ہاکنس بہادر در بارۂ پرورش شما بصدر منظور افتاد۔ فرمان منظوری عرض دریافت۔'' گفتم۔ آیا صاحب رزیڈنٹ بہادر چہ تجویز کردہ اند'' گفت قاعدۂ سابق را در مستقبل برقرار داشتہ اند۔''[1]

اس مضمون کو 'متفرقات' کے اس خط میں اس طرح ادا کیا گیا ہے:

''ندانم برسر رپورٹ چہ آید۔ یاد خواہد بود کہ فرد ملتمسات روز وداع بداور سپردہ آمدہ بودم وگزشتن آں را بہ معیت رپورٹ می خواستم۔ آن ہم ہمچناں مطمورہ نشین زاویہ عدم ماندیہ چہ دانم کہ درانجا بخت بدبامن کرد۔ این صاحب اسٹنٹ رسیڈنٹ مرا طلبید وگفت کہ مسٹر فرانسس ہاکنس صاحب بہادر رسیڈنٹ دہلی می فرمایند کہ تجویز کردیم وحکم دادیم کہ متعلقان نصراللہ بیگ

---

1 متفرقات غالب

خاں پنج ہزار روپیہ سالانہ موافق سند گزرانندۂ جاگیردار فیروز پور چنانکہ در ماضی یافتہ آمدہ اند در مستقبل می یافتہ باشند۔

فرورفتم واز حیرت جنوں کردم کہ این بندۂ خدا چہ می فرماید۔ این پنج ہزار روپیہ رامن خود بہ کونسل نشان دادہ وازین مقدار ناخوشنودی خود ظاہر ساختہ طالب فیصلۂ جدید بودہ ام۔ تجویز کونسل راچہ شد وفرمان دہان صدر راچہ پیش آمد۔ دہ ہزار روپیہ مندرجۂ تحریر کرنیل مالکم صاحب کہ برد۔

من وخدا اکنون از شش جہت درچارہ جوئی فراز وعالمی را با خویشتن ناسازمی بینم خواستہ ام کہ عرضداشت بنام نامی نواب گورنر جنرل بہادر بفرستم تا ترجمۂ آن بکونسل بگزرد وصاحبان صدر حال مرادریابند۔ امادرین امر عنایتی از جناب مولوی صاحب وقبلہ باید تا کارروان گردد۔ چوں می ترسم کہ دریں انجمن نیز بیدردی جگر تشنۂ خون من است، امید کہ خدمت حضرت مولانا از جانب خود بعرض رسانید کہ اسداللہ واجب الرحم است واستعداد غلامی وخدمت گزاری دارد۔ علی الرغم عدد سعی دراں باید فرمود کہ عرضداشت ومی مترجم بخط انگریزی گردیدہ بہ اجلاس کونسل بگذرد۔ بلکہ مبادی حال او را پارۂ بگوش صاحب سکرتر باید دمید تا نامرادی را بیاد آرند وختہ را بشناسند۔ فقط[1]

تغیر وترمیم کے اسباب: مذکورہ بالا تغیر وترمیم کی جملہ مثالوں پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس کے اسباب حسب ذیل تھے:

(1) اصلاح وتزیین عبارت۔

چونکہ مرزا صاحب نے اپنی زندگی میں ہی فارسی نثر جمع کی اور چھپوائی تھی اس لیے انھوں نے ان مسودوں پر جو ان کے پاس محفوظ تھے اصلاحی نظر ڈالنا ضروری سمجھا اور اپنے روز بروز ترقی پذیر ذوق ادب کے تحت الفاظ فقروں اور جملوں میں جگہ جگہ خوبصورت اور مناسب سیاق وسباق رد و بدل کردیا۔ یہی وجہ وہاں بھی کارفرما نظر آتی ہے جہاں 'متفرقات' کی کسی بڑی عبارت کی جگہ اس مفہوم کی مختصر عبارت 'پنج آہنگ' میں چھاپی گئی ہے کیونکہ ترقی پذیر ادیب کی حیثیت سے 'خیر الکلام ماقل ودل' پر عمل کرنا برابر ضروری ہوتا جارہا تھا۔

'متفرقات' کی مختصر عبارت کی 'پنج آہنگ' میں تفصیل کی علت بھی یہی اصلاح وتزیین

---

1. متفرقات 31 و 32

قرار دی جانی چاہیے کیونکہ وہ اشارے کنائے جو مکتوب الیہ کے لیے صراحت کا حکم رکھتے تھے عام مطالعہ کرنے والوں کے حق میں پہیلیاں بن سکتے تھے اور اس بنا پر یہی مناسب تھے کہ انھیں قدرے وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے۔

(2) اس حذف و اضافے کی دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مرزا صاحب نے یہ خط جس زمانے میں لکھے تھے اس وقت لوگوں سے جو تعلقات تھے وہ بعد میں نیک یا بدشکل میں بدل چکے تھے۔ پہلے کسی غرض سے وہ ایک شخص کے بارے میں برے الفاظ لکھ چکے تھے لیکن پھر اس سے یا اس کے متعلقین سے تعلقات خوشگوار ہو جانے کے باعث یہ نامناسب تھا کہ ان برے الفاظ کو منظر عام پر لایا جائے یا اس کے برعکس کسی فرد کے متعلق اچھے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ بعد میں تعلقات بگڑ گئے تو کم از کم یہ بہتر نظر آیا کہ اچھے لفظوں کی جگہ عام اور معمولی لفظ رکھ دیے جائیں۔ انگریز افسروں یا ہندوستانی بارسوخ افراد کے لیے سراہنا ضروری تھا بعد میں اپنی خودی نمایاں کرنے کی خاطر اس میں کمی درکار تھی۔ ادھر یہ لوگ 'اتراشحنہ' بن چکے تھے۔ اس بنا پر مادی نقصان کا خطرہ بھی نہ رہا تھا۔ پھر کیوں وہ انھیں اتنا اونچا کر کے پیش کرتے۔

(3) اس کی تیسری وجہ مرزا صاحب کی سہل انگاری بھی قرار دی جاسکتی ہے۔ اکثر ایسی صورت پیش آجاتی ہے کہ آپ نے کسی خط کا مسودہ صاف کیا تو صاف کرنے میں بھولے ہوئے لفظ بھی نہیں بلکہ کچھ اس وقت مناسب جاتے ہوئے الفاظ مبیضے میں بڑھا دیئے اور ان لفظوں کو مسودے میں نہیں لکھا۔

کبھی کبھی یہ اضافہ لانبے لانبے جملوں تک پہنچ جاتا ہے جس کی وجہ دراصل کسی نئے مطلب کا اضافہ ہوتا ہے۔

اس قسم کے اختلاف الفاظ وفقرات اور اضافوں کی مثالیں 'متفرقات' وغیرہ میں بھی معلوم کی جاسکتی ہیں۔ اگر مرزا صاحب مسودے کو مبیضے کے مطابق کر لینے کی زحمت گوارا کر لیتے تو کسی حد تک اختلاف کم ہوسکتا تھا۔

(4) چوتھی وجہ یہ بھی قرار دی جاسکتی ہے کہ مرزا صاحب کو بعد میں بعض واقعات کی جو تحقیق ہوئی اس کا تقاضا یہ ہوا کہ شائع کرتے وقت متعلقہ عبارت میں تغیر وتبدل کیا جائے تاکہ وہ اصحاب جن سے یہ امر علاقہ رکھتا ہو غلط صورت واقعہ کے پیش نظر مرزا صاحب سے ناراض نہ ہوں۔

نتیجہ بحث: اس سال ساری گفتگو کا حال یہ ہے کہ 'پنج آہنگ' میں چھپے ہوئے خطوط پر یہ یقین

کسی طرح نہ کرنا چاہیے کہ یہ الفاظ و مطالب کی ابتدائی شکل پیش کرتے ہیں۔

ان خطوط کی عبارتوں میں کئی وجھوں کے تحت مرزا غالب نے تغیر و تبدل کر دیا ہے۔ یہ تغیر و تبدل صرف الفاظ ہی کی حد تک عمل میں نہیں آیا ہے بلکہ مطالب و مقاصد بھی دانستہ بدل کر لکھے گئے ہیں۔

چونکہ غالب کے فارسی خطوط کا بڑا حصہ ابھی تک اپنی اصلوں سے جدا ہے اور اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں دانستہ و نادانستہ کتنی معنوی تحریف ہو چکی ہے اس بنا پر ان حضرات کو زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہیے جو اب تک مرزا صاحب کے فارسی خطوط کو ان کی سوانح عمری کا سب سے زیادہ قابل اعتماد مسالہ خیال کرتے ہیں۔

اس انکشاف کا تقاضا یہ ہے کہ فارسی خطوں کی اصلیں تلاش کرنے کی زیادہ کوشش کی جائے تا کہ ایک طرف تو یہ اندازہ ہو سکے کہ مرزا صاحب کے ذوق فارسی میں کب کب اور کیا کیا تغیر ہوا اور دوسری طرف ان کی سیرت کی تعین اور سوانح حیات کی ترتیب میں آسانی ہو جائے۔

امید ہے کہ 'غالب پسند' طبقہ اس تلاش میں مضمون نگار کی مدد فرمائے گا۔



ترجمہ منظوم

دعاء الصباح

غالب کی ایک نادر فارسی مثنوی کا مخطوطہ رام پور

تمہید

مرزا غالب مرحوم نے کلیاتِ فارسی کی ترتیب و طباعت کے بعد جس قدر فارسی اشعار لکھے تھے انھیں سبد چین کے نام سے اپنی زندگی میں شائع کر دیا تھا لیکن یہ تتمہ ان کے تمام تازہ شعروں پر حاوی نہ تھا۔ وہ قصیدے، قطعے اور رباعیاں جن کی نقول ان کے پاس محفوظ نہ تھیں، یا بروقت اشاعت کہیں سے دستیاب نہ ہو سکی تھیں اس مجموعے میں بار نہ پا سکیں۔ چنانچہ ایسی متعدد فارسی رباعیاں مکاتیب غالب میں[1] چھپ چکی ہیں۔ جو سبد چین کے پہلے اڈیشن میں نہیں ملتیں۔

برادر مکرم جناب مالک رام صاحب نے مکاتیب غالب کی اشاعت کے بعد سبد چین کا دوسرا اڈیشن شائع کیا، تو اس میں مکاتیب غالب کے حوالے کے ساتھ وہ فارسی اشعار بھی درج کر دیے۔ لیکن اب بھی میرزا صاحب کے فارسی کلام کا کچھ حصہ باقی ہے، جو یا تو ابھی تک شرمندۂ طباعت نہ ہو سکا اور یا اس کی شہرت نہ ہونے پائی۔ موخر الذکر صنف میں ان کی ایک فارسی مثنوی کا شمار ہو سکتا ہے، جو انھوں نے اپنے حقیقی بھانجے میرزا عباس بیگ صاحب اکسٹرا

---

[1] مکاتیب غالب میرزا صاحب کے ان غیر مطبوعہ خطوط کا مجموعہ ہے جو نوابان رام پور اور ان کے درباریوں کو مختلف اوقات میں میرزا صاحب نے لکھے تھے۔ یہ مجموعہ ایک مفصل دیباچے اور تشریحی حاشیوں کے ساتھ کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ (عرشی)

اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ کی فرمائش پر لکھی تھی۔ یہ مثنوی دعاء الصباح کا ترجمہ ہے جو امیر المومنین حضرت علیؓ بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔

نسخے کی کیفیت

اس مثنوی کا قلمی نسخہ کتاب خانہ رام پور کے ایک مجموعے میں مجھے دستیاب ہوا۔ جو 4:3/4x7:1/2 سائز کے 23 صفحات پر 1284ھ میں امروہہ کے ایک بزرگ محمد علی بن سید برخوردار علی نامی نے نقل کیا تھا۔

اس قلمی نسخے میں اصل دعا کا عربی متن سیاہ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ اس کے نیچے منثور فارسی ترجمہ شنگرفی روشنائی سے اور ترجمہ نثر کے نیچے منظوم ترجمہ، متن عربی کی ہم رنگ سیاہ روشنائی سے تحریر ہے۔ عبارت کے چاروں طرف قرمزی دہری جدول ہے اور متن عربی، ترجمہ نثر اور ترجمہ نظم کو باہم جدا کرنے کے لیے بھی قرمزی لکیریں کھینچی گئی ہیں۔ یہ کتاب مجموعے کے ورق 56 ب سے شروع ہو کر 67 ب پر ختم ہوتی ہے۔ لیکن کاتب مجموعہ نے ہر رسالے کے اوراق پر جداگانہ ہند سے ڈالے ہیں۔ کاغذ باریک یورپی ہے۔ کہیں کہیں پیوند کاری اور اکثر جگہ کرم خوردگی کے نشانات پائے جاتے ہیں۔

مثنوی کا آغاز مفاتیح النجات مصنفہ محمد باقر بن محمد مومن خراسانی السبز واری کے ایک اقتباس سے ہوتا ہے جس میں اس دعا کی فضیلت اور اس کے نام کا ذکر ہے اور کسی بزرگ کی زبانی یہ نقل کیا گیا ہے کہ میں نے امیر المومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قلم کا ایک سفینہ دیکھا جس کی تاریخ کتابت 25ھ تھی۔ اس میں درج تھا کہ یہ دعا مجھے رسول اللہ ﷺ نے تعلیم فرمائی ہے۔ تمہید کا عنوان اسناد دعاء الصباح ہے جو شنگرفی روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک دعا لکھی ہے، جو دعاء الصباح سے پہلے پڑھی جانا چاہیے۔ اس کا عنوان ہے **هذا الاعتصام یقرء سبع مرات** اور یہ بھی شنگرفی روشنائی سے لکھا گیا ہے۔

اس کے بعد دوسرے ورق کے دوسرے صفحے سے دعاء الصباح شروع ہوتی ہے۔ اس کے آغاز میں دعاء الصباح شنگرفی روشنائی سے ایک دہرے خط کے نیم شنگرفی نیم دائرے کے اندر لکھا گیا ہے۔ اس صفحہ پر جدولوں کے بالائی گوشوں میں دو شنگرفی چھوٹے چھوٹے دائرے بھی بنائے گئے ہیں۔

دعاء الصباح ورق 11 ب پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد 12 الف و ب پر امام زین العابدین بن علیہ السلام سے منقول دعا ایک اردو عنوان کے نیچے ترجمۂ نظم و نثر کے ساتھ درج ہے۔ اس کے خاتمے پر کاتب نے لکھا ہے:

> ''دعای ماثور و منقول از جناب امیر علیہ السلام مع ترجمۂ نثر و نیز ترجمہ منظوم مرزا اسداللہ خاں غالب موسوم بہ دعائی صباح حسب الایمای مرزا عباس بیگ صاحب اکسٹرا، اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ بہ مطبع منشی نول کشور رونق طبع یافتہ بود بست و سوم شہر رجب سنہ یکہزار و دو صد و ہشتاد و چہار — بندہ حقیر فقیر محمد علی بن سید برخوردار علی امروہوی نقل برداشت۔''

مندرجہ بالا عبارت کے جن الفاظ کے ذریعہ 1284ھ ظاہر کیا گیا ہے، یہاں غالبًا کاتب نے سال طباعت کتاب نقل کیا تھا لیکن بعد ازاں اس کو مٹا کر سال کتابت لکھا ہے۔ بہر حال اس سے اتنا یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمۂ منظوم میرزا عباس بیگ صاحب کی فرمائش پر منشی نول کشور کے مطبع لکھنؤ میں میرزا غالب (متوفی 1285ھ) کی زندگی میں چھپا تھا اور ان کے انتقال سے ایک سال تین مہینے کچھ دن قبل نسخۂ مطبوعہ سے اس کی نقل کی گئی ہے۔

کاتب کے خاتمے کے ظاہری الفاظ سے جو دراصل نسخۂ مطبوعہ کا خاتمہ ہے، یہ ترشح ہوتا ہے کہ دونوں ترجمے میرزا غالب کے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ صرف ترجمۂ منظوم میرزا صاحب کا ہے، نثر کا ترجمہ کسی عربی داں عالم نے کیا ہوگا، جس پر لفظی اصلاح ممکن ہے میرزا صاحب نے بھی دے دی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرزا صاحب زبان عربی کے ایسے ادیب نہ تھے کہ دعاء الصباح کی عبارت کا از خود ترجمہ کر لیتے۔ میرے اس خیال کی تائید خاتمہ کی عبارت کو بہ غور پڑھنے سے بھی ہوتی ہے۔ اگر دونوں ترجمے میرزا صاحب کے ہوتے تو عبارت یوں ہونی چاہیے تھی۔ ''معہ ترجمۂ نثر و ترجمہ منظوم از مرزا اسداللہ خاں غالب۔'' یقیناً خاتمہ نگار نے نیز کا اضافہ کر کے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اس عبارت میں صرف موخرالذکر فقرہ غالب سے متعلق ہے۔

مثنوی کا رتبہ

بہ لحاظ شعریت میرزا صاحب کی یہ مثنوی کوئی بلند پایہ نظم نہیں معلوم ہوتی۔ غالبًا اسی

باعث سے میرزا صاحب نے اس کا تذکرہ کسی جگہ نہیں کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے شاگرد رشید حالی مرحوم بھی یادگار غالب میں اس کا ذکر نہ کر سکے لیکن جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے، اس میں شبہ نہیں کہ میرزا صاحب نے اصل دعا کے مطلب اور مفہوم کو شعر فارسی میں پورا پورا ادا کر دینے میں کمال کر دکھایا ہے، حتیٰ کہ بہت سے فقروں کا ترجمہ اتنے ہی مختصر الفاظ میں کیا گیا ہے، جتنے مختصر الفاظ اصل عربی کے تھے اور شاید ہی کسی جگہ اصل عربی کا کوئی لفظ میرزا صاحب کے ترجمہ کی گرفت سے بچ نکلا ہو۔ مثلاً دعا کا ایک ٹکڑا ہے:

یا من ارقدنی فی مهاد امنه وامانه
وایقظنی الی ما منحنی به من منه واحسانه

اس کا ترجمہ میرزا صاحب کی زبان سے اس طرح ادا ہوتا ہے:

ای کہ در گہوارۂ امن و اماں — خواب را در چشم من کردی نہاں
باز چشم من بہ بیداری گشاد — سوے احسان و عطای کو بداد

یا مثلاً دعا کا فقرہ ہے:

واجر اللهم بهیبتک من آما فی ذرفات الدموع
وادب اللهم نزق الحرق منی بازمة القنوع

میرزا صاحب اس کا ترجمہ کرتے ہیں:

دایم از بیم خودت، اے کردگار! — اشک ہا از گوشۂ چشم بہار
سبکی نادانیم تادیب کن — از شکیبائی مرا تہذیب کن

لیکن بعض ان مقامات پر جہاں اصل عربی الفاظ زیادہ مطالب پر حاوی تھے، میرزا صاحب کو ایک یا دو توضیحی شعروں کا اضافہ بھی کرنا پڑا ہے۔ مثلاً دعا کا فقرہ ہے:

یا من قرب من خطرات الظنون وبعد عن ملاحظة العیون

میرزا صاحب فرماتے ہیں:

ای کہ نزدیکی بہ خطرات ظنوں — دور تر ہستی ز دیدارِ عیوں
یعنی از دیدہ شدن ذاتش بری ست — برکرانہ از جہات پیکری ست
گوہر او از پس و پیش است پیش
کرد ہستی را محاطِ علم خویش

اسی طرح جہاں میرزا صاحب کو اپنے ذاتی تاثرات کے اظہار کا مناسب موقع ملا ہے، وہاں بھی متعدد شعر بڑھائے ہیں۔ مثلاً دعاء کا فقرہ ہے:

وبابک مفتوح للطلب والوغول

باب تو مفتوح باشد جاوداں بر رُخِ خوانندہ و ناخواندگاں

طالبان و ہم طفیلی آشکار بر در بکشادہ ات یا بند باد
ہر کہ می خوانیش، می آید بزود وانکہ نا خوانیش نیز آید فرود
ایں درت بر روی کس بستہ نیست خواندہ و ناخواندہ، جود اینجا یکیست
از کمالِ جود تو ایں فتحِ باب تا ہمہ گردند از تو بہرہ یاب
بخشش خود را تو زنجیرِ دراز بر کشیدی، ای خدای بے نیاز
خود نمی بندی درت بر روی کس جز برحمت می نہ بینی سوی کس
لطفِ تو عام است و ہرگز نیست خاص دور تر رفتہ ازیں در اختصاص
بستہ نبود بررخ کس باب تو ہر کسی رخشاں بود از تابِ تو
ابرِ تو ریزد بہر دامن گہر ہر کسی را فیض تو آید ز در

ممسکی و بخل درتو یافت نیست
آنکہ در ہستی بود بی بہرہ کیست

اگرچہ ان اشعار اور اسی قسم کے بعض اور شعروں میں نسبتاً زیادہ لطف پیدا ہوگیا ہے، لیکن یہاں بھی شاعر کی فکر اصل الفاظ کی قید سے مطلقاً آزاد ہوکر پرواز نہیں کرسکی ہے۔ اس لیے میرزا صاحب کی دوسری فارسی مثنویوں کے حمد یہ مناجاتی اشعار جیسی والہانہ کیفیت ان میں نہیں پائی جاتی۔

بہرحال یہ مثنوی اس لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے ذریعے سے ہمیں ہندوستان کے ایک مشہور شاعر کے ترجمے کی کوشش کا علم ہوتا ہے۔ چونکہ مطبع نول کشور سے اس کا کوئی مطبوعہ نسخہ دستیاب نہ ہوسکا اور نہ کسی کتاب خانے کی فہرست میں اس کا ذکر نظر سے گزرا، اس لیے میں نے کچھ اس دل چسپی کی بنا پر جو مجھے میرزا صاحب کی شاعری سے ہے اور زیادہ تر مالک رام صاحب کے اصرار پر جو سبد چین اور ذکر غالب وغیرہ کے ذریعے "غالب نوازی" کا ثبوت دے چکے ہیں، اس نظم کو شائع کردینا مناسب خیال کیا۔

اس میں شک نہیں کہ میرزا صاحب کے ترجمے کی خوبی اسی وقت اچھی طرح منکشف ہوسکتی تھی کہ اس کے ساتھ عربی دعا بھی چھاپی جاتی، لیکن عربی ادب کے ساتھ دل چسپی اس قدر کم ہو چلی ہے کہ مجھے خطرہ ہوا، مبادا ارباب ذوق کی نازک طبیعتوں پر میری یہ جرأت بار گزرے، اس لیے صرف ترجمے کی اشاعت پر اکتفا کی گئی۔ اگر حالات نے مساعدت کی اور کبھی اس مثنوی کی طباعت بہ شکل کتاب ممکن نظر آئی تو اسی طرح چھاپی جائے گی جیسے مطبع نول کشور میں میرزا صاحب کی حیات میں چھپی تھی۔

اصلاح متن

آخر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ میرزا صاحب کے اس ترجمۂ منظوم کی نقل میں کاتب نے متعدد غلطیاں کی تھیں۔ چونکہ محل و موقع سے ان کے خلاف شہادت بہ سہولت دستیاب ہوتی تھی، اس لیے میں نے زیر نظر متن میں ان کی تصحیح کر کے حاشیے میں اصل کا لفظ لکھ دیا ہے تا کہ مطالعہ کرنے والوں کو آزادانہ رائے قائم کرنے کا موقع ملے۔

یہاں مثال کے بہ طور ایک غلطی کا تذکرہ کرتا ہوں۔ قلمی نسخے میں ایک شعر اس طرح لکھا ہے:

ہر کرا خواہی، تو روزی می دہی　　بیش از انداز و مقدارش دہی

ظاہر ہے کہ اگر اس شعر میں دہی کو ردیف قرار دیا جائے تو قافیہ ندارد ہے۔ اور اگر اس کو قافیہ مانیں تو چونکہ لفظاً و معناً قافیہ دونوں مصرعوں میں ایک ہے، اس لیے تکرار قافیہ لازم آتی ہے جو ایک شعر کے اندر واقع ہونے کی وجہ سے الطای جلی کی کھلی ہوئی مثال ہوگی۔

میرے عقیدے میں میرزا صاحب سے اس قسم کی غلطی کے سرزد ہونے کا امکان ہی نہیں، اس لیے میں نے اس کو کاتب کی تصحیف پر محمول کیا ہے اور مصرعۂ ثانی کے الفاظ ''مقدارش'' کو ''مقداری'' بنایا ہے تا کہ دہی ردیف اور می اور مقداری قافیہ بن جائیں چونکہ خط شکست میں ''مقداری'' کی ی کو ش پڑھا جاسکتا ہے جس کا تجربہ ہر ادیب کو ہوگا، اس لیے مجھے یقین ہے کہ اس ادبی جرأت کو ارباب فن قبول فرمائیں گے اور میرزا صاحب کے مذکورہ شعر کو اس طرح پڑھیں گے:

ہر کرا خواہی تو روزی می دہی　　بیش از انداز و مقداری دہی

دعاء الصباح

ای خدا ای داوری[1] کو برکشاد از درخشیدن زبانِ بامداد
پاره هایٔ تارِ شب را آفرید پرده هایٔ تارِ ظلمت درکشید
کرد صنعِ چرخِ گرداں استوار در مقداویر تزین آشکار
ای خداوندی که تاب آفتاب کرد یکجا با فروغ التهاب
چهرۂ مهر درخشان برفروخت باہمہ تابش در آتش رخت سوخت
ای که ذاتش را بذاتش رہبری گشت از ہمجنسی عالم بری
در جہاں ہستیش[2] ہمجنس کیست ہیچ مخلوقی بدو ہمجنس نیست
برتر از کیفیت آمد گوہرش کیفیت ہا نیستی گیرد برش
ای که نزدیکی بخطرات ظنون دورتر ہستی ز دیدارِ عیون
یعنی از دیده شدن ذاتش بری است بر کرانه از جہات پیکری است
گوہر او از پس و پیش است بیش کرد ہستی را محاط علم خویش
ہرچہ در عالم بہ ہستی رو نمود پیش از ہستی بعلم او کشود
ای که در گہوارۂ امن و اماں خواب را در چشم من کردی نہاں
باز چشم من بہ بیداری کشاد سوی احسان و عطائی کو بداد
دست او بربست دستِ ہر زیاں قدرتِ او ازبدی دادم اماں
بر فرست ای داورِ ہستی! درود بر کسی کو سوی تو را ہم نمود،
در شبِ تاریک تر شد رہنما سوی درگاہِ تو اے گیتی خدا!
از سبب ہائی تو، ای رب الامیں! از شرف گیرندۂ حبل[3] المتین
آں فروزاں گوہری ویژه نژاد آنکہ بر دوش بلندی پا نہاد
آنکہ آمد در نخستیں روزگار پای او بر جای لغزاں استوار

---

[1] اصل: داور [2] اصل: ہستی اش۔ چونکہ میرزا صاحب نے سرور کے نام کے خط میں تصریح کردی ہے کہ بجز اس لفظ کے جس کے آخر میں ہ ساکن ماقبل مفتوح ہو اور عام الفاظ کے ساتھ ت، م، ش، ملا کر لکھے جاتے ہیں، بنابریں یہاں بھی تین میں ملا کر لکھا گیا ہے۔ [3] اصل: الوطین

نیز بر آلش کہ از بس طاہر اند — پاک دین و برگزیده ظاہر اند

نیک کرداراں و یزداں برگزیں — برگزیده گوہرانِ پاک دیں

ای خدا! بکشا مصاریع الصباح — از برای ما، بمفتاح الفلاح

یعنی ای داوار گیتی دادگر! — برکشا بر ما تو درہای سحر

از کلید لطف درہا بازکن — بہرما سامانِ رحمت سازکن

بہتریں پیرایۂ رُشد و سداد — در برم پوشاں تو ای رب العباد

برنشان بر من ینابیع الخشوع — از روانم کن رواں عین الخضوع

پیشگاه عظمت ای بی نیاز! — کن رواں از چشم من آبِ نیاز

دایم از بیم خودت، ای کردگار — اشکہا از گوشۂ چشمم ببار

سکیِ نادانیم تادیب کن — از شکیبائی مرا تہذیب کن

گر نباشد از تو آغازِ کرم — ورنہ توفیقِ تو باشد رہبرم

کس نیارد بردنِ من سوی تو — در کشاده تر رہی در کوئی تو

گر مرا حلم تو بسپارد بہ آز — برکشد زنجیرۂ حرصم دراز

کس نیامرزد گناہم، اے خدا! — سرنگون افتادنِ من در ہوا

نصرتِ تو گر مرا ناید[1] معیں — گاهِ جنگ نفس و شیطانِ لعین

ایں چنیں خذلاں بحرمانم کشد — در ہمہ رنج و تعب جانم کشد

خود مرا می بینی، اے ہستی خدا — کامدم سویت بامید و رجا

دست پیوستم باطراف الحبال — چون گنہ افگند دورم از وصال

چون بدوری درشدم از بارگاه — زانکہ چیره شد بمن دستِ گناه

زشت مرکوبی کہ نفسِ من برآں — از ہوا و حرص شد دایم رواں

واہ! از تسویلِ نفس ذو فنون — کاں بود از آرزوہای و ظنون

آه! زاں خواہش کزو برخاستہ — آرزوہا آردش آراستہ

ہر زماں گامی بہر سویش برد — فرش خواہشہا بہر سو گسترد

بردرازی ہا کشد طولِ امل — تا بدوری افتد از حسنِ عمل

---

[1] اصل نیابد:

نیست ناداں، نفس فرماں ناپذیر — کو بود پیش خداوندش دلیر
جرأت و گستاخی و عصیان کند — سرکشی از طاعت یزداں کند
ای خداوندا! من از دست رجا — کوفتم دروازۂ رحمِ ترا
سوی تو بگریختم با اضطرار — از وفورِ خواہش نا استوار
دررسن ہای تو، ای گیتی خدا! — باز پیوستم سرانگشت ولا
درگزار[1] از من تو، ای رب الورا — ہرچہ کردم از گناہ و از خطا
لغزشی کز من بیاید آشکار — درگزار از من تو، ای پروردگار!
عفو کن افتادنِ من در بلا — بازد از ہر چہ زاید زاں عنا
زینکہ ہستی سرور و معبودِ من — غایتِ ہر خواہش و مقصود من
در زمانِ ہر کجا گردید نم — نیز در ہنگامِ آرامیدنم
خود چہ ساں میرنی ای پروردگار — بے نوائی کامدت با اضطرار
یعنی آن مسکین کہ آوردست رو — باہمہ صد ناشکیبی، سوی تو
از گناہ خود گریزاں آمدہ — و ز خطای خود پشیماں آمدہ
رہ پژوہی را کہ خواہد راہِ تو — قصد او باشد ہمہ درگاہِ تو
سوی درگاہِ تو باشد تیز گام — میکنی دورش چرا از راہِ کام؟
تشنہ را باز میداری چرا؟ — آنکہ سوی حوضِ تو شد رہ گرا
آب جویاں آمدہ بر چشمہ سار — تا لبِ خود تر کند زان آبشار
زینہار ایں حوضِ تو پر از زُلال — پر بود ہنگامِ قحط و خشک سال
باب تو مفتوح باشد جاودان — بر رُخِ خواہندۂ ناخواندگان
طالبان و ہم طفیلی آشکار — بر در بکشادہ ات یا بند یار
ہر کہ میخوانیش می آید بزود — وانکہ ناخوانیش نیز آید فرود
ایں درت برروی کس بربستہ نیست — خواندہ و ناخواندہ، جوداینجا یکیست
از کمال جود تو ایں فتحِ باب — تا ہمہ گردند از تو بہرہ یاب
بخششِ خود را تو زنجیرِ دراز — برکشیدی، ای خدای بے نیاز

1. اصل: گذار۔ لیکن یہ میرزا صاحب کے املا کے خلاف تھا۔ اس لیے اصلاح کردی گئی ہے۔

خود نمی بندی درت بر روی کس — جز برحمت می نہ بینی سوی کس
لطفِ تو عام است و ہرگز نیست خاص — دور تر رفتہ ازیں در اختصاص
بستہ نبود بر رُخ[1] کس بابِ تو — ہر کسی رخشاں بود از تاب تو
ابر تو ریزد بہر دامن گہر — ہر کسی را فیض تو آید ز در
ممسکی و بخل در تو یافت نیست — آنکہ در ہستی بود بی بہرہ کیست
غایتِ مامول و مسئولم توئی! — آخرِ مقصود و ما مولم توئی!
ایں زمام نفسِ خود را، ای خدا — کردہ ام بربستۂ بندِ رضا
مرکب نفسم کہ از بس سرکش است — ہر زماں سر برفلک چوں آتش است
با رضایت کردہ ام فرماں پذیر — تا بود در محبس فرماں اسیر
ہر چہ ریزندش، ہمہ گیر و بسر — سر نتابد از قضا و از قدر
ہرچہ پیش آیدش، گیرندہ شود — ہرچہ بدہندش پذیرندہ شود
گر ہمہ تلخی پذیرندش بکام — در کشد یکسر، چناں کز شہد جام
خواہش خود را نیاید بے نشاں — خواہش تو پیش گیرد جاوداں
از گناہم بود بس بارگراں — رافت و رحم تو کردش بے نشاں
بی نشانش کردم از الطاف تو — ساختم معدومش از اعطاف تو
واین ہوای نفسِ من گمراہ کن — از طریقِ راستی بیراہ کن
سوی لطف و رافتت بسپردمش — سوی غفاری و عفوت بردمش
ای خدا! برمن بیار ایں بامداد — با فروغ راستکاری و رشاد
واین سحر را کن تو، ای پروردگار — از برای دین و دنیا پاسدار
شام گاہم را بکن بہرم سپر — از فریب دشمنان کینہ ور
نیز آں شامِ مرا کن پاسدار — از ہوا و ز مہلکات روزگار
باشدت، بر ہرچہ می خواہی تواں — ہر کرا خواہی، دہی ملک جہاں
ملک خود را باز بستانی ہمیں — از کسے کش خواہش کردن چنیں
ہر کرا خواہی، تو عزت میدہی — ہر کرا خواہی، تو ذلت میدہی

[1] اصل: بستہ نبود بر رخ آہ۔

نیکی و خوبی ہمہ در دستِ تست   ہرچہ باشد ہستیش پا بستِ تست

بر ہمہ ہستی توانائی تراست   دیگری را ایں توانائی کجاست؟

شب درونِ روز می آری ہمیں   باز روز آری درون شب چنیں

تو برآری زندہ را از مردہ تن   می برآری مردہ از زندہ بدن

خوں ز جسم و جسم را از آب خوں   از توانِ خود ہمی آری بروں

بیضۂ از مرغ و مرغ از بیضہ ہا   می برآری تا شود ہستی گرا

یا ز نادانی، خدا را ناشناس   عالمی یزدان ستاوَ باسپاس

باز از دانا تو ناداں آوری   کوبدوری افتد از دانش وری

ہر کرا خواہی تو روزی می دہی   بیش از انداز و مقدارش دہی

ہرچہ خواہد عفوِ تو خود آں کند،   چارۂ آں جرم و آں عصیاں کند

بر ز داید ہرچہ کردم از گناہ   برکرانم آرد از کارِ تباہ

لطف او نگز اردم دربند آز   تا نمانم بستۂ بند نیاز

جز تو معبودی نشد ہستی گرا   بہر تو آریم تسبیح و ثنا

مر ترا دایم ستایش گستریم   در ستایشہا نیائش آوریم

کیست آں کو داندت حکم و تواں   پس نیاید بیم تو او را بجاں؟

کیست آں کو انچہ ہستی داندت   پس ز تو نا ترسد و نا خواندت؟

از توانِ تست تالیف الفرق   باشد از رحمِ تو یفلق الفلق

فرقہ ہائے مختلف یکجا کنی   صبح را از تار شب پیدا کنی

تار شب را ساختی رخشندہ رخت   آب را کردی رواں از سنگ سخت

آب را کردی دو گونہ آشکار   یک بود شور و دگر شیریں گوار

از فشارندہ کہ آں باشد سحاب   خود فرود آوردۂ ریزندہ آب

ساختی خورشید و مہ را آشکار   درجہان مثل چراغ نوربار

بی ازاں کز احتمال رنج و درد   ماندگی آید ترا از کار کرد

ای یگانہ! باہمہ عز و بقا   بندگاں را پست کردی از فنا

ای خدائی پاک و ای رب ودود!   از فرازیں برفرود آورد رود!

بر محمد مصطفےٰ و آلِ او — آں گزیدہ گوہرانِ پاک خو!
بشنو آوازم، پذیراکن دعا — دشمنانم را گزیں بہر فنا
از کرم، امیدِ من کن استوار — ای کہ خوانند ت پیِ کشفِ ضرار
ای بعسر و یسر مامولِ ہمہ! — وی ز تو انجاح مسئول ہمہ!
حاجتِ خود پیش تو آوردہ ام — ناگزیری بر تو عرضہ کردہ ام
پس ز ناکامی نگر دانم ز جود — از گزیدہ بخششِ خود ، ای ودود!
ای دہشور، ای دہشور مہرباں! — مہربان تر از ہمہ رحمت کناں!
یا الٰہی! قلب من محجوب و تنگ — عقل من مغلوب و نفس من بہ تنگ
حرص من بوداست برمن چیرہ دست — کثرت عصیان و طاعت اندک است
معترف آمد زبانم در ذنوب — چیست تدبیر من؟ علام الغیوب؟
ای گنہ آمرز وستار العیوب! — عفو کن از من بہ بخشایم ذنوب
ای بہنگام عقوبت سخت گیر — وی بحلم و مغفرت پوزش پذیر!
حاجت من بہر قرآن کن روا! — وز برائے حضرتِ خیرالورا!

ای خدا، از آسماں آور فرود!
بر نبی و آل اطہارش درود!



[1] یہاں سے امام زین العابدین علیہ السلام کی مناجات کا ترجمہ شروع ہوتا ہے۔ (عرشی)

دلی کے چند مشاعروں کی کہانی، غالب کی زبانی

دہلی کے جن مشاعروں میں میرزا صاحب نے شرکت کی ہے ان میں شہر اور قلعۂ معلیٰ دونوں کے مشاعرے نظر آتے ہیں۔ان کی تفصیل یہ ہے:

(1) ایک مشاعرہ جمعے کے دن 17 مارچ 1843 کو منعقد ہوا تھا۔ میرزا صاحب نے اس کی روداد پنجشنبہ 23 مارچ کو شیفتہ کے خط میں اس طرح لکھی ہے:

> ''روز آدینہ چوں شب شد، بزمِ سخن آراستند۔ ازاں رو کہ غزل نگفتہ بودم از شرمِ تہی دستی سر در پیش داشتم و رفتن بہ انجمن مضمونی بود کہ ہرگز بخاطرنمی گذشت، والا جاہ نواب ضیاء الدین خاں سلمہ اللہ تعالیٰ دو فرشتہ برمن گماشت: زین العابدین خاں عارف وغلام حسن خاں محو۔ یعنی ایں ہر دو ابرام پیشہ شام گاہ بخلوت کدۂ تنہائی من آمدند وفیل آوردند و بدانساں کہ شیر را چون شکار کنند، برفیل بار کنند، مرا بہ انجمن بردند۔ دیدار مخدوم معظم وصدر اعظم مولوی محمد صدرالدین خان بہادر تلافی رنجِ راہ کرد۔ باری صرفۂ رہ رواں دراں بود کہ مولانا صہبائی قدم رنجہ فرمودہ بودند۔ غزلِ مولانا صہبائی در زمینِ طرحی دو سہ بیت دل نشیں داشت۔
>
> بالجملہ چوں غزل خوانی سر آمد ''گریبانم نمی آید و دامانم نمی آید'' در بحرِ ہزج مثمن سالم، طرح کردند۔
>
> از یاران بندہ میرزا زین العابدین خاں عارف وجواہر سنگھ جوہر در زمینِ طرح دو غزل خواندہ نقشِ نغز گوئی بہ کرسی نشاندند۔ من بغزلے کہ ہمدراں روز گفتہ بودم، زمزمہ سرا آمدم، غزل:

تحریک، دہلی، فروری 1963

صبح شد، خیز، کہ روداد اثر بنمایم

(کلیاتِ نثر: پنج آہنگ، ص 201)[1]

اس مشاعرے کے مصرع طرح کا ذکر میرزا صاحب نے نہیں کیا ہے۔

(2) دوسرا مشاعرہ جمعے کے دن (غالباً 28 اپریل 1843 کو) منعقد ہوا تھا۔ طرح سابق مکتوب میں بیان کی جا چکی ہے۔ اس زمین میں میرزا صاحب نے بھی غزل لکھی تھی۔ شیفتہ کو اس کی کیفیت اس طرح لکھی ہے:

''دی کہ ناہید روز بود، شامگاہ بہ بزمِ حضرتِ آزردہ باریافتم۔ پیش ازاں کہ از مدعا سخن رانم، اثر رنجوری از ناصیۂ مخدوم آشکار یافتم۔ نزلہ و زکامے داشتند۔ ہمانا زندہ داشتن شبہا بدیں روز نشاندہ بود۔

بالجملہ بمشاعرہ نخر امیدند و رہی را دستوری دادند۔ درانجمن ریختہ گویاں، بسیار گرد آمدہ بودند۔ غزلہائے دراز خواندند۔ تابکاشانہ آیم و پہلو بہ بستر نہم، نیمۂ از شب گذشتہ بود۔

بالجملہ درنورد غزل خوانی چون نوبت بہ من رسید، نخست ''ملک نخواست و فلک نخواست'' سرودم۔ آنگاہ غزل طرحی خواندم۔

غزل: چہ عیش از وعدہ چوں باور ز عنوانم نمی آید

بنوعے گفت ''می آیم'' کہ می دانم نمی آید

1۔ جمعہ کے دن، رات ہو جانے پر، بزمِ سخن آراستہ کی گئی۔ میں نے چونکہ غزل نہیں کہی تھی اس لیے شرم تہی دستی سے سر جھکائے ہوئے تھا اور جا کر شریکِ بزم ہونا ایک ایسا خیال تھا جو ہرگز دل میں نہیں گزر سکتا تھا۔ والا جاہ نواب ضیاء الدین خاں سلمہ اللہ تعالیٰ نے دو فرشتے مجھ پر مقرر کیے، زین العابدین خاں عارف اور غلام حسین خاں محو۔ یعنی یہ دونوں ابرام پیشہ شام کے وقت میرے اکیلے گھر پر آئے اور ہاتھی ساتھ لائے اور جس طرح شیر کو شکار کر کے ہاتھی پر لادتے ہیں مجھے مشاعرے میں لے گئے۔ مخدومِ معظم مولوی صدر الدین خاں بہادر صدر اعظم کے دیدار بہجت آثار نے راستے کی تکلیف کی تلافی کر دی۔ بارے یہ مہلت غنیمت تھی کہ مولانا صہبائی نے آنے کی تکلیف نہیں فرمائی تھی۔ طرحی زمین میں مولانا صہبائی کی غزل دو تین پسندیدہ شعروں کی حامل تھی۔

فی الجملہ، جب غزل خوانی ختم ہوئی ''گریبانم نمی آید و دامانم نمی آید'' بحرِ ہزج مثمن سالم میں، مصرع طرح مقرر کیا گیا۔

راقم الحروف کے دوستوں میں سے میرزا زین العابدین خاں عارف اور جواہر سنگھ جوہر نے طرحی زمین میں غزلیں پڑھیں اور نغز گوئی کا سکہ جما دیا۔ میں نے غزل، جو اسی روز کہی تھی، پڑھی۔

نہاں مباد کہ اقبال نشاں، محمد ضیاء الدین خاں بہادر مصرع عرفی، ع:

صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

طرح فرمودہ اند۔ درین زمین طالبؔ آملی قصیدہ دارد و عرفیؔ شیرازی دو غزل

تا غالبؔ بے نوا را بکدام زمزمہ در خروش آرند؟''[1]

(کلیاتِ نثر، پنج آہنگ، ص 201)

(3) تیسرا مشاعرہ بھی جمعے کے دن (26 مئی 1843 کو) منعقد ہوا تھا۔ مصرعہ طرح پر میرزا صاحب نے پورا قصیدہ لکھا تھا جو ان کے کلیات میں چھپ چکا ہے (کلیات غالب، ص 203) شیفتہؔ کو اس کی روداد بھی لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

''امید گاہا!

دی آدینہ روز بود، و نوید بزم سخن سامعہ افروز، شامگاہ ہماں دو فرخ سروش از در در آمدند، و مرا بہ انجمن بردند، و میر نظام الدین ممنونؔ و مولوی امام بخش صہبائی چوں رنجور بودند، نیامدند۔ کس بخدمت حضرتِ آزردہ فرستادہ شد، اگر چہ دیر آمدند، اما آمدند و دلم را صفا و زبانم را نوا بخشیدند۔ بندہ را در زمین ''گریستن'' نگارشِ قصیدہ اتفاق افتادہ بود۔ آں می سنجیدم کہ ایں ورق را چوں برات نامقبول باز برم، و ریختہ گویاں را دردِ سر ندہم۔ از آمدنِ حضرتِ آزردہؔ دل بخود بالید و زباں بزمزمۂ دستوری یافت۔ سحابی نیز ناخواندہ حاضر بود و در

---

[1] کل، کہ جمعہ کا دن تھا، شام کے وقت، حضرتِ آزردہؔ کی محفل میں باریابی پائی۔ اس سے پہلے کہ عرض مدعا کروں، میں نے موصوف کی پیشانی پر طبیعت کی ناسازی کا اثر ظاہر دیکھا، نزلے زکام میں مبتلا تھے۔ اسی شغلِ شب زندہ داری نے اس دن کو پہنچایا تھا۔

بہر صورت مشاعرے میں تشریف نہیں لائے، فدوی کو اجازت دے دی۔ بزم میں ریختہ گو بہت جمع ہو گئے تھے۔ لمبی لمبی غزلیں پڑھیں۔ جب تک میں گھر آ کر بستر پر لیٹوں، آدھی رات گزر چکی تھی۔ فی الجملہ غزل خوانی کے دوران میں جب نوبت مجھ تک پہنچی، پہلے میں نے ''ملک نخواست'' اور ''فلک نخواست'' کے ردیف قافیے والی غزل پڑھی، پھر طرحی۔

مخفی نہ رہے کہ اقبال نشاں، محمد ضیاء الدین خاں بہادر نے مصرعہ عرفی ''صد سال می تواں بہ ''تمنا گریستن'' کو مصرعِ طرح قرار دیا ہے۔ اس زمین میں طالبؔ آملی کا ایک قصیدہ اور عرفیؔ شیرازی کی دو غزلیں موجود ہیں۔ پھر غالبِ بے نوا کو کس پیرائے میں طبیعت کی جولانی دکھانے کو کہا جا رہا ہے؟

زمینِ گریستن غزل انشا کردہ۔ چوں قصیدۂ مرا شنود، خجل شد و از گفتۂ خود لختے خواندہ درگذشت۔"[1] (کلیاتِ نثر، پنج آہنگ، ص 202)

(4) چوتھا مشاعرہ غالباً جمعہ کے دن 23 جون 1843 کو منعقد ہوا تھا۔ اس کے لیے میرزا صاحب نے غزل لکھ لی تھی، مگر شریک نہ ہو سکے۔ شیفتہ کو تحریر کرتے ہیں:

"دریں مشاعرہ کہ گذشت، خاک زمیں گیرِ من، غبارِ چشمِ ریختہ گویاں نہ گشت۔ غزل خود یک ہفتہ پیش از روزِ غزل خوانی گفتہ، بخدمتِ حضرت آزردہ، دام بقاؤہ، فرستادہ ام و سرآں داشتم کہ چوں بنامہ کامیاب گردم و آں را پاسخ نگار شوم، در نگارشِ ہمان غزل سرمایۂ من باشد۔"[2]

(کلیاتِ نثر، پنج آہنگ، ص 202)

اس ماہانہ مشاعرے کی جائے وقوع اور منتظمین کا صراحتاً تذکرہ مذکورہ خطوں میں نہیں پایا جاتا لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیر کے زیرِ اہتمام منعقد ہوتا تھا۔ عارف و مجرو وغیرہ اس کے انتظام کے ذمہ دار تھے۔ ہر مہینے کا آخری جمعہ اس کے لیے مقرر تھا اور اس میں اردو اور فارسی دونوں طرحیں دی جاتی تھیں۔

لال قلعے میں جو مشاعرے کیے گئے تھے، ان میں سے حسبِ ذیل کا تذکرہ میرزا

---

1. کل جمعے کا دن تھا اور نوید بزمِ سخن سامعہ افروز ہو چکی تھی۔ شام کے وقت وہی دو خجستہ پے ہاتف دروازے سے اندر آئے اور مجھے بزم میں لے گئے۔ میر نظام الدین ممنون اور مولوی امام بخش صہبائی چونکہ بیمار تھے، نہیں آئے۔ کسی کو حضرتِ آزردہ کی خدمت میں بھیجا گیا۔ دیر سے آئے لیکن آگئے اور میرے دل کو جلا اور زبان کو گویائی بخشی۔ راقم الحروف کو "گریستن" کی زمین میں قصیدہ لکھ لینے کا اتفاق ہوا تھا۔ میں خیال کر رہا تھا کہ اس ورق کو براتِ نامقبول کی طرح واپس لے جاؤں اور ریختہ گویوں کو دردِ سر میں مبتلا نہ کروں۔ حضرتِ آزردہ کے آجانے سے دل بڑھا اور زبان نے اذنِ زمزمہ پیرائی پایا۔ سحابی بھی بن بلائے موجود تھا اور "گریستن" کی زمین میں غزل (بھی) لکھی تھی۔ جب میرا قصیدہ سنا تو شرمندہ ہوا اور اپنے کہے ہوئے میں سے تھوڑا سا پڑھنے پر ہی اکتفا کی۔

2. اس مشاعرے میں جو گزر چکا، میری خاکِ زمین گیر، ریختہ گویوں کی آنکھ کا غبار نہ بنی۔ میں اپنی غزل، مشاعرے کی تاریخِ انعقاد سے ایک ہفتہ پہلے کہہ کر، حضرت آزردہ دام لقاؤہ کی خدمت میں بھیج چکا ہوں اور میرا خیال تھا کہ جب آپ کے خط سے سرفراز ہوں گا اور اس کا جواب لکھوں گا تو خط میں یہ غزل ہی میرا سرمایۂ تحریر ہوگی۔

صاحب کے خطوں میں ملتا ہے۔

(1) پہلا مشاعرہ کسی شاہزادے کے زیرِ اہتمام منعقد ہوا تھا۔ اِس میں میرزا صاحب نے اردو غزل پڑھی تھی۔ 16 ربیع الاوّل (1264ھ) مطابق 22 فروری (1848) کو منگل کے دن منشی نبی بخش کو اس کی روداد لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

''دوش، یکے از شاہزادگان تمر خانیہ بزمِ سخن آراستہ بود، و سخن سنجاں را بہ غزل خوانی خواندہ، مرا کہ بہ گفتنِ ریختہ سری نماندہ، اگر چہ دل بہ سگالش نہ بستہ بودم، لقا روز یکہ شب بداں انجمن بایست رفت، خاصہ ہنگامے کہ سوارۂ رہ می بریدم، بیتے چند، بے خواست از دلِ غمزدہ سر برزد۔'' [1]

(کلیاتِ نثر، پنج آہنگ، ص 217)

(2) دوسرا مشاعرہ شوال 1265ھ (اگست 1852) میں مرزا نورالدین بہادر متخلص بہ شاہی نے منعقد کیا تھا۔ اس میں میرزا صاحب نے ردیف نون کی بے نظیر طرحی غزل ''سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں'' پڑھی تھی اور منشی نبی بخش کو اس کی نقل روانہ کرتے ہوئے لکھا تھا ''خدا کے واسطے! غزل کی داد دینا۔ اگر ریختہ یہ ہے تو میر و میرزا کیا کہتے تھے؟ اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے؟'' (نادراتِ غالب؟ ص 26)

(3) تیسرا مشاعرہ آخری تاجدار دہلی کے حکم سے جمعے کے دن 25 فروری 1853 کو منعقد ہوا تھا، میرزا صاحب اس زمانے میں زمرۂ خدام میں منسلک تھے، اس لیے اردو میں زمزمہ سرائی کی تھی۔ مجروح کو اس کی پوری تفصیل لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

''نزدیکاں را نشاط و دوراں را بشارت کہ شاہ فرمان داد و حاجبِ بارگاہ سخن گستراں را ایوانِ نظارت نشاں داد کہ روزِ آدینہ بست و پنجم فروری، بداں خجستہ نشیمن بیایید و جامِ سخن بریک دگر پیمایید۔ گروہے از شہزادگانِ بابریہ و تنے چند از آزادگانِ شہر فراہم آمدند۔ جا بر مردم تنگی گرد، گوئی پیکر اندر پیکر ہمی خزید۔''

---

[1] کل تیمور خانی شہزادوں میں سے ایک نے بزمِ سخن آراستہ کی تھی اور سخن سنجوں کو غزل خوانی کی دعوت دی تھی۔ میں نے کہ اب ریختہ گوئی کا خیال چھوڑ چکا ہوں، اگر چہ دل کو فکرِ سخن پر آمادہ نہ کیا تھا، لیکن جس دن رات کو مشاعرے میں جانا تھا، عین راستہ چلنے کے دوران میں، چند شعر، بلا خواہش، غمزدہ طبیعت سے سرانجام پا گئے۔

نخست سلطان الشعراء شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ زخمہ برتارزد، وغزلِ سلطاں را
بداں نوابرخواند کہ زہرہ از سپہر فرود آمد سپس شہزادۂ یوسف دیدار، ہمایوں آثار
میرزا خضر سلطان بہادر غزل طرحی بداں لحن سرود کہ پنداری پروین بر بساطِ
بزم افشاند۔ میرزا حیدر شکوہ میرزا نورالدین ومیرزا عالی بخت عالیؔ راساز سخن
بلند آہنگ شد، غالب آشفتہ نوا کہ بر پہلوئے عالی جاداشت، دہ بیت از
خویشتن خواند۔
محویؔ نام امردے از مئے آشامانِ خمکدۂ صہبائی نغمۂ مستانہ زد حاجی میرزا
شہرتؔ کما بیش ہفتاد بیت در زمینِ طرح برسامعۂ انجمن نشینان عرضہ داشت،
من بہ بہانۂ آب تاختن از بزم بیرون آمدم وراہِ غمکدہ گرفتم، دردکانہا کشودہ
بود و چراغہا روشن ہمانا نیمہ، از شب نہ گذشتہ بود کہ بر بوریائے بینوائی دورِ جامِ
بادہ روائی داد و بادہ آشامیدم وخفتم، بامداد بہ ارک ہمایوں روئے آوردم،
ہر چہار سلطان زادہ کہ نام نامی آناں بر زبانِ قلم رفت۔ زمزمۂ شبانہ تازہ
کردند، من نیز غزل رادوبارہ خواندم، از ہمدماں شنیدہ شد کہ شب در ہنگامہ سر
آمد ونزدیک بدمیدنِ سپیدۂ سحر بزم برشکست، گویند، سلطان الشعراء پایانِ
انجمن دوغزل از خویشتن سرود، امانہ درطرح۔"[1]

(کلیاتِ نثر، پنج آہنگ، ص238)

(4) چوتھا مشاعرہ جمادی الثانی 1269ھ (اپریل 1853) میں منعقد ہوا تھا۔ میرزا صاحب نے رجب 1265ھ میں منشی نبی بخش حقیر کو لکھا ہے:

1۔ نزدیک اور دور کے لوگوں کو مژدہ کہ بادشاہ نے حکم دیا اور حاجب بارگاہ نے سخنوروں کو ایوان شاہی کی دعوت دی کہ جمعے کے دن 25 فروری کو اس دارِ سعادت میں آؤ اور جامِ سخن ایک دوسرے پر لنڈھاؤ۔ شہزادگانِ بابریہ کی ایک جماعت اور چند لوگ آزادگانِ شہر میں سے جمع ہوگئے۔ جگہ کم پڑ گئی، لوگ گویا ایک دوسرے میں سمائے جاتے تھے۔ پہلے سلطان الشعراء شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ نے سازِ سخن چھیڑا اور بادشاہ کی غزل اس آہنگ کے ساتھ پڑھی کہ وجد میں زہرہ آسمان سے اتر پڑی۔ اس کے بعد شاہزادۂ خوش جمال، مبارک خصال میرزا خضر سلطان بہادر نے طرحی غزل اس خوش الحانی کے ساتھ سنائی کہ معلوم ہوتا تھا بزم کی بساط پر انھوں نے ستارے برسا دیئے ہیں۔ اب میرزا حیدر شکوہ، میرزا نورالدین اور میرزا عالی بخت عالیؔ نے سخن سرائی کی۔ غالب پریشاں نوا نے، کہ اس کی نشست میرزا عالی کے ساتھ تھی، اپنے دس شعر پڑھے۔=

''یہاں بادشاہ نے قلعے میں مشاعرہ مقرر کیا ہے۔ ہر مہینے میں دو بار مشاعرہ ہوتا ہے، پندرہویں کو اور انتیسویں کو۔ حضور فارسی کا ایک مصرعہ اور ریختے کا ایک مصرعہ طرح کرتے ہیں:

اب کے جمادی الثانی کی تیسویں کو جو مشاعرہ ہوا اس میں مصرع فارسی یہ تھا: زیں تماشا گاہ گریاں می رود۔ ریختے کا مصرع یہ تھا: خمار عشق ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے۔ نظر ہے کیا کہیے، خبر ہے کیا کہیے۔'' (نادراتِ غالب، ص 35)

اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاہی مشاعرہ ہر مہینے کی 15 اور 29 (یا 30) کو قلعۂ معلیٰ میں منعقد ہوا کرتا تھا۔

(5) پانچواں مشاعرہ منگل کی صبح کو شعبان 1269ھ (مئی 1853) میں دیوانِ خاص میں کیا گیا تھا۔ اس میں میرزا صاحب نے اپنی یہ طرحی غزل پڑھی تھی:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

قاضی عبدالجمیل صاحب بریلوی کو ۱۸۵۴ء میں لکھتے ہیں:

''مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا قلعے میں شہزادگانِ تیموریہ جمع ہو کر غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ وہاں کے مصرعۂ طرحی کو کیا کیجیے اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا؟

میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے۔ اس کو دوام کہاں؟ کیا معلوم ہے اب ہی نہ ہو۔ اب کے ہو تو آئندہ نہ ہو۔'' (خطوط: 1، 113)

= محوی نام کے ایک خوبصورت لڑکے نے، جو صہبائی کے میکدے کے مئے آشاموں میں سے ہے، مستانہ نغمہ سرائی کی۔ حاجی میرزا شہرت نے کم وبیش ستر شعر طرحی زمین میں سامعین کے سامنے پیش کیے۔ میں ایک بہانہ کر کے محفل سے باہر آیا اور گھر کا راستہ لیا۔ دکانیں کھلی ہوئی تھیں اور چراغ روشن تھے۔ ابھی آدھی رات نہ گزری تھی کہ بسترِ بے نوائی پر شغل مئے نوشی شروع ہو گیا۔ شراب پی کر میں سو گیا۔ صبح میں نے پھر محل شاہی کا رخ کیا۔ چاروں شہزادوں نے کہ ان کے اسمائے گرامی زبانِ قلم پر آ چکے ہیں، رات کی غزلیں پھر سنائیں۔ میں نے بھی اپنی غزل دوبارہ پڑھی۔ ہم نشینوں سے سنا گیا کہ پوری رات ہنگامہ آرائی میں ختم ہو گئی اور صبح کی سپیدی نمودار ہونے کے قریب بزم برخاست ہوئی۔ کہتے ہیں سلطان الشعرا نے بزم کے آخر میں اپنی دو غزلیں سنائیں لیکن طرح میں نہیں۔

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر کے مشاعرے 1854 میں بند ہو چکے تھے۔صرف قلعے کے اندر تھوڑا بہت چرچا باقی تھا جس میں کبھی کبھی میرزا صاحب بھی شریک ہوتے اور اردو غزلیں پڑھتے تھے۔سید بدرالدین صاحب کے خط مورخہ 3 جنوری 1855 میں فرماتے ہیں:

> ''آپ ہندی اور فارسی غزلیں مانگتے ہیں۔ فارسی غزل تو شاید ایک بھی نہیں کہی۔ ہاں، ہندی غزلیں قلعے کے مشاعرے میں دو چار لکھی تھیں۔
>
> (اردوئے معلیٰ، 127، خطوط: 1، 109)



غالب کا دربار اور خلعت

دربار اور خلعت کی بحالی کے متعلق مرزا صاحب کے بیانات صاف نہیں ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ سوانح نگاروں نے جو تاریخیں متعین کی ہیں وہ واقعات کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی ہیں۔ ضروری ہے کہ ان کے سب بیان سامنے رکھ کر اس کا فیصلہ کیا جائے کہ کب دربار کی شرکت کی اجازت ملی اور سرکاری طور پر کس دربار میں خلعت عطا ہوا۔ سب سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ غدر سے پہلے دہلی کا تعلق پنجاب کے گورنر سے نہ تھا۔ اس لیے یہاں صرف گورنر جنرل کی آمد سے دربار ہوتا تھا۔ 1828 میں لارڈ لیک نے یہاں دربار کیا تو انھیں دربار کی شرکت اور داہنی صف میں دسویں نمبر کی نشست سے معزز کیا۔ لارڈ الن برا نے خلعت ہفت پارچہ و سہ رقم جواہر سے بھی عزت بخشی۔ لارڈ ہارڈنگ نے دسمبر 1845 میں دہلی میں دربار کیا تو اس میں مرزا صاحب کی شرکت اور خلعت یابی ثابت ہوتی ہے۔ لارڈ ڈلہوزی 21 نومبر 1848 کو دہلی آئے، مگر دربار نہیں کیا۔ اس کے بعد غدر تک شاید کوئی دربار دہلی میں منعقد نہیں ہوا۔

1856 میں مرزا صاحب نے لارڈ کیننگ گورنر جنرل کی وساطت سے ایک مدحیہ قصیدہ پیش کر کے ملکہ وکٹوریہ سے درخواست کی تھی کہ مجھے خطاب عطا کیا جائے اور قدیم پنشن اور خلعت میں اضافہ کیا جائے (ذکر غالب: 58) اس کا فیصلہ ابھی نہ ہوا تھا کہ 1857 کا فتنہ برپا ہو گیا اس کے فرو ہو جانے کے بعد لارڈ کیننگ کا میرٹھ میں دربار منعقد ہونا طے پایا۔ مرزا صاحب نے 28 نومبر 1859 کو یوسف مرزا کو لکھا:

> ”سب سے بڑھ کر آمد آمد گورنمنٹ کا ہنگامہ ہے۔ دربار میں جاتا تھا۔ خلعت فاخرہ پاتا تھا وہ صورت اب نظر نہیں آتی، نہ مقبول ہوں، نہ مردود، نہ بے گناہ ہوں، نہ گناہگار، نہ مخبر ہوں نہ مفسد بھلا اب تم ہی کہو کہ یہاں دربار

ماہِ نو، کراچی، جنوری فروری 1969

ہو اور میں بلایا جاؤں تو نذر کہاں سے لاؤں۔ دو مہینے رات دن خونِ جگر کھایا اور ایک قصیدہ 640 بیت کا لکھا۔ محمد فضل مصور کو دے دیا۔ وہ پہلی دسمبر کو مجھے دے گا۔ یہ اس کا مطلع ہے:

ز سال نو وگر آبی بروی کار آمد ہزار و ہشت صد و شست در شمار آمد

اس میں التزام اپنی تمام سرگزشت لکھنے کا کیا ہے۔" (خطوط: 16471)

اس کے بعد 13 دسمبر 1859 کو مجروحؔ کو تحریر کیا:

"میاں تم پنشن پنشن کیا کرر ہے ہو؟ گورنر جنرل کہاں؟ اور پنشن کہاں؟ ڈپٹی کمشنر، صاحب کمشنر، لفٹنٹ گورنر بہادر جب ان تینوں نے جواب دیا ہو تو اس کا مرافعہ گورنمنٹ میں کروں، مجھے تو دربار اور خلعت کے لالے پڑے ہیں، تم کو پنشن کی فکر ہے یہاں کے حاکم نے میرا نام دربار کی فرد میں نہیں لکھا۔ میں نے اس کا اپیل گورنر کے ہاں کیا ہے۔ دیکھیے کیا جواب آتا ہے۔" (اردوئے معلّٰی اور خطوط!، 259)

یکم جنوری 1860 کو پھر مجروحؔ کو لکھا:

"پنجشنبہ 29 دسمبر کو پہرون چڑھے لارڈ صاحب یہاں پہنچے، کابلی دروازہ کی فصیل کے تلے ڈیرے ہوئے اسی وقت توپوں کی آواز سنتے ہی میں سوار ہو کر گیا۔ میر منشی سے ملا اس کے خیمے میں بیٹھ کر صاحب سکرتر کو خبر کروائی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ یہ جواب سن کر نومیدی کی پوٹ باندھ کر لے آیا۔" (خطوط: 1، 206)

مارچ 1860 میں بے خبر کو مفصل طور پر تحریر کیا:

"گورنر اعظم نے میرٹھ میں دربار کا حکم دیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے سات جاگیرداروں میں سے تین جو بقیۃ السیف تھے ان کو حکم دیا اور دربار عام سے سوائے میرے کوئی باقی نہ تھا یا چند مہاجن مجھ کو حکم نہ پہنچا۔ جب میں نے استدعا کی تو جواب ملا کہ اب نہیں ہو سکتا۔ جب یہ سرزمین مخیم قیام گورنری ہوئی میں اپنی عادت قدیم کے موافق خیمہ گاہ میں پہنچا۔ مولوی اظہار حسین خاں صاحب بہادر سے ملا، چیف سکرتر بہادر کو اطلاع دی،

جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ میں سمجھا کہ اس وقت فرصت نہیں تو دوسرے دن پھر گیا۔ میری اطلاع کے بعد حکم ہوا کہ ایام غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے، اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو، اس دن چلا آیا۔ دوسرے دن انگریزی خط ان کے نام لکھ کر ان کو بھیجا۔ مضمون یہ کہ باغیوں سے میرا اخلاص مظنۂ محض ہے، امیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہو تا کہ میری صفائی اور بے گناہی ثابت ہو۔ یہاں کے مقامات پر جواب نہ ہوا، اب ماہ گزشتہ یعنی فروری تھا پنجاب کے ملک سے جواب آیا کہ لارڈ صاحب بہادر فرماتے ہیں کہ ہم تحقیقات نہ کریں گے پس یہ مقدمہ طے ہوا کہ دربار خلعت موقوف، پنشن مسدود، وجہ نا معلوم۔'' (اردوئے معلیٰ: 282)

4/ مارچ 1863 کو تفتہ کو لکھا:

''ہمیشہ نواب گورنر جنرل بہادر کی سرکاری سے دربار میں مجھ کو پارچے اور تین رقم جواہر خلعت ملتا تھا۔ لارڈ کیننگ صاحب میرا دربار اور خلعت بند کر گئے ہیں۔ ناامید ہو کر بیٹھ رہا اور مدت العمر کو مایوس ہو رہا۔'' (اردوئے معلیٰ: 111)

2/ مئی 1863 شیونرائن کو اطلاع دی:

''غدر کے رفع ہونے اور دلی کے فتح ہونے کے بعد میرا پنشن کھلا۔ چڑھا ہوا روپیہ دام دام ملا۔ آیندہ کو بدستور بے کم و کاست جاری ہوا مگر لارڈ صاحب کا دربار اور خلعت جو معمولی و مقرری تھا۔ مسدود ہو گیا۔ یہاں تک کہ صاحب سکرتر بھی مجھ سے نہ ملے اور کہلا بھیجا کہ اب گورنمنٹ کو تم سے ملاقات بھی منظور نہیں میں فقیر متکبر مایوس دائمی ہو کر اپنے گھر بیٹھ رہا اور حکام شہر سے بھی مناسبت موقوف کر دیا۔'' (اردوئے معلیٰ: 383)

1863 میں ہی بے خبر کو لکھا:

1863 میں لارڈ صاحب بہادر نے میرٹھ میں دربار کیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی اہالی دہلی کو ساتھ لے گئے۔ میں نے کہا میں بھی چلوں؟ فرمایا کہ نہیں۔ جب لشکر میرٹھ سے دہلی آیا۔ میں موافق اپنے دستور کے روز و روز لشکر مخیم میں گیا۔ میر منشی صاحب سے ملا۔ ان کے خیمے میں اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرتر بہادر

کے پاس بھیجا، جواب آیا تم غدر کے دنوں میں بادشاہی باغیوں کی خوشامد کیا
کرتے تھے۔ اب گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں میں گدائی مبرم اس حکم سے
ممنوع نہ ہوا۔ جب لارڈ صاحب بہادر کلکتہ پہنچے میں نے قصیدہ حسب معمول
بھیج دیا۔ مع اس حکم کے واپس آیا کہ اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو۔
میں مایوس مطلق ہو کر بیٹھ رہا اور حکام شہر سے ملنا ترک کیا۔" (اردوئے معلیٰ، 280)

لیکن دراصل مرزا صاحب مایوس ہو کر بیٹھے کبھی نہیں۔ جب مئی 1860 میں ان کی پنشن جاری ہو گئی تو انھوں نے دربار اور خلعت کی بحالی کی کوشش شروع کر دی۔ جنوری 1862 میں کیننگ کی جگہ لارڈ الگن گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ مرزا صاحب نے یکم جون 1862 کو درخواست دی اور اس میں یہ لکھا کہ "میری پنشن کا اجرا میری بے گناہی کا ثبوت ہے۔ میرے معاملے کی تحقیق کر کے بے قصور ثابت ہونے پر دربار و خلعت بحال کیا جائے۔" (ذکر غالب:56)

فروری 1863 میں گورنر پنجاب نے دہلی میں دربار کیا اس کے متعلق 4 مارچ 1863 کے تفتہ کے خط میں لکھتے ہیں:

"اب جو یہاں لیفٹیننٹ گورنر جنرل آئے۔ میں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ
ملیں گے۔ کل انھوں نے مجھ کو بلا بھیجا۔ بہت سی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ
لارڈ صاحب دلی میں دربار نہ کریں گے میرٹھ ہوں گے اور میرٹھ میں ان
اضلاع کے علاقہ داروں اور مالگزاروں کا دربار کرتے ہوئے انبالہ جائیں
گے۔ دلی کے لوگوں کا دربار وہاں ہوگا تم بھی انبالہ جاؤ شریک دربار ہو کر
خلعت معمولی لے آؤ۔

بھائی کیا کہوں کہ میرے دل پر کیا گزری۔ گویا مردہ جی اٹھا۔ نذر معمولی میرا
قصیدہ ہے اِدھر قصیدے کی فکر اُدھر روپے کی تدبیر حواس ٹھکانے نہیں۔"
(اردوئے معلیٰ:111)

3 رمئی 1863 کو شیونرائن کے خط میں تحریر کرتے ہیں:

"بڑے لارڈ صاحب کے ورود کے زمانے میں نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر
پنجاب بھی دلی آئے دربار کیا۔ خیر کرو، مجھ کو یاد کیا! ناگاہ دربار کے تیسرے
دن بارہ بجے چپراسی آیا اور کہا کہ نواب لیفٹیننٹ گورنر نے یاد کیا ہے۔ بھائی

یہ آخر فردوسی ہے..... بہر حال سوار ہوا گیا پہلے صاحب سکرتر بہادر سے ملا۔ پھر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تصور میں کیا بلکہ تمنا میں بھی جو بات نہ تھی وہ حاصل ہوئی یعنی عنایت ہی عنایت۔ اخلاق سے اخلاق۔ وقت رخصت خلعت دیا اور فرمایا کہ یہ ہم تجھ کو اپنی طرف سے ازراہِ محبت دیتے ہیں اور مژدہ دیتے ہیں کہ لارڈ صاحب کے دربار میں تیرا نمبر اور خلعت کھل گیا۔ اب آگرے جا، دربار میں شریک ہو، خلعت پہن۔" (اردوئے معلیٰ: 383)

اس کی تفصیل پنجؔ کو اس طرح لکھی ہے:

"اواخر ماہ گذشتہ یعنی فروری 1863 میں نواب لیفٹیننٹ گورنر پنجاب دلی آئے اہالی شہر سب ڈپٹی کمشنر بہادر صاحب کمشنر بہادر کے پاس دوڑے اور اپنے نام لکھوالائے میں تو بیگانۂ محض اور مطرود حکام تھا جگہ سے نہ ہلا۔ کسی سے نہ ملا۔ دربار ہوا۔ ہر ایک کامگار ہوا۔ شنبہ 28 فروری کو آزادانہ منشی پھول سنگھ صاحب کے خیمے میں چلا گیا۔ اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرتر بہادر کے پاس بھیجا۔ مہربان پا کر نواب صاحب کی ملازمت کی استدعا کی وہ بھی حاصل ہوئی۔ حاکم جلیل القدر کی وہ عنایتیں دیکھیں جو میرے تصور میں بھی نہ تھیں۔ جملہ معترضہ: میر منشی لیفٹیننٹ گورنری سے سابقہ تعارف نہ تھا وہ بطریق حسنِ طلب میرے خواہاں ہوئے تو میں گیا۔ جب حکام بمجرد استدعا مجھ سے بے تکلف ملے تو میں قیاس کر سکتا ہوں کہ میر منشی کی طرف سے حسن طلب بایمائے حکام ہوگا والرحمٰن الطاف خفیہ۔

بقیہ روداد یہ ہے کہ دوشنبہ دوم مارچ کو سواد شہر مخیم خیام گورنری ہوا۔ آخری روز میں اپنے شفیق قدیم جناب مولوی اظہار حسین خاں بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ تمھارا دربار و خلعت بدستور بحال و برقرار ہے متحیرانہ پوچھا کہ حضرت کیونکر؟ حضرت نے کہا کہ حاکم نے ولایت سے آکر تمھارے علاقہ کے سب کاغذات انگریزی و فارسی دیکھے اور باجلاس کونسل حکم لکھوایا کہ اسداللہ خاں کا دربار اور نمبر اور خلعت بدستور بحال و برقرار رہے۔ میں نے پوچھا کہ حضرت یہ امر کس اصل پر متفرع ہوا؟ فرمایا کہ ہم کو

کچھ معلوم نہیں۔ بس اتنا جانتے ہیں کہ یہ حکم دفتر میں لکھوا کر چودہ دن یا 15 دن ادھر کو روانہ ہوئے ہیں۔ میں نے کہا کہ سبحان اللہ کارسازِ مابفکر کارما۔ 3 مارچ کو 12 بجے نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر نے مجھ کو بلایا خلعت عطا فرمایا اور ارشاد ہوا کہ لارڈ صاحب کے یہاں کا دربار اور خلعت پاؤ گے عرض کیا گیا حضور کے قدم دیکھے خلعت پایا۔ لارڈ صاحب بہادر کا حکم سن لیا۔ نہال ہوگیا۔ اب انبالہ کہاں جاؤں جیتا رہا تو اور دربار میں کامیاب ہورہوں گا۔''
(اردوئے معلّٰی:380)

16 مارچ 1863 کو نواب فردوس مکاں کو لکھا:

''منگل 3 مارچ کو جناب لیفٹیننٹ گورنر بہادر نے خلعت عطا کیا اور فرمایا کہ ہم تمھیں مژدہ دیتے ہیں کہ نواب گورنر جنرل بہادر نے اپنے دفتر میں تمھارے دربار اور خلعت کے بدستور بحال رہنے کا حکم فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ میں انبالہ جاؤں فرمایا۔ البتہ انبالہ جانا ہوگا۔ بعد میں جناب نواب صاحب کے جانے کے شہر میں شہرت ہوئی کہ دلی کے لوگ انبالہ جانے سے ممنوع ہیں گھبرلیا۔ اور صاحب کمشنر کے پاس گیا۔ آپ خط اپنا دے آیا۔ زبانی پرسش کا جواب زبانی پایا۔''

پھر خط کے جواب میں خط محررہ 7 مارچ آیا:

''کل سے ایک اور خبر ہوئی ہے کہ نصیب اعداء لارڈ صاحب کی طبیعت ناساز ہوگئی ہے، انبالہ میں دربار نہ کرسکیں گے اور شملہ کو چلے جائیں گے۔ تار برقی میں جناب نواب صاحب سے حکم منگاؤں گا جو حکم آئے گا آپ سے عرض کرکے اس کی تعمیل کروں گا۔'' (مکاتیب 240)

اس کے جواب میں نواب فردوس مکاں نے تحریر فرمایا:

''جو کہ خط نواب صاحب کمشنر بہادر سے عدم حصول شرف ملازمت جناب مستطاب معلّٰی القاب نواب گورنر جنرل بہادر دام اقبالہم کا بمقام انبالہ مستنبط ہے اس واسطے تشریف لے جانا آپ کا انبالہ کو بلا استجازت ضروری نہیں معلوم ہوتا۔''

1863 علائی کو تحریر کیا:

''جناب لیفٹیننٹ گورنر بہادر نے دربار کیا۔ میری تعظیم وتوقیر اور میرے حال

پر لطف و عنایت میری ارزش و استحقاق سے زیادہ بلکہ میری
خواہش وتصور سے سوا مبذول کی۔'' (خطوط:1،248)

4/اگست 1863 کو پھر نواب فردوس مکاں کو لکھا:

''جب میرا جانا نہ ہوا تو میں نے قصیدہ مدح جو دربار کی نذر کے واسطے لکھا تھا
بطریق ڈاک جناب چیف سکرتر بہادر کو اس مراد سے بھیجا کہ آپ اس کو
جناب نواب معلّی القاب کی نظر سے گزار دیں اور یہ دستور قدیم کہ جب میں
قصیدہ مدحیہ بھیجتا تو صاحب سکرتر بہادر کا خط بیواسطہ حکام ماتحت آجاتا اب جو
میں نے موافق معمول قصیدہ بھیجا یقین ہے کہ مارچ یا اپریل کے مہینے میں وہ
لفافہ یہاں سے لشکر کو گیا صدائے برنخواست ناامید ہو کر بیٹھ رہا یہ خیال گزرا کہ
جب رسم تحریر خطوط نہ رہی تو دربار وخلعت کہاں۔ ناگاہ کل شام کو صاحب سکرتر
بہادر کا خط ڈاک میں آیا وہی انشائی کا غذ وہی القاب۔'' (مکاتیب:25)

22 فروری اور 22 اگست 63 کے درمیان کی کسی تاریخ میں قدر بلگرامی کو لکھا:

''میں ہمیشہ نواب گورنر جنرل بہادر کے دربار میں سیدھی صف میں دسواں نمبر
اور سات پارچہ اور تین رقم جواہر خلعت پاتا تھا۔ غدر کے بعد پنشن جاری
ہوگئی لیکن دربار وخلعت بند اب کے جو لارڈ صاحب یہاں آئے تو اہلِ دفتر
نے بموجب حکم کے مجھ کو اطلاع دی کہ تمھارا دربار و خلعت واگزاشت
ہوگیا۔ مگر دلی میں دربار نہیں انبالے آؤ گے تو دربار میں نمبر اور خلعت معمولی
پاؤ گے۔ میں نے خبر میں وجدان کا مزا پایا اور انبالہ نہ گیا۔ رابرٹ منٹگمری
صاحب لیفٹیننٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب یہاں آئے دربار کیا۔ میں دربار میں
نہ گیا۔ دربار کے بعد ایک دن 12 بجے چپراسی آکر مجھ کو بلا لے گیا بہت
عنایت فرمائی اور اپنی طرف سے خلعت عطا کیا۔'' (خطوط:1،1946)

1865 میں شروع میں مرزا صاحب نے ایک درخواست دی کہ مجھے ملکہ کا شاعر دربار
مقرر کر کے دربار میں اونچی جگہ دی جائے اور دستنبو کو گورنمنٹ اپنے صرف سے شائع کرے
اب لارڈ لارنس گورنر جنرل تھے۔ مرزا صاحب ان کے مداح رہ چکے تھے۔ انھوں نے
لیفٹیننٹ گورنر پنجاب سے رپورٹ طلب کی چیف سکریٹری گورنمنٹ پنجاب نے لکھا کہ میرے

خیال میں کمشنر دہلی کی یہ سفارش معقول ہے کہ علیاء حضرت ملکہ معظمہ کا تو نہیں البتہ مرزا غالب کو وائسرائے کا درباری شاعر مقرر کردینے میں کوئی حرج نہیں یہ بھی لازم نہیں کہ عہدے کے ساتھ کوئی تنخواہ مقرر ہو سالانہ خلعت ضرور دیا جائے اور اگر سال کے دوران میں بھی کسی خاص تقریب میں وہ قصیدہ پیش کریں تو بیشک خلعت دیا جاسکتا ہے، اس سے مرزا غالبؔ کی بھی اشک شوئی ہوجائے گی اور علوم مشرقیہ کی حوصلہ افزائی بھی اس وقت بہت کم نگاہی کا شکار ہورہی ہے اس پر مزید تحقیقات کا حکم ہوا کہ غدر کے دنوں میں مرزا غالبؔ کے رویہ کی پڑتال کی جائے نیز ان سے دستنبو کا ایک نسخہ طلب کرکے اس پر بھی رائے لکھی جائے۔ جب مرزا صاحب سے دستنبو کا نسخہ طلب کیا گیا ہے تو اس وقت رام پور میں تھے۔ رام پور ہی میں انھوں نے دستنبو کے پہلے ایڈیشن کی تصحیح کرکے بریلی میں دوبارہ طابع کرایا ایک نسخہ حکومت پنجاب کو بھیج دیا۔ حکومت کے میر منشی نے دستنبو کو دیکھ کر یہ رپورٹ کی کہ اس کی زبان پرانی قسم کی فارسی ہے جو اب نامانوس بعید الفہم ہے۔ اس لیے اسے حکومت کے خرچ پر شائع کرنا بے سود ہے۔

اسی کے ساتھ غدر کے دوران میں مرزا غالبؔ کے رویہ کی پڑتال بھی ہورہی تھی اس پر بھی وہی رپورٹ برآمد ہوئی جس میں مرزا صاحب سے ایک سکہ منسوب کیا گیا تھا۔

''آخر تمام امور پر غور کرکے حکومت نے 6 جنوری 1866 کو یہ فیصلہ کیا کہ مرزا صاحب کو درباری شاعر بنانا مناسب نہیں البتہ گورنر جنرل کو اس میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اگر لیفٹیننٹ گورنر پنجاب انھیں خلعت عطا کریں یا انھیں دربار میں پہلے سے اونچی جگہ عطا کی جائے۔'' (ذکر غالبؔ 62-61)

اس حکم پر گورنر پنجاب نے انھیں خلعت عطا کی تو حسب ذیل قطعہ لکھا:

اسداللہ خاں بہادر را رہبری کرد بخت و اقبالش
داد خلعت گورنر پنجاب مہربانی نمود برحالش
عیسوی گفتم از سرِ عزت
خلعت ہفت پارچہ سالش

1866 - 1796

(دیوانِ سالک ص 271)

یادِ غالب

جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے غالب کے کلام کی قدر و قیمت بڑھتی جاتی ہے۔ اس کا کمال محض الفاظ اور زبان پر منحصر نہیں بلکہ ایک ایسے جذبے کی صداقت پر ہے جو شعر کے اثر کی جان ہے۔

غالب نے اپنے نظریۂ شعر پر کوئی مضمون تو نہیں لکھا لیکن ان کی تحریروں اور کلام میں ایسے کئی اشارے ملتے ہیں جن سے فن کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے۔

''شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں۔''

سخن کی تعریف میں انھوں نے کہا ہے ''سخن... گراں ارض متاع عالم قدس است۔''

شعر کے اوصاف کے بارے میں ان کا ایک واضح نظریہ تھا۔

ایک قصیدہ کی تعریف میں لکھتے ہیں:

''ہزار آفریں ایک اچھا قصیدہ لکھا ہے! واہ واہ! چشم بد دور! تسلسل معنی سلاست الفاظ۔''

مہر کے قصیدے کے متعلق فرماتے ہیں:

انشاء اللہ خاں کا بھی قصیدہ میں نے دیکھا ہے، تم نے بہت بڑھ کر لکھا ہے اور اچھا سماں باندھا ہے۔ زبان پاکیزہ، مضامین اچھوتے، معانی نازک، مطالب کا بیان دلنشیں۔''

شفق کی ایک فارسی غزل کے متعلق تحریر کیا ہے

''کیا پاکیزہ زبان ہے، اور کیا طرزِ بیان۔''

بے خبر کی غزل کی داد دیتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

''فروغ اردو'' لکھنؤ، اپریل 1963

''رامپور ہی میں تھا کہ اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر فراز ہوئی۔ کیا کہنا ہے ''ابداع'' اس کو کہتے ہیں ''جدتِ طرز'' اس کا نام ہے۔ جو ڈھنگ تازہ نوابان ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا، وہ تم بروئے کار لائے ہو۔''

مہر کی غزل کے ایک شعر کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سحر ہوگی، خبر ہوگی، اس زمین میں وہ شعر یعنی:

تمہارے واسطے دل سے مکاں کوئی نہیں بہتر
جو آنکھوں میں تمھیں رکھوں تو ڈرتا ہوں نظر ہوگی

کتنا خوب ہے اور اردو کا کیا اچھا اسلوب ہے۔

مہر کی مثنوی کے بارے میں فرماتے ہیں:

''مثنوی پہونچی، جھوٹ بولنا میرا شعار نہیں، کیا خوب بول چال ہے، انداز اچھا، بیان اچھا، روزمرہ صاف جشنوں کا استغاثہ کیا کہوں، کیا مزہ دے رہا ہے۔

تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''پر جو تم نے التزام کیا ہے ترصیع کی صنعت کا اور دولخت شعر کہنے کا اس میں ضرور نشست معنی بھی ملحوظ رکھا کرو۔''

سرور کے ایک شعر کی ان الفاظ میں داد دیتے ہیں:

''رجب علی بیگ سرور نے جو ''افسانۂ عجائب'' لکھا ہے، آغاز داستان کا شعر اب مجکو بہت مزا دیتا ہے:

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ
یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

مصرع ثانی کتنا گرم ہے اور یاد رکھنا، فسانے کے واسطے کتنا مناسب، جنوں بریلوی کو تحریر کیا ہے۔

''عربی میں تعقید لفظی و معنوی دونوں معیوب ہیں۔ فارسی میں تعقید معنوی عیب اور تعقید لفظی جائز ہے بلکہ فصیح اور ملیح۔ ریختہ تقلید ہے فارسی کی۔''

خود اپنے کلام کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

''میرا فارسی دیوان جو دیکھے گا وہ جانے گا کہ جملے کے جملے مقدر چھوڑ جاتا ہوں۔'' لیکن

میرزا صاحب کے نزدیک جملوں کو مقدر چھوڑنے کے لیے ضروری ہے کہ سننے والے کا ذہن حذف شدہ الفاظ کی طرف بہ سہولت منتقل ہو سکے ورنہ وہ اس کو عیب شمار کرتے تھے۔ میر مہدی مجروح کو لکھا ہے:

می خواہم از خدا و نمی خواہم از خدا
دیدن حبیب را و ندیدن رقیب را

لف ونشر مرتب ہے ''می خواہم از خدا دیدن حبیب را نمی خواہم از خدا ندیدن رقیب را خوار وزار وخستہ وسوگوار۔''

معنی تو اس میں موجود ہیں، مگر بول چال ٹکسال باہر ہے۔ ایک جملے کا جملہ مقدر چھوڑ دیا ہے اور پھر اس بھونڈی طرح سے کہ جس کو 'المعنی فی بطن الشاعر' کہتے ہیں۔ نساخ کے دیوان پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میں دروغ گو نہیں، خوشامد میری خو نہیں، دیوان فیض عنوان اسم با مسمیٰ ہے۔''
''دفتر بے مثال'' اس کا نام بجا ہے۔
''الفاظ متین، معانی بلند، مضمون عمدہ، بندش دل پسند۔''

محاسنِ شعر کے ساتھ عیوب شعر پر میرزا صاحب کا نقطۂ نگاہ دریافت کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے جیسا کہ کئی جگہ ذکر کیا گیا ہے۔ وہ ابتداً بیدل کی پیروی میں کوشش کر کے ایسا خیال نظم کرتے تھے جو عام دماغوں کی دسترس سے باہر ہو لیکن آخر میں اس سے خود بھی احتراز کرنے لگے تھے اور شاگردوں کو بھی اس سعی نا مشکور سے باز رکھتے تھے۔ جنوں بریلوی کو لکھتے ہیں:

قطرہ مے بس کہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خط جام مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اس مطلع میں خیال ہے دقیق، مگر کوہ کندی و کاہ برآوردن، یعنی لطف زیادہ نہیں۔ اسی طرح میرزا صاحب کو یہ بھی ناپسند تھا کہ مطلع میں تخلص باندھا جائے۔

قدر کو لکھتے ہیں:

مطلع میں نام اپنا لکھنا رسم نہیں ہے۔ میر کا تخلص اور صورت رکھتا ہے۔ میر جی اور میر صاحب، کر کے وہ اپنے آپ کو لکھ جاتا ہے اور کو اس بدعت کا تتبع نہ چاہیے۔''

دیوان کی پہلی غزل کے مطلع میں حروف والفاظ کی قید کے بھی قائل نہ تھے۔ قدر ہی کو

لکھا ہے:

''آغاز دیوان کے شعر، یعنی مطلع، میں ہرگز حروف والفاظ کی قید نہیں ہے۔ ہاں، ردیف الف کی۔ یہ امر قابل پرسش کے نہیں، بدیہی ہے۔ دیکھ لو اور سمجھ لو۔ یہ جو دیوان مشہور ہیں۔ حافظ و صائب و سلیم و کلیم ان کے آغاز کی غزل کے مطلعے دیکھو اور حروف و الفاظ کا مقابلہ کرو، کبھی ایک صورت، ایک ترکیب، ایک زمین، ایک بحر نہ پاؤ گے۔ چہ جائے اتحادِ حروف و الفاظ؟ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

توارد کے متعلق میرزا صاحب کی رائے یہ تھی کہ اگر پس جو شاعر اپنے پیشرو سے مضمون آفرینی یا طرزِ ادا میں زیادہ لطف و خوبی پیدا کر دے، تو یہ اُس کے لیے قابل فخر بات ہے۔ میرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:"

ایک مصرع میں تم کو محمد اسحٰق شوکت بخاری سے توارد ہوا یہ بھی محل وفخر وشرف ہے کہ جہاں شوکت پہنچا۔ وہاں تم پہنچے۔ وہ مصرع یہ ہے:

چاک گردیدم واز جیب بداماں رفتم

پہلا مصرع تمھارا اگر، اُس کے پہلے مصرع سے اچھا ہوتا، تو میرا دل اور زیادہ خوش ہوتا۔''

میرزا صاحب کو خواہ مخواہ کی قیود کا التزام بھی ناپسند تھا۔ تفتہ نے شاید اپنے قصائد کو حروف تہجی پر مرتب کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ انھیں لکھتے ہیں:

''خبردار، قصائد بقید حروف تہجی نہ جمع کرنا۔''

غالباً کچھ محقق انگریزی الفاظ نیز ان مصطلحات کو جو سرکاری دفاتر کی پیداوار تھے یا انگریزی تہذیب وتمدن کی بدولت مروج ہوئے تھے، ٹکسال باہر جانتے تھے، اور اپنے روزمرہ میں ان کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے۔ میرزا صاحب نے اس کے متعلق سنہ 1858 میں قدر بلگرامی کو لکھا ہے۔

''پاپی، لغت انگریزی ہے۔ اس زمانے میں اس اسم کا شعر میں لانا جائز ہے، بلکہ مزا دیتا ہے۔ تار بجلی اور دخانی جہاز کے مضامین میں نے اپنے یاروں کو دیئے ہیں، اوروں نے بھی باندھے ہیں روبکاری اور طلبی اور فوجداری اور سررشتہ داری خود یہ الفاظ میں نے باندھے ہیں۔''

قصیدے کے اخیر میں ایسے الفاظ جو خاتمے پر دلالت کرتے ہوں، لانے کو بھی میرزا صاحب عیب جانتے تھے۔ چنانچہ میرزا تفتہ کو لکھا ہے:

''ایک خیال رکھا کرو کہ شعر کے اخیر میں کوئی بات ایسی آجائے کہ جس سے اختتام کے معنی پیدا ہوا کریں۔''

ایطا بھی ان کے نزدیک عیب تھا۔ چنانچہ ایک مکتوب میں تفتہ کو بگڑ کر لکھا ہے۔

''حضرت، اس غزل میں پروانہ، و پیمانہ، و بت خانہ، تین قافیے اصلی ہیں۔ دیوانہ چونکہ علم قرار پاکر ایک لغت جداگانہ مشخص ہو گیا ہے، اس کو بھی قافیۂ اصلی سمجھ لیجیے۔ باقی، غلامانہ، ومستانہ ومردانہ، وترکانہ، ودلیرانہ، وشکرانہ، سب ناجائز و نامستحسن، ایطا اور ایطا بھی قبیح... یاد رہے ساری غزل میں، مردانہ، یا مستانہ یا ان کے نظائر میں سے ایک جگہ آوے دوسری بیت میں زنہار نہ آوے۔ یہ غزل نظری ہوگئی۔''

غزل کے اشعار کی زائد تعداد بھی پسند نہ تھی۔ فرماتے ہیں:

''ایک بات اور تمھارے خیال میں رہے۔ میری غزل پندرہ سولہ بیت کی بہت شاذ و نادر ہے۔ بارہ بیت سے زیادہ اور نو شعر سے کم نہیں ہوتی۔''

میرزا صاحب بے مزہ لفظی صنعتوں سے بہت کم کھیلتے تھے۔ لفظی صنعتوں سے پرہیز کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ معما اور تاریخ گوئی میں اچھی دستگاہ پیدا نہ کرسکے۔ اردوئے معلیٰ میں لکھتے ہیں:

میں فن تاریخ گوئی و معما سے بیگانہ محض ہوں۔ اردو زبان میں کوئی تاریخ میری نہ سنی ہوگی۔ فارسی دیوان میں دو چار تاریخیں ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ مادہ اوروں کا ہے، اور اشعار میرے ہیں۔ حساب سے میرا جی گھبراتا ہے، اور مجھ کو جوڑ لگانا نہیں آتا۔ جب کوئی مادہ بناؤں گا، حساب درست نہ پاؤں گا۔ دو ایک دوست ایسے تھے کہ اگر حاجت ہوتی تو مادۂ تاریخ وہ مجھے ڈھونڈھ لادیتے۔ موزوں میں کرتا۔'' ان شاعرانہ داؤ پیچوں کو میرزا صاحب مرتبۂ شاعری سے فروتر سمجھتے تھے۔

دیکھو اسم کو پرکھنے کے لیے انھوں نے ایک میزان شعر مقرر کی جس کے مطابق فارسی شعرا کے کلام کو سامنے رکھتے ہوئے انھوں نے یہ تین طرزیں ٹھہرائیں:

(1) خاقانی، اُس کے اقران (2) ظہوری، اُس کے امثال (3) صائب اس کے نظائر۔

ان کے علاوہ ایک چوتھی طرز بھی ہے جو اُردو زبان میں اہل ہند کے ملتی ہے۔ اس کی مثالیں انھوں نے میر تقی، سودا، قائم، مومن خاں سے دی ہیں۔ ان شاعروں کو انھوں نے شیوا بیان شاعر کہا ہے۔ ان کے اکثر اشعار میں تیر و نشتر ہیں۔ غالب نے شیوا بیان شاعر کے لیے

ان چار اوصاف کو لازم قرار دیا تھا:

''سخن عشق و عشق سخن، کلام حسن و حسن کلام۔''

مختصراً شعر کی خوبی اور اس کا حسن یہ ہے کہ ''سہل ممتنع ہو اسی صنعت کو انھوں نے حسن بیان کی معراج قرار دیا ہے۔ عود ہندی میں لکھا ہے۔

''سہل ممتنع اُس نظم کو کہتے ہیں کہ دیکھنے میں آسان نظر آئے اور اس کا جواب نہ ہو سکے۔ بالجملہ سہل ممتنع، کمال حسنِ کلام ہے اور بلاغت کی نہایت ہے۔ ممتنع، درحقیقت ممتنع النظیر ہے۔

شیخ سعدی کے بیشتر فقرے اس صنعت پر مشتمل ہیں اور رشید وطواط وغیرہ شعرائے سلف نظم میں اس شیوے کی رعایت منظور رکھتے تھے۔

خودستائی ہوتی ہے۔ سخن فہم اگر غور کرے گا تو فقیر کی نظم و نثر میں سہل ممتنع اکثر پائے گا۔

اپنے اشعار کے متعلق میرزا صاحب کا یہ خیال اتنا پختہ ہوگیا تھا کہ وہ اسے عام ریختہ اشعار سے جداگانہ قسم کا کلام مانتے تھے، اور میر و میرزا کے کلام سے بھی بالاتر سمجھتے ہیں۔



تاثراتِ غالب

اِس برِ صغیر میں جو 'ماہرین غالبیات' ہیں— یا جن لوگوں کو غالب پر اتھاریٹی قرار دیا جاسکتا ہے— یا غالب شناس کہا جاسکتا ہے اُن میں مولانا امتیاز علی عرشی کا نام بڑی اہمیت کا حامل بلکہ سرفہرست ہے 'ذکرِ غالب ہو اور محفل میں مولانا عرشی' نہ ہوں تو محفل بے رنگ رہے گی۔ غالب پر کوئی کتاب لکھی جائے اور عرشی صاحب کا اُس میں کوئی Contribution نہ ہو تو اُس کتاب کی کیا قیمت۔ غالب پر اگر کوئی دستاویز تیار کی جائے اور اُس میں مولانا عرشی کا حصہ نہ ہو، تو میرے نزدیک وہ دستاویز خام ہوگی۔ یہی جذبہ تھا جس کے تحت میں دلی سے چل کر اُن کی خدمت میں رامپور حاضر ہوا۔ مولانا کی صحبت سے فیضیاب ہونے کا بہت کم وقت میسر ہوا، اور ڈھائی تین گھنٹے کی گفتگو کے بعد جب میں اُن سے رخصت ہوا تو طبیعت سیر نہ ہوئی تھی تشنگی باقی تھی، اور وہ شوق جو ملاقات سے قبل تھا دو چند ہو چکا تھا— چنانچہ میں ایک بار پھر رامپور آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا۔

عرشی صاحب سے میری پہلے کوئی ملاقات نہ تھی۔ زندگی میں دیکھا بھی دوسری ہی بار تھا۔ پہلی بار وگیان بھون کی اس تقریب میں دیکھا تھا جس میں دیوان غالب کے نسخۂ عرشی کی ترتیب پر انھیں ساہتیہ اکیڈمی کا اوارڈ دیا گیا تھا۔ دلی سے ایک خط بغیر کسی ''دید شنید'' کہ ان کے صاحب زادے اکبر علی خاں کے نام لکھ کر رامپور پہنچ گیا تھا اور یہ مولانا کی وضع داری، شفقت اور غالب سے غیر معمولی لگاؤ تھا کہ انھوں نے طویل بیماری سے حال ہی میں اٹھنے اور مکمل طور پر صحتیاب نہ ہونے کے باوجود مجھے اتنا وقت عنایت فرمایا۔

میرے خیال میں علم و ادب کے پیاسوں کے لیے رامپور میں دیکھنے کی دو ہی قابلِ قدر

علم وفن، دہلی (غالب نمبر)، اپریل 1969

چیزیں ہیں، ایک رضا لائبریری اور دوسرے عرشی صاحب۔ دن میں مولانا کے صاحبزادے اکبر علی خاں صاحب سے خوب دل کھول کر 'غالب اور غالبیات' پر گفتگو ہوئی۔ خوشی اس بات کی تھی کہ وہ اپنے والد محترم کی روایات کے امین ہیں۔ غالب ان کا بھی محبوب شاعر ہے۔ انھیں بھی مولانا ہی جیسی لگن ہے۔ انھوں نے تفصیل کے ساتھ اپنی ان کتابوں کے بارے میں بتایا جو وہ غالب پر مرتب کرر ہے ہیں— اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

عصر کی نماز کے بعد مولانا سے گفتگو شروع ہوئی تھی اور تین گھنٹے جاری رہی۔ کچھ دیر رسمی گفتگو کے بعد میں نے سوالات کا سلسلہ شروع کیا:

س: اُردو شعر و ادب میں غالب کا مقام کیا ہے؟

ج: میری دانست میں غالب کا مقام اردو شعر و ادب میں سب سے بلند ہے۔ جہاں تک اس کے کلام کا تعلق ہے وہ اپنے چھوٹے سے حجم کے باوجود بڑے بڑے اساتذہ کی کلیات میں ممتاز ہے اور میں تو بطور مذاق یہ بھی کہا کرتا ہوں کہ اردو ادیبوں اور شاعروں کو چاہیے کہ کوشش کر کے اس کو ممنوع الاشاعت قرار دلادیں، اس لیے کہ اس کی وجہ سے ہماری شعر و شاعری کی بہت سی بلند شخصیتیں بھی پست نظر آتی ہیں۔

میں نے دوسرا سوال پوچھا—

س: غالب کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت کیا ہے؟

ج: غالب کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت میرے خیال میں ندرت فکر اور جدتِ ادا ہے۔ وہ اگر عام خیالات کو بھی ادا کرتا ہے تو اُس کا انداز اتنا نادر ہوتا ہے کہ پڑھنے والا خود اس مضمون کو نادر سمجھنے لگتا ہے، جب وہ کسی خیال کو ہم تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اور اِس بات کی دانستہ کوشش بھی نظر آتی ہے تو وہ خیال بھی پڑھنے والے کو اچھا معلوم ہونے لگتا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ندرتِ خیال اور جدتِ ادا میں اُردو ادب میں اس کی ٹکر کے شاعر بہت کم ہیں۔ غالب کی ان صفات کو موجودہ زمانے کے شعرا میں سب سے زیادہ اقبال کے یہاں دیکھا جاسکتا ہے۔

اِس کے بعد میں نے عرض کیا—

س: مولانا اب یہ فرمایئے کہ غالب کے کلام میں جس پہلو کو آپ نمایاں کریں یا ندرت قرار دیں وہ اُس میں کیسے پیدا ہوئی۔

ج: غالب کے یہاں ندرتِ خیال اور جدتِ ادا خود اُن کے اپنے بیان کے مطابق بیدلؔ کے ساتھ ظہوری، عرفی اور نظیری کے کلام کے مطالعے سے پیدا ہوئی — اور اُن کے کلام کا مطالعہ کرنے والا اُن کے اِس بیان کو واقعی قرار دینے پر مجبور ہوگا۔ چنانچہ آج بھی نسخۂ حمیدیہ سے شروع کر کے مثنوی ابرگوہر بار تک آئیں تو اس اعتراف کی صداقت عیاں ہو جائے گی۔

''میرے خیال میں یہ جواب کافی ہے'' مولانا نے فرمایا اور میں نے اگلا سوال پیش کیا۔

س: سماجی زندگی پر غالب کے کلام کا کیا اثر ہوا؟

ج: میں نے کبھی اس پہلو سے اس کو پرکھنے کی کوشش نہیں کی اور نہ اس زمانے میں شاید کسی شاعر کے کلام کو پرکھنے کا ایسا کوئی طریقہ تھا — اور جہاں تک غالب کے زمانے کا سماج یا سماجی روایات تھیں وہ اب ختم ہو چکی ہیں اُس زمانے میں اس کا جو بھی اثر رہا ہو، لیکن آنے والے سماج پر اس کا کوئی اثر باقی نہیں ہے البتہ — اگر اس سوال کو ادبی سماج تک محدود کیا جائے تو میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جہاں تک اردو ادب میں خودی و خودداری کا تعلق ہے اس کا سرچشمہ ہمیں میر اور سودا کی جگہ غالب کے یہاں تلاش کرنا چاہیے کہتے ہیں:

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

اَب میں نے دریافت کیا —

س: آپ غالب کے اُردو کلام کو ترجیح دیتے ہیں یا فارسی کلام کو؟

ج: غالب کے فارسی کلام میں جو پختگی اوّل تا آخر ہے اور جملہ اصنافِ سخن میں جو بلندی پائی جاتی ہے وہ اردو میں نہیں۔ خصوصاً اس کے کلام کے ابتدائی دور میں جو تاثر ظہوری اور عرفی وغیرہ سے لیا وہ جس پختگی اور بلندی پر فارسی میں ملتا ہے اس کی اردو میں توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی، کیونکہ بقول غالب اردو میں فارسی کے نقش ہائے رنگ رنگ کی گنجائش نہیں تھی۔ چنانچہ غالب کے اس خیال کو اردو میں کس طرح پیش کیا جاسکتا ہے جو اس نے کلکتہ جاتے ہوئے حسینانِ بنارس کی تعریف میں کیا ہے:

زرنگیں جلوہ ہا غارت گرِ ہوش
بہارِ بستر و نوروز آغوش

میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ اگر غالب فارسی کے اتنے بلند پایہ شاعر نہ ہوتے تو اُردو میں وہ یہ

شہرت کبھی نہ پاسکتے:

گر اک ادا ہو تو اسے اپنی قضا کہوں

لیکن بات یہ ہے کہ زمانے کے ساتھ ساتھ فارسی کی تعلیم اور علم کم ہوتا چلا گیا، اور اُردو ترقی کے مدارج طے کرتی چلی گئی تو غالب کا اردو کلام زیادہ تر پیش نظر رہ گیا اور فارسی کلام نظروں سے اوجھل ہوگیا— اس لیے میں اردو اہلِ قلم کو یہ مشورہ دوں گا کہ وہ اس کے فارسی کلام کا مطالعہ بھی کریں کیونکہ اُس میں ندرت خیال، دل نشینی اور ایک خیال کو مختلف طریقوں سے ادا کرنے کا بڑا مظاہرہ ہے، اور اِسی کے ساتھ ساتھ لفظی اور معنوی اغلاط اور اشکال بھی بہت کم ہیں۔ اِس سے اس کا مطالعہ خود اردو شعر و ادب کی ترقی میں معاون ثابت ہوگا۔

شراب و رند کا ذکر جوش، ریاض اور جگر وغیرہ نے کیا ہے لیکن وہ بالکل انوکھے انداز میں کہتا ہے:

ہے بہ زاہد مکن عرض کہ ایں جوہرِ ناب
پیش ایں قوم بہ شورابۂ زمزم نہ رسد

ایک اور ایسے ہی سوال پر روشنی ڈالیں:

س: آپ غالب کی نظم کو ترجیح دیتے ہیں یا نثر کو؟

ج: غالب کی نظم اور نثر دونوں ہی چیزیں میرے لیے دل نشیں ہیں۔ البتہ اُن کے فارسی نثر کے اسٹائل کو زیادہ پسند نہیں کرتا۔ اِس میں انھوں نے عربی کے عام الفاظ سے اجتناب کر کے اپنی تحریوں کو نامانوس اور اجنبی بنا دیا ہے اس لیے وہ دل نشینی بھی کم نظر آتی ہے۔ جہاں تک اُن کی خطوط نویسی کا تعلق ہے وہ اپنی مثال آپ ہے— اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی اس درجے کی نثر مشکل سے تخلیق کی جا سکے گی۔ ان کی خطوط نویسی سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مکتوب الیہ کی نفسیات کو پوری طرح سمجھ کر لکھتے ہیں اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر وہ مکتوب الیہ کو ناگوارِ خاطر بھی کوئی بات لکھتے ہیں تو ایسا انداز اختیار کرتے ہیں کہ خود مکتوب الیہ بھی محظوظ ہوئے بغیر نہ رہتا ہوگا۔ اُن کے خطوط میں مقفیٰ اور مسجع عبارت بھی ملتی ہے مگر نہ تو وہ پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتی ہے کہ وہ مقفیٰ اور مسجع عبارت لکھی ہے اور نہ گراں گزرتی ہے۔

اب آخری سوال عرض کروں گا—

س: کیا غالب اس دور کے شاعر ہیں؟

ج: غالب میرے خیال میں دنیا کے بڑے شاعروں میں سے ایک ہیں، اور بڑے شاعر کسی خاص ملک یا قوم کے ساتھ مخصوص نہیں کیے جاسکتے۔ اِس لیے غالب کو بھی کسی خاص دور کا شاعر کہنا غلط ہوگا۔ وہ بھی زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ اگر اس کا صحیح طور پر ترجمہ کیا جاسکے تو خواہ وہ روسی میں ہو یا جرمنی میں یا انگریزی میں، اُس سے ہر زبان و ادب کے لوگ لطف اندوز اور فیضیاب ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ وہ خود کہتا ہے:

بیاورید گر اینجا بود زباں دانے
غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

مجھے یقین ہے کہ اس کی سخن ہائے گفتنی کو سمجھنے کے لیے دنیا اُن کی زبانوں کو بھی سیکھے گی جن میں وہ کہی گئی ہے اور یہ اُس خزانے کی بازیافت ہوگی جو بقول غالب، چرخ دفن کرکے بھول گیا ہے۔ فرماتے ہیں:

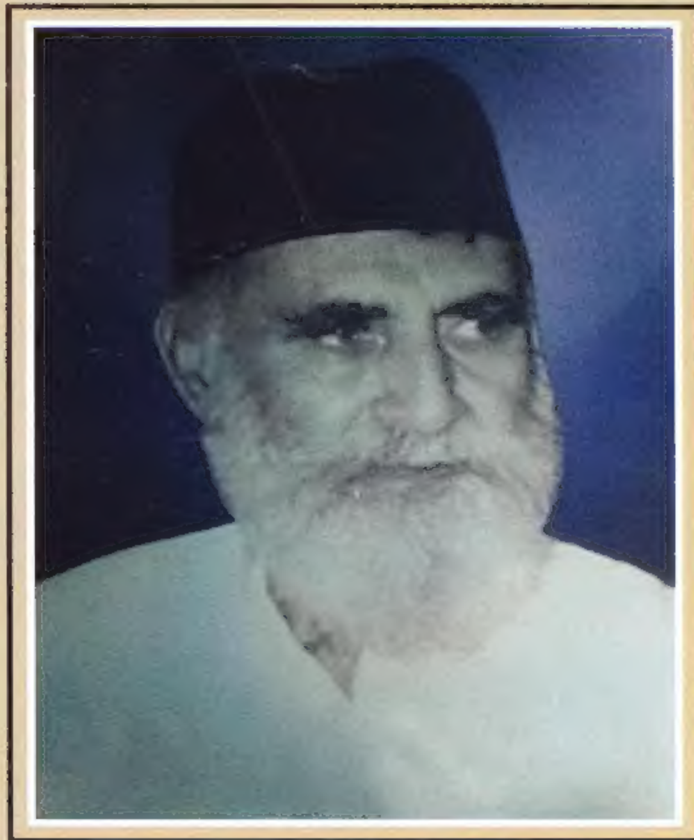
دَر لئیمی شہرۂ دہر از تہی دستی ست چرخ
رفتہ مسکیں راز یاد و گنج پنہانش نہم

یہاں پہنچ کر سوال و جواب کا سلسلہ ختم ہوا اور میں آئندہ پھر کسی وقت رضا لائبریری دیکھنے کا وعدہ لے کر رخصت ہوا۔



Imtiyaz Ali Arshi Ki Ghalib Shanasi

Compiled by : Saquib Imran



Maulana Imtiyaz Ali Arshi
(8-12-1904 - 25-02-1981)

Rampur Raza Library
Rampur-244 901 (U.P)
ISBN: 978-93-82949-52-7